دہلی کی یادگار شخصیتیں

اِس کتاب میں دہلی کے موسیقار، خوش نویس، اطبا، دہلی
کی سرائیں باؤلیاں، اُردو، فارسی کے شاعرات علمی
وادبی شخصیتوں کے حالاتِ زندگی درج ہیں۔

محمد امداد صابری

ناشر: سید حامد حسین جعفری میونسپل کونسلر گلی قاسم جان۔ بلیماران۔ دہلی

ہندوستان میں ملنے کا پتہ: امداد صابری۔ چوڑی والان۔ دہلی
پاکستان میں ملنے کا پتہ: حافظ منظر احمد۔ جنرل بوٹ ہاؤس۔ زیب النساء اسٹریٹ
صدر کراچی۔
سعودی عربیہ میں ملنے کا پتہ: مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ۔ پوسٹ بکس ۱۱۴
خوشنویس: سید حسن علی نقوی امروہوی
سالِ اشاعت: ۱۹۸۷ء
مطبوعہ: جمال پریس، چھتہ شیخ منگلو۔ چوڑی والان۔ دہلی

"دہلی کی یادگار شخصیتیں" کو میں اپنے بھانجے
واصف کمال صدیقی
کے نام معنون کرتا ہوں۔

یہ نوجوان واصف کمال صدیقی اپنی چھوٹی سی عمر میں انتہائی ہر دلعزیز ہو گیا تھا اس کی خدمت گذاری کی وجہ سے ڈی، ٹی، سی کا ہر ملازم ان کو دیوتا کہتا تھا۔ اس کی جان پر اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار رہتا تھا۔

ڈی، ٹی، سی کا ہر ملازم اس کی نعش کے ساتھ تھا۔ اس کے انتقال کے بعد ہر شخص ان کی خدمات کا اعتراف کرتا اور گنواتا تھا کہ میرے ساتھ یہ سلوک کیا۔ میری زندگی اس طرح بنائی۔

واصف کمال نے اپنے محلے اور عزیز و اقربار کو اپنے مرنے کے بعد ہی نہیں تڑپایا بلکہ ہر دلی والا تڑپ اٹھا جو اس کے انتقال کی خبر سنتا تھا بے چین ہو جاتا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ اس کے ماتم میں تقریباً ہر شہری نے حصہ لیا۔

اللہ تعالیٰ واصف کمال صدیقی کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور جنت الفردوس عطا فرمائے اور ہر ہندوستانی میں اس کی طرح ملک و قوم کی خدمت کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔

محمد امداد صابری
مدرسہ صولتیہ۔ مکہ معظمہ

محمد واصف کمال صدیقی

واصف کمال کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ ان کے جدِ امجد حافظ عبدالخالق صدیقی تھے۔ حافظ صاحب چمڑے کی تجارت کرتے تھے ان کی دکان تیلی واڑہ میں تھی، اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے دہلی کے رئیسوں میں شمار ہوتا تھا۔ ان کی ایک شکرم تھی جس میں بیٹھ کر دکان جاتے تھے۔ اور سیر و تفریح بھی کرتے تھے۔

حافظ صاحب مذہبی معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے، کسی نے ذکر کر دیا کہ فلاں مسجد کی دیوار ٹوٹی ہوئی ہے، فرش ٹوٹا ہوا ہے، چھت گر رہی ہے تو فوراً اس مسجد میں پہنچ جاتے، اس کی دیوار اور چھت بنوا کر دم لیتے تھے۔

غریب طلباء کا بہت خیال کرتے تھے۔ طلباء کی کتابیں خرید کر ان کو دیتے تھے، ان کے ماہانہ وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ یتیم بچوں کی شادی میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ اگر کسی نے بتا دیا کہ فلاں غریب بچی کی شادی ہونے والی ہے، اس کو فلاں چیز کی ضرورت ہے تو اس کا پتہ معلوم کر کے اس کی ضرورت کی چیز بڑی خاموشی سے پہنچا دیتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک غریب عورت آئی اس نے کہا میری بیٹی مر گئی ہے، اس کے لئے کفن کی ضرورت ہے اتنے روپے دیدیجئے۔ حافظ صاحب نے مطلوبہ روپے فوراً دیدئے۔ تین چار مہینے کے بعد وہ عورت پھر آئی، اس نے پھر یہی کہا کہ میری بچی کے لئے کفن کے لئے روپے چاہئے ہیں۔ حافظ صاحب نے اس مرتبہ بھی اس کو روپے دیدئے۔ حافظ صاحب

کے صاحبزادے عبدالمالک دونوں مرتبہ بیٹھے ہوئے تھے اس مرتبہ انھوں نے اپنے والد سے کہا۔ یہ عورت پہلے بھی اسی ضرورت کے لئے روپے لے گئی اب بھی اسی ضرورت کے لے مانگ رہی تھی۔ آپ نے فوراً دیدیئے۔ حافظ صاحب نے کہا بیٹا اس کی دوسری بیٹی مرگئی ہوگی، اس کے لینے کے لئے آئی ہوگی۔ اگر اس نے غلط بیانی سے کام لیا ہے تو اس کو کسی نہ کسی کام کے لئے روپے کی ضرورت ہوگی اگر ہمارے روپے اس کے کسی کام میں لگ جائیں تو کیا حرج ہے، ہمارا مقصد تو غریب کی مدد کرنا ہے۔

ان کے دو بھائی عبدالصمد صاحب اور عبدالرزاق صاحب تھے۔ عبدالصمد صاحب تجارت پیشہ تھے اور عبدالرزاق صاحب کو پہلوانی کا شوق تھا۔ اُن کی شادی امت الرحمٰن بنت نظام الدین صاحب سے ہوئی جس سے امت الشکور صاحبہ زوجہ چودھری اشفاق احمدؒ صاحب، امت السلام زوجہ شیخ خلیل احمدؒ صاحب جوہری ہوئیں۔

عبدالخالق کی پہلی بیوی سے عبدالملک صاحب اور دو لڑکیاں حسینہ بیگم زوجہ نور الٰہی صاحب کلکتے والے اور برکت النساء زوجہ حافظ نذیر احمدؒ صاحب عرف نذیری تھیں[1]

حاجی عبدالملک صاحب

حاجی عبدالملک صاحب نیک دل نیک سیرت انسان تھے۔ ان کی پہلی دوکان پاپوش کی چاندنی چوک میں تھی۔ اس کے بعد انھوں نے بلیماران میں دو دکانیں لیں۔ ایک دوکان کسی کو دے دی تھی۔ دوسری دوکان پر اپنا کاروبار چلایا جس میں آخیر زندگی تک تجارت کرتے رہے۔ حاجی صاحب کو پہلوانی کا شوق تھا۔ کسرت زیادہ تر گھر پر کرتے تھے کشتی

---

[1] رسالہ صدیقی گزٹ دہلی

کبھی نہیں لڑی ۔ یہ شوق ۷۵ سال کی عمر تک رہا۔ قویٰ ان کے مضبوط تھے۔ حج کے زمانے کا واقعہ آپ اپنے صاحبزادے کو سنایا کرتے تھے کہ میری صحت اتنی اچھی تھی کہ چلتے ہوئے اونٹ سے جب مجھے کسی کام کے لئے اترنا ہوتا تھا تو اونٹ کی گردن پکڑ کر اُتر جاتا تھا اور جب ضرورت پوری ہو جاتی تو چلتے ہوئے اونٹ پر چڑھ جاتا تھا۔

ان کو آم کھانے کا بہت شوق تھا تقریباً بارہ مہینے آم کھانے کی کوشش کرتے تھے اور دہلی کے مشہور آم کھانے والوں کی ایک ٹولی بنی ہوئی تھی جس میں ان کے علاوہ حافظ حمید الدین صاحب مالک یونانی دواخانہ لیماران، حاجی نور الٰہی صاحب، شمس العلماء سید احمد صاحب امام جامع مسجد دہلی تھے ۔ ان لوگوں سے حاجی صاحب سے گہرے مراسم اور تعلقات تھے ۔

حاجی صاحب کو اولاد سے بے پناہ محبت تھی، ایک مرتبہ رات کے دس بجے دس بجے دوکان سے گھر پہنچے۔ جب زینہ پر سے جانے لگے تو ان کی اہلیہ نے اُن سے کہا۔ زینہ کی کنڈی نہ لگانا غلام محمدؐ کو دیکھنے کے لئے ڈاکٹر آیا ہوا ہے۔ اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔ وہ یہ سُن کر سکتے میں رہ گئے۔ اور پڑوسیوں سے جو اُن کے ہم عمر تھے اُن سے اُنھوں نے کہا میرا لڑکا بیمار ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ میرا مرنا جینا بیٹے لڑکوں کے ہاتھوں میں ہو جب وہ اوپر آئے تو اُنھوں نے فرمایا۔ آج بابر کی رسم دوبارہ ہوگی۔ اور میں آج اپنی زندگی اپنے بیٹے کو دے رہا ہوں۔ لوگوں نے سمجھایا۔ آپ ایسا نہ کہیں یہ انشاء اللہ لڑکا ٹھیک ہو جائے گا۔ رات بھر دُعا کرتے رہے۔ فجر کی نماز با جماعت پڑھی صبح کو جبکہ ڈاکٹر دوبارہ آیا تو اس وقت اُنھوں نے کہا کہ میں نے اپنی زندگی اور اپنا رزق اپنے بیٹے کو دیدیا۔ ظہر کی اذان تک تسبیح پڑھنے میں مصروف رہے۔ رفع حاجت کے بعد وضو کیا۔ اس کے بعد نماز پڑھنے کی تیاری کر رہے تھے کہ انتقال ہو گیا۔ ان کا انتقال ۱۹۳۵ء کے ابتدائی مہینوں میں ہوا۔ ان کا مزار خواجہ باقی باللہ میں ہے۔

حاجی عبدالملک صاحب کا جنازہ جب گھر سے باہر نکلا تو غلام محمد صاحب کے اصرار پر اُن کو ڈولی میں بٹھایا گیا۔ آگے جنازہ اور اس کے پیچھے ڈولی تھی۔ غلام محمد صاحب کا کہنا ہے کہ وہ جب قبرستان سے واپس آئے تو اُن کا بخار اتر چکا تھا اور اُس وقت سے اُن کی طبیعت سنبھلتی چلی گئی [1]

حاجی عبدالملک صاحب کی پہلی شادی سعیدالنساء سے ہوئی جن سے محمد ایوب صاحب اور دو صاحبزادیاں خاتون بیگم زوجہ معراج الدین صاحب اور ہاجرہ بیگم زوجہ محمد یامین صاحب ہوئیں۔

محمد ایوب صاحب نیک دل محنتی اور حوصلہ مند انسان تھے۔ نیک کاموں میں کافی حصہ لیتے تھے۔ ان کی دیانتداری مشہور تھی۔ یہ اپنے والد صاحب کے ساتھ بلیماران کی دوکان میں کاروبار کرتے تھے۔ اس کے بعد گھر پر گلی حکیم جی والی میں کام کیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اسلام الدین ٹوپی والوں سے دوکان لی جو اب کشمیر چپل اسٹور کے نام سے مشہور ہے۔

ان کی شادی بنت غیاث الدین سے ہوئی۔ جن سے محمد رئیس صاحب اور لڑکیاں اُم ہانی زوجہ نور احمد، یمین زوجہ محمد محسن صاحب مینے والے، جواہر بی زوجہ محمد اجمل صاحب ہوئیں۔

محمد رئیس صاحب سادہ طبیعت آدمی ہیں۔ اپنے کاروبار سے واسطہ رکھتے ہیں دنیا کے کسی جھمیلے میں نہیں پھنستے۔ اپنے والد کی دوکان کو اُنھوں نے چار چاند لگائے ہیں اور کافی ترقی کی ہے، اللہ نظر بد سے بچائے۔

رئیس صاحب نے اپنی معاملہ فہمی اور دیانتداری کی وجہ سے اپنے کاروبار کو اتنے بام عروج پر پہنچایا کہ اُن کی دوکان کا بلیماران کی مشہور و معروف دکانوں میں شمار ہوتا ہے اور ملک کے بڑے شہروں میں ان کا مال سپلائی ہوتا ہے۔

---

[1] صدیقی برادری کی شخصیتیں صفحہ ۳۹۰۔

جنتا سرکار کے دور میں وقف بورڈ کی پروپرٹی کمیٹی کے یہ ممبر نامزد ہوئے انھوں نے پروپرٹی کمیٹی کے اور ممبروں کے ساتھ اپنی سمجھ بوجھ کی وجہ سے وقف بورڈ کی خستہ حالت اور مقروض بورڈ کی مالی حالت کو سدھارا۔ قرضہ ادا کرنے کے بعد اس کی آمدنی میں دگنے سے زیادہ سے اضافہ کیا۔ اور جب وقف بورڈ سے علیحدہ ہوئے تو وقف بورڈ کے خزانہ میں لاکھوں روپئے نقد چھوڑے۔ رئیس صاحب کی تجارتی حلقوں میں بڑی ساکھ ہے۔

رئیس صاحب کی شادی بدر منیر بنت حاجی عارف الٰہی صاحب سے ہوئی جن سے لڑکے اور لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۶۵ء میں آپ نے بھی حج کیا۔ مدینہ منورہ میں ہمارے ساتھ تھے۔

عبدالملک صاحب کی دوسری شادی رفیق النساء سے ہوئی جن سے غلام محمدؐ صاحب دوست محمدؐ صاحب، نور محمدؐ صاحب، غوث محمدؐ اور دو لڑکیاں عائشہ بیگم زوجہ محسن الٰہی صاحب اور ہزار بی زوجہ کرم الٰہی صاحب ہوئیں۔

غلام محمدؐ صاحب نے سنہری مسجد فوارہ میں قاری محمدؐ اسمٰعیل صاحب سے نصف قرآن مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد ایم، بی اسکول بلی ماراں میں چوتھی جماعت تک تعلیم پائی۔ گھر پر بھی مولوی محمدؐ ابراہیم صاحب سے تعلیم حاصل کی۔

ابتدا میں اپنے والد صاحب کے ساتھ کام کیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی دکان پر ملک بوٹ ہاؤس کے نام سے بلی ماراں میں کاروبار چلایا۔

غلام محمدؐ صاحب ہنس مکھ، ملنسار اور خلیق آدمی ہیں۔ ان کے دل میں قوم کا درد ہے جو ان کی باتوں سے پایا جاتا ہے۔ یہ کٹرہ شیخ چاند لال کنواں میں سکونت رکھتے ہیں۔

ان کی شادی ۱۹۴۲ء میں حور جبین بنت حاجی محمدؐ ایوب صاحب سے ہوئی جن سے سلطان محمدؐ صاحب، کمال محمدؐ صاحب، اقبال محمدؐ صاحب۔ لڑکیاں سلطانہ شمیمہ، سلطانہ ثریا سلطانہ مدینہ اور سلطانہ قمر ہوئیں۔

سلطان محمد صاحب نے فتحپوری ہائی اسکول سے ہائی سکنڈری کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے۔ بی کام کیا۔

کمال محمد صاحب فتحپوری مسلم ہائی اسکول سے ہائی اسکنڈری کی تعلیم پارہے ہیں اقبال محمد صاحب سے قرآن مجید پڑھ رہے ہیں۔ دوست محمد صاحب نے محلہ رودگران کی مسجد میں ناظرہ قرآن مجید پڑھا عربک اسکول اجمیری گیٹ میں نویں کلاس تک تعلیم پائی۔ ۱۹۵۶ء میں اپنے بڑے بھائی غلام محمد صاحب کے ساتھ کاروبار شروع کیا۔ اور ۱۹۶۵ء میں فرینڈ فٹ ویر کے نام سے کوٹھی حاجی کرم الٰہی احسان الٰہی میں تجارت شروع کی۔

ان کی شادی دل وجان بیگم بنت محمد شفیع صاحب وکیل سے ہوئی جن سے ایک صاحبزادے خالد محمد صاحب ہوئے۔

نور محمد صاحب نے عربک اسکول سے میٹرک ایف اے علی گڑھ مسلم کالج اور دیال سنگھ کالج لاہور سے بی اے کیا۔ اپنے بھائی دوست محمد صاحب کے ساتھ کاروبار کرتے ہیں

غوث محمد صاحب نے سنہری مسجد میں ناظرہ قرآن مجید پڑھا اور اردو کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ پاپوش کے اچھے تاجر ہیں ان کی شادی شکیلہ بیگم بنت شیخ عبدالواحد صاحب سے ہوئی جن سے ایک صاحب زادے شاکر محمد اور لڑکیاں عابدہ بیگم شہناز بیگم، فرحت بیگم، یاسمین بیگم اور شاہدہ پروین ہوئیں۔

عبدالخالق صاحب کی دوسری بیوی سے سلیم الدین صاحب عبدالواحد صاحب اور عبدالجبار ہوئے۔ شروع میں تینوں بھائی فتحپوری مسجد کے سامنے کورونیشن ہوٹل کے نیچے۔ ایک دکان میں پاپوش کا کاروبار کرتے تھے۔ عبدالجبار صاحب کا عین جوانی میں بواسیر کے مرض میں انتقال ہوا۔

سلیم الدین صاحب نے پہلے بلیماران میں دکان کی اس کے بعد ریلی کی دکان سے

پہاڑ گنج میں کی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد بلی ماران میں آگئے تھے، جہاں گلوب چپل کمپنی کے نام سے کاروبار کیا جس میں حاجی نواب الدین صاحب، حاجی نعیم الدین صاحب، محمد عاقل صاحب بیٹھتے تھے، ۱۹۷۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ خواجہ باقی باللہ میں ان کا مزار ہے۔

سلیم الدین صاحب کی شادی امت السارہ بنت حاجی محمد یوسف صاحب سے ہوئی جن سے بشیر الدین صاحب حاجی نواب الدین صاحب حاجی نعیم الدین صاحب محمد عاقل صاحب، عبد الرحمن صاحب اور لڑکیاں امت القدیر زوجہ محفوظ الٰہی صاحب امت البصیر زوجہ حاجی نبی احمد صاحب، کنیز فاطمہ زوجہ محمد عارف صاحب بننے والے اور سلطان بی رقیب النسا ہوئیں۔ مؤخر الذکر دونوں لڑکیاں فوت ہو چکی ہیں۔

بشیر الدین صاحب سنجیدہ اور متین طبیعت کے مالک ہیں۔ زیادہ زندگی آگرہ میں گذاری۔ آگرہ کی شو مارکیٹ میں جواہر شو کمپنی کے نام سے کاروبار کرتے ہیں۔ ان کی شادی صالحہ بیگم بنت شمس العارفین صاحب سے ہوئی جن سے کوئی اولاد نہیں ہے۔

نواب الدین صاحب نے بلی ماران کے ایم۔ بی اسکول میں چوتھی جماعت تک پڑھا اس کے بعد اسرار حسن خاں صاحب مرحوم سے تعلیم پائی تجارت کی ابتدا آگرہ سے ہوئی۔ حاجی محمد یوسف صاحب کے ساتھ آگرے گئے اور اعتماد بوٹ ہاؤس میں کام سیکھا۔ اس کے بعد حاجی محمد مسلم صاحب کی دکان برکت بوٹ ہاؤس میں کام کیا۔ کچھ عرصے کے بعد دہلی چلے آئے۔ پہاڑ گنج میں دکان کی جو ہنگامہ ۱۹۴۷ء میں لٹ گئی۔ بعدہٗ بلی ماران میں اپنے والد صاحب کے ساتھ کام کیا۔ آج کل موڈرن گوٹ ہاؤس بلی ماران میں شرکت میں کام کر رہے ہیں انھوں نے ۱۹۶۰ء میں حج کیا تھا۔

ان کی شادی ۱۹۴۲ء میں رحمت بی بنت حاجی احسان الحق صاحب سے ہوئی۔ جن سے ضیاء الدین صاحب، ریاض الدین صاحب لڑکیاں۔ نصرت نواب، حمیدہ نواب فرحت نواب، فرزانہ نواب اور خورشید نواب پیدا ہوئیں۔

ضیاء الدین صاحب اور ریاض الدین صاحب مدرسہ تعلیم القرآن میں قرآن مجید حفظ کر رہے ہیں۔ اور ان دونوں کو گھر پر ماسٹر پڑھانے کے لئے آتا ہے۔ نعیم الدین صاحب نے بلیماران کے مدرسہ ایم بی اسکول میں پانچویں جماعت تک تعلیم پائی۔ اس کے بعد تجارت شروع کی اور اپنے والد صاحب کے ساتھ بلی ماران میں کام کیا۔ اس کے بعد جامع مسجد اور پہاڑ گنج میں کام کیا۔ سنہ ۱۹۴۸ء کے بعد یوروپ چپل اسٹور کے نام سے بلی ماران میں کاروبار شروع کیا۔ ایک سال کے بعد سنہ ۱۹۴۹ء میں ہیرو چپل اسٹور کے نام سے تجارت شروع کی۔ ان کی شادی زیب النساء بنت احمد میاں صاحب آگرے والوں سے ہوئی۔ ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

محمد عاقل صاحب نے ناظرہ قرآن مجید مولوی عبد اللطیف کی مسجد محلہ چوڑی والان میں پڑھا۔ اردو کی تعلیم گھر پر پائی۔ والد صاحب کی دکان گلوب چپل کمپنی میں کام سیکھا۔ سنہ ۱۹۵۴ء سے آکسفورڈ شو کمپنی کے نام سے کاروبار کیا۔ ان کی شادی بمبئی کے خاندان میں ہوئی ہے۔ ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

عبد الرحمن صاحب نے بھی مسجد عبد اللطیف محلہ چوڑی والان میں قرآن مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد گھر پر اردو کی تعلیم پائی۔ سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد گلوب چپل کمپنی میں کام کیا۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں نائس چپل اسٹور کے نام سے ذاتی کاروبار کیا۔

ان کی شادی ۸ ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء کو فیروزہ بیگم بنت حافظ عبد المنان صاحب آگرے والوں سے ہوئی۔ جن سے فرح نعمان ۸ جون سنہ ۱۹۶۲ء کو اور صاحبزادے خالد رحمان ۲۰ اپریل سنہ ۱۹۶۴ء کو ہوئے۔

عبد الواحد صاحب نے بلی ماران گلی سوداگران میں ایک کارخانہ بنگال سلیپر فیکٹری کے نام سے جاری کیا تھا۔ یہ خوش طبیعت اور نیک سیرت انسان تھے۔ علماء کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ مولانا نور الدین صاحب بہاری اور مولانا عبد العلیم صدیقی سے خاص تعلقات

تھے اُن کا ۵ جنوری ۱۹۵۷ء کو انتقال ہوا۔ خواجہ باقی باللہ میں آرام فرما ہیں۔

اُن کی پہلی شادی سرور جہاں بنتِ محمد عمر صاحب عرف لوتو سے ہوئی۔ جن سے ایک صاحبزادے حامد کمال صاحب ہوئے۔ اُنھوں نے مسجد حمام کٹرہ بڑیان میں ناظرہ قرآنِ مجید ختم کیا۔ اور قاری فہیم اللہ صاحب سے مدرسہ تعلیم القرآن محلہ چوڑی والان میں نصف سے زیادہ قرآنِ مجید حفظ کیا۔ مدرسہ نعمانیہ فراشخانہ میں اُردو کی تعلیم پائی۔ اُنھوں نے احرار اور کانگریس کی تحریکوں میں حصہ لیا۔ جمیعت العلماء صوبہ دہلی کے ممبر ہیں۔ اور دہلی صدیقی برادری کی جماعت کے جنرل سکریٹری اور قومی اوقاف کی انجمن کے خزانچی ہیں۔

حامد کمال صاحب کی شادی صفیہ سلطان بنتِ مولوی شرف الحق صاحب سے ۱۹۴۲ء میں ہوئی جن سے واصف کمال صاحب اشرف کمال صاحب اور عطیہ سلطان ذکیہ سلطان ہوئیں۔ دو بچے ایک لڑکی اور ایک لڑکا تین اور چار سال کی عمر میں فوت ہوگئے۔

اشرف کمال ۲۹ جولائی ۱۹۵۲ء کو پیدا ہوئے اُنھوں نے قرآن مجید قاری موسیٰ صاحب سے حفظ کیا۔ پہلے چلا گیٹ کی مسجد میں تراویح سنائی۔ اس کے بعد جامع مسجد میں سنانے لگے جس کا سلسلہ ماشاء اللہ جاری ہے۔ آپ کا قرآنِ مجید حافظ نعمت اللہ صاحب سنتے ہیں۔ حافظ نعمت اللہ صاحب نے قرآنِ مجید اپنے والدِ ماجد رحمت اللہ صاحب سے مدرسہ دار الھدیٰ کشن گنج میں حفظ کیا۔ راقم الحروف امداد صابری نے اسی زمانہ میں حافظ رحمت اللہ صاحب سے قرآنِ مجید حفظ کیا۔ حافظ نعمت اللہ صاحب میری ہم جماعت اور اُستاد زادے ہیں۔

اشرف کمال نے مدرسہ کریمیہ گلی بدلیاں سے پانچویں کلاس تک تعلیم پائی۔ اینگلو عربک اسکول اجمیری گیٹ سے ہائر سکنڈری کا امتحان ۱۹۷۱ء میں پاس کیا۔ بی۔ اے آرٹز کا امتحان دہلی کالج سے ۱۹۷۴ء میں دیا۔ ۱۹۷۶ء میں ایم کام کیا۔ پہلے ملازمت ہمدرد دواخانہ میں

کی۔[1] بعد میں این۔بی۔سی۔ میں ملازم ہوئے۔ ایک سال سے زیادہ ہو گیا، اس کمپنی کی طرف سے بغداد گئے ہوئے ہیں۔ ان کی شادی شگفتہ بیگم سے ہوئی جس سے ایک صاحبزادے حسن ہوئے جو آٹھ نو مہینے کے ہیں۔ انھوں نے میرے ساتھ بچپن میں جامع مسجد میں آزاد ہند فوج کا ایک گیت سنایا تھا۔ بچپن سے تقریر کرنے کی عادت ہے۔ اردو ہندی کے اچھے مقرر ہیں۔

ذکیہ سلطانہ ۲۰ر اگست ۱۹۵۶ء کو پیدا ہوئیں۔ چشمہ بلڈنگ گرلز ہائر سکنڈری اسکول سے ہائر سکنڈری کا امتحان پاس کیا۔ لار کا امتحان بھی دیا۔ ۱۹۶۰ء میں اپنی والدہ کے ساتھ ڈھائی سال کی عمر میں حج کیا۔ دوسرا حج ۱۹۸۳ء میں اپنے والد ماجد عبدالمنان صاحب کے ساتھ کیا۔ دو سال ہوئے اُن کی شادی واجد علی ایڈوکیٹ سے ہوئی۔ جس سے ایک صاحبزادے حماد علی پیدا ہوئے جو نو مہینے کے ہیں۔

ذکیہ نام کی نہیں بلکہ عملاً بھی ذکی و فہیم و عقلمند ہیں۔ اگر یہ وکالت کرتی رہتی تو شاید وہ بھی کامیاب جج ثابت ہوتیں۔

علیہ خاتون حاجی کریم الدین صاحب کے مکان گلی حکیم جی والی محلہ چوڑی والان میں قرآن مجید پڑھنے کے لیے جاتی تھیں۔ اہلیہ رضی الدین صاحب شاندار کمپنی سے پڑھ رہی تھیں۔ یہ پورا گھر علیہ سے محبت کرتا تھا اور خاص طور پر شیخ کریم الدین صاحب کو اس سے بہت اُنس تھا، یہ اس کا بہت خیال کرتے تھے اور علیہ بھی ان کا کام جی جان سے کرتی تھی۔

علیہ ۱۰ر اگست ۱۹۵۸ء کی شام کو اپنی استانی کے ہاں سے اپنے گھر آگئی تھی۔ اس کا گھر میں دل نہیں لگتا تھا۔ استانی کے ہاں زیادہ وقت گزارتی تھی۔ چنانچہ

---

[1] داستان غدر ص۱۲۵

وہاں سے آنے کے بعد پھر جب وہیں جانے لگی تو اس کی والدہ نے منع کیا لیکن موت کھینچ رہی تھی کیسے نہ جاتی چنانچہ وہ اپنی استانی کے ہاں چلی گئی، جانے کے بعد کیا حادثہ پیش آیا ۱۳۔ اگست ۱۹۵۸ء کے نئی دنیا کی زبانی سُنئیے :۔

"محلہ چوڑی والان گلی حکیم جی والی میں ایک چار منزلہ مکان ۱۰ اگست ۱۹۵۸ء کو شام کے پونے چھ بجے اچانک منہدم ہو گیا جس میں تین بچے ہلاک اور دو اشخاص شدید مجروح ہوئے جناب حامد کمال صاحب کی بچی اور جناب مولانا امداد صابری صاحب کی بھانجی علیہ خاتون عمر سات سال ملبے کے نیچے دب کر ہلاک ہو گئی یہ معصوم بچی جس وقت اس حادثہ کا شکار ہوئی ہے اس وقت وہ قرآن پاک کا درس لے رہی تھی۔ اس حسرتناک موت پر سینکڑوں اشخاص کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں، جو اس موقع پر جمع ہوئے تھے۔ جناب رضی الدین صاحب کے دو بچے شہاب الدین اور شفیع الدین عمر دس سال اور سات سال تھی ملبے کے نیچے دب کر ہلاک ہو گئے تھے۔ حافظ کریم الدین صاحب عمر ۷۵ سال اور نسیم الدین عمر بارہ سال شدید طور پر اس حادثہ میں مجروح ہوئے۔ انھیں ارون ہسپتال میں داخل کر دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ علیہ خاتون حادثہ کے ڈھائی گھنٹے کے بعد ملبہ سے نکالی جا سکی۔ شہاب الدین، شفیع الدین کی لاشیں پانچ گھنٹے کے بعد ملبے سے نکالی گئیں۔ ان کی نماز جنازہ جامع مسجد میں ادا کی گئی اور حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ میں تینوں لاشیں سپرد خاک کی گئیں۔" انا للہ وانا الیہ راجعون۔

علیہ کو جب ہسپتال لے جایا گیا اور معائنہ کرنے کے بعد اس کی نعش لواحقین کو دی گئی۔

تو میں بدنصیب امداد صابری اس کے سرہانے کھڑا تھا۔ اس کی مٹھی کھولی تو ایک نیا پیسہ اور ایک پانچ پیسہ کا سکہ گویا ایک آنہ اس میں سے نکلا۔ یہ ایک آنہ مجھ سے اسکائی کے جلنے سے ایک گھنٹہ پہلے لے کر گئی تھی۔

یہ ہونہار کافی ہوشیار و فہیم تھی۔ جناب ماموں رشید صاحب صدیقی پلولی کچھ مہینے ہمارے مکان میں مقیم رہ چکے تھے عطیہ ان سے بہت مانوس تھی۔ انھوں نے اس کے دو واقعات مجھ کو لکھ کر دیئے ہیں۔ ان سے اندازہ لگایئے کہ یہ شہیدہ کس قدر ذہین و ذکی تھی۔

"کئی دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ عطیہ خاتون صابری صاحب کے مکان میں سو جاتی تھی اور آخر صابری صاحب مجھ سے فرماتے کہ میں اس کی والدہ کے پاس پہنچا آؤں۔ عطیہ کی والدہ کے مکان کا فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ چند دکانیں راستے میں پڑتی ہیں۔ ایک رات جب عطیہ کو گود میں لیکر اور کندھے سے لگا کر چلا تو وہ جاگ اٹھی اور میں نے دو پڑیاں عطیہ کے لئے خرید لیں۔ ایک میں نمک پارے اور دوسرے میں غالباً برفی تھی۔ عطیہ پیدل پڑیاں لئے ہوئے چلتی رہی۔ اس وقت اس کی عمر ساڑھے چار سال کی ہوگی۔ جب اُس کی والدہ کے بالاخانہ کا زینہ آگیا تو میں نے کہا آؤ گود میں آجاؤ۔ میں تمہیں اُوپر پہنچا دوں۔ عطیہ نے اصرار کیا میں خود زینہ پر چڑھ جاؤں گی۔ اوپر چڑھنے میں اسے ایک ہاتھ سے اگلی سیڑھی پکڑنی پڑی تو پڑیا ہاتھ سے چھوٹنے لگی۔ عطیہ نے اس موقعہ پر ہار نہ مانی اور مجھ سے درخواست نہیں کی کہ تم ہی اوپر پہنچا دو بلکہ اُس نے سیڑھیوں پر پڑیاں کو رکھ کر ایک پڑیا کو دوسری پڑیا پر رکھ دیا اور صاف اوپر پہنچ گئی۔ ایک واقعہ تو اس کی ذہانت کا یہ پیش آیا دوسرا واقعہ دن نے

بھی زیادہ عجیب ہے، وہ یہ ہے۔

ایک رات میں مولانا امداد صابری صاحب کے قالین پر بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا۔ مکان کے نچلے حصہ میں ان دنوں بجلی کا انتظام نہ تھا بلکہ ہری کن جلتی تھی۔ عطیہ نے میری کمر کی طرف جا کر میری کمر کو دانتوں سے کاٹنا شروع کیا۔ جب مجھے تکلیف زیادہ ہوئی تو میں نے اسے ڈانٹ کر منع کیا۔ تب اس نے کاٹنا چھوڑا۔ کاٹنے کی جگہ گوشت ذرا اوپر ابھر آیا تھا۔ میں نے نہایت نرمی اور عاجزی کے ساتھ عطیہ سے کہا۔ دیکھو تم نے کتنے زور سے کاٹا ہے، دیکھو ذرا ہری کن سے عطیہ نے لالٹین سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کافی کاٹ لیا ہے تو کہنے لگی تو اچھا تم بھی میری کمر میں کاٹ لو۔ میں نے پیار کے ساتھ ہلکے سے اس کے کاٹا تو کہنے لگی اور زور سے کاٹو میں نے ذرا اور زور سے کاٹا تو کہنے لگی ہر کن سے دیکھو بدلہ پورا لے لیا یا نہیں۔ میں نے ہر کن سے دیکھا اور کہہ دیا ہاں خوب کاٹا ہے۔

اب جب کبھی اس کا یہ واقعہ بیان کرتا ہوں تو اس کی صورت آنکھوں میں پھر جاتی ہے اور رونا آجاتا ہے۔"

میری تین بہنیں اُمت البصیر، اُمت الرشید اور صفیہ سلطانہ تھیں۔ ۱۹۴۷ء میں امت البصیر اور امت الرشید پاکستان چلی گئیں۔ امت الرشید کی بڑی لڑکی راشدہ تھی اس کو اپنے ننھیال کی طرف سے بہت پیار ملتا تھا۔ نانی کی یہ لاڈلی تھی۔ یہ اپنے والدین کے ساتھ پاکستان چلی گئی تو صفیہ سلطانہ کے صاحبزادے واصف کمال رہ گئے اُن کو ننھیال کی طرف پیار ملنے لگا۔ اُن کی نانی اُن کی پوری دیکھ بھال کرتی تھیں۔ صبح اسکول جانے کے لئے تیار کر کے مدرسہ کریمیہ میں بھیجتیں۔ ننھیال میں نانی، ماموں، ممانی سب ہی

پیار کرتے تھے گھر کو کھلونا بنے ہوئے تھے۔ ان کی نانی، ماموں اور ممانی ان کو پیار میں بتو کہتے تھے کبھی بتو طوطا بھی کہہ دیا جاتا۔ واصف کو بتو طوطا عرفیت بہت پسند تھی۔ واصف کے بچپن میں ایک رسالہ "آزاد ہندوستان" نکلتا تھا۔ اس کے ستمبر ۱۹۴۹ء کے شمارے میں ان کی ممانی صابرہ خاتون کا ایک مضمون "بتو طوطا" کے عنوان سے حسب ذیل شائع ہوا۔

منے میاں تم ضرور سوچو گے کہ "بتو طوطا" کوئی نام ہے تو سنو ہمارے ایک بھانجے ہیں۔ ان کو سب پیار سے بتو کہتے ہیں۔ ہمارے گھر میں ایک طوطا پلا ہوا تھا جو بہت ہی کٹکھنا تھا۔ چھوٹے بڑے سب کو کاٹتا تھا۔ ایک روز بتو گھٹیوں چلتے ہوئے اس کے پنجرے کے پاس پہنچ گئے۔ طوطا اپنی عادت کے خلاف ان سے بہت خوش ہوا۔ گردن اٹھا کر اور پھلا کر ان سے بہت دیر تک باتیں کرتا رہا۔ بتو اس کی گردن مروڑتا، اس پر نے سے ہاتھ زور زور سے مارتا وہ بہت دیر تک گردن پھلائے بیٹھا رہتا تھا۔ اسی روز سے بتو کا نام بتو طوطا پڑ گیا۔ بتو کا اصل نام محمد واصف کمال ہے۔

ڈیڑھ برس کی عمر کی بات ہے ننا کہو تو رونے لگتے تھے۔ واصف کہو تو رونے لگتے تھے۔ میاں کہو تو رونے لگتے تھے "بتو طوطا" کہو تو خوش ہوتے تھے۔ اس عمر میں ننگے رہنے کو برا سمجھتے تھے، کوئی ننگا کر دے تو رونے لگتے تھے۔ ازار بند باندھنا نہیں آتا تھا دو منٹ ازار بند نہ بندھا تو رونے کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

بتو طوطے کے ایک بزرگ حاجی محبوب الٰہی صاحب دہلی کے مشہور رئیس اور سوداگر، بتو طوطے کو اس عمر میں پجامہ پہنتے پر "بی بی بخش" کہا کرتے تھے۔ بتو طوطے دو برس کے ہوئے تو صبح اٹھ کر نماز پڑھنے حوض والی مسجد پوڑی والان میں جاتے تھے۔ نماز تو پڑھنی آتی نہیں تھی نقل کرتے، جس طرح دوسرے نماز پڑھتے ہیں۔ بتو طوطے اسی طرح رکوع کرتے اور سجدہ کرتے تھے۔ اسی عمر میں نماز پڑھتے پر اسی مسجد کے متولی حاجی عبد الحکیم

صاحب مالک جنرل بوٹ ہاؤس بوطوطے کو "مسلمان" کہہ کر پیار کرتے تھے۔

بوطوطے اس عمر میں اتنے نازک مزاج تھے کہ اگر کوئی ان کو پیار کرتا تھا۔ خواہ انکے دادا ہوں خواہ اماں ہوں خواہ نانی ہوں تو آپ دہاڑے مار کے رونے لگتے تھے اور گلے کو پونچھ کر جیسے اس پر کوئی گندی چیز لگ گئی ہو روتے روتے کہتے تھے پیار مام (پیار ماموں) ہی کریں گے۔

بوطوطے کو ڈھائی برس کی عمر میں پڑھنے کے لئے مدرسہ کریمیہ میں جو ان کے گھر کے قریب ہے بٹھا دیا گیا تھا۔ یہ وہ بچہ تھا جس کی حاضری کے رجسٹر کے خانہ میں کوئی غیر حاضری نہیں لکھی ہوئی ہے۔ صبح اٹھ کر ناشتہ کھائے پیئے چلے جاتے تھے۔ اس دو سال کی ننھی سی جان بوطوطے کی لغت یعنی بولی سن لیجئے۔

اماں اٹی، دا ماں سدی لا دو، اماں آ کر جا، وسالن دیدو، امام مام (اماں ماموں) اماں پیا مہ، (اماں پجامہ) اماں چیپر طرا (اماں جیبی کے ہاں جاؤ) اماں پوپی (اماں ٹوپی) اماں آیا (اماں چیز دو) اماں سی (اماں یہ مانی ہیں) اماں آلہ (اماں خالہ) اماں لنگو (اماں دوپٹہ) جیتہ (کرتا) پیان (بنیان) جیتی (جوتی) بات (برف) لولی (ڈولی) خمہ (ختم) طوبیے حقوت (طوطا بے وقوف)۔

تقریباً چار برس کی عمر سے بوطوطے گھر کا تمام کام کاج کرتے اور سودا سلف لاتے تھے۔ ترکاری، دہی لاتے، گوشت بھی قصائی کے ہاں سے لاتے تھے، پان چھالیا، کتھ، زردہ، وہی خرید کر لاتے تھے۔ پولیس والا ہو، فوجی ہو، دکاندار ہو، ملنے جلنے والے ہوں، چلتا پھرتا کوئی آدمی ہو۔ ان کے بھولپن کو دیکھ کر ان کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ بھولی بھالی باتیں سنتا۔ محلہ کا ہر ایک شخص ان سے محبت کرتا ہے۔ ہر دکاندار سودا اچھا اور زیادہ دیتا ہے اور پیار سے باتیں کر کے دل بہلاتا ہے۔ ماشاء اللہ عمر زیادہ دے۔ اب آپ چھ برس کے ہیں۔ نماز ان کو پوری یاد ہے۔ سو تک گنتی آتی ہے۔ آٹھ تک پہاڑے یاد ہیں۔

قرآن مجید جہاں سے چاہو پڑھ والو، اُردو کی کوئی سہل کتاب کہیں سے پڑھوا لو پڑھ دینگے
بوطوطے کو بکری اور بکری کے بچے پالنے کا بہت شوق ہے۔ بقر عید کے دن صبح اُٹھتے
ہی حافظ رحمت اللہ صاحب جوان کے ماموں کے استاد ہیں کے یہاں پہنچے وہاں کے
بکروں کی تعداد امی کو بتائی اور ان کے رنگ 'بکری ہے یا بکرہ' یہ بتلایا اس کے بعد بھائی
فرید الدین کے ہاں پہنچے ان کے بکرے بہت پسند آئے بھاگم بھاگ امی کے پاس
آئے امی امی بھائی فرید کے بکرے بہت اچھے ہیں' حافظ جی کے بکرے اچھے نہیں ہیں
دُبلے پتلے ہیں سینگ مارتے ہیں۔ بھائی فرید کے بکرے موٹے تازے ہیں۔ میں نے
ان کو پیار کیا۔ اُنھوں نے مجھ کو کچھ نہیں کہا اور کاٹا نہیں' خاموش کھڑے رہے غرض
تین روز تک ہر ایک کے بکروں کے ذبح ہونے کی پوری۔ پوری رپورٹ دیتے تھے آج بنتان
کے ہاں ہوں گے کل بھائی فرید کے ہاں ہوں گے اور پرسوں حافظ جی کریں گے۔
بوطوطے پڑھنے میں بہت تیز ہیں۔ مولانا محمد یوسف قبلہ دہلوی نے ان کا امتحان
لیا۔ پہاڑے سُنے گنتی سُنی۔ چاروں کلمے سُنے، قرآن مجید کا ہر ایک ورق کھول کر پڑھوایا
انھوں نے فر فر پڑھا۔ صحیح گنتی سنائی پہاڑے سُنا دئے، بچوں میں چاروں کلمے بھی ایک ایک
سانس میں سُنا دئے۔ مولانا یوسف صاحب بہت خوش ہوئے، خوش ہو کر مولانا نے ان کو
ایک کتاب ارکان اسلام انعام میں دی۔ بوطوطے کے امتحان کا نتیجہ نکلا تو بوطوطے دوڑے
دوڑے آئے۔ امی' امی ماسٹر جی نے میرے گلے میں ہار ڈالے ہیں۔ دیکھنا محمد میاں بہت
کھلنڈرا تھا۔ بہت دنوں سے ہمارے مدرسے میں پڑھتا تھا وہ فیل ہو گیا وہ بہت رو رہا
تھا ہم کو مولانا یوسف صاحب نے یہ کتاب انعام میں دی ہے۔ دیکھنا ہاں امی'
بچے محمد میاں کو چھیڑ چھیڑ کر یہ کہہ رہے تھے۔

"پڑھو گے، لکھو گے تو ہو گے نواب کھیلو گے کودو گے تو ہو گے خراب"

واصف کمال اکتوبر ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے چھٹی جماعت تک مدرسہ کریمیہ

گلی بدلیاں، محلہ چوڑی والاں میں تعلیم پائی۔ اینگلو عربک اسکول، اجمیری گیٹ دہلی سے ہائر سکنڈری کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۶۳ء کو دہلی کالج سے بی۔ اے آنرز کیا ۱۹۶۶ء میں دہلی یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۶۲ء میں دہلی کالج سٹوڈنٹ کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے تھے۔

ملازمت کے لئے درخواستیں دیں جہاں درخواستیں دیں وہاں سے انٹرویو میں بُلایا گیا۔ تمام انٹرویو میں کامیاب ہوتے ہر ایک نے ان کو ملازمت کے لئے بلایا۔ آخر انھوں نے ڈی سی ٹی۔ سی میں ملازمت قبول کی۔

بچپن ہی سے واصف کمال نے اچھے خیالات کو اپنے دماغ میں رکھا اور ان پر عمل پیرا رہے۔ ملازم ہوئے وہاں بھی اُن خیالات پر عمل کیا۔ محنت و پیار اُن کو بچپن سے ملنا شروع ہوا۔ تو انھوں نے دوسروں کے ساتھ بھی ہمدردی و ملنساری کا بھی اظہار و برتاؤ کیا۔ شروع سے ہی اچھی پوسٹ پر لگے تھے۔ نہ انہ ضرور تمند ان کے پاس جاتے اور اپنی ضرورتوں کو بیان کرتے تھے۔ ٹال مٹول کا طریقہ انھوں نے اختیار نہیں کیا۔ اپنے افسروں اور ماتحتوں سے اچھے تعلقات رکھے۔ اکڑ نوں کی نہیں۔ چنانچہ جس کام میں ہاتھ ڈالا کامیاب ہوئے۔ تھوڑے دنوں میں ان کے کام کرنے کی شہرت ہوگئی۔

گھر سے جب نکلتے جاتے اور جاننے والے کو سلام کرتے ہوئے گزرتے کسی کا دل دُکھانا نہیں جانا، ان کی دفتر کی گاڑی ان کو صبح لینے کے لئے آتی تھی۔ ان کی گلی کے سامنے کھڑی ہو جاتی تھی جہاں رکشائیں کھڑی ہوتی تھیں۔ ایک روز کسی رکشا پولر نے ان کے ڈرائیور سے کہدیا کہ ان کی گاڑی سے ہماری رکشا کھڑی ہونے میں دقت پیدا ہوتی ہے۔ ڈرائیور نے رکشا پولر کی بات واصف سے کہہ دی۔ واصف نے ڈرائیور سے کہا کہ کل سے تم جامع مسجد کی پولیس چوکی کے نزدیک درخت کے پاس گاڑی کھڑی کر دیا کرو۔ کل سے میں وہاں جا کر گاڑی پر بیٹھ جایا کروں گا۔ رکشا ڈرائیوروں نے دیکھا کہ ہماری جگہ پر گاڑی کھڑی نہیں ہو رہی ہے تو انھوں نے واصف کمال کو بڑی دعائیں دیں۔

اسی طرح کا ہمدردانہ کام واصف اپنے دفتر میں کرتے۔ دفتر یا گھر میں یار استے میں کسی نے کہہ دیا کہ میں نے ڈرائیوری کے لئے درخواست دی ہے یا ٹکٹ چیکری یا کلرکی کی درخواست دی ہے تو اس کا نام اپنی ڈائری میں لکھ لیا کرتے تھے یا کسی نے کہا کہ آپ کے سامنے یا کسی افسر کے سامنے فلاں تاریخ کو انٹرویو ہونے والا ہے تو ڈرائیوری، ٹکٹ چیکری اور کلرکی اُمیدواروں کی مدد کرتے، انٹرویو لیتے وقت خود اس کا خیال کرتے اگر کسی دوسرے افسر کے انٹرویو ہونے والا ہوتا تو اس کو ٹیلیفون کر کے اُس کی سفارش کر دیتے عام طور پر افسران واصف کی سفارش پر ہمدردانہ عمل کرتے تھے اور یہ بھی افسران کی سفارش پر توجہ دے کر اُن کا کام کر دیا کرتے تھے۔ معلوم واصف کمال نے کتنے ڈرائیور، ٹکٹ چیکروں، کلرکوں اور دوسرے [illegible] لگوا دیا تھا اس کی تعداد معلوم نہیں ہو سکی۔

کسی اسکول و کالج کے ساتھی نے کہا کہ اجمیری گیٹ سے فلاں روڈ لگوا دو۔ کسی نے کہا جمنا پار اور نیو سیلم پور جامع مسجد سے کافی لوگ آتے جاتے رہتے ہیں وہاں کے جانے آنے کے لئے بس لگوا دو۔ اوکھلے سے بھی جامع مسجد کے لوگوں کی اچھی آمد و رفت رہتی ہے وہاں جانے کے لئے بس کی ضرورت ہے۔ [illegible] لگوا دیجئے تو کسی [illegible] وعدہ کر لیا پورا کیا۔

واصف کمال اپنے بزرگوں کے ساتھیوں سے بڑا ہمدردانہ سلوک کرتے تھے۔ میرے قدیم دوست پنڈت ہر سروپ شرما تھے اُن کے بھانجے ڈی۔ ٹی۔ سی میں ملازم تھے۔ ان کو کسی افسر نے غالباً معطل کر دیا تھا۔ ان کے بھانجے نے ہر سروپ شرما جی سے کہا کہ واصف کمال مولانا امداد صابری کے بھانجے ہیں۔ اُن کے پاس مجھ کو لے چلئے وہ میری واصف کمال صاحب سے سفارش کر دیں گے تو میرا کام ہو جائے گا۔ شرما جی نے اپنے بھانجے سے کہا کہ صابری صاحب کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے

تم واصف کمال سے میرا نام لینا وہ تمہارا کام کرادیں گے چنانچہ شرماجی کے بھانجے نے واصف سے شرماجی کا نام لیا اُن سے اپنا رشتہ بتایا اور کام بیان کیا، تو واصف نے اُس سے کہا تم پنڈت ہرسروپ شرما کے بھانجے ہو اور میں صابری صاحب کا بھانجہ ہوں۔ بھانجہ بھانجے کا کام ضرور کرے گا۔ چنانچہ اسی وقت واصف نے متعلقہ افسر کو ٹیلیفون کیا اور اس سے کہا کہ یہ کام فوراً کردو۔ میں ان کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔ پنڈت ہرسروپ شرما کا بھانجہ اس افسر کے پاس پہنچا اُسی وقت اُس نے ان کی بحالی کا آرڈر لکھ کر دے دیا۔ یہ بات اس نے شرماجی سے کہی اور ایک روز شرماجی نے اس واقعہ کا ذکر مجھ سے کیا۔ مجھ کو یہ واقعہ سُن کر ہنسی بھی آئی اور خوشی بھی ہوئی۔

واصف کمال کے والد ماجد حامد کمال کے دوستوں میں حکیم سید حسین اور عبدالحق پراچہ تھے۔ ان کو واصف کمال سے کچھ کام پڑ گیا۔ یہ دونوں حضرات اُن کے دفتر پہنچے، واصف نے ان کو دیکھ کر کرسیوں پر بٹھایا۔ چائے پلائی اور معلوم کیا کہ کس کام سے آئے ہیں۔ اُنھوں نے کام بتایا۔ واصف نے ٹائپ کراکر پرچہ دے دیا۔ غالباً ان کو بسوں کی کسی تقریب کے سلسلے میں ضرورت ہوگی وہ بسیں تاریخ مقررہ پر پہنچ گئی تھیں۔

واصف کے کام کا ڈھنگ ہمدردانہ ہوتا تھا۔ روزانہ جو بھی کام لے جاتا تھا اُس کا کام ہو جاتا تھا۔ روزانہ اسی فی صدی کام اُس کے ہاتھوں سے ہوتے تھے آج سے پندرہ سولہ سال پہلے کی بات ہے کہ مساجد کی تحریک دہلی میں چلی جس میں ہزاروں آدمی گرفتار ہوئے تھے گرفتاری اس طرح ہوتی تھی جلسہ ہوا اس کے اختتام پر چار سو پانچ سو آدمی گرفتار کئے جاتے تھے اور گرفتار ہو جاتے تھے دلی کے عمائدین دہلی کے افسران اور مساجد تحریک کے لیڈران سے مشورہ کرتے سمجھوتا کرایا۔ رہائی کی تاریخ مقرر ہوئی میں بھی اُس وقت دہلی کی تہاڑ جیل میں مساجد تحریک کے لوگوں کے ساتھ تھا میں نے جیل سے واصف کو ٹیلیفون کیا کہ فلاں آدمی تمہارے روپیے لے کر آئے گا۔ فلاں تاریخ کو فلاں وقت تہاڑ جیل کے گیٹ پر آتی بسیں

بھجوا دیتا۔ مقررہ وقت پر آدمی واصف کے پاس گیا روپے جمع کرائے تو وقتِ مقررہ بہن تہاڑ
جیل پہنچ گئیں۔

ایمرجنسی کے زمانے میں میں انبالہ سنٹرل جیل میں نظر بند تھا۔ انبالہ بس جاتی تھیں
واصف ان کے ذریعہ مجھ کو پہننے کے کپڑے اور پھل وغیرہ بھجوا دیتے تھے اور جب رہا ہوا
تو واصف انبالہ ہسپتال پہنچ گئے تھے، میں اس وقت شدید بیمار تھا۔ مجھ کو ریل سے
اپنے ساتھ اپنے بھائی اشرف کمال اور میرے بڑے لڑکے اشرف صابری کے ساتھ بڑے آرام
سے لائے۔ مجھ کو واصف سے اور واصف کو مجھ سے بے حد محبت تھی میرا بہت لحاظ
کرتے تھے۔

ڈی، بی، ڈی، سی کا ایک ملازم بلا وجہ واصف کی مقبولیت سے جل کر ان کی مخالفت کرتا
تھا۔ ان کے خلاف ملازموں کو ہر طرح اکساتا ملازموں پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا اس لئے کہ وہ واصف
کی خصلت سے واقف تھے اس میں زیادہ تعداد ایسی تھی کہ جو واصف کے احسان مند تھے۔
افسران کو بھی واصف کے خلاف گمنام لوگوں کے نام سے چٹھیاں لکھتا تھا افسران بھی واصف
کے کردار و اطوار کو جانتے تھے لیکن کتنا ہی بے اثر مخالف ہو کچھ نہ کچھ ذہن، دل و دماغ پر اس
کی مخالفت کا اثر ہوتا ہے اور اس وقت تو ضرور ہوتا ہے جب انسان سوچتا ہے کہ میں
نے اس کی کوئی مخالفت نہیں کی کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ آخر یہ ایسا کیوں کر رہا ہے
واصف کے سامنے جب اس کی مخالفت کا ذکر آتا تو ہنس کر ٹال دیتے تھے۔ اور کوئی بات
شروع کر دیتے تھے، ایک لفظ بھی کبھی اس کے خلاف نہیں کہا۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ واصف کے اس مخالف کے خلاف افسران کو شکایتیں
پہنچیں جو خاصی وزنی تھیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس کا کیس تحقیقات کے لئے واصف
کے پاس پہنچا۔ واصف نے اس کی تحقیقات صاف ذہن سے کی۔ جب واصف کو معلوم
ہوا کہ اس کے خلاف جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ دشمنی کی وجہ سے لگائے گئے ہیں۔

اس میں کوئی سچائی نہیں ہے۔ ان کی رپورٹ پر وہ بری ہو گیا۔

جب واصف کے مخالف کو معلوم ہوا کہ واصف کمال صاحب نے میرے حق میں رپورٹ دی ہے جس کی وجہ سے میں بے قصور ٹھہرایا گیا ہوں تو اس نے مجھ تک پہنچنے کے لئے آدمی کی تلاش کی تو اس کو پنڈت ہر سروپ شرما نظر آئے۔ ان کے ہمراہ ایک اور وہ حضرت میرے گھر پر آ گئے، بہت نادم تھے کہ میں نے ان کے ساتھ ایسے ایسے سلوک کئے اور انھوں نے میری زندگی بچالی میں ملازمت سے علیحدہ ہو جاتا تو میری بیوی اور بچے بھوکے مرتے میں ان سے معافی مانگنے آیا ہوں میں نے ان کو بٹھایا اور واصف کو آواز دی وہ دفتر جا چکے تھے۔ میں نے شرما جی سے کہا تم واصف کو جانتے ہو وہ دل میں بات نہیں رکھتا۔ اگر کسی نے اس کی مخالفت کی ہے تو بُرا نہیں مانتا ہر سروپ جی نے کہا میں نے اب یہی سمجھایا ہے کہ وہ نیک بچہ ہے میں ان کو بچپن سے جانتا ہوں۔ میں نے اُن سے کہا آپ لوگ کل آٹھ بجے سے پہلے آ جاؤ۔ میں ان کو اس وقت بلوا دوں گا۔ واصف رات کو گھر پر آئے۔ وقت مقررہ پر اپنے چھوٹے بچے فضل کمال کو اپنے ہمراہ لائے میں نے اُن سے ہر سروپ شرما جی اور ان کے مخالف کے آنے کا ذکر کیا تو واصف نے کہا ماموں مجھ کو آپ کی ایک ہدایت یاد ہے اس پر سختی سے عمل کرتا ہوں کہ وہ غریب قصور وار نہیں ہے غلط فہمی میں میری مخالفت کرتا تھا میں نے اس کی مخالفت پر کبھی توجہ نہیں دی۔ مجھ کو اپنے خدا پر یقین ہے، وہی عزت دیتا ہے وہی ذلت دیتا ہے۔ اگلے روز ہر سروپ جی کے ساتھ واصف کے مخالف آئے۔ واصف کو آواز دی۔ واصف نے اپنے مخالف کو دیکھتے ہی گلے لگا لیا۔ وہ معذرت کرتا رہا۔ واصف نے کہا کوئی بات نہیں ہے زندگی میں مخالفت موافقت دونوں ہوتی ہے میرے دل میں تمہاری مخالفت نہ پہلے تھی نہ اب ہے جاؤ آرام سے کام کرو۔ زیادہ زندہ رہتے ہو تو میں نے تم کو معاف کیا۔ واصف کمال کو ملازمت کے زمانہ میں یہ کردار تھا۔

ڈی ٹی سی کے ملازمین نے ایک مرتبہ ایجی ٹیشن کیا مشتعل ملازموں نے افسران پر حملے کئے۔ واصف پر بھی حملہ ہوا حملہ ہونے کے بعد واصف کے حامیوں نے ان کو گھیرے میں لے لیا اور مشتعل ملازمین کو سمجھا بجھا کر اس ہڑبونگ سے نکال کر واصف کو ان کے گھر پہنچا دیا واصف کے چوٹیں آئیں لیکن اس قدر نہیں جو افسروں کے آئی تھیں۔ واصف کا علاج ہوا چند دنوں میں تندرست ہو گئے۔

جب ایجی ٹیشن ٹھنڈا ہو گیا۔ تو جس ڈپو پر جھگڑا مار دھاڑ ہوئی تھی اس کے انتظام سنبھالنے کا مسئلہ افسران کے سامنے آیا۔ کوئی افسر اس ڈپو پر جانے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ آخر واصف کمال کا نام آیا۔ واصف تیار ہو گئے۔ اُن کے نام پر ملازمین نے اعتراض نہیں کیا۔ واصف نے تھوڑے دنوں میں اس ڈپو کا انتظام سابقہ طور پر چلا دیا تھا اس لئے کہ ہر ملازم نے اُن سے تعاون کیا تھا۔ واصف کمال نے ۱۹۸۲ء کے حج کے لئے اپنی اپنی اہلیہ زرین آراء اور اپنے چھوٹے لڑکے تفضل کمال کی درخواستیں بھیجی تھیں۔ بھاگ دوڑ کر کے ان تینوں سیٹوں کا انتظام بھی کر لیا تھا۔ وہاں جو سامان جاتا ہے اس کے انتظام میں یعنی خریدنے میں لگے ہوئے تھے۔

۲۲، ۲۳ اپریل ۱۹۸۲ء کی درمیانی شب میں واصف کمال اپنے والد حامد کمال سے مل کر اپنے چھوٹے بچے تفضل کمال کے ساتھ مجھ سے نیچے ملنے آئے مل کر اپنے سونے کے بالا خانہ پر چلے گئے لیٹے پونے گیارہ بجے پیٹ میں درد ہوا تکلیف بڑھی بیوی سے کہا ایسی تکلیف مجھے کبھی نہیں ہوئی۔ اُن کی بیوی نے کہا۔ تمہارے والد کو بلا لوں۔ اُنھوں نے کہا نہیں، اُن کو تکلیف نہ دو، میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ باتیں کرتے کرتے اُن کی بیوی سو گئیں۔ واصف پانی لینے کے لئے اُٹھے۔ کچھ چلے تو گر گئے۔ میں نیچے اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھ کو کسی کے گرنے کی آواز آئی اتنے میں ان کی اہلیہ نے ان کی حالت دیکھ کر سب کو آواز دی۔ نیچے ہم سب لوگ اور درمیانی حصے سے ان کے والد کمال اُن کے چھوٹے بھائی اشرف کمال

اور پہنچے، دیکھا واصف گرے پڑے ہیں۔ اشرف کمال بھائی کے دوست ڈاکٹر نثار کو لینے گئے۔ انھوں نے واصف کو خوب اچھے طریقے سے دیکھ کر مجھ کو اشارے سے کہلایا میں کچھ رکھا نہیں ہے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ڈاکٹر جیرت آئے انھوں نے بھی یہی کہا کہ فوت ہو گئے ہیں۔ انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون۔

گھر میں کہرام مچ گیا۔ واصف کمال کی ساس اور سالے آئے، دیکھ کر بے حال ہو گئے شادی کو ہوئے سات سال گذرے تھے دو چھوٹے بچے آصف کمال پانچ سالہ چھوٹا افضل کمال سوا تین سالہ بیوی جوان، اللہ کے بھید اللہ ہی جانے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ جو کرتا ہے اس کی بھلائی کے لئے کرتا ہے۔

سارا گھر رات بھر جاگا۔ صبح کو واصف کمال کے، دفتر میں انتقال کی خبر پہنچی تو آگ کی طرح تمام اسٹاف میں پھیل گئی۔ اب جو دفتر کے لوگ آنے شروع ہوئے ہیں تو تانتا بندھ گیا گھر بھر گیا، محلہ بھر گیا۔ گلی ہدلیان سے لے کر سڑک پریم نرائن کمال مسجد تیلیوں کا پھاٹک کا بازار، دوسری طرف پہاڑی املی، بازار چتلی قبر، محلہ قبرستان کے بازار سے لے کر کمان گیٹ کے باہر نکل کر رام لیلا گراؤنڈ سے ہوتے ہوئے جے پرکاش ہسپتال سے گذر کر ہندیوں تک جم غفیر تھا پولیس نے جب بڑا اژدحام دیکھا تو ٹریفک کے انتظام کے لئے کھڑی ہو گئی تعداد کتنی تھی اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا کوئی پانچ ہزار کوئی دس ہزار کہتا تھا لیکن پانچ اور دس ہزار کے درمیان تو تعداد ضرور ہی تھی۔ سکدار ناتھ ساہنی اور میر مشتاق احمد اس تعداد کو دیکھ کر حیرت میں رہ گئے۔ اور جو آتا تھا اس کی تعریفیں کرتا ہوا آتا۔ یہ بات تو متفقہ طور پر ڈی۔ ٹی۔ سی کا عملہ کہتا تھا کہ ایسا دیانتدار آفیسر کبھی ڈی۔ ٹی۔ سی کو میسر نہیں ہوگا۔ ہر ملازم کی عزت کرتے تھے اُن کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ جنازہ کی نماز مولانا اخلاق حسین قاسمی نے پڑھائی۔ علی محمد شیر میوات متولی درگاہ حضرت شاہ ولی اللہ نے بتایا کہ جب ان کے سرداوے کو کھولا گیا تو وہاں جو لوگ کھڑے ہوئے تھے انھوں نے بتایا کہ سرداوے

سے ایسی بھینی بھینی عجیب و غریب خوشبو نکلی کہ سب کے دماغ معطر ہو گئے۔

دوسرے ہفتہ پیر کے روز دہلی شہر یو ں کی نمائندہ کارپوریشن نے واصف کمال کی خدمات کو سراہتے ہوئے ایک تعزیتی تجویز پاس کر کے تمام ممبران نے دو منٹ کے لئے کھڑے ہو کر اظہار غم کیا اور مغفرت کے لئے دعا مانگی۔

محمد امداد صابری

مدرسہ صولتیہ۔ مکہ معظمہ۔ ۹ ستمبر ۱۹۸۶ء

سببِ تالیف

میری جو کتابیں ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہیں اُن میں سے حج کے سفر نامے، دہلی کے انقلابی لوگ، دہلی کی یادگار شخصیتیں، سیرت حاجی امداد اللہ اور اُن کے خلفاء، تاریخ صحافت اُردو کی چھٹی اور ساتویں جلد، قاریانِ دہلی، حجاز مقدس میں علماء ہند و پاک کی دینی خدمات وغیرہ ہیں۔

ایک سال سے میری کتاب "سیاسی رہنماؤں کی مائیں اور بیویاں" کی کتابت ہو رہی ہے۔ ۹۶ صفحے لکھ کر منشی محمد الیاس جواب دے گئے۔ منشی رشید نے کتابت شروع کی تو دو سو صفحے لکھ کر بہانہ بنا کر چلے گئے، تین جز کی تقریباً کتابت باقی رہ گئی تھی۔

نور الاسلام کاتب نے ڈیڑھ مہینے کے بعد پندرہ صفحے لکھ کر باقی کا ایک ہفتہ کا وعدہ کر کے چلے گئے، پچیس روز ہو گئے ہیں ابھی تک انھوں نے شکل نہیں دکھائی۔

ایک خوش نویس سید ذہین نقوی صاحب (غالب اکیڈمی) نے ایک خوشنویس سید حسن علی نقوی امروہوی بھیجے، اُن کی مستعدی اور تیز رفتاری نے مجھ کو بٹھا دیا۔ میں سفر ناموں کی نظر ثانی کر کے دیتا ہوں۔ ایک مہینے میں انھوں نے ڈھائی سو صفحوں کی کتابت کر دی ہے۔

دس روز کے لئے نقوی صاحب امروہہ گئے ہوئے ہیں تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ اور "دہلی کی یادگار شخصیتیں" جس کو میں اسّی فی صدی تالیف کر چکا ہوں۔ اس کا سببِ تالیف

اور اس کتاب کو میں اپنے بھانجے واصف کمال کے نام معنون کر رہا ہوں۔ واصف کمال کے
حالاتِ زندگی لکھ کر اور کچھ مضامین نقوی صاحب کو دے دوں گا کہ وہ اس کو فرصت
کے وقت لکھتے رہیں، بیکار نہ بیٹھیں۔ ان حج کے سفرناموں کا نام میں نے "اللہ کے گھر
میں بار بار حاضری" رکھا ہے۔ اس کی پہلی جلد ختم ہو جائے گی تو اس کے بعد نقوی صاحب
"دہلی کی یادگار شخصیتیں" کتابت کریں گے۔

"دہلی کی یادگار شخصیتوں" میں دہلی کے خوشنویس، اطبا، موسیقار دہلی کی سرائیں
دہلی کی باؤلیاں، دہلی کی جامع مسجدیں، دہلی کے معززین، ادبی صحافی و علمی شخصیتوں کے
حالات درج ہیں جو مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔ اخبار جنگ کراچی، دہلی سوسائٹی
اخبار میں چھپے ہیں "دہلی کی یادگار ہستیاں" چھپ چکی ہے۔ دہلی ایک ایسا شہر ہے کہ اس
پر جتنی کتابیں لکھی جائیں کم ہیں۔ اس کے ایک ایک محلہ پر ایک ایک کتاب مرتب
ہو سکتی ہے۔ یہ بہت قدیم شہر ہے۔ دارالسلطنت رہ چکا ہے اور دارالسلطنت
ہے۔ اس میں بہت سے راجاؤں اور بادشاہوں کی حکومتیں ہو چکی ہیں۔ دہلی کی
حکومتوں پر کافی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، دہلی کی شخصیتوں اور دہلی پر بھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔
جتنی لکھی جاتی ہیں اس کے باوجود معلوم کیوں تشنگی باقی رہتی ہے کیوں کا جواب یہ ہے
کہ مکمل شخصیتوں کی تاریخ کبھی مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ ہر ایک شخصیت کے حالات
لکھے نہیں گئے۔ ہندو دھرم کے علمی و ملی شخصیتوں کے حالات کتابوں میں نہ ہونے کے
برابر ہیں۔ دہلی پر لکھنے والے ہندو بھی ہیں انھوں نے یہ بے اعتنائی کیوں برتی۔ دہلی کے
ہندوؤں میں بڑے مشہور و معروف ہستیاں گذری ہیں مجھ کو چند معززین علمی و ادبی
حضرات کے حالات زندگی حاصل کرنے میں بڑی دقتیں پیش ہوتی ہے لوگوں کے متعلق
ان کے حالات زندگی دستیاب نہیں ہوتے یہ دقت اس کتاب میں بھی ہے جو نہایت تکلیف دہ ہے۔
سب محقق تنگ نظر اور متعصب نہیں ہوتا۔ تحقیقی کتابوں کی ترتیب میں سالہا سال لگ

جاتے ہیں، ایک مضمون لکھنے میں مہینے صرف ہو جاتے ہیں۔ دہلی کی یادگار شخصیتیں اس وقت سے ترتیب دی جانے لگی تھی۔ جس وقت "دہلی کی یادگار ہستیاں" طبع ہو چکی تھی۔

حاجی رشید احمد پر مضمون ۱۹۶۷ء میں مدینہ منورہ میں حاجی رئیس احمد صاحب فرزند حاجی رشید احمد صاحب نے تیار کرایا تھا جو مضمون انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیا تھا وہ میرے پاس موجود ہے۔

استاذ مرحوم حافظ رحمت اللہ صاحب کے حالات زندگی اُن کے صاحب زادے حافظ نعمت اللہ صاحب نے لکھ کر دیئے۔ چودھری احمد بخش صاحب اُن کے فرزند چودھری گلزار احمد صاحب ایڈیٹر "روشنی" کراچی نے تحریر فرما کر ارسال کیے تھے۔ شوکت فہمی صاحب اور مولانا اخلاق حسین قاسمی نے اپنے حالات زندگی خود لکھ کر مجھ کو عنایت کیے تھے۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی صاحب کے حالات زندگی اُن کی زندگی میں اُن سے معلوم کر کے میں نے تحریر کیے تھے۔ قاری جلال الدین، شیخ زبید الدین اور حافظ بنّے کے حالات اپنے بزرگوں سے معلوم کر کے میں نے قلمبند کیے تھے۔ ماسٹر احمد بیگ صاحب کے حالات رسالہ "یاران قدیم" دہلی سے نقل کیے۔ مولوی عزیز مرزا کے حالات زندگی "چند ہم عصر" مؤلفہ بابائے اردو علامہ عبدالحق، سید محمد خاں ایڈیٹر سید الاخبار دہلی کے حالات زندگی "آب حیات" مؤلفہ مولانا الطاف حسین حالی، حضرت غلام علی شاہ صاحب کے حالات "آثار الصنادید" مؤلفہ سر سید احمد خاں اور "تذکرہ علمائے ہند" مؤلفہ مولوی رحمان علی خاں، سید حیدر رضا خاں صاحب کے حالات زندگی رسالہ "زبان دہلی"، رسالہ "مزدور" امرتسر اور استاد رسا کے حالات زندگی "ارض وطن" دہلی اور دوسرے اخبارات سے اور سید محمد [illegible] علی کے حالات زندگی "قرآن السعدین" دہلی سے اقتباس کیے۔ صوفی حاجی محبوب الٰہی کے حالات زندگی برادری کے بزرگوں سے معلومات کر کے لکھے گئے۔ اس کتاب میں میرے وہ نو مضامین بھی شائع ہوئے ہیں جو شاہجہان آباد میں مختلف ناموں سے

شائع ہوئے۔

عجیب اتفاق ہے کہ جب "دہلی کی یادگار ہستیاں" کے معنون کرنے کے لئے نام کی تلاش ہوئی تو میری بہن امت البصیر کے صاحب زادے میرے بھانجے امداد اللہ چشتی کا نام ذہن میں آیا اس لئے کہ وہ میرے بچپن کے ساتھیوں شیخ مختار احمد، شیخ سلطان احمد، حافظ منظر الدین احمد اور مقصود احمد میں سے تھے۔ اس تعلق نے مجھ کو زیادہ متاثر نہیں کیا تھا بلکہ انھوں نے ایک ظریف، مزاح نگار، چنچل شوخ ہوتے ہوئے مجذوبیت اختیار کر لی تھی مجذوب ہو گئے ہم ساتھیوں سے بالکل علیحدہ ہو کر دنیا سے بے تعلق کر لی تھی۔ اس بنا پر میں نے ان کے نام دہلی کی یادگار ہستیاں معنون کی تھی۔

اب بھی عجیب و غریب بات ہوئی۔ اپنی چھوٹی بہن صفیہ سلطانہ کے فرزند محمد واصف کمال صدیقی کے نام سے دہلی پر اپنی دوسری کتاب "دہلی کی یادگار شخصیتیں" معنون کر رہا ہوں کیوں کر رہا ہوں اس لئے اس بھانجے کی تقریباً تمام پرورش اور تربیت میں ان کی نانی اور میرا حصہ رہا ہے۔ اس نے جن حالات میں تعلیم پائی اور جن حالات میں اس نے لازمت کی اور جس اخلاق و محبت و ملنساری کا اس نے ثبوت دیا اور تھوڑے عرصہ میں اپنے محکمہ ڈی سی ڈی ای ہی میں نہیں بلکہ دہلی بھر میں جو شہرت حاصل کی اور ایکا ایکی ڈیڑھ دو گھنٹے میں جوان صالح، اپنے دو معصوم بچوں اور جوان بیوی کو چھوڑ کر سدھار گئے۔ اس کا میرے دل و دماغ پر اس قدر اثر ہوا کہ تھوڑے دنوں میں صحت اس قدر گر گئی کہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا میری زندگی بالکل بدل گئی۔ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا۔ ایک خاصا آدمی بیکار ہو کر رہ گیا۔

جس سال ۱۹۸۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اسی سال انھوں نے اپنا، اپنی اہلیہ زمن آرا اور چھوٹے بچے تفضل کمال کی حج کی درخواستیں بھجوا دی تھیں وہ تو موت کی وجہ سے نہ جا سکے نہ ان کی اہلیہ اور بچہ، لیکن اسی سال میں اپنی اہلیہ صابرہ خاتون کے ساتھ حج کے

لے گی جس طرح حضرت مولانا حسرت موہانی کو اپنی اہلیہ کے وفات کے بعد حج میں ہر قدم پر اپنی اہلیہ کی یاد آئی، اسی طرح مجھ کو بھی واصف کمال کی یاد نے ہر قدم پر ستایا یہ خیال زیادہ پریشان کرتا تھا کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو ہمارے ساتھ ہوتے وہاں خواب میں بھی بار بار آئے، ایک خواب میں تو انھوں نے کہہ دیا تھا کہ امی میں تمہارے ساتھ حج کر رہا ہوں۔

ان حالات نے مجھ کو مجبور کر دیا کہ یہ" دہلی کی یادگار شخصیتوں" کو اپنے جگر کے ٹکڑے محمدؐ واصف کمال صدیقی کے نام معنون کروں تاکہ اس کے حالات سے علمی و ادبی و صحافی طبقہ واقف ہو جائے اور شاید کوئی اس کے حالات پڑھنے کے بعد اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرے۔

یہ حالات زندگی محمدؐ واصف کمال صدیقی کے میں نے کس طرح لکھے ہیں وہ میرا دل ہی جانتا ہے میرا قلم کتنا غمزدہ تھا۔ واصف کا خیال آتے ہی دل و دماغ ان کے حالات لکھنے کے لئے تیار نہیں تھے، قلم اٹھایا دل بے قابو ہو گیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہونے شروع ہو گئے۔ دل پر جبر کر کے روتے دھوتے حالات قلمبند ہوئے۔ اللہ اس کی مغفرت کرے انطلوم دن میں اور رات میں کتنی مرتبہ اس کی مغفرت کے لئے دُعا کرتا ہوں، اللہ تعالےٰ سے یقین ہے قبول فرمالی ہوگی یہ محبت بڑی اندھی ہوتی ہے۔ واصف کو فوت ہوئے دو سال سے زیادہ ہو گئے لیکن دل و دماغ نہیں مانتا کہ واصف موت کے آغوش میں چلے گئے۔

عرصہ ہوا ایک نشست میں جناب خضر صاحب کے سامنے میری تصانیف چھپنے کا ذکر آیا تھا۔

کس طرح میرے دوست احباب میری تالیفات کو طبع کرانے میں اعانت کرتے ہیں۔ تو خضر صاحب نے بھی وعدہ کیا کہ میں بھی اپنے دوست و احباب و کرم فرماؤں کے

مدرسے دہلی کی یادگار شخصیتوں کو طبع کرانے کی کوشش کروں گا چنانچہ انھوں نے اپنا وعدہ پورا کیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ کتاب مطبوعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میں ان کا شکر گذار ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کا ان کو اجر دے گا۔

میں جناب انیس احمد بن حاجی رشید احمد، حافظ نعمت اللہ، چودھری گلزار باغ احمد، شوکت فہمی صاحب، مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب، جناب تنویر علی صاحب، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی وغیرہ حضرات کا بے حد ممنون ہوں انھوں نے میری درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور حالات زندگی کی فراہمی کی اور اعانت فرمائی۔

میں جناب انور دہلوی اور ذہین نقوی صاحب (غالب اکیڈمی) کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے میرے عرض کرنے پر خوشنویس بھجوائے۔

محمد امداد صابری
مدرسہ صولتیہ۔ مکہ معظمہ۔

دِلّی کے
محلّوں اور بازاروں کی وجہ تسمیہ

دہلی کا پہلا نام اندرپرست تھا۔ اندرپرست کو دہلی کب سے کہنے لگے اس کے بارے میں کئی روایتیں مشہور ہیں۔ ایک یہ کہ دہلی ماخذ ہے ہندی کے نام ڈھلی سے یعنی وہ مقام جس کی زمین ایسی پلپلی اور نرم ہو کہ اس میں میخ نہ گڑ سکتی ہو۔ دوسری روایت یہ ہے کہ قنوج کے ایک راجہ کا نام دیلو تھا جس کی مقبوضات میں ایک مقام دہلی بھی تھا جہاں کا گورنر سروپ دت تھا جس نے اندرپرست کے ویران شدہ مقام پر ایک شہر آباد کیا۔ جس کا نام اپنے راجہ کے نام پر دیلو رکھا اس روایت کی تائید میں امیر خسرو کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے ؎

یا نکہ نسیم بخش یا از خور بغیر یا بار گیر
یا فرماں دہ کہ گرد وں نشیم در دیلو روم

تیسری روایت یہ ہے کہ راجہ دیپ کی بسائی ہوئی ہے۔ سرسید لکھتے ہیں، دیلو ایک زمیندار تھا اس نے اپنے نام پر ایک گاؤں آباد کیا۔ جب سے اس کو دہلی کہنے لگے۔ غرض ان روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ دہلی کو پہلے ڈھیلی یا دیلو کہا جاتا تھا استعمال ہوتے ہوتے دہلی ہوگیا۔

دہلی کے محلوں، بازاروں اور گلیوں کے نام زیادہ تر اشخاص یا پیشوں کی وجہ سے

رکھے گئے ہیں لیکن بعض نام واقعات کے مطابق بھی رکھے گئے ہیں۔

نمک حرام کی حویلی

کوچہ گھانسی رام بازار فتحپوری میں آخری مغلیہ دور کی ایک عالی شان حویلی تھی۔ اس حویلی میں منشی بھوانی شنکر کھتری رہتے تھے جو دہلی کے بڑے رئیس اور دولتمند تھے۔ منشی صاحب پہلے ریاست گوالیار میں بخشی تھے جب مرہٹوں نے دہلی پر تسلط کر لیا تو منشی جی کو ایک بڑی ذمہداری کی خدمت پر دہلی بھیج دیا۔ یہ دہلی آکر انگریزوں سے مل گئے تو مرہٹوں نے ان کی اس غداری کی وجہ سے ان کو علحدہ کر دیا۔ علحدہ ہونے کے بعد انگریزوں نے ان کو پنشن دی۔ انگریزوں سے ساز باز کرنے کے الزام میں مرہٹوں نے ان کو نمک حرام اور ان کی حویلی کو نمک حرام کی حویلی کہنا شروع کر دیا۔ منشی جی کو یہ بات ناگوار گزری۔ اس وقت دہلی پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ انھوں نے انگریزوں سے شکایت کی کہ مجھ کو نمک حرام اور میری حویلی کو نمک حرام کی حویلی مشہور کر دیا ہے۔ چنانچہ انگریزی حکام نے عام منادی شہر میں کرا دی کہ کوئی منشی جی کو نمک حرام اور ان کی حویلی کو نمک حرام کی حویلی نہ کہے۔ اس منادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر کے لوگوں کی زبان پر الفاظ چڑھ گئے۔ اور آج کو مکان بھی نمک حرام کی حویلی کا نام سے مشہور ہو گیا۔

چتلا دروازہ

جامع مسجد کے قریب ایک محلہ چتلا دروازہ کے نام پر مشہور ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہاں چالیس آدمی شہید ہو گئے تھے تو ان کا نام چہل تن دروازہ رکھ دیا گیا۔ نام کا استعمال ہوتے ہوتے چتلا دروازہ بن گیا۔ ان شہیدوں میں ایک بزرگ وہ بھی ہیں جن کی قبر چتلی مشہور ہے۔ یہ قبر سید روشن کی ہے۔ جو کوئی بزرگ تھے۔ یہ مزار شاہجہاں آباد سے چھ سو برس پہلے کا ہے۔

کلن شاہ کی ڈگڈگی

خانقاہ شاہ ابوالخیر ترکمان گیٹ کے قریب ایک گلی ہے۔ وہ ایک دالان تھا جس میں ایک چھوٹی سی دیوار۔

یہ چراغاں کی بنی ہوئی تھی۔ اس میں ایک درویش مداریہ فرقہ کے رہتے تھے وہ روشنی کرتے تھے۔ ایسے مکان کو اس فرقہ کی اصطلاح میں ڈگڈگی کہا جاتا ہے۔ بعض اس کی وجہ تسمیہ یہ بتاتے ہیں کہ شاہ صاحب کے دروازہ پر ایک دھونسہ (نقارہ) رکھا رہتا تھا جو کوئی مہمان آتا، ایک چوب لگاتا۔ دو مہمان آتے تو چوب لگتے تھے۔ اس طرح بیس چوبوں کا حکم تھا اور اگر اس سے زیادہ ہوتے تو گجر بجایا جاتا۔

کوڑیا پُل

دہلی شہر کے اسٹیشن کے قریب ایک بازار کوڑیا پُل کہلاتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ نواب شادی خاں مہتمم تہ بازاری وصول کرنے میں کوڑیاں کثرت سے جمع ہو جاتی تھیں۔ شاہ عالم ثانی کے دورِ حکومت میں نواب صاحب نے بادشاہ سے اجازت لے کر ان کوڑیوں سے ایک پُل بنایا۔ پُل تو رہا نہیں لیکن نام رہ گیا اور بازار کا یہ نام پڑ گیا۔

باڑہ ہندو راؤ

یہ مکان دراصل ولیم فریزر ایجنٹ گورنر جنرل دہلی نے ۱۸۳۰ء میں تعمیر کیا تھا۔ یہ موقع کے اعتبار سے ایسی جگہ پر تھا جہاں سے سارا شہر دکھائی پڑتا تھا۔ اور کسی رُخ بھی ہوا چلتی مگر اس میں ضرور آتی تھی۔ فریزر کے قتل ہونے کے بعد اس مکان کو ہندو راؤ نے خرید لیا۔ یہ سردار بیجا بائی کا بھائی تھا جو راجہ گوالیار کی بیوی تھی۔ اپنے خاوند کے مرنے کے بعد گدی نشین ہو گئی تھی لیکن سال بھر کے بعد معزول کر دی گئی اور اپنے بھائی کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دامن میں جا کر پناہ لی ہندو راؤ کچھ عرصے تک کشن گنج میں رہا اس کے بعد یہ مکان خریدا۔ اس میں کچھ عرصہ تک اس نے اپنا چھاپہ خانہ کھولا بعد میں رہائش اختیار کی۔ ہندو راؤ ۱۸۵۷ء سے قبل ہی فوت ہو گیا تھا۔

حویلی حیدر قلی

یہ محلہ مغلیہ دور کے آخری عہد کی بڑی حویلی تھی جس میں اب بہت بڑی آبادی بسی ہوئی ہے۔ سید حسین علی سادات بارہ میں سے تھے

جو محمد شاہ اور اس سے قبل کے دو بادشاہوں کے عہد کے بڑے مقتدر وزیر تھے۔ انھوں نے محمد شاہ کے دورِ حکومت میں حیدر قلی خاں کو توپ خانہ کا کمانڈر مقرر کر دیا تھا۔

سید حسین علی اور اس کے بھائی کے خلاف امرا سازشیں کرتے رہتے تھے۔ اس لیے کہ یہ دونوں بھائی انتہائی خود مختار اور غیر محدودہ طاقت کے مالک بن گئے تھے۔

امرا کی سازش میں حیدر قلی خاں بھی تھا اور حسین علی کے قتل میں بھی یہ شریک تھا یہ بات اگر صحیح نہ ہو لیکن درست ہے کہ یہ کھلے خزانے سادات بارہ کی مخالفت پر آمادہ رہتا تھا۔ سادات بارہ اس سے حسین علی کے قتل کا بدلہ لینے کی فکر میں لگے رہتے تھے لیکن حیدر قلی ہوشیار تھا وہ ہفت ہزاری منصب اور اسی قدر سواروں کے مرتبہ پر پہنچا اور معز الدولہ کے خطاب سے سرفراز ہوا۔

پھاٹک حبش خاں

یہ پھاٹک کی رہا کی میں ہے جو شاہجہاں کے دور کا تعمیر کردہ ہے یہ پھاٹک حبش خاں نے بنایا تھا جس کا اصلی نام سیدی مفتاح تھا۔ یہ شاہجہاں اور اورنگ زیب کے عہد میں تھے اور حبشی النسل تھے اور نظام شاہی بادشاہ احمد نگر کے غلام تھے ان پر بڑا اعتماد تھا۔ اودگیر ضلع بیدر مملکت سرکار عالی نظام کے قلعہ دار بھی رہ چکے تھے۔ سیدی مفتاح نے نظام شاہیوں کی طرف سے افواجِ شاہجہانی کو قلعہ اودگیر میں گھسنے دیا خوب مقابلہ کیا۔ آخر کار مغلوب ہوا اور قلعہ حوالہ کر کے ۱۰۴۶ھ میں زمرۂ ملازمین شاہجہانی سے حبش خاں کا خطاب سہ ہزاری منصب اور پندرہ سو سوار ملے۔ جب نادر شاہ نے دہلی پر تاخت کی یورش حبش خاں شہر دہلی کے کوتوال تھے۔

پھاٹک حبش خاں کے دروازے کی مرمت بعد میں فولاد خاں نے کی جو حبش خاں کی اولاد میں تھا۔

چھتہ شادی

پھاٹک اور سارے کا سارا چھتہ شادی کا مکان کہلاتا تھا جو مغلیہ دور کے آخر میں تعمیر ہوا تھا۔ ان کا اصل نام شادی خانہ تھا۔ شاہ عالم کے زمانہ میں ہندوستان میں مرہٹے آئے تھے۔ جب مرہٹے دہلی پر قابض ہوئے تو انھوں نے مرہٹوں سے سازش کر لی۔ اور بادشاہ کو جو وظیفہ مرہٹے دیتے تھے ان کی وساطت سے ملنے لگا۔ یہی وہ شادی خاں ہے جس نے کوڑیا پل بنایا تھا۔

کٹڑہ آدینہ بیگ

آدینہ بیگ آرین [illegible] کا تھا۔ اس کے باپ کا نام چنو تھا۔ [illegible] لاہور کے پاس مقیم تھا۔ آدینہ بیگ نے مغلوں میں پرورش پائی۔ بڑا قابل اور لائق آدمی تھا۔ اس لئے ملازمت کی ابتدا موضع [illegible] کی تحصیلداری سے ہوئی جو لدھیانہ کے نزدیک ہے۔ اس معمولی خدمت سے ترقی کرتے کرتے صوبہ داری سلطان پور کی خدمت جلیلہ پر پہنچا۔ اس کے بعد وہ جالندھر کا صوبیدار مقرر ہوا جس کا انتظام اس نے بڑی قابلیت سے کیا۔ نہایت ہوشیار اور زیرک تھا۔ امور سلطنت میں کافی مہارت رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ لاہور کے گورنروں کا مورد عنایت رہتا تھا۔ ابدالی سرداروں اور سکھوں کی [illegible] کی وجہ سے اپنی قوت [illegible] دیکھ کر اس نے سرہند اور لاہور کا کل حصہ فتح کر لیا لیکن افسوس وہ اپنی فتوحات سے فیضیاب نہ ہو سکا اور ۱۱ محرم سنہ جلوس عالمگیر ثانی میں فوت ہو گیا۔

بلیماران

اس بازار کی وجہ تسمیہ میں مختلف باتیں مشہور ہیں کوئی کہتا ہے کہ پہلے یہاں دریا بہتا تھا اور بلی لگتی تھی، اس واسطے بلیماران ہوا لیکن زیادہ تر

یہ بات دل کو لگتی ہے کہ اس محلے میں کثرت سے قصاب رہتے تھے ان کی وجہ سے یہ نام پڑا۔
لیکن دہلی والے عوام زیادہ تر چلی ماران بکسر الرائے بولتے ہیں جو یقیناً غلط العام ہے۔

گلی قاسم جان

قاسم خاں کے باپ عبدالرحمن بخارا سے آئے تھے اور شاہ
عالم ثانی کے زمانہ میں نائب وزیر تھے جن کی شین خدمت کے
بیٹے ہیں سہراب جنگ۔ ان کا خطاب اور شمس آباد اور دہ جاگیر میں ملی تھی۔ قاسم جان ایک
حویلی تھی جس کو قاسم جان نے تعمیر کرایا تھا۔ اسی قاسم جان نے ایک مسجد بھی جس حویلی کے
صاحب سنہ ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۷۸۶ء میں تعمیر کرائی تھی۔ قاسم جان کا خطاب بہادر
جنگ تھا۔

حویلی حسام الدین حیدر خاں

حویلی حسام الدین آخری ...
تعمیر کردہ تھی۔ اس کو نواب
حیدر نے بنایا تھا۔ یہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور وہاں کے رئیس تھے۔
میں رہنے لگے تھے۔ ان کے دو بیٹے مظفر الدولہ اور نواب حسین مرزا بہادر شاہ
ثانی کے عہد میں بڑے بڑے عہدوں پر تھے۔ نواب حسین خاں اہل قلعہ کے ناظم تھے۔
اور بہادر شاہ ظفر نے ۱۶ جنوری ۱۸۴۰ء کو اپنے دربار میں نواب حسام الدین
حیدر خاں کے فرزند کی تقریب شادی میں خلعت سہ پارچہ اور جیغہ سرپیچ مرحمت
فرمایا تھا۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۴۲ء کو نواب حسام الدین حیدر خاں فالج میں مبتلا ہو کر راہی
ملک جناں ہوئے۔ اس کی اطلاع بہادر شاہ ظفر کو دی گئی تو اُن کا ذکر اُن کے
روزنامچے میں اس طرح کیا گیا۔

"ایسے نیک خصائل، دریا دل، با مروت اور وضعدار امیر اب
کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ آپ کی رحلت کی سبب اہل دہلی کی
مجلس سے ایک قابل قدر اور مشہور رئیس اٹھ گیا۔"

۱۳ر نومبر ۱۸۴۶ء کے بہادر شاہ ظفر کے دربار میں نواب حسام الدین حیدر خاں کے بڑے صاحب زادے معین الدولہ نظارت خاں حاضر دربار ہوئے بادشاہ سلامت نے مرحوم کی خدمات جلیلہ کا ذکر فرما کر ان کی وفات پر بہت رنج وغم کا اظہار کیا۔ اور صبر کی تلقین فرمائی۔ پھر خلعت شش پارچہ اور نیمہ آستیں طلائی معین الدولہ کے بڑے صاحبزادے مظفر الدولہ بہادر کو اور ایک ایک دوشالہ ان کی صاحبزادی اور زوجہ کو مرحمت فرما کر رخصت کیا۔

گنج میر خاں

یہ محلہ رکاب گنج کے قریب ہے اور نواب امیر خاں نے بنوایا تھا۔ نواب امیر خاں عمدۃ الملک محمد شاہ کے دربار میں بڑا رتبہ اور رسوخ رکھتے تھے۔ قمر الدین خاں وزیر اعظم اور نواب آصف الدولہ بہادر کی ٹکر کے امیر تھے۔ ان دونوں کی وجہ سے امیر خاں کو الہ آباد کا صوبیدار بنا کر بھیج دیا گیا تھا لیکن امیر خاں خاموش بیٹھنے والے نہ تھے۔ جاہ منزلت کی بلند پروازی نے ان کو چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ صفدر جنگ کو گانٹھ کر اپنے مخالفوں کی چالبازیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے جوڑ توڑ کرتے رہے کہ زندگی نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ اور اپنے ہی نمک حرام ملازم کے ہاتھ سے ۶ جنوری ۱۷۴۶ء مطابق ۲۳ ذوالحجہ ۱۱۵۹ھ کو شہید ہو گئے۔

گلی مسجد سید رفاعی

بازار جتلی قبر پر ایک مسجد اس نام سے مشہور ہے اور گلی کا نام بھی اسی مسجد کے نام سے پڑ گیا۔ سید رفاعی صاحب اس مسجد میں بہت عرصے تک رہے اور اس کی مرمت بھی انھوں نے کرائی۔ سید صاحب بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ ان کے یہاں ایک مجلس بنام خصرہ ہوا کرتی تھی۔ اس میں یہ قید تھی کہ اس کے اردگرد کوئی عورت نہ ہو محفل میں مرد ہی مرد ہوں چنانچہ آپ کے مریدوں کے ہاتھوں میں چھرے ہوتے تھے وہ کلمہ طیبہ پڑھتے جاتے تھے۔ ان پر ایک بے خودی اور دجلہ کی حالت طاری رہتی تھی۔ آپ کا وصال ۱۲۳۳ھ مطابق

۱۸۱۵-۱۶ء میں ہوا۔

مٹیا محل اس کی صحیح وجہِ تسمیہ تو معلوم نہ ہو سکی لیکن لوگ کہتے ہیں کہ جب قلعہ بن رہا تھا تو شاہجہاں بادشاہ کی عارضی اقامت کے لئے مٹیا محل بنایا گیا بعد میں یہ محل نواب عزیز آبادی بیگم جو کسی شہزادے کی بیگم تھیں دے دیا گیا اور اسی وجہ سے اگلا حصہ عزیز آبادی کی حویلی کہا جانے لگا

کیونکہ مٹیا محل ہی کے سامنے عزیز آبادی کی حویلی تھی جو مدت تک نواب مغل بیگ خان کے تصرف و قبضہ میں رہی بعد میں بہادر شاہ ثانی نے یہ حویلی اپنے کسی پوتے کو دے دی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد تمام شاہی مکانات ضبط ہوئے اور پھر فروخت کئے گئے۔

حویلی صدر الصدور بازار مٹیا محل میں ایک محلہ اس نام سے مشہور ہے جس میں رہائش کے لئے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ یہ حویلی ہزارہ بیگ کی حویلی کہلاتی تھی۔ مفتی صدر الدین صاحب آزردہ نے اسے خرید کر نئے سرے سے تعمیر کرایا۔ یہ حویلی دلکش اور بہت خوش وضع تھی اس میں باغیچہ نہر اور فوارے سب کچھ تھے لیکن مکین کے ساتھ رونق بھی خاک میں مل گئی۔

بنگش کا کمرہ یہ عالی شان حویلی فیض اللہ خان بنگش نے بڑی کثیر رقم سے تعمیر کرائی تھی۔ جو بازار سوئیوالان پر ہے بنگش دراصل ایک پہاڑ کا نام ہے جو صوبہ سرحدی شمالی مغرب میں کوہاٹ کے پاس ہے اس جگہ سے جو لوگ دہلی آئے وہ بنگش کے نام سے مشہور ہوئے سب سے پہلے بنگشی لوگ ہندوستان میں شاہ عالم اول کے زمانہ میں آئے۔ ان لوگوں کا عروج محمد شاہ کے دورِ حکومت میں ہوا نواب محمد خان غضنفر جنگ بنگش فرخ آباد، آگرہ

اور الہ آباد کے صوبیدار مقرر ہوئے۔ اور یہ وہی علاقہ ہے جس پر آگے چل کر انغیں کے صاحبزادے نواب احمد خاں غالب جنگ خود مختارانہ حکومت کرنے لگے فیض اللہ بیگ نام خاں کے صاحبزادے تھے۔ جو محمد خاں کی سرکار میں میر عمارت تھے۔ رابعہ بیگم محل صاحبہ محمد خاں کو عمارت کا بڑا شوق تھا۔ اس وجہ سے فیض اللہ بنگش پر ان کی نظر کرم ہوئی۔ چنانچہ ان ہی کے اہتمام میں بیگم صاحبہ نے کئی ایک سرائیں، مسجدیں، پل اور محلات وغیرہ بنوائے۔ محمد خاں کی وفات کے بعد ہی بیگم صاحبہ ہی مالک و مختار بنیں۔ اور تمام کاروبار فیض اللہ کے سپرد ہوا۔ اور یہ ہی دربار شاہی میں بیگم صاحبہ کی طرف سے وکیل تھے۔ اب بنگش کا کمرہ دھوبیوں کا کٹرہ بنا ہوا ہے۔ تقریباً تمام گھر دھوبیوں میں بسے ہوئے ہیں اس کی ہر چیز شکستہ اور خستہ حالت میں ہے۔

چاندنی محل یہ محل بھی دور آخیر مغلیہ میں محمد شاہ کے عہد کا بنا ہوا ہے شہزادہ سلیم پسر اکبر ثانی کے قبضہ میں تھا پھر مرزا اکو بر شہزادے نے اپنی بہن حسینی بیگم سے جو شہزادہ سلیم شاہ کی بیوی تھیں۔ سے لے لیا آخر کار جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد نواب اعظم مرزا الٰہی بخش سمدھی بہادر شاہ ظفر کے صاحبزادے مرزا ثریا جاہ کے قبضہ میں آگیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کی دونوں صاحبزادیاں مالکہ بنیں۔ کسی زمانے میں عجیب و غریب مکان تھا۔ حوض فوارہ اور باغیچہ سب کچھ موجود تھا تیموری جہاں صاحبہ جو مرزا الٰہی بخش اور مرزا ثریا جاہ کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ انھوں نے چند سال ہوئے ایک بہت بڑی عمارت چاندنی محل کی حکومت کے ہاتھ فروخت کی ہے جس پر تھانہ کی عمارت حال میں تعمیر ہوئی۔

قاضی کا حوض تھانہ حوض قاضی کے پاس چوراہے پر باؤلی کی طرح کا ایک حوض تھا جس کو قاضی معتبر الدولہ نے ۱۲۶۲ھ میں تعمیر کرایا تھا اس پر ایک سنگ مرمر کی تختی پر یہ قطعہ تاریخ تھا۔

آب در منبع این حسن جدید   از وجود معتز الدولہ رواں
ہاتف بوصف فیضش   گفت تاریخ بسا فیض رساں

اس حوض میں نہر آتی تھی نہر بند ہوئی تو حوض بھی بند ہوا۔ حوض کو پاٹ کر ترکاری کی مارکیٹ بنائی گئی اب مارکیٹ بھی نہیں بلکہ اس جگہ ایک باغیچہ بنا ہوا ہے۔

کوچہ اُستاد حامد جامع مسجد کے نزدیک یہ کوچہ عہد مغلیہ کی یادگار ہے جس میں کبھی اُستاد حامد صاحب کا مکان تھا۔ اُستاد حامد وہ تاریخی شخصیت تھی جنہوں نے شاہجہاں کے دورِ حکومت میں بڑی عالی شان اور تاریخی عمارتیں تعمیر کی تھیں۔ اس فن میں وہ کامل تھے اسی وجہ سے اُستاد مشہور تھے۔ اس کوچہ میں پہلے سادہ کار اور چماری والے رہتے تھے۔ اب مختلف قوموں کے مختلف طبقے بستے ہیں۔

کوچہ اُستاد ہیرا یہ کوچہ بھی عہدِ مغلیہ میں خواجہ اُستاد ہیرا کے نام سے مشہور ہے۔ اُستاد ہیرا بھی شاہجہاں بادشاہ کے زمانہ کا بڑا معمار تھا جس نے لال قلعہ وغیرہ بہت سی عمارتیں بنائی تھیں۔

گلی امام والی جامع مسجد کے پاس یہ گلی ہے۔ ۱۶۵۶ء سے قبل کی بنی ہوئی ہے۔ اس میں جامع مسجد شاہی دہلی کے امام صاحبان رہا کرتے تھے جس وقت شاہجہاں نے جامع مسجد بنوائی تو اس کے لئے متقی و پرہیزگار امام کی ضرورت تھی۔ بخارہ میں حضرت سید عبدالغفور شاہ کا شہرہ تھا شاہ بخارا کی وساطت سے ۱۶۵۶ء میں نہایت اعزاز و احترام کے ساتھ ان کو طلب فرمایا اور منصبِ امامت پر ممتاز فرمایا۔ امام سید محمدؐ صاحب اس مکان میں رہتے تھے۔ اس کے بعد ان کے فرزند امام سید حامد بخاری صاحب

مقیم ہوئے جو جامع مسجد کے نائب امام تھے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل تک سید یوسف بخاری کا قیام رہا جو امام سید حامد بخاری کے صاحبزادے ہیں۔ آج کل اس مکان میں کتب خانہ رشیدیہ والے سکونت پذیر ہیں اور یہ مکان اختر انصاری صاحب کی ملکیت میں ہے۔

پھاٹک مفتیان

کوچہ روح اللہ خاں سے آگے تراہا بہرام خاں کے نزدیک یہ پھاٹک ہے۔ اس میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خاندان کے لوگ رہتے تھے۔ اس لئے اس خاندان کے نام کی مناسبت سے اس پھاٹک کا نام مفتیان ہوگیا۔ اس میں منشی عبدالقدیر صاحب اور دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر اخبار "ریاست" بھی رہتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اس میں زیادہ تر شرنارتھی خاندان رہتے ہیں۔

گلی مدرسہ شاہ عبدالعزیز

یہ مدرسہ کسی زمانہ میں نہایت شاندار مدرسہ تھا اور علوم کا مخزن سمجھا جاتا تھا اس کے مہتمم شاہ عبدالعزیز صاحب جیسے نامور عالم و فاضل تھے۔ محمد شاہ بادشاہ نے شاہ ولی اللہ صاحب محدث کو پرانی دہلی سے قبرستان مہندیان جہاں پناہ سے بلا کر ایک بڑا اعالی شان مکان بنادیا تھا جس میں تعلیم کا سلسلہ جاری ہوا شاہ ولی اللہ۔ رحمتہ اللہ علیہ کے بعد اُن کے چاروں فرزندوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا اور دینی تعلیم نے وہ نام پایا کہ دُور دُور شہرہ ہوگیا۔ جب شاہ صاحب کے فرزندوں میں کوئی نہیں رہا تو مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ جب آپ نے ۱۲۵۶ھ میں ہجرت کی اور حجازِ مقدس پہنچ گئے تو مولانا مخصوص اللہ صاحب اور مولانا محمد موسیٰ صاحب فرزند حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب اس کی نگرانی فرمانے لگے۔ اِن حضرات

نے بھی ۱۸۵۶ء میں انتقال فرمایا تو مولانا محمد موسیٰ صاحب کے صاحبزادے میاں عبدالسلام صاحب بہت چھوٹی عمر کے اور ایک صاحبزادی رہ گئیں۔ خاندان بھر میں کوئی ایسا نہ رہا جو عبدالسلام کو لکھاتا پڑھاتا۔ غرض جو درس و تدریس کا سلسلہ پشت ہا پشت سے چل رہا تھا وہ بند ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مکانات لوٹ لئے گئے اور منہدم کر دئے گئے۔ لوگوں نے لکڑی اور تختے لوٹے اب کافی گھر اس میں بسے ہوئے ہیں۔ مگر شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسہ کا نام آج تک چلا آ رہا ہے۔

کلاں محل یہ عمارت شاہ جہاں کے زمانہ کی ہے۔ قلعۂ معلیٰ بننے سے پہلے شاہجہاں اس میں سکونت رکھتے تھے۔ یہ کسی زمانہ میں بہت بڑا محل تھا۔ موجودہ محل اس محل کا آٹھواں حصہ بھی نہیں ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد اس محل کو لالہ چھنامل نے کوڑیوں کے مول لیا۔ پہلے نارمل اسکول تھا پھر ماڈل اسکول رہا۔ عیسائی خاندان بھی بسے لیکن آج کل یہ محل کھنڈر کی صورت میں ہے اور مختلف قسم کے محنت کشوں کے خاندان اس میں آباد ہیں۔ اب وہاں پھر اسکول بن گیا۔

چھتہ حکیم آغا جان کلاں محل سے آگے گلی راجان کے پاس یہ گلی ہے۔ اس کو حکیم آغا جان نے بنوایا تھا۔ حکیم صاحب دہلی کے مشہور و معروف حکیم تھے۔

ان کے انتقال کے بعد ان کے اعزا اور اقربا اس میں رہنے لگے تھے، اب وہ نہ چھتہ رہا نہ مکین۔ ایک محلہ کی حیثیت ہو گئی ہے۔ اس کا ایک لداؤ دی دراز تھا اس کی بہت مخدوش حالت ہو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی نے ۱۹۳۲ء میں گروا دیا۔

96298

اس کا ایک عبرت ناک واقعہ مشہور ہے۔ اس کی چھت اس قدر مضبوط تھی کہ ٹوٹتی نہ تھی۔ اور کدالوں کے منھ پھر جاتے تھے۔ ایک شخص عبد العزیز اِدھر سے گزر رہے تھے۔ دن کے دس بجے ہوں گے ان کی جو شامت آئے شیخی میں آکر مزدوروں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

"اے میاں کیا تماشہ بنا رکھا ہے لاؤ مجھے کدال دو میں آغا جان کا سر توڑ دوں" کدال لے اوپر چڑھ گئے۔ ایک دو ہی کدال لگائے ہوں گے کہ چھت کا ایک حصہ دھڑام سے آن پڑا۔ عبد العزیز صاحب کا نیچے کا دھڑ اس میں ایسی بری طرح پھنسا کہ کسی سے نہ بن پڑا کہ انھیں نکال سکیں۔ بلیاں، کڑیاں سامان لانے میں دیر ہو گئی کئی گھنٹے معلق رہے۔ بڑی مشکل سے ان کو نکالا۔ دوا خانہ میں ان کو لے گئے۔ دونوں ٹانگیں چور ہو گئیں۔ شام نہ ہونے پائی تھی کہ دم نکل گیا۔ گئے تھے حکیم آغا جان کا سر توڑنے اور خود دام اجل میں گرفتار ہو گئے۔

پھاٹک تیلیاں

اندرون ترکمان گیٹ اور کلاں مسجد کے درمیان سربازار پھاٹک کا ایک عظیم الشان دروازہ ہے جو قدیم مغلیہ دور کی یادگار ہے اور اب تک موجود ہے۔

یہ دراصل مظفر خاں کی حویلی تھی جو شاہجہاں بادشاہ کے زمانے کے ایک رئیس تھے حویلی ختم ہو گئی۔ مکان تعمیر ہو گئے۔ اس میں جناب حاجی نور محمد صاحب عرف نتوا تیلی کا خاندان آباد ہے۔ یہ خاندان دو سو برس سے اس میں رہتا ہے جو تیل اور عطر کا کام کرتا تھا۔ لال قلعہ دہلی میں ان کی عطر کی بڑی کھپت تھی شہزادے اور شہزادیاں بہت پسند کرتی تھیں۔ دہلی میں عطر کے دو ہی مشہور تاجر تھے۔ گلاب گندھی کا کاروبار، اب تک دریبہ کلاں میں جاری ہے لیکن حاجی نتوا تیلی کی دوکان صرف بطور یادگار رہ گئی ہے۔

۱۹۴۷ء سے قبل پھاٹک میں اس خاندان کے افراد کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی۔ گرچہ اب اتنی نہیں ہے لیکن پھاٹک میں اب بھی اس خاندان کے لوگ رہتے ہیں جن کی اکثریت کباڑ کا کام کرتی ہے اور ان کی دوکانیں جامع مسجد پر ہیں۔

کوچہ فولاد خاں کوچہ چیلان کے پاس کوچہ فولاد خاں ہے۔ یہ فولاد خاں حبش خاں کی اولاد میں سے تھے۔ یہ حبش خاں وہی ہیں جن کے نام سے پھاٹک حبش خاں کھاری باؤلی میں مشہور ہے۔ اور فولاد خاں وہی ہیں جنہوں نے فولاد خاں کے دروازہ کی مرمت کرائی تھی۔ اور جن کے بھائی اہتمام علی خاں دہلی کے کوتوال تھے جو شاہجہاں کے دربار کے ایک امیر تھے پہلے یہ ہزاری منصب دار اور پانچ سو سواروں کے افسر تھے۔ بعد میں ان کو دو ہزاری دو صدی اور سوار ملے۔ اور دو دفعہ دہلی کے کوتوال بنائے گئے۔ ان کا انتقال ۱۰۵۶ھ مطابق ۱۶۴۶ء میں ہوا۔ انھوں نے ایک مسجد حتہ آغا جان میں بنوائی تھی جو اب تک موجود ہے۔ یہ محلہ فولاد خاں کی ایک حویلی تھی۔

گلی حکیم بقا یہ چاوڑی بازار میں حوض قاضی کے قریب ہے جو حکیم بقا صاحب کی حویلی تھی۔ حکیم صاحب مغلیہ دور کے شاہی طبیب تھے اور اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ ممتاز طبیب تھے۔ یہ خاندان دہلی میں آنکھوں کے علاج کے لئے مخصوص تھا۔

اس خاندان میں حکیم ذکاء اللہ، حکیم حسام الدین عرف حکیم منجھلے صاحب حکیم قیام الدین، حکیم سمیع الدین، حکیم کرم الدین اور حکیم لیاقت حسین خاں صاحب بہت نامور ہوئے۔ اس خاندان میں حکیم منیر الدین صاحب کے صاحبزادے

حکیم شریف الدین صاحب دہلی میں ہیں جن کا بقائی دواخانہ جتلی قبر پر ہے حکیم صاحب نے خاندانی منصب کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سنبھالے رکھا ہے۔ اپنے بزرگوں کے سچے جانشین ثابت ہو رہے ہیں، آبا و اجدائی خصوصیات قیافہ شناسی، دقیقہ رسی، فہم و فراست، اخلاق و مروت اور مریضوں کی دلجوئی آپ کی ذات میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ آپ دہلی کی مختلف دینی درسگاہوں اور مسجدوں کی منتظمہ کمیٹی کے ممبر اور عہدیدار ہیں۔

کھاری باؤلی

یہ باؤلی بہت قدیمی شاہجہان آباد سے پہلے کی بنی ہوئی تھی، اسلام شاہ بن شیر شاہ کے عہد ۹۵۲ھ مطابق ۱۵۴۵ء میں خواجہ عماد الملک معروف خواجہ عبداللہ قریشی نے ایک کنواں بنوایا تھا۔ چھ برس کے بعد ۹۵۸ھ مطابق ۱۵۵۱ء میں کنویں کو باؤلی میں تبدیل کر دیا گیا۔ جب شاہجہاں نے شہر بسایا تو یہ باؤلی بھی شہر میں آگئی اور کرچہ لواب مرزا کی قدیمی مسجد کے احاطے کے شمالی دیوار میں ملی ہوئی تھی۔ اس باؤلی پر تین کتبے تھے۔ اب یہاں بازار کے علاوہ بہت سے مکان بن گئے۔

چاوڑی بازار

یہ بازار جامع مسجد سے لے کر حوض قاضی تک پہنچتا ہے۔ اس کا اصل نام چوڑا بازار تھا۔ کثرتِ استعمال کی وجہ سے چاوڑی بازار ہو گیا۔ اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہلے بساطیوں جفت فروشوں، کیسروں، لوہیوں، کاغذیوں، رفوگروں اور حلوائیوں وغیرہ کی دوکانیں تھیں اور کوٹھوں پر ارباب نشاط حُسن فروشی کرتی تھیں۔ دہلی کے البیلے عاشق مزاج نوجوان دیکھنے دکھانے کے شوق میں بن ٹھن کر کوئے جاناں کے چکر کاٹتے رہتے تھے۔ بقول مولانا راسخ دہلوی سہ

چاوڑی قاف ہے یا خُلدِ بریں ہے راسخ   جمگھٹے حوروں کے پریوں کے پرے ملتے ہیں

شاہ بولا کا بڑ

چاوڑی بازار میں اور نئی سڑک کی نکڑ پر شاہی زمانہ میں ایک بڑ کا درخت تھا۔ یہاں شاہ بولا نامی ایک فقیر رہتے تھے جن کی قبر اب تک موجود ہے۔ لیکن انقلابات زمانہ نے رنگ دکھایا۔ اب بڑ کے درخت کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ اس مزار کے سامنے تانگہ اسٹینڈ ہے۔

کوتوالی

اس جگہ ایک چوک اسی گز مربع تھا اور اس کے جنوب میں کوتوالی چبوترہ تھا۔ اور جانب شمال پر ترپولیہ تھا۔

اب نہ وہ چبوترہ ہے اور نہ ترپولیہ۔ یہ مقام ہمیشہ سے بیوپار کا مرکز رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ یہاں دریا بہتا تھا اور اس مقام پر چبوترہ بنا تھا جہاں کشتیاں غرق ہو جاتی تھیں۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ یہاں گھنا جنگل ہو گیا جس میں شیر بسنے لگے جو کسی ذی روح کو زندہ نہیں چھوڑتے تھے۔ اب یہاں شہر کی کوتوالی ہے۔ وہ بھی ختم ہو گئی ہے۔

مور سرائے

کوڑیا پل کے قریب جہاں مور سرائے ہے، وہاں ۱۸۵۷ء سے قبل کا غذی محلہ تھا۔ ۱۸۶۱ء میں ہملٹن صاحب کمشنر نے ایک لاکھ پانچ سو تیرہ روپے سے ایک سرائے بنوائی ہے۔ ابتدا میں اس کا نام ہملٹن سرائے مشہور رہا اس کے بعد مور صاحب انجینئر نے اس کی برجی پر مور کی تصویر لگائی جب سے لوگ مور سرائے کہنے لگے۔ اب یہاں غریب لوگ آباد ہیں۔ سرائے کا وجود نہیں ہے۔

عرب سرائے

بستی حضرت نظام الدین میں ہمایوں کے مقبرے سے بالکل ملا ہوا محلہ عرب سرائے ہے۔ اس سرا کو حاجی بیگم اہلیہ ہمایوں بادشاہ (اکبر بادشاہ کی والدہ نے ۹۶۸ھ مطابق

۱۵۶۰ھ میں بنوایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بیگم صاحبہ نے تین سو عرب آباد کیے تھے، جن میں سے سو عرب سادات سے تھے، سو مشائخ اور سو عوام الناس تھے یہ لوگ معاشی پریشانیوں کی وجہ سے منتشر ہو گئے، اب اس میں محنت کش طبقہ آباد ہے۔

بولی بھٹیاری کا محل

اجمیری دروازہ سے دو میل آگے پہاڑ گنج کی حدود میں سید حسن رسول نما کی درگاہ کے آگے یہ مشہور محل ایک پہاڑی پر بولا جان پٹھان کا بنوایا ہوا ہے۔ بعض لوگ بو علی بختیاری کسی بزرگ کا بنایا ہوا کہتے ہیں۔ غرض یہ کہ اصل نام بگاڑ کر بھوری یا بولی یا بھولی بھٹیاری کا محل کر دیا ہے لیکن بو علی بختیاری ہی زیادہ موزوں اور قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ یہ محل ایک مرتفع پہاڑی پر بنایا گیا ہے۔

(یہ مضمون واقعات دارالحکومت دہلی آثار الصنادید، آثار دہلی اولیاء دہلی اور بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ سے مرتب کیا ہے)۔

شاہجہاں آباد کے موسیقار

موسیقی ہندوستان میں قدیم ترین دور سے چلی آرہی ہے۔ وسطی عہد میں ہندوستان کے صوفیائے کرام نے نمایاں حصہ لیا حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں محفل سماع جاری تھی حتیٰ کہ حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات بھی سماع کی حالت میں ہوئی۔ یہ سلسلہ ہندوستان کے راجوں مہاراجوں اور بادشاہوں کے دربار میں بھی جاری ہو گیا تھا چنانچہ شاہجہاں بادشاہ بھی اس فن کی سرپرستی میں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔

مورخوں کا کہنا ہے کہ خود شاہجہاں کی آواز میں بڑی دلکشی تھی جب وہ گاتا تو بڑے بڑے اہل دل کے دلوں میں ربودگی پیدا ہو جاتی تھی۔ شاہجہاں "دھرپد" کا عاشق تھا۔ اسی لئے اس کے حکم سے بخشو کے ایک ہزار منتخب دھرپد جمع کر کے ایک کتاب میں قلمبند کئے گئے اور اس کا نام "ہزار دھرپد نائک بخشو" رکھا گیا۔ راگ درپن کا مولف کہتا ہے کہ شاہجہانی عہد کی موسیقی اکبری دور کی موسیقی سے زیادہ ترقی یافتہ تھی لیکن اس کی یہ رائے پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اکبر کے زمانے کے گویے محض عطائی تھے کیونکہ اس کی ساری قابلیت و لیاقت "راگ ساگر" پر مبنی تھی اور رمل کو قوبل کے ذریعے جو انقلاب ہوا۔ اس سے یہ سب ناواقف تھے۔ لیکن شاہجہاں کے دور کے گویے تان کو قوبل کے راگ رانگینیوں سے روشناس تھے۔

اور انھوں نے ان میں لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کیں "راگ درپن" کے مصنف کی رائے ہے کہ شاہجہاں کے دربار میں موسیقی کے بڑے بڑے ماہرین جمع ہو گئے تھے شاہجہاں کی لڑکی جہاں آرا جل گئی تھی۔ جب وہ تندرست ہو گئی تو اس کی خوشی میں شاہجہاں نے جشن منایا۔ شاہی تخت کو موتیوں سے سجایا گیا جب شہزادے اور امرا اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو خوش آواز مغنی اور باکمال ساز نواز طلب کئے گئے۔ جب انھوں نے گانا شروع کیا تو ان کے ساز و آہنگ کی آواز زمین آسمان کو ہلا رہی تھی اور طبل و نفیری کی صدا کرۂ اثیر تک پہنچ رہی تھی۔

شاہجہانی امرا میں مقبل خاں کے یہاں موسیقی والوں کا بڑا مجمع رہتا تھا۔ "راگ درپن" میں شاہجہانی عہد کے ان ماہرین فن کا بھی ذکر ہے جنھوں نے اپنے فن میں بڑا کمال حاصل کیا تھا۔ (۱) گن سین اسے نائک افضل کا خطاب ملا تھا۔ (۲) محب خاں یہ دھرپد کا ماہر تھا (۳) بازید خاں (۴) تلسی رام کلاونت (۵) دہرم داس کلاونت یہ تینوں دھرپد گانے میں مشہور تھے۔ (۷) رحیم داد ڈھاڑی (۸) گوپ چند ڈھاڑی (۹) روضہ (۱۰) اکبر۔ یہ دونوں مشہور قوال تھے (۱۱) شیخ بہاء الدین موسیقی کے بھی ماہر تھے انھوں نے گیت، دھرپد، خیال اور ترانے میں نئی نئی چیزوں کا اضافہ کیا شاہجہاں کے دربار میں اور بھی حسب ذیل ماہرین فن تھے۔

لال خاں کلاونت، تان سین کے لڑکے بلاس خاں کا داماد تھا۔ تان سین نے اس کے بچپن ہی میں اس کا گانا سنا تو اس نے پیشین گوئی کی تھی کہ وہ آگے چل کر استاد فن ہو گا۔ اس لئے اس نے اپنے لڑکے بلاس خاں کے سپرد کیا۔ اور اپنی پوتی سے شادی بھی کر دی۔ دھرپد گانے میں لال خاں بے مثال تھا۔ شاہجہاں جشن کے موقع پر لال خاں کے تین لڑکے خوش حال خاں جب توڑی گاتا تو

شاہجہاں پر ربودگی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی ۔ خوش حال خاں اور بہرام خاں کے
لئے دربار میں وہی جگہ مقرر تھی جو اکبر کے زمانے میں تان سین کے لئے تھی ۔ آخر میں
یہ دونوں شاہجہاں کے عتاب میں آگئے تھے ۔ ان کو یہ حیثیت عالمگیر کے عہد میں بھی
حاصل تھی چنانچہ ان کو اور دوسرے شاہی موسیقاروں کو بارھویں جلوس عالمگیری میں
یہ حکم ہو گیا تھا کہ صرف مجرائے شاہی کے لئے دربار میں حاضر ہوں لیکن نغمہ پردازی
نہ کریں ۔

جگن ناتھ شاہجہاں کے دربار کا مشہور موسیقار تھا ۔ شاہجہاں نے اس کو
مہا کوی کا خطاب دیا تھا ۔ ہندوستانی موسیقی کے فن میں وہ بے مثل تھا ۔ شاہجہاں
نے اس کے فن کی قدردانی کے سلسلہ میں اس کو چاندی کے روپوں میں تلوالیا تھا ۔ اس
کا وزن ساڑھے چار ہزار روپے کے برابر ہوا جو اس کو انعام میں دے گئے —
عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے کہ تان سین کے بعد موسیقی میں اسی کا درجہ ہے ۔ شاہجہاں
کے عہد میں موسیقی کا سب سے بڑا مرکز شاہ نواز خاں صفوی کا دربار تھا ۔ اتنے گویے
اور سازندے تھے کسی اور امیر کے پاس نہیں تھے ۔ شاہجہانی دور میں ملا عبدالسلام
اپنے مذہبی اور فقہی علوم کے لئے مشہور تھے ۔ یہ موسیقی کے مشکل مسائل حل کر دیا کرتے
تھے ۔ اسی دور میں شیر خاں لودی نے مراۃ الخیال لکھی تو ہندی نغمات پر مشتمل
ایک باب لکھ کر ہندوستانی موسیقی کی بہت سی باریکیاں بتائیں ۔ شاہجہاں کے
درباری مورخ عبدالحمید لاہوری نے ہندوستانی موسیقی کی تعریف دل کھول
کر کی ہے ۔ وہ لکھتا ہے :

"موسیقی لذیذ ترین متلذذات اور دقیق ترین معقولات میں سے ہے خصوصاً
ہندوستانی نغمہ تو ایسے مرتبہ کی چیز ہے کہ اس سے بلند تصور میں نہیں آسکتا ۔
اس کی آواز میں دلربائی ہے کیفیت ہے دل کشائی ہے ۔ ہر قوم میں موسیقی تو

ہے لیکن جو وسعت، نازک خیالی، دل نشینی اور ناز و نیاز ہندوستانی نغمہ میں ہے اس کا دسواں بلکہ ہزارواں حصہ بھی کسی اور قوم کی موسیقی میں نہیں ہے۔ اسی لئے ہندوستان کے نغمے کا حسن یہاں کے حسن کی طرح عالمگیر ہے۔"

عالمگیر مذہبی معاملات میں بے حد پابند شرع تھا پنجگانہ نماز بڑی پابندی کے ساتھ ادا کرتا تھا۔ ہمیشہ باوضو رہتا تھا۔ اوّل وقت مسجد میں جا کر نماز گذارتی رمضان کے آخری عشرہ میں مسجد میں اعتکاف کرتا تھا۔ ابتدائے سن شعور سے تمام کروہات محرمات سے شدت کے ساتھ پرہیز کرتا تھا۔ خلافِ شرع کاموں کو اس نے اپنے دورِ حکومت میں ختم کرانے کی کوشش کی مصوری اور موسیقی کو خلافِ شرع تصور کرتا تھا اس کو بند کیا۔ اربابِ نشاط کے طبقہ میں جو شخص سرود کے پیشہ سے توبہ کر لیتا اس کو مدد کے طور پر کچھ جاگیر دے دی جاتی تھی۔ صاحب مآثر عالمگیری لکھتے ہیں۔

"مرزا اکرم خاں صفوی جو فن موسیقی کا بہترین ماہر تھا اس نے عالمگیر سے سوال کیا کہ نغمہ و سرود کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ عالمگیر نے جواب دیا جو اس کے اہل ہیں ان کے لئے حلال ہے۔ مرزا نے عرض کیا آپ اہل ہونے کے باوجود کیوں اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ عالمگیر نے جواب دیا کہ تمام راگ راگنیاں بغیر مزامیر اور خصوصاً پکھاوج مزہ نہیں دیتیں اور مزامیر بالاتفاق حرام ہے۔ حرمت مزامیر کی وجہ سے میں نے نفس سرود سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔"

درباری گانے والوں نے جب پیشہ ترک کر دیا اور بے روزگار ہو گئے تو ان لوگوں نے احتجاجی قدم اٹھایا اس کے متعلق منوچی لکھتا ہے جس کی تصدیق خافی خاں نے بھی کی ہے۔

"اورنگ زیب کی راسخ الاعتقادی نے اسے مجبور کیا کہ وہ موسیقی کو ممنوع قرار

دے۔ اس طرح گانے بجانے والے بے روزگار ہوگئے۔ سُنا گیا ہے کہ تقریباً سو گانے والوں نے بیس جنازے تیار کئے اور روتے پیٹتے ہوئے وہ قلعہ کے دروازہ پر اس وقت پہنچے جب کہ اورنگ زیب نماز کی غرض سے جامع مسجد جا رہا تھا۔ یہ عمل اس وجہ سے کیا گیا کہ بادشاہ کو انھیں دیکھ کر رحم آجائے۔ اورنگ زیب کے سوال پر انھوں نے یہ جواب دیا کہ اورنگ زیب نے موسیقی کو مار ڈالا تو یہ لوگ اس کو دفن کرنے جا رہے ہیں۔ اورنگ زیب نے جواب دیا کہ ان کو ہدایت دی جائے کہ وہ مردے کی روح کے لئے دُعائے خیر کریں اور اس کی تجہیز و تکفین اچھی طرح کریں۔"

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کی موسیقی کی مخالفت کے باوجود موسیقی کی کئی اہم اور معیاری کتابیں اس دور میں لکھی گئیں، یا ترجمہ کی گئیں۔

راگ درپن

حضرت امیر خسرو کے بعد موسیقی کو فن کی حیثیت سے ترقی دینے والوں میں جون پور کے حکمراں حسین شاہ شرقی کا نام بہت نمایاں ہے۔ اس نے ایک درجن سیام ایجاد کیں (۱) ملہار سیام (۲) گورا سیام (۳) بھوپال سیام (۴) کیسر سیام (۵) سوہو سیام (۶) رام سیام (۷) میگھ سیام (۸) بسنت سیام (۹) بیراری سیام (۱۰) سیام گودانی (۱۱) گوند سیام (۱۲) پوربی سیام۔ حسین شاہ نے چار ٹوڑیاں بھی ایجاد کیں۔ (۱) جون پوری ٹوڑی (۲) رانا ٹوڑی (۳) اسوتی ٹوڑی (۴) بہلے ٹوڑی۔ ان ٹوڑیوں میں کچھ راگ بھی ملائے۔ مثلاً جون پوری ٹوڑی میں مالسری اور موافق کو ملایا۔ رانا ٹوڑی میں رام کلی اور مالسری کو مخلوط کیا اور رسوتی ٹوڑی میں ملتانی اور دھناسری کو ضم کیا۔ حسین شاہ شرقی کی وفات کے بعد ہندوستانی موسیقی کی قیادت گوالیار کے حکمراں راجہ مان سنگھ ٹونوار کے ہاتھ آگئی۔ صاحب بادشاہ نامہ اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس کو ہندوستانی موسیقی کے تمام دقائق سے پوری آگاہی تھی۔ محمد صالح کنبوہ

نے اپنی تصنیف عمل صالح میں راجہ مان سنگھ کی مہارت موسیقی کی بڑی تعریف کی ہے اور اس کے اختراعات کا ذکر کیا ہے۔ راجہ مان سنگھ کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس نے ہندوستانی راگ اور راگنیوں کو علیحدہ علیحدہ تقسیم کر کے ان کی وضاحت اور تشریح کی۔ مسلمانوں کے آنے کے بعد موسیقی میں نئے نئے نغمے اور راگ پیدا ہو گئے تھے۔ بہت سے راگوں کی ہیئت بدل گئی تھی اور ان کی شناخت مشکل ہو گئی تھی۔ اس نے ماہرین فن موسیقی کا ایک کمیشن مقرر کیا جس نے پوری تحقیق و تفتیش کے بعد ایک کتاب ترتیب دی۔ اس کتاب میں نئے اور پرانے راگوں کے لئے قواعد بنائے گئے۔ اس کا نام "مان کوتوہل" رکھا۔ اس میں تمام راگ اور راگنیوں کا ذکر ہے جس میں وہ راگ بھی شامل ہیں جو مسلمانوں کے اثر سے پیدا ہوئے۔ راگ راگنیوں کی یہ تقسیم شمالی ہند کی موسیقی کے ارتقاء کا ایک اہم باب ہے۔

امیر فقیر اللہ سیف خاں جو اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کا ماہر موسیقی ہے اس کو "مان کوتوہل" سنہ ۱۶۶۲-۶۳ء مطابق سنہ ۱۰۷۳ھ کو ہاتھ لگی تو اس نے اس کو ہندی سے فارسی میں منتقل کرنا شروع کیا۔ کتاب کے کئی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے سنہ ۱۶۶۵-۶۶ء مطابق سنہ ۱۰۷۶ھ میں اس کا ترجمہ مکمل کر لیا تھا جس کا نام اس نے "راگ درپن" رکھا۔

فقیر اللہ نے جب اس کتاب کا ترجمہ کرنا شروع کیا تو بہت سی مشتبہ و مبہم نظر آئی۔ اس نے مختلف کتابوں کی مدد سے تشریح کر کے مزید اضافہ کیا۔ تاکہ اس کو پڑھنے والوں کو کلاسیکی موسیقی کی تینوں کتابوں بھرت سنگیت، سنگیت درپن اور سنگیت رتناکر کی ضرورت نہ پڑے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جن کتابوں سے مدد لی، ان کے نام یہ ہیں۔ رسالہ سید منصور، ترتیہ ترنگی اور راگ پرکاش۔ شیخ محمد صالح۔ چنانچہ "راگ درپن" اور "مان کوتوہل" کی بنیاد پر ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ راگ درپن دس ابواب پر مشتمل ہے۔

فقیر اللہ نے اس کتاب کے مکمل کرنے میں بڑی جدوجہد وسعی اور کاوش کی ان کے شوق کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اس کتاب میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں روپے خرچ کیے۔
اس کتاب کے علاوہ (۱) رجانک مترجم روشن ضمیر (۲) مفتاح السرور یا تحفہ قاضی حسن بن خواجہ طاہر بن خواجہ محمد (۳) معرفۃ النغم مصنفہ ابوالحسن قیصر (۴) شمس الاصوات مترجم رس بر س بن خوش حال خاں کلاونت (۵) تشریح الموسیقی مصنفہ محمد اکبر ارزانی (۶) رسالہ موسیقی مصنفہ مُلا عوض بیگ ۔

فقیر اللہ سیف خاں

ان کا اصل نام سیف الدین محمود عرف فقیر اللہ تھا۔ ان کے والد تربیت خاں شاہجہاں کے دور کے امیر تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی تخت نشینی کے بعد فقیر اللہ نے دربار میں اثر و رسوخ بڑھایا۔ ۱۰۶۹ھ کو عالمگیر نے ان کو حکم دیا کہ وہ سپہر شکوہ پسر دارا شکوہ کو قلعہ گوالیار میں نظر بند کر کے خود تخت گاہ واپس ہو۔ اس کے بعد اس کو ناظم صوبہ کشمیر مقرر کیا گیا۔ ۱۰۸۰ھ میں ان کو اس عہدے سے ہٹا کر افتخار خاں کو ناظم کشمیر مامور کیا گیا۔ الہ آباد و ملتان کی گورنری بھی عطا ہوئی۔ ۱۰۸۰ھ میں بہار کا صوبیدار بنایا گیا۔ ۱۰۸۷ھ میں خدمات قلعداری و فوجداری اعظم نگر اور تلکوکن سپرد کی گئیں۔ پانصدی منصب اور ہزاری و تین سو سوار کا اضافہ بھی ان کو مرحمت ہوا۔ راگ درپن میں انھوں نے وارد واور گلگت کی فتح کا ذکر کیا ہے۔ ان فتوحات سے خوش ہو کر اورنگ زیب نے ان کو سیف خاں کا خطاب عطا کیا۔

فقیر اللہ موسیقی کے استاد اور موسیقاروں کے سرپرست تھے، انھوں نے مختلف راگوں کو ملا کر چند نئے راگ نکالے تھے انھوں نے ان مغنیوں اور سازندوں کا ذکر کیا ہے جن کے ساتھ سنگیت میں خود حصہ لیا تھا۔ لغت ترکی کا مصنف فضل اللہ خاں ہے سیف خاں چاکر اس کے جد اعلیٰ تھے اور چودہ پشت سے یہ

خاندانِ مغلوں کی خدمت کرتا آرہا تھا۔ سیف خاں کا انتقال ۱۰۹۵ھ مطابق ۸۴-۱۶۸۳ء میں ہوا۔ عالمگیر کے عہد کے ایک مشہور شاعر ناصر علی سرہندی تھے جن کے سرپرست سیف خاں تھے۔ ناصر علی تعلیم پانے کے بعد سیف خاں گورنر کی سرکار سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ۱۰۶۸ھ میں سیف خاں الہ آباد کے گورنر بنا کر بھیجے گئے تو ناصر علی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ سیف خاں سے ناصر علی کو والہانہ محبت وعقیدت تھی۔ ان کے انتقال پران کو بے حد صدمہ ہوا تو ایک مرثیہ کہا جس کا ایک مصرعہ یہ تھا:

سیف از سرم گذشت وقلم را دو نیم کرد

مرزا روشن ضمیر

مرزا ایران سے دہلی آئے اور یہیں مقیم ہو گئے۔ عالمگیر نے ان کی سرپرستی کی۔ یہ اپنے عہد کے مشہور عالم وفاضل تھے۔ عربی، فارسی اور ہندی میں قدرت حاصل تھی۔ فارسی اور ہندی زبانوں میں ضمیر اور سنیہی تخلص رکھتے تھے۔ جب عالمگیر نے قرآن حفظ کر لیا تو انھوں نے یہ رُباعی کہی ؎

محی الدین و مصطفیٰ حافظ تو
صاحب سیفی و مرتضیٰ حافظ تو
تو حامیٔ شرع و حامی تو شارع
تو حافظ قرآن و خدا حافظ تو

اس رُباعی پر عالمگیر نے مرزا کو سات ہزار روپے عطا کیے۔ مرزا کے بارے میں "صاحب روزِ روشن" تحریر کرتے ہیں جس میں اس رُباعی کا بھی ذکر ہے بلکہ یہ رُباعی بھی انھوں نے نقل کی ہے۔

"مرزا روشن ضمیر دہلوی ماہر فن موسیقی وساز نوازی دبعضے فنون دیگر بود در تہنیت حفظ قرآن بحضورِ عالمگیر بادشاہ

ایں رباعی گزرانده جائزه معتد به یافت "

اورنگ زیب عالمگیر نے مرزا روشن ضمیر کو سورت کا بخشی اور وقائع نگار مقرر کیا تھا۔ یہ صاحب تصانیف تھے۔ انھوں نے دو یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ایک مناظرۂ "چشم و زبان" جس کے آخر میں اورنگ زیب کے جلوس کی منظوم تاریخ ہے۔ دوسری کتاب "پارجاتک" ہے۔ یہ کتاب سنسکرت میں موسیقی "پراہوبل" کی کلاسیکی کتاب ہے جس کا فارسی میں ترجمہ مرزا روشن ضمیر نے کیا۔ چونکہ روشن ضمیر علم موسیقی کے استاد تھے۔ اس لئے ان کا ترجمہ مستند اور معیاری ہے۔ اس میں ترجمے کے ساتھ تشریح اور توضیح کی ہے۔ جہاں کہیں روشن ضمیر نے اہوبل سے اختلاف کیا ہے یا مزید توضیح کی ہے۔ وہاں "مترجم گوید" تحریر کیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا روشن ضمیر کے سامنے اصل "پرجاتک" اور اس کی شرح دونوں کتابیں تھیں۔ جیسا کہ حسب ذیل عبارت سے پتہ چلتا ہے۔

"اگر چہ از توضیح شارح ہم تعیین استخوان سرمائی مذکور مشخص نشد اما
ایں قدر معلوم گشت کہ چوں ماتن و شارح ہر دو بایں عبارت
گفتہ اند"

یہ کتاب صرف ترجمہ ہی نہیں بلکہ اس میں بہت کچھ اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ پارجاتک تین ابواب پر منقسم ہے۔ پہلا گیت کانڈ ہے جس میں گانے کے اصول و قواعد ہیں۔ دوسرا وادیہ کانڈ ہے جس میں سازوں کی بحث ہے۔ تیسرا کانڈ نرتیہ یعنے رقص سے متعلق ہے۔ مرزا روشن ضمیر نے ان دو کتابوں کے علاوہ موسیقی پر عربی، فارسی اور ہندی میں اور کتابیں بھی تصنیف کی ہیں لیکن ان کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ملتیں۔

مرزا روشن ضمیر کا انتقال سورت میں ۱۰۷۶ھ–۱۶۶۵ء مطابق [illegible] میں ہوا تھا۔ مرآۃ الخیال کا مؤلف شیر خاں جو مرزا روشن ضمیر کا ہم عصر نہیں تھا بلکہ ان کا دست

تھا۔ ان سے ذاتی تعلقات رکھتا تھا۔ وہ ان کے بارے میں لکھتا ہے "مرزا روشن ضمیر آسمانِ فضل وکمال کے بدرِ منیر تھے۔"

شاہجہاں آباد کے آخری دور میں محمد شاہ رنگیلے کا دربار گویّوں اور سازندوں کا مرکز بن گیا تھا۔ ان میں نعمت خاں المعروف صدا رنگ اب تک مشہور ہے خیال کیا جاتا ہے کہ آج کل جتنے خیال گائے جاتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر صدا رنگ کے وضع کردہ ہیں۔ نعمت خاں کے شاگردوں میں اس کے بھائی کے علاوہ لالہ بنگالی اور نیازی قوال تھے۔ محمد شاہ کے درباری مغنی "سارنگ" نے سارنگی ایجاد کی جو اس قدر مقبول ہوتی چلی گئی کہ دوسرے ساز مثلاً بین، سرود، رباب، طنبورہ اور قانون بجانے کا فن اس کے سامنے روز بروز کم ہوتا چلا گیا۔

نعمت خاں دہلی میں نعمت خاں صدا رنگ اور فیروز خاں ادا رنگ کا خاندان تھا۔ یہ خاندان موسیقی جاننے والوں میں مشہور تھا۔ فیروز خاں بھی محمد شاہ کے زمانہ کا موسیقار تھا۔ درگاہ قلی خاں نعمت خاں کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"در ہندوستان وجودش از نعمت ہائے عظمیٰ است در اختراع نغمات و ایجاد شعبات ید طولیٰ دارد و بانائیکان پیشین پہلو می زند و موجد خیالہائے رنگین است در چندیں زبان تصانیف دارد و بالفعل مغنیانِ دہلی است و بمقتضائے تمنائے ذاتی غیر از بادشاہ بہیچ کس سرفرو نمی آرد۔ در عہد محمد معز الدین طرفہ سازی بہم رسانیدہ (؟) ... در عرس ہائے بزرگان حاضر می شود و خود ہم بازدہم می کند و سادہ داعیان شہر بر ماہے ادر تیا ز دہم بخانہ اش ہجوم می کنند تماشا بہ کثرت می شود کہ جا بہم میرسد لہٰذا از جمیع مردم سبقت می کنند۔

وایں صحبت تا سفیدۂ صبح می کشد ۔۔۔ درنوا خلق ہیں جہاں تے واز
کہ شاید در عرصۂ وجود بہتر ازیں خلق نشدہ باشد"

فیروز خاں

فیروز خاں ادا رنگ کی سازِ زندگی کا تار شاہ عالم ثانی کے زمانے میں ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے کئی سُروں کو ملا کر ایک سُر نکالا اور اس کا نام "سندورا" رکھا جو رواج پا گیا اور مقبول ہو گیا۔ اکثر لوگ بسنت کی راتوں میں پوری سُر میں گاتے ہیں۔ ہندوستانیوں کے نزدیک اس فن کا گُر یہ تھا کہ تین "بسنک" گلے سے ادا نہیں کیے جا سکتے۔ مگر فیروز خاں ادا کرتا تھا ایک "بسنک" کو سینہ کی آواز سے ادا کرتا تھا اور اس کے سینہ کی آواز بلندی کی وجہ سے گلی کی آواز جیسی ہو جاتی تھی۔

فیروز خاں کے بارے میں درگاہ قلی خاں کی یہ رائے تھی:

"در تمہید آلات طرفہ دستے دارد تا چہار چہار ساعت بچندیں رنگ بہ نغمات مختلف و آہنگ ہائے جیشی مترنم می شود و بقوت استعداد اعادہ باصل آہنگ می نماید ہوش در تصحیح آواز کلمہ مغنیاں می سپرد وایں قسم صنعت و قدرت ہیچ کس نیست خواندنش کیفیت است"

محمد شاہی دور ہی ایسا تھا کہ لوگوں نے فن موسیقی سیکھنا شروع کر دیا تھا شعراء کرام بھی اس فن لطیف سے خالی نہیں تھے شعر و شاعری کے ساتھ موسیقی میں بھی کمال حاصل کرتے تھے جن میں حسب ذیل حضرات بھی تھے۔

نواب امیر خاں انجام

انجام صاحب کا اصل وطن یزد ایران تھا۔ ان کے بزرگ ایران میں سلاطین صفویہ کے دربار میں ہمیشہ ممتاز رہے۔ ان کے والد امیر الامراء نواب امیر خاں عالمگیر کے عہد میں صوبہ داری کے منصب سے سرفراز رہے۔ یہ خود اپنے زمانہ کے ممتاز و مقتدر

مُقرّامیروں میں گنے جاتے تھے۔نواب امیر خاں ۱۱۵۲ھ میں بخشی گری کے عہدے پر ممتاز ہوئے۔صوبہ دار الہ آباد مقرر ہوئے۔عمدۃ الملک کا خطاب عطا کیا گیا۔محمد شاہ کو ان سے ایسا انس تھا کہ خلوت وجلوت میں کسی وقت انھیں حضوری سے علیحدہ نہیں کرتے تھے اور انھوں نے اپنی حاضر جوابی اداشناسی ونکتہ سنجی سے بادشاہ کے دل میں گھر کر لیا تھا اور ایسا رسوخ پیدا کیا تھا کہ دیگر امرا کی نظروں میں خار کی مانند کھٹکتے تھے۔ ان کی شوخ طبعی اور بذلہ سنجی کے اکثر لطیفے مشہور ہیں۔ اور حقیقتاً یہ اس رنگیلے دربار کے روحِ رواں تھے۔شعروشاعری میں مرزا بیدل کے شاگرد تھے۔اُردو فارسی کے علاوہ ہندی زبان سے بھی واقف تھے۔چنانچہ پہیلیاں اور مکرنیاں اکثر کہا کرتے تھے۔

علم موسیقی میں ان کو ایسا دخل تھا کہ اس فن کے اچھے اچھے استاد اُن کا نام سُن کر جھک جاتے تھے اور ان کی خداداد ذہانت اور قابلیت کے قائل اور معترف ہوتے تھے۔آخر محفل خاص کی بے تکلفانہ صحبتوں نے رنگ دکھایا۔مخالفوں نے رنگیلے شاہ کے کان بھرے کہ یہ آدابِ شاہی کا خیال نہیں کرتے اور بادشاہ کے دل میں اُن کے خلاف ایسی کدورت بھر دی کہ بادشاہ کی ہی ایما سے ۱۱۶۹ھ میں دیوانِ خاص دہلی کے صحن میں ایک غلام نے کٹار سے اُن کا کام تمام کر دیا ہمراہیوں نے اُسی وقت اُس کو پکڑ کر کیفر کردار کو پہنچایا "عمِ عمد" آپ کی تاریخ وفات ہے۔ دہلی میں سرائے روح اللہ کے قریب ان کا مزار ہے۔

مرزا انجو مرزا محمد ان کا نام تھا۔دہلی کے رہنے والے تھے۔ایک جگہ ان کو قرار نہیں تھا۔کبھی عظیم آباد میں ہیں تو کبھی مرشد آباد میں اور کبھی فیض آباد پہنچے ہوئے ہیں۔علم موسیقی اور ستار نوازی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔شاہ عشق دہلوی کے شاگرد تھے۔ خوش طبع، شیریں کلام ؛

اور عاشق مزاج تھے، مذاق عالی رکھتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں چلے گئے تھے، وہیں فوت ہوئے۔

محبوب خاں محبوب خاں دہلی کے قدیمی باشندے تھے۔ موسیقی کے شائق تھے اور راگ راگنی سے خوب واقف تھے۔ دہلی کے مشہور قوالوں میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ اُردو شاعری سے بھی رغبت تھی۔ محبوبؔ تخلص تھا۔

مکھوا پکھاوجی ان کا خاندان دہلی کا قدیمی خاندان تھا۔ مکھوا جی بڑے ملنسار اور ہنس مکھ انسان تھے۔ صاحب کمال ہوتے ہوئے انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ سر سید احمد خاں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"پکھاوج بجانے میں یکتائے عصر اور یگانۂ دہر۔ باتفاق کہتے ہیں کہ جو صحت اس کے ہاتھ میں ہے نہ سلف کو میسر ہوئی اور نہ خلف کو"۔

حافظ غلام اشرف حافظ غلام اشرف دہلوی علم موسیقی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ جنتر اور بین بجانے اور خیال و دھرپت گانے میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان کے کمال کی ہندوستان بھر میں شہرت تھی صاحب گلستانِ سخن ان کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"علم موسیقی میں مہارت چست اور اس فن کی سمجھ بہت درست جنتر اور بین بجانے میں دستگاہ تمام، خیال اور دھرپت گانے میں قدرت مالا کلام مگر وہ سب مضامین عرفان سے مالا مال ہوتے اور وہ راگ ان معانی بلند کی اعانت سے عارف کو مدارج علیا تک پہنچتے۔ گویا یہ شعر مولانا اشرف العارفین جلال الدین رومی

قدس سرہٗ کا اسی کے نغمہ کی شان میں ہے ؎

این زمزمہ مرکبی ہست مر روح ترا
بردارد و خوش بعالم ما برد

مرزا ظہور علی خلیق خلیق صاحب کے والد مرزا بو خدا رکھتے تھے خلیق صاحب نے عربی کی بعض کتابیں پڑھی تھیں۔ ماہر فن موسیقی تھے۔ اس کے ساتھ مرثیہ خواں بھی تھے۔ شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا۔ کبھی اُردو میں اشعار کہہ لیا کرتے تھے۔ محمدؐ شاہ کے عہد میں نواب نوازش محمدؐ خاں شہاب جنگ کی فہمائش و خواہش پر مرشد آباد گئے تھے۔ وہیں سکونت اختیار کی تھی۔ ۱۱۹۹ھ میں بنگال میں کسی عہدہ پر مامور تھے جس کے بارے میں صاحب گلشن ہند تحریر کرتے ہیں :-

"جوان آراسیدہ و خوش ذہن است، گاہے ریختہ می گوید۔ از محمدؐ شاہ فردوس آرام گاہ حسب الطلب نواب نوازش محمدؐ خاں شہامت جنگ وارد مرشد آباد شدہ در آں سکنے اختیار کردہ تا سال ۱۱۹۹ھ باشد در سرکار نظامت بنگالہ منسلک و با راقم آشناست۔"

گھنانند یہ بمبئت ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ کایستھ تھے۔ اور محمدؐ شاہ کے میر منشی تھے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ گانے میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ ایک بار محمد شاہ کے دربار میں کسی نے ان کے گانے کی تعریف کی۔ محمدؐ شاہ نے اصرار کیا۔ مگر یہ ٹالا کرتے تھے کسی نے کہا اس وقت تک نہ گائیں گے جب تک سجانی طوائف ان کے سامنے نہ ہو۔ طوائف طلب کی گئی اور انھوں نے اس کی طرف منھ اور بادشاہ کی طرف پیٹھ کرکے گانا شروع کیا۔

بادشاہ اور درباری گانا سن کر خوش ہوئے۔ مگر بادشاہ نے بے ادبی کی سزا دی اور
انھیں شہر بدر کر دیا۔ انھوں نے سجان طوائف سے اپنے ہمراہ چلنے کے لئے کہا مگر
اس نے انکار کر دیا۔ انکار سے اس کا دل ٹوٹ گیا اور یہ فقیر بن کر بندرا بن
چلے گئے اور آخر تک وہیں رہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ نادر شاہ کے حملے کے بعد
جب لوٹ پٹ اور سپاہی متھرا تک آ گئے تو کسی نے ان کو خبر دی کہ بادشاہ
کا میر منشی بندرا بن رہے اس کے پاس کافی دولت ہوگی۔ سپاہی زر، زر، زر
چلاتے ہوئے آئے اور انھیں گھیر لیا۔ انھوں نے اس لفظ کو الٹ کر رز رز
رز کہا۔ اور دو تین مٹھی خاک ان کی طرف پھینک دی کہ اس کے سوا ان کے
پاس اور کچھ نہیں ہے۔ سپاہیوں نے غصہ میں آکر ان کا ہاتھ کاٹ ڈالا
مرنے کے بعد قریب انھوں نے اپنے خون سے یہ کبت لکھا ؎

بہت دنان کی اودھی آس پاس پرے
کھرے برنی بھرے ہیں، اٹھی جان کو
کہو کہو آدن چھبیلے من بھاون کو
گوگھرا کھت ہو دے دسے سن مان کو
جھوٹ بتیاں کی پتیاں تیں اداس ہو کے

اب نہ گھرت گھن آنند نداں کو
ادھر لگے ہیں آئے کرنے کہے پیال پران
چاہت چلن لے سندیسے سجان کو

ان کی پانچ تصانیف ہیں (۱) سجان ساگر (۲) برہ لیلا (۳) کوک سار (۴) رسکیے
ورتی (۵) کرپا کانڈ۔ ان سب میں سجان کا ذکر ملتا ہے۔ حالانکہ انھوں نے بندرابن

پہنچ کر بھگوان سے لو لگائی گئی لیکن ان کا کلام عاشقانہ ہے فقیرانہ نہیں ہے، اور چونکہ ہجر و فراق کی منزلوں سے گزرے تھے اس لئے اس قسم کے مضامین میں ان کا جوہر کھلتا ہے اور ان کے اسی قسم کے کبت مشہور ہوئے ہیں۔

تلسی داس صمیم

تلسی داس جی کو دنیا کے لوگوں سے نفرت تھی۔ فقرا سے دلی لگاؤ تھا۔ دلی کے مشہور طبیب تھے۔ فارسی زبان سے بقدر ضرورت آگاہ تھے۔ ستار بجانے میں بے مثل تھے۔ صاحب گلستان سخن ان کی محفل سرود میں شامل ہوئے تھے تو ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"علی الخصوص فن موسیقی کی پوتھیوں سے صاحب انتباہ ستار بجانے میں ہوش سر سے اور جان تن سے نکال لیتا ہے۔ میں نے اس کے نغمۂ دل نواز کو اپنے کان سے سنا اور اس کیفیت سے حظ دل خواہ اٹھایا۔"

تلسی داس جی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ ان کا تخلص صمیم تھا۔

حکیم پناہ دہلوی

حکیم صاحب صحیح النسب سید تھے۔ ان کا خاندان دہلی کا رہنے والا تھا۔ آپ کے والد سید محمد شریف خاں ایک بخش تھے ظل سبحانی نے خطاب خانی و منصب ہزاری سے سرفراز کیا تھا۔ حکیم جی پناہ درش خلق، خوش اختلاط اور عاشق مزاج تھے۔ موسیقی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اور اچھے طبیب تھے۔ خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ صاحب تذکرہ ہندی مصحفی ان کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"در علم موسیقی و عمل تکسیر و عبور کتب تواریخ و طب و سیر دو دواوین اساتذہ و تذکرہ ہائے سلف یگانۂ روزگار است شعر درد مندانہ می گوید تلاش عاشقانہ می کند۔"

پہلے آپ کا تخلص نثار تھا پھر پیشہ طبابت کی وجہ سے حکیم پر بدل کیا۔

موسیقی کے علاوہ دیگر علوم شریفہ میں مرتبہ کمالی حاصل تھا۔ کلام میں روانی و سلاست ہے۔

محمد حسن فدوی دہلی کے شرفاء میں فدوی کا شمار ہوتا تھا۔ ان کے والد کا نام میر غلام علی مصطفےٰ خاں تھا۔ محمد شاہی کے جوانوں میں شامل تھے۔ ناجی کے شاگرد تھے۔ علم موسیقی کے ماہر تھے۔ ستار نوازی میں مشہور تھے چنانچہ ان کے بارے میں صاحب تذکرہ میرحسن لکھتے ہیں:۔

"در علم موسیقی و ستار نوازی شہرتے دارد، از شرفائے شاہجہاں آباد است جوان محمد شاہی ست تا حال زندہ است"۔

مرزا ہدایت اللہ مرزا ہدایت اللہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ موسیقی میں کمال رکھتے تھے۔ دھرپت خوب گاتے تھے۔ دہلی کے شعراء میں بھی ان کا شمار تھا۔ ان کا مرزا تخلص تھا۔

خواجہ حسن خواجہ حسن بن خواجہ ابراہیم بن غیاث الدین بن محمد شریف بن ابراہیم المعروف خواجہ کہاری دہلی کے رہنے والے تھے۔ موسیقی کے ماہر تھے۔ اس فن پر ان کی تصانیف بھی ہیں۔ علوم نجوم سے بھی واقف تھے اور علم تصوف کے بادشاہ تھے۔ حسن پرست بھی تھے۔ اکثر مقطعوں میں اپنے محبوب کا نام لایا کرتے تھے۔ ان کی محبوب بخشی طوائف تھی۔ جعفر علی خاں حسرت کے شاگرد تھے اور صاحب دیوان تھے۔

یحییٰ خاں جرأت جرأت صاحب کی عرفیت قلندر بخش تھی۔ ان کے باپ حافظ امان خاں دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے خاندان کا سلسلہ رائے امان کا کوچہ انھیں کا بنوایا ہوا ہے۔ جرأت، جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے شعر و شاعری کے علاوہ موسیقی میں اچھی دسترس حاصل تھی۔ ستار خوب بجاتے تھے۔

شمع ساں کس نے تجھے پھولتے پھلتے دیکھا
میں ہوں وہ نخل کہ دیکھا بھی تو جلتے دیکھا
جیں کیا ہو خانۂ ہستی میں خاک
جو یہاں آیا مکدر ہے گیا

موسیقی مغلیہ دربار میں آخر دم تک قائم رہی۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بہت سے ماہرین موسیقی جمع تھے۔ وہ کم و بیش وہی ہے جو ان کے والد ماجد اکبر ثانی کے عہد میں تھے۔ تھوڑا بہت فرق ہوا ہوگا۔

وقائع عبدالقادر خانی مؤلفہ مولوی عبدالقادر رام پوری ۱۸۳۶ء میں تالیف و تصنیف ہوئی جبکہ اکبر ثانی کا دور تھا۔ اس میں انھوں نے اس دور کے موسیقار نعمت خاں، فیروز خاں، ہمت خاں، قائم خاں، راگ رس خاں، تار احمد اور نظام خاں کا تذکرہ کیا ہے۔ سر سید خاں نے آثار الصنادید ۱۲۶۳ھ میں مرتب کی جبکہ بہادر شاہ ظفر کا عہد تھا۔ اس میں انھوں نے اُس دور کے موسیقار ہمت خاں، راگ رس خاں، سید ناصر احمد، قائم خاں، گلاب سنگھ، اور سکھوا کھاؤ جی کا ذکر کیا ہے۔ اس میں نعمت خاں اور فیروز خاں کے نام نہیں ہیں جو محمد شاہ کے زمانے کے تھے۔ بقایا نام تمام اکبر ثانی کے دور کے موسیقاروں کے ہیں۔ البتہ بہادر شاہ ظفر کے دور میں بہادر خاں ستار نواز، سیم سین، گلاب سنگھ، کھاؤ جی اور سکھوا کھاؤ جی کے نام نئے ہیں جو بہادر شاہ ظفر کے عہد کے ہیں۔

ہمت خاں

یہ موسیقار ہر قسم کا گانا جانتا تھا۔ ہر فن مولا تھا لیکن دھرپد کے گانے میں اس کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ یہ اس قدر مستغنی المزاج فن کار تھا کہ کسی کی ملازمت کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ دہلی کا عاشق تھا اس کو اس شہر کی گلیوں اور در و دیوار سے اس قدر محبت تھی کہ دہلی سے باہر قدم رکھنا نہیں

چاہتا تھا۔ چنانچہ سر سید احمد خاں اپنی مشہور تصنیف آثار الصنادید میں اس کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"باران کا شاگرد کہیں اور نہ گیا۔ اس کا تلمیذ کمترین۔ یہ زبدہ علمائے روزگار اس صناعت میں اپنے عہد میں کوس لمن الملکی مارتا تھا۔ سب ارباب نغمہ اس کے نام سے اپنا کان پکڑتے تھے۔ دھرپد کے گانے میں اس کا نظیر نہ تھا۔ اگر تان سین زندہ ہوتا زانوئے شاگردی طے کرتا اور اگر برجو باورا قیدِ حیات میں ہوتا تو خط غلامی لکھ دیتا۔ ہرچند اطراف عالم سے رؤسا، ذی الاقتدار اور راجہ ہائے عالی تبار نہایت آرزو سے بطمع زر خطیر خط لکھ کر تمنا کرتے تھے کہ یہ صاحبِ کمال قصد ان کی ملازمت کا کرے باستعانت استغنائے خداداد جو ارباب کمال کے لوازم ذاتیہ سے ہے۔ تمام عمر ان کی طرف منہ نہ کیا اور دلی سے قدم باہر نہ رکھا جو نغمہ سرا کہ مالک دور دست سے مدعی اس فن کا کردار شاہجہاں آباد ہوا، اس کی ایک تان کے سنتے ہی نہ تال کی خبر رہی نہ سُر کی اور اس کے قدم کی خاک کو اپنی آنکھ کا کحل الجواہر بنایا حضرت بابرکت شاہ محمد نصیر مرحوم سجادہ نشین خلافت حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمتہ کے سامنے بہ پیروی رسم مستمرہ کے دوسری اور چوبیسویں ہر مہینے کی مجلس نغمہ زنی کیا کرتا تھا اور در و دیوار اس کی کمال داد دہی سے مست ہو جاتے تھے اور از بسکہ درد باطن اور لذت فقر کی چاشنی اس مستغنی الاوصاف کے گلوی حال میں پہنچی ہوئی تھی، اس نغمہ کو ایک اور ہی کیفیت بہم پہنچی تھی۔ غرض چند سال کا ہوتا ہے کہ اس عالم عنصری سے انقطاع تام کیا اور بزم جنت میں خراماں ہوئے"

صاحب وقائع عبد القادر خانی ان کے بارے میں تحریر کرتے ہیں :۔

"ہمت خاں بے شک اس فن (موسیقی) کا ماہر تھا لیکن سکھانے میں بہت چوکے دیتا تھا۔ رات میں پوریا اور بھیر دونوں کا گلے سے نکالنا مشکل کام ہے

لیکن میں ایک محفل میں موجود تھا اس میں ہمت خاں نے خوب ادا کیا۔"

راگ رس خاں جس طرح ہمت خاں دھرپد میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا اسی طرح راگ رس خاں بین نوازی میں یکتائے روزگار اور یگانہ شہر و دیار تھا اور اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا ہمت خاں کے ساتھ دوسری اور چوبیسویں میں درگاہ حضرت خواجہ میر درد میں بین نوازی کے کمالات دکھاتا تھا اور ذوق و شوق کے ساتھ سامعین کو محظوظ کرتا تھا مولانا عبدالقادر رام پوری فرماتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں نور خاں، رس بین خاں اور راگ رس خاں بین بجانے والے تھے۔

میر ناصر آپ کا خاندان سادات غلام سے تعلق رکھتا تھا آپ کے والد ہمت خاں کے داماد تھے۔ ان کی صاحبزادی سے شادی ہوئی تھی ہمت خاں میر ناصر احمدؒ کے نانا تھے۔ ان سے ہی انھوں نے رشد و ہدایت پائی اور ان کے فیض و کرم سے اپنے زمانہ میں نامور ہوئے۔ ان کے نانا خاص طور پر دھرپد میں مشہور تھے لیکن نواسہ دھرپد و نغمہ سرائی کے علاوہ بین نوازی میں بھی معروف روزگار رہا اور ان دونوں فنون میں وہ کمال پیدا کیا کہ سابقین کے ترانے اور نغمے بھی فراموش کر گئے جس طرح یہ ان فنون کی ادائیگی کرتے تھے سلف کو یہ مجال نہ تھی کہ عشر عشیر بھی اس طرح ادا کر سکتے۔ آپ اپنے نانا کے فوت ہونے کے بعد قدیم دستور کے مطابق حضرت خواجہ محمد نصیر کے سامنے نغمہ سرائی اور بین نوازی اپنی دو تاریخوں میں کرتے رہے۔ تلاش روزگار کے لئے ادھر روانہ ہوگئے تھے۔

بہادر خاں ستار زن ستار نوازی میں یہ اپنے زمانہ میں یگانۂ روزگار تھا۔ اس کی آواز سے در و دیوار مسرور ہو جاتے

تھے اور جانور تک متاثر ہوتے تھے اس پر یہ فقرہ کہ "مرغ از طیران آب از جریان باز دارد صادق آتا تھا۔ آثار الصنادید کی تالیف کے وقت ان کو فوت ہوئے پانچ چھ برس کا عرصہ گزر چکا تھا۔

رحیم سین ستار زن

یہ بہادر شاہ ظفر کے دور کا موسیقار تان سین کی اولاد میں تھا۔ اس کو چھ راگ اور چھتیس راگنیوں پر پورا عبور حاصل تھا۔ نواب فیض احمد خان والئے جھجر ان کے قدر داں تھے۔ ان کی قدر و منزلت کرنے کی وجہ سے ان کے ہاں رحیم سین ملازم ہوئے۔ نواب صاحب کی وفات کے بعد نواب فیض علی خان نے بھی اس کی قدر و منزلت کرنے میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی جب ریاست جھجر عبدالرحمٰن پسر نواب منتقل ہوئی تو اس رئیس نے بھی کوئی فروگذاشت نہیں کی۔ بقول سر سید احمد خاں واقع میں ایسے لوگ یکتا ئے روزگار عرصۂ عالم میں کم جلوہ گر ہوتے ہیں۔"

قائم خاں

قائم خاں کے والد ماجد عالم خاں تھے۔ دھرپد گانے میں کمال رکھتا تھا۔ بقول صاحبؒ "آثار الصنادید" دھرپد نوازی پر ایسا کمال تھا کہ مقامات دوازدہ گانہ راگ کو کہ کمال صعوبت سے ہفت خوان رستم کا حال رکھتے ہیں اس کے انفاس و معجزہ اساس نے بآسانی سر کیا تھا۔ عہد آدم سے اس دم تک ایسا بر پیدا نہیں ہوا اور اس زمانہ سے نفخ صور تک اس کے نظیر کا پیدا ہونا متصور نہیں۔"

صاحب علم و عمل معلوم دیتا ہے کہ قائم خاں سے کچھ ناراض ہیں۔ ان کے کمال کو اہمیت نہیں دیتے۔ چنانچہ اس کا ذکر بڑے انداز سے کیا ہے تحریر کرتے ہیں:-

"قاسم خاں پسر عالم خاں بھی فن موسیقی میں مشہور رہے۔ میں نے رام پور میں نواب نصر اللہ خاں کے زمانے میں بارہا اس کا گانا سنا

ہے وہ ایک طرز پر گاتا تھا اور اس کے تین ساتھی تین تال گاتے تھے
اور سم برابر پڑ رہا تھا۔ بہت سے لوگ اس عجیب صفت پر اس کے
کمال کی تعریف کرتے تھے۔ حالانکہ یہ کوئی بڑی کاری گری نہیں
اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ اگر چند تال میدان میں ادا ہوں
تو ان کی باہمی نسبت دوگنی، آدھی، تہائی، چوتھائی یا برابر کی ہوگی
جیسا کہ رو پک کر چوتالہ آڑا دکی، دھیمائی ہے اور جھپک (؟) میدان
تب آدھ پونے تال کی برابری ہو سکتی ہے اور سم برابر ملتے ہیں۔"

نظام خاں

اُن کے والد ماجد کا نام قائم خاں تھا۔ دھرپد سرائی پر ان کو پوری قدرت حاصل تھی۔ یہ صاحب کمال تان سین اور برجو باورے کو کچھ نہیں سمجھتا تھا اور خیال میں نہیں لاتا تھا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے کافی عرصہ پہلے فوت ہو گیا تھا۔ نظام خاں کے بارے میں صاحب علم و عمل کی اچھی رائے ہے معلوم دیتا ہے کہ ان سے کوئی پرخاش نہیں ہے۔ اور ان کے مداح ہیں چنانچہ ان کے بارے میں اُن کی یہ رائے ہے:-

"قائم خاں کا لڑکا نظام خاں اپنے باپ کا بہترین جانشین تھا اور نظام
خاں اس فن میں اتنا کمال رکھتا تھا کہ بعض اس کو بہت خاں پر ترجیح
دیتے تھے۔ یہ لوگ دھرپت سے گانے والے تھے سدجی اور خیال مشہور
تھا اور اصل الفاظی ترتیب میں مشہور ٹپہ اور ٹھمری بہترین گاتے
ہیں اور صاحب حیثیت لوگوں میں خواجہ میر درد کا خاندان اس فن
کو خوب جانتا ہے۔ شاہ نظام الدین عرف بڑے صاحب کا بھتیجا
بین بجانے میں اور غلام حسین پسر فیض اللہ بیگ کا لڑکا ستار
بجانے میں سب سے بہتر شمار ہوتا ہے۔"

گلاب سنگھ پکھاوجی

اس صاحبِ کمال کا موسیقی کا ہاتھ بجانے میں ایسا تیار تھا کہ اس کی ایک ہاتھ کی جنبش سے میں سو راگ آنکھوں میں پھر جاتے تھے۔ ستار نوازی میں اس کو یہ کمال حاصل تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ستار نوازی کو از سرِ نو زندہ کیا ہے۔ علاوہ اس کے جل ترنگ بجانے میں اس کو یدِ طولیٰ حاصل تھا جوانی میں داغِ مفارقت دے گئے۔

مرزا محمد رضا قزلباش خاں

ان کا اصل وطن ہمدان تھا جوانی میں اصفہان آکر مرزا طاہر وحید کے شاگرد ہوئے اور علوم کی تحصیل کی۔ عالمگیر کے آخری دور میں ہندوستان آئے۔ بہادر شاہ کے زمانے میں منصب ہزاری پایا مگر اس منصب پر خوش نہیں ہوئے اور یہ شعر کہا ؎

شل بلبل کے ہوں سدا نالاں
یہ مرا منصب ہزاری ہے

معز الدین جہاندار شاہ کے عہد میں دکن میں کسی خدمت میں مامور ہوئے جب امیر الامراء حسین علی خاں نے داؤد خاں ناظم برہان پور پر فتح پائی۔ تو یہ تخفیف میں آئے اور امیر الامراء کے دربار میں حاضر ہوئے چونکہ علم مجلس کا سلیقہ اور مزاج دانی کا ملکہ حاصل تھا چند ہی روز میں امیر الامراء ان سے ایسے خوش ہوئے کہ ان کو کرناٹک کا داروغہ کر دیا چنانچہ ارکاٹ جا کر کئی برس وہاں رہے اس کے بعد نواب آصف خاں سے متعلق ہو گئے تو سنہ ۱۱۵۱ھ میں جب نواب آصف جاہ دہلی طلب ہوئے تو یہ بھی ان کے ساتھ دہلی آگئے جس زمانے میں محمد شاہ کے بعد میں نادر شاہ نے دہلی کو لوٹا آپ وہیں موجود تھے۔ جب نادر شاہ کے واپس ہونے کے بعد آصف جاہ دکن واپس جانے لگے تو یہ دہلی کی محبت کے مارے نوکری

چھوڑ کر دہلی ہی کے ہو رہے۔ موسیقی میں ان کو کمال حاصل تھا بقول صاحب "خم خانہ جاوید" باوجود ولایت زائی ہندی راگوں کے گانے اور سمجھنے میں نہایت درجہ کمال حاصل تھا۔" ۱۳۰۵ھ میں فوت ہوئے۔

شاہزادہ غلام حسین

شاہزادہ غلام حسین کے والد ماجد مرزا ہدایت علی تھے مرزا صاحب علم موسیقی کے دلدادہ تھے۔ اس میں انھوں نے بڑا کمال پیدا کیا تھا۔ لال قلعہ کے شہزادے ان کی نغمہ طرازی کے بڑے دلدادہ تھے۔ مرزا صاحب کو شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا۔ انداز تخلص تھا شیخ ابراہیم ذوق کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔

مرزا رحیم الدین حیاؔ

مرزا رحیم الدین حیا کے باپ مرزا کریم الدین بیا گورگانی نبیرۂ شاہ عالم تھے۔ ستار نوازی کی نواب یوسف علی خاں والئے رام پور بڑی قدر کرتے تھے۔ شطرنج بے مثل کھیلتے تھے ولایت سے جس قدر مشکل نقشے آتے تھے آپ اُن کو حل کر دیتے تھے۔ آپ ایک کہنہ مشق شاعر تھے، حیاؔ تخلص تھا۔

نواب غلام حسین سرور

نواب غلام حسین سرور ابن شرف الدولہ نواب فیض اللہ بیگ رئیس اعظم دہلی ستار نوازی میں کمال رکھتے تھے۔ مرزا قادر بخش صابر مولف گلستانِ سخن کی ان کے بارے میں یہ رائے ہے:۔

"حیات علم موسیقی خصوصاً ستار نوازی کے باب میں جو کمال حاصل تھا اس کا وصف آشنائے زبان کرنا قرط ہی حکم تکرار میں ہے۔ اس ساز کا ہر تار بجائے آہنگ نغمہ ستائش زبان پر رکھتا ہے۔"

نواب سرور کو شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ قادر الکلام شاعر تھے کلام میں

ندرت، درد و تاثیر ہے۔

مرزا فخر الدین ستیارہ

مرزا فخر الدین بن مرزا معز الدین ثابت بن شاہ عالم بادشاہ، عالی طبع، خوش وضع صاحبِ فکرِ بلند تھے۔ ستار بجانے میں شہرۂ آفاق تھے۔ عبدالرحمٰن احسان کو کلام دکھاتے تھے۔

میر مدد اللہ

ان کا اصل نام مرزا صادق علی تھا۔ عرفیت میر مدد اللہ تھی ان کے والد کا نام میر حمزہ علی تھا۔ علم موسیقی میں مہارت رکھتے تھے۔ خیال نعمت خاں خوب ادا کرتے تھے۔ جوان محمد شاہی تھے ظریف طبع تھے، کبھی کبھار ایک دو شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ میاں نعمت خاں کے شاگرد اور سوداؔ کے دوست تھے۔ سنہ ۱۲۰۲ھ میں فوت ہوئے۔

نواب ظفر یار خاں

نواب ظفر یار خاں صاحبیکے باپ سرشعر و فرانسیسی تھے۔ دہلی کے رہنے والے تھے "مظفر الدولہ ممتاز الملک نواب ظفر یار خاں بہادر جنگ" کے خطاب یافتہ تھے علم موسیقی کے ماہر تھے۔ مصوری میں بھی اچھا دخل تھا شعر و شاعری سے بھی دلچسپی تھی "صاحب" تخلص کرتے تھے عالم جوانی میں رحلت کر گئے۔

شاہجہاں آباد کے خوش نویس

مسلمان جب ہندوستان میں آئے تو خطاطی اور خوش نویسی کو بھی ساتھ میں لائے
لیکن سلاطین دہلی کے زمانے تک زیادہ ایرانی خوشنویسی ہی کی تقلید رائج رہی اور خود
ہندوستانیوں نے ان میں کوئی جدت پیدا نہیں کی جب مغلوں کا دور شروع ہوا تو انھوں
نے دوسرے فنون لطیفہ کی طرح خوشخطی اور خطاطی کی بھی بڑی قدردانی اور سرپرستی
کی۔ ان میں اکثر بادشاہ خود بھی اعلیٰ درجہ کے خوش نویس تھے اور ان کے امرا تک
اس فن کی قدر و منزلت کرتے تھے۔

اکبر کے دور میں یہ فن زیادہ پھیلا۔ ملا عبدالرحیم عنبریں رقم، خواجہ عبدالصمد
شیریں رقم، محمد حسین کشمیری زریں رقم اور میر عبداللہ مشکیں رقم وغیرہ اور جہانگیر
کے دور کے محمد شریف شیریں رقم، قاضی احمد غفاری، مرزا احمد حسین اور احمد علی
ارشد تھے۔

تیموری بادشاہوں میں فن لطیفہ کا سب سے بڑا قدردان شاہجہاں بادشاہ تھا
وہ خود بھی نستعلیق کا ماہر تھا اس نے اپنے سب لڑکوں کو خوش خطی کی تعلیم دلائی تھی،
اس کی اس قدردانی سے اس عہد میں خوش خطی نے اور زیادہ ترقی کی اور بڑے بڑے
کاتب پیدا ہوئے۔ اس کے متعلق مولوی غلام محمد تحریر کرتے ہیں۔

در شاہزادہ خرم یعنی شاہجہاں بادشاہ در تحصیل علم عربی و فارسی و خط

نستعلیق نہایت مہارت داشتند ... در آں عصر از خوش نویساں

ملا باقر کشمیری، محمد حسین کشمیری و مقصود علی و میر محمد کاشی، ہا نیز

عبداللہ و شکر اللہ و محمد عظیم در خط نستعلیق و شکستہ نوس کتابت می نتاختند

و میرزایان دفتر بودند"

شاہجہانی خوش نویسوں میں آقا عبدالرشید دیلمی، عبدالباقی یاقوت رقم، مرزا جعفر الملقب بہ کفایت خاں، مرزا عبداللہ الملقب بہ دیانت خاں میر مراد کشمیری، میر محمد مومن اور چندر بھان برہمن بھی تھے۔

میر محمد صالح کشفی

کشفی دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد ماجد میر عبداللہ وصفی تھے۔ سلسلہ نسب شاہ نعمت اللہ ولی سے ملتا ہے۔ سادات ترمذ سے تھے۔ شیخ فضل اللہ بہاری پوری سے بیعت تھے۔ ریاضت و مجاہدہ میں بھی اپنا وقت لگاتے تھے۔ اکبر و جہانگیر کے دربار میں رسائی تھی۔ بہت نامور اور ہفت قلم خوش نویس تھے۔ اکبر نے ان کو مشکیں رقم کا خطاب دیا تھا۔ شرف الدین علی پیام اکبر آبادی نے ان کو سواد خط کی بڑی تعریف کی ہے اور ملا عبدالقادر بدایونی نے ان کو اکبر کے درباری شعراء کے زمرہ میں شمار کیا ہے اور ان کی خوش نویسی کے بھی معترف ہیں۔ چنانچہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"بسیار خوش خط است شاگرد شاہ غیاث مولانا ارقمی

است و بہ ہفت قلم می نویسد"[4]

وصفی کا انتقال ۱۰۲۳ھ میں ہوا۔

میر محمد صالح اپنے زمانے کے مسلمہ خوش نویس ہونے کے ساتھ فارسی اور ہندی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کا فارسی میں تخلص کشفی تھا اور ہندی میں سبحانی تھا۔

ان کی ابتدائی زندگی فقر و فلاکت میں گزری۔ جب شاہجہاں کی ان پر نظر التفات پڑی تو ان کی کایا پلٹ ہوئی۔

چندر بھان برہمن پنڈت چندر بھان کا اصل وطن آگرہ تھا مگر یہ دہلی میں آ بسے تھے۔ فارسی کی استعداد عالمانہ تھی۔ شاہی دربار تک رسائی ہوئی۔ شاہجہاں کے دفتر میں میر منشی ہو گئے۔ اعلیٰ درجے کے خوش نویس تھے نستعلیق میں آغا عبدالرشید دیلمی اور شکست میں کفایت خاں کے شاگرد تھے۔ داراشکوہ کو ان کی انشا بہت پسند تھی، اس نے انھیں اپنا میر منشی مقرر کیا تھا۔ ان کو شہزادہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ وہ شہزادہ بھی ان کو عزیز رکھتا تھا۔ اور ہر وقت ان کے اعزاز و ترقی کا خواہاں رہتا تھا۔ ایک دن داراشکوہ نے بارگاہ شاہی میں جب کہ کاملان فن جمع تھے عرض کیا کہ منشی چندر بھان سے عجیب شعر موزوں ہوا ہے اگر حکم ہو تو اگر ظلِ سبحانی کی خدمت میں عرض کرے۔ بادشاہ نے طلب کیا اور فرمایا کہ آج تمہارا شعر بابا نے پسند کیا ہے۔ سناؤ انھوں نے یہ شعر پڑھا۔

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار
بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

شاہجہاں کے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خاں بھی برہمن کے قدردان تھے، داراشکوہ کے قتل کے بعد دنیا کو ترک کر کے بنارس چلے گئے اور وہاں یادِ خدا میں مشغول ہو گئے۔ ۱۰۷۳ھ میں فوت ہوئے۔

عاشقانہ اور متصوفانہ دونوں رنگوں میں اچھا شعر کہتے تھے۔ ایک دیوان فارسی "منشآت برہمن" ان کی یادگار ہے۔ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کی زبان مخلوط بہ ہندی ہے مگر مضامین میں نفاست ہے ؎

برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیاں میں — نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

اورنگ زیب عالمگیر بذاتِ خود بہت عمدہ خطاط اور خوش نویس تھے۔ نسخ، نستعلیق و شکستہ کے ماہر تھے۔ خطِ نسخ میں دو کلام مجید لکھے تھے جس کی سات ہزار روپے میں جلد بنوائی گئی تھی اور یہ دونوں نسخے مسجد نبوی میں بطور نذر رکھوائے گئے تھے۔

عالمگیر کی بیشتر اولاد خوش نویسی میں ید طولیٰ رکھتی تھی۔ محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ اوّل خوش نویسی میں یکتائے زمانہ تھے اور مختلف قسم کے خطوط لکھنے میں استادیت کا درجہ رکھتے تھے۔ شہزادہ کام بخش بھی مختلف اقسام کے خط لکھنے میں مہارت رکھتے تھے۔ شہزادی زیب النسا نے خطوط نسخ نستعلیق و شکستہ پر پوری قدرت حاصل کی تھی۔

عالمگیر کے زمانے کے خوش نویسوں میں سرآمد خوش نویساں حاجی محمد اسماعیل نے بعض فرامین "خطِ گوہر" میں لکھے تھے۔ ان کا "روشن قلم" خطاب تھا۔ مرزا محمد خلف حاجی قاسم نسخ نویس قرآن مجید کی کتابت کرتے تھے۔ عالمگیر کے دربار میں ایک مرتبہ حاضر ہوئے تو ان کو ایک ہزار روپے بطور انعام مرحمت ہوئے۔

ہدایت اللہ خاں دہلوی

یہ سید علی خاں کے شاگرد تھے اور خوش نویسی میں استادِ وقت تھے۔ اس فن میں اپنے استاد پر بھی سبقت لے گئے تھے۔ اورنگ زیب نے ان کو شاہزادوں کی اتالیقی پر مامور کیا تھا۔ مرزا کام بخش اور محمد اعظم شاہ کے لڑکے ان کے شاگرد اور بہت اچھے خوش نویس تھے۔ آخر میں یہ کتب خانہ کی نظامت پر مقرر ہوئے اور "زریں رقم" کا خطاب ملا۔ انھوں نے عالمگیر اورنگزیب کے لئے دیوان حافظ کے نسخے لکھے تھے۔

حافظ محمد علی

حافظ صاحب قدیم شاہی خوش نویس تھے۔ خطِ نسخ کے ماہر تھے اور نستعلیق آقا عبدالرشید دیلمی کے طرز میں بہت اچھا لکھتے تھے۔ شاہ عالم کے لڑکے مرزا جواں بخت بہادر کے استاد تھے۔ ان کے بیٹے لقاء اللہ بھی خوش نویسی میں باپ کے خلف الصدق تھے۔

میر محمد باقر دہلوی محمد باقر اورنگ زیب کے درباری خوش نویس تھے۔ عالمگیر کو محمد باقر کا خط بہت پسند تھا۔ شہزادہ والا جاہ، محمد اعظم وغیرہ کی تعلیم خطاطی ان کے سپرد رہی۔

سید محمد میر سوز آپ پرانی دہلی کے قراول پورہ میں رہتے تھے، ان کے بزرگ بخارا کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام سید ضیاء الدین تھا۔ ان کا پہلا تخلص میر تھا۔ میر کے تخلص کی شہرت ہونے کی وجہ سے سوز تخلص اختیار کیا۔ شاہ عالم کے زمانے میں جب دہلی کی تباہی حد سے گزر گئی تو ۱۱۹۱ھ میں فقیری اختیار کر لی۔ لکھنؤ چلے گئے وہاں سے ۱۲۱۲ھ میں ناکام مرشد آباد گئے۔ یہاں بھی قسمت نے یاوری نہیں کی پھر لکھنؤ آئے۔ اب قسمت چمکی اور نواب آصف الدولہ ان کے شاگرد ہوئے۔ میر سوز خط شفیعا اور نستعلیق خوب لکھتے تھے۔

شیخ بقاء اللہ بقا دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں سکونت اختیار کی۔ حافظ لطف اللہ خوش نویس کے صاحبزادے مرزا رفیع سودا، میر تقی میر اور درد وغیرہ کے ہم عصر تھے۔ اردو میں شاہ حاتم اور فارسی میں فاخر مکیں کے شاگرد تھے۔ خط نستعلیق اور نسخ میں مہارت رکھتے تھے۔ پہلے ان کا تخلص غمگین تھا۔ بعد میں بقا تبدیل کر لیا۔ غزلوں کے علاوہ قصائد بھی کہے۔ آخر عمر میں لکھنؤ چلے گئے تھے۔ ۱۲۰۶ھ میں حجاز مقدس میں فوت ہوئے۔

عشق میں جو ہے کبریائی کی
عاشقی جس نے کی خدائی کی

میر محمد حسین منشی میر محمد حسین منشی صحیح النسب سید تھے۔ سادات رضویہ سے ان کا تعلق تھا۔ ان کے والد میر ابو الحسن شرف

میر کلن بھی خوش نویس تھے۔ ان کے بزرگ ایران کے رہنے والے تھے۔ دو تین پشت سے دہلی میں ان کے خاندان نے بود و باش اختیار کی تھی۔ اکثر فارسی کی نظم و نثر کی کتابیں ان کی نظر سے گزریں، عربی بھی جانتے تھے۔ قسمت نے یاوری کی تو مرزا سلیمان شکوہ بہادر کے ہاں خدمت انشا پر مامور ہوئے اور اپنی آبائی خدمت شہزادوں کی استادی پر مامور تھے۔

میر ابوالحسن

میر صاحب کلن کے نام سے مشہور تھے۔ خط نسخ و نستعلیق میں محمد حفیظ خاں کے شاگرد اور آقا عبدالرشید کے طرز میں بہت عمدہ لکھتے تھے۔ ایک زمانے تک نواب عبداللہ خاں کی رفاقت میں رہے، پھر اکبر شاہ ثانی کی سرکار سے متوسل ہو گئے۔

مولوی بخش اللہ نامی

مولوی بخش اللہ صاحب کے والد ماجد مولوی امراللہ تھے۔ جامع کمالات خوش نویس تھے۔ آپ نے مصحفستان شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی گلستاں کے جواب میں لکھی تھی۔ بوستاں کے مقابلہ پر بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ جب ریاض الفصحا مولفہ مصحفی ترتیب پا رہا تھا اس وقت ان کی عمر ستر برس سے زیادہ تھی۔ قمر الدین منت کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ مصحفی ان کے کافی مداح ہیں۔

محمد حفیظ خاں

محمد شاہ کے عہد کے نامور اُستاد تھے۔ دربار شاہی سے "یساولان دارو غگی" کے منصب پر فائز تھے۔ خط نسخ، ثلث، نستعلیق اور شکستہ میں مہارت رکھتے تھے۔ کئی کلام مجید لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے۔ بعض بڑے اور مشہور خوش نویس ان کے شاگرد تھے۔ نستعلیق میں میر ابوالحسن عرف "میر کلن" دُر بخش، محمد اسمٰعیل، محمد تقی اور خط شکستہ میں منشی مجیسن سنگھ، بھی نرائن پنڈت، لالہ سکھ رام، منشی محبوب رائے اور منشی مسل سنگھ،

اور مولوی غلام محمد دہلوی ہفت قلم بھی انہی کے شاگرد تھے۔

شیخ محمد مسعود مخفی

شیخ محمد مسعود ابن حافظ محمد معصوم دہلوی اصل پنجاب کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد ماجد حافظ محمد معصوم عہد محمد شاہ میں شاہجہاں آباد دہلی آگئے تھے۔ شیخ مسعود خط نستعلیق و شکستہ کے ماہر تھے۔ شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے مخفی تخلص تھا۔

رائے پریم ناتھ آرام

کھتری برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ دہلی کے قدیم روسا میں تھے۔ ان کے بزرگ شاہ عالم ثانی کی سرکار میں ملازم تھے خود آرام بھی صاحب اقتدار تھے اور نواب مرید خاں کے شاگرد تھے اور اپنے زمانہ کے مشہور خوش نویس تھے خصوصاً خط شکست بہت عمدہ لکھتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ دو ہزار اشعار کا دیوانہ یادگار زمانہ ہے۔

قاضی عصمت اللہ خاں

شاہ عالم ثانی کے دور کے خوش نویس تھے اور خط نسخ میں تمام خوش نویسوں پر سبقت لے گئے تھے، اور اس میں بڑی خوبصورت ایجادیں کی تھیں۔ ان کے بھائی فیض اللہ خاں بھی نامور خوش نویس تھے۔ انھوں نے کلام مجید کے کئی نسخے یادگار چھوڑے ہیں۔ فیض اللہ خاں کے صاحبزادے عباد اللہ خاں بھی اچھے خطاط تھے، باپ کے صحیح جانشین تھے اپنے والد کے لکھے ہوئے کلام مجید کے ناتمام نسخوں کو مکمل کیا اور ان کے خط سے اپنا خط ایسا ملا دیا تھا کہ بڑے بڑے مبصروں میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔

حافظ نور اللہ

ان کا اصل وطن دہلی تھا۔ نواب آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ آئے اور دربار آصفی سے منسلک ہو گئے۔ اپنے دور کے بڑے باکمال خطاط تھے۔ آقا عبدالرشید کے طرز پر ان سے بہتر کوئی

لکھنے والا نہیں تھا۔ نواب آصف الدولہ کی فرمائش پر ان کے لئے ہفت بند کاشی لکھی۔ مولوی غلام محمدؒ ہفت قلم کا بیان ہے کہ اس میں ایسی سحر کاری تھی کہ اس کے دیکھنے سے دل سیر نہ ہوتا تھا۔ ان کے بھائی حافظ خورشید بھی نستعلیق کے بہت اچھے خطاط تھے۔

شاہ وارث الدین وارث

آپ حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج قدس سرہٗ کی اولاد میں سے تھے۔ کھاری باؤلی دہلی میں رہتے تھے۔ عالمگیر ثانی کے استاد تھے۔ خوش نویسی میں زریں رقم کا خطاب پایا تھا۔ نسخ، نستعلیق، ریحان، شفیعا، تعلیق، شکستہ اور گلزار ساتوں خطوں میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ اپنے گھر پہ ہر ماہ کی چار تاریخ کو ایک مجلس منعقد کرتے تھے، درویش صفت انسان تھے۔

مولوی غلام محمد راقمؔ دہلوی

راقمؔ صاحب دہلی کے باشندے تھے حکیم قدرت اللہ خاں قاسم دہلوی سے عربی فارسی کی انشاء پردازی کے سبق لئے تھے عربی فارسی زبانوں کے علاوہ شفیعا، شکستہ ریحان وغیرہ ساتوں خطوں میں کمال حاصل تھا۔ ہفت قلم کہلاتے تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے خوشنویسوں کے زمرہ میں شامل تھے۔ شاعر بھی تھے راقمؔ تخلص تھا۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں دادِ سخنوری دیتے تھے۔ فنِ خوش نویسی کے سلسلہ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے خوش نویسوں کا ایک تذکرہ لکھ کر ان کی تاریخ محفوظ کر دی۔ انھوں نے اپنی اس تالیف میں زیادہ تر انہی خوش نویسوں کے حالات لکھے ہیں جن کی قلم کاری کے نمونے انھوں نے خود دیکھے تھے۔ اپنے زمانے کے اکثر خوش نویسوں سے ملے تھے اور ان سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے۔ یہ تذکرہ مرحوم ایشیاٹک سوسائٹی کی جانب سے چھپ چکا ہے۔ آخر عمر میں لکھنؤ چلے گئے تھے اور وہیں سنہ ۱۲۳۶ھ

میں فوت ہوئے۔

منشی لچھمن سنگھ غیور لچھمن سنگھ دہلوی اگروال برادری سے تعلق رکھتے تھے شرح چمنی و تحریر اقلیدس اور مفتاح الحساب شیخ خیر اللہ ریاضی داں سے تحصیل کیں۔ فارسی عربی زبانوں میں مہارت رکھتے تھے فارسی کے اعلیٰ درجے کے انشا پرداز تھے۔ اپنی انشاء پر ان کو اتنا ناز تھا کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ طاہر وحید طاہر کمنی اور میر جلولا کے طرز میں لکھتے تھے۔ شاعری میں میر شمس الدین فقیر سے تلمذ تھا۔ ان کی تصانیف میں شعلۂ آہ اور بعض دوسری کتابیں یادگار ہیں۔ خوش نویسی میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔ خط شکستہ میں محمد حفیظ مرزا آقا کے شاگرد تھے۔ مولوی غلام محمد دہلوی کے ہم عصر تھے۔ ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ احمد علی سندیلوی نے ان کا ایک عجیب واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ وہ کچھ کتابیں بیچنے کے لیے لکھنؤ چلے گئے کسی قدرداں کی سفارش سے انگریزوں نے تین سو روپے ماہانہ کا وظیفہ مقرر کیا۔ مگر انھوں نے یہ کہہ کر اس کے لینے سے انکار کر دیا کہ میں کئی پشتوں سے مسلمانوں کا نمک خوار ہوں اس لئے میں دشمنانِ دین کی ملازمت اختیار نہیں کر سکتا خواہ فاقہ سے جان چلی جائے۔ دہلی میں انھوں نے ۸۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ فارسی میں شعر کہتے غیوری تخلص تھا ؎

رفیق سوارہ آمد آں دل برست
زاں زلف دل آویز بخیرم بست
ایں تادرہ در جہاں ندید ست کسے
خورشید بر آسماں ہلالے در دست

حافظ بقاء اللہ ان کے والد ماجد حافظ ابراہیم خوش نویس تھے۔ دہلی

کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد خلیق، متواضع، متقی بزرگ تھے۔ خط نسخ و نستعلیق کے مسلّمہ استاد تھے۔ ابوالنصیر معین الدین اکبر شاہ ثانی کے عہد میں مرشدزادگان کے خوش نویسی میں اُستاد تھے۔

بقاءاللہ بھی مسلّم الثبوت اُستاد تھے۔ ان کے خط میں وہی شان پائی جاتی ہے جو ان کے والد کے خط میں تھی۔ قلعہ معلّٰی میں سکونت رکھتے تھے۔ شاہزادوں کو بھی خوش نویسی کی تعلیم دیتے تھے۔ سنہ ۱۲۲۳ھ مطابق سنہ ۱۸۰۸ء میں فوت ہوئے۔

رام نندرام پنڈت

راجہ نندرام صاحبِ علم و استعداد شخص تھے۔ اور خطِ شکست نے ماہر تھے۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ دہلی کی شاہ گردی کے زمانہ میں لکھنؤ چلے گئے تھے۔ وہیں بود و باش اختیار کی اور نواب حسن رضا خاں کی سرکار میں منشی گیری کی خدمت میں مامور ہو گئے۔

بالا پرشاد خرد

خرد صاحب قوم کھتری سے تعلق رکھتے تھے۔ فارسی میں کافی استعداد تھی۔ خوش مزاج نیک اخلاق تھے۔ خط نستعلیق کے ماہر تھے۔ صاحب گلستانِ سخن ان کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"خطِ نستعلیق کو اس درستی سے لکھتا ہے کہ درست نویسانِ روزگار اس کے روبرو اگر اپنی تحریر پر خطِ شکستہ کا گمان کریں تو عجب نہیں ہر چند طبیعت نہایت موزوں ہے لیکن جب وارستہ مزاج سے کچھ فرصت بہم پہنچتی ہے تو فکرِ شعر کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔"

مرزا سہراب بیگ

مرزا سہراب بیگ دہلی کے پُرانے رہنے والے تھے۔ مغل خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ علم رمل میں دستگاہ رکھتے تھے اور خط نسخ کے ماہر تھے۔ شعر و شاعری کا شوق تھا۔ سہراب تخلص تھا۔

شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد تھے۔ مرزا قادر بخش صابر ان کے متعلق تحریر کرتے ہیں:۔

"مرد معمر صاحب اخلاق حمیدہ اوصاف پسندیدہ علم رمل میں
دستگاہ تمام اور استخراج احکام میں قدرت مالاکلام خط نسخ سے
یاقوت کی آبرو کو خاک پر گرا دیا ہے اور جو کہ گوہر رقم اس کے خطاب
مستطاب کا جز ہے اس نسبت سے گوہر کا وقار بڑھا دیا ہے فن
سخن میں فکر رسا اور تلاش بلند رکھتا ہے۔"

مرزا صفدر علی بیگ بلند

آپ کے والد ماجد مرزا فضل علی بیگ کھاری باؤلی میں سکونت رکھتے تھے۔ ان کے والد راجہ الور کی سرکار میں کسی مدرسہ کے مدرس تھے۔ نہایت درست نواز تھے طبیعت میں بلا کی شوخی تھی۔ علم حساب میں مہارت نامہ اور انشا نگاری میں بڑا کمال رکھتے تھے۔ خط نستعلیق اور شکستہ بہت اچھا لکھتے تھے۔ مرزا قادر بخش مولف گلستان سخن کے شاگرد تھے۔

منشی دیپ چند مرشم

منشی مرشم کھتری قوم سے تعلق رکھتے تھے دہلی میں مقیم تھے۔ فارسی میں کامل استعداد رکھتے تھے۔ طرز نثر نگاری انتہائی دلچسپ تھی۔ حضرت امیر خسرو کی طرز پر لکھتے تھے۔ صاحب طبقات سخن نے ان کے بارے میں لکھا ہے:۔

"معمر و سنجیدہ تھا۔ خط نستعلیق و شکستہ کو بہت درست لکھتا تھا خوبی
اس کی دائرہ بیان سے خارج ہے۔"

میر سید محمد غافل

میر صاحب کا سادات عظام سے تعلق تھا۔ دہلی کالج میں حکام وقت کی طرف سے خوش نویسوں کی سلک میں منسلک تھے اور طلباء کو خط نستعلیق سکھلانے پر ملازم تھے۔ اردو نا گری کی بھی تعلیم دیتے تھے۔

لغات ناگری میں ایک کتاب مفتاح اللغات تالیف کی تھی۔ علم حساب میں لیلاوتی کا ترجمہ اُردو زبان میں کیا ہے۔ تاریخ گوئی کی طرف زیادہ توجہ تھی کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ فاضل تخلص تھا۔

میر جمیل الدین ہجر

ان کے والد ماجد میر ابرار علی دہلی کے سادات کرام اور شرفائے شہر تھے۔ نیک سیرت، خوش صورت، علوم ضروری سے بہرہ ور نوجوان تھے نستعلیق نگاری میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ دہلی میں نواب بہادر جنگ رائے بہادر گڑھ کی سرکار میں وکالت کے عہدہ پر ممتاز تھے۔ دہلی کے انقلابی جریدہ صادق الاخبار کے ایڈیٹر تھے۔ جنگ آزادی کی خبروں کے لئے وقف تھا۔ انگریزوں کا جب دہلی پر قبضہ ہوگیا تو ان کو گرفتار کیا گیا۔ بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلا۔ اور تین سال کی سزا ہوئی۔ شعر و شاعری سے بھی ان کو شوق تھا۔ نفیس و شستہ شعر کہتے تھے۔ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے۔

سید محمد امیر رضوی پنجہ کش

میر پنجہ کش سید میر کے صاحبزادے صحیح النسب سید تھے۔ بہادری اور جامع مسجد دہلی میں سکونت رکھتے تھے۔ ان کے مکان پر خوش خط "عاقبت بخیر" لکھا ہوا تھا۔ ان کو جو کمال خوش نویسی میں حاصل تھا وہ پنجہ کشی میں بھی حاصل تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پنجہ کشی میں زیادہ ماہر تھے۔ اسی کی مناسبت سے ان کی عرفیت کی زیادہ شہرت ہوئی۔ میر صاحب لوہے کے پنجے سے زور کیا کرتے تھے اور آخر میں لوہے کا پنجہ مڑ جاتا تھا۔ ہندوستان میں بادشاہت کا خاتمہ سراج الدین ابو ظفر پر ہوا اور خوش نویسی کا آخری تاجدار میر پنجہ کش کو مانا جاتا تھا۔ شمالی ہند میں جو شہرت و مقبولیت ان کی خوش نویسی کو حاصل ہوئی وہ اور کسی کو نہیں ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر ان کی بہت عزت و توقیر کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء کو میر صاحب کے لڑکے قطب عالم

کی شادی کے موقع پر بادشاہ سلامت نے ایک پورا جوڑا اور سہرا میر پنجہ کش کو مرحمت فرمایا۔ خوش نویسی میں ان کے استاد مولانا غلام محمد ہفت قلم دہلوی تھے۔ انھوں نے محمد حفیظ خاں سے خوش نویسی سیکھی تھی۔ میر کلن۔ قادر بخش، محمد اسمٰعیل، گجی سنگھ، گھی نرائن پنڈت، سرب سکھ رائے۔ محبوب رائے اور کشن سنگھ وغیرہ ان کے معاصر تھے۔

میر صاحب خوش نویسی و پنجہ کشی کے علاوہ، بانک بنوٹ، مصوری، نقاشی جدول کشی، علاقہ بندی اور سنگ تراشی میں بھی ماہر تھے۔ میر صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کے پاس کوئی سائل یا ضرورت مند آتا تو بجائے نقد یا کوئی چیز دینے کے حروف لکھ کر دے دیتے تھے جو بازار میں فوراً بک جاتا تھا نیز جب کوئی شاگرد ہوتا تو اس سے کوئی وصلی لکھوا کر اپنے پاس رکھ لیتے تھے اور جب اس کو اپنے خط کے برابر لے آتے تو اس کو ابتدائی تحریر دکھاتے تھے کہ تم نے اس عرصہ میں کتنی ترقی کی ہے۔ خطِ ثلث میں جرمنی میں سب سے پہلے ان کی حمائل چھپی جو اس قدر مقبول ہوئی کہ تمام ممالکِ اسلامیہ میں ہدیہ ہوئی۔ میر صاحب جس سے خوش ہوتے تھے اس کو ایک قطعہ خطِ ثلث میں لکھ کر دیتے تھے۔ آپ جامع مسجد شاہی کے نائب امام بھی تھے۔ امام سید محمد صاحب سے اُن کے گہرے تعلقات ہونے کی وجہ سے لوگ ان کو امام صاحب کا بھائی سمجھتے تھے۔

میر صاحب نے اپنے کمال کا اظہار کاغذ کے صفحات کے علاوہ اپنے مکان کی کڑیوں پر "یا فتاح" اور "بسم اللہ" لکھ بھی دیا تھا۔ ان کے قطعے پسند کئے جاتے تھے اور ان ممالک کی لائبریریوں کی زینت بنتے تھے۔ چنانچہ مسٹر ایس بیرون میکسوئل صاحب نے ایران کے کتب خانہ کے متعلق (جہاں میر پنجہ کش دہلوی کے قطعے رکھے ہوئے ہیں) لکھا ہے۔

اس میں نہایت بیش قیمت کتابیں ہیں۔ ان کتابوں میں اور قطعوں میں سے زیادہ مشہور وہ ہیں جو میر پنجہ کش کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ میر صاحب کی ہر سطر کی قیمت دو تومان لگائی جاتی ہے۔ اس شرح سے اگر دیکھا جائے تو شاہ کے قبضہ میں جو تحریریں میر صاحب کی ہیں اُن کی قیمت کروڑوں پونڈ ہو جائے گی۔

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں جہاں دہلی کے صحافیوں، عالموں نے حصہ لیا، اسی طرح میر پنجہ کش نے بھی حصہ لیا اور فرنگیوں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ اس وقت ان کی عمر ۶۴ سال کی تھی۔ ان کا مزار پہاڑی املی پر ان کے مکان میں تھا جو آج کل اسکول بنا ہوا ہے۔

میر نثار علی علوی نثار آپ کے خاندان میں علم و ادب کا سلسلہ موروثی چلا آتا ہے۔ کوئی فارسی و عربی کا کامل ہوا ہے تو کوئی خوش نویسی میں یگانہ ہوا ہے۔ میر صاحب نے فارسی مولانا امام بخش صہبائی سے تحصیل کی اور خطِ نستعلیق میر محمد پنجہ کش سے سیکھا۔ اس کے بعد بہادر شاہ ظفر نے ان کو وقائع نگاری پر مامور کیا۔ بہادر شاہ ظفر کے شاہی جریدے سراج الاخبار کی ترتیب دینے کا کام بھی ان کو سونپا گیا تھا۔ صاحب گلستانِ سخن ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اس کمال خوش نویسی کے دست آویز اور یگانگی کا عروۃ الوثقیٰ بنا یا انشا پردازی اور شعر طرازی میں قدرت تمام حاصل ہے۔"

مرزا آغا جان مرزا صاحب کی عرفیت آغا صاحب تھی۔ دہلی کے باشندے تھے۔ اصل میں عیسائی تھے۔ فہم و فراست میں بہت تیز تھے۔ مگر اپنے استاد سید محمد امیر کی ہدایت پر مسلمان ہوئے تھے۔ کمپنی میں بھی ان کو

وہ کمال حاصل تھا کہ بڑے بڑے استاد ان کے سامنے ہیچ نظر آتے تھے۔ خوش نویسی میں ایسی مہارت تھی کہ میر پنجہ کش کے شاگردوں میں ان سے بہتر کوئی نہیں تھا۔ چنانچہ سرسید مرحوم ان کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"یہ صاحب کمال شاگرد رشید سید امیر صاحب موصوف کے اور اس فن میں ایسا کمال بہم پہنچایا کہ اُستاد کو اُن کے کمال فن پر ناز ہے اور اس فن کی تکمیل کے سبب اساتذہ سلف سے ممتاز ہیں۔"

منشی رحیم الدین یہ بھی دہلی کے باشندے تھے اور یہ آغا جان کے شاگرد تھے یہ خط نسخ اچھا لکھتے تھے مگر نستعلیق میں بھی ان کو بڑا کمال حاصل تھا۔ آقا عبدالرشید کے طرز پر لکھتے تھے اور ان کی نقل بالکل اُن کے مشابہ کرتے تھے، وہی آب و تاب، وہی حسن آفرینی تھی اور کمال یہ تھا کہ آقا کی وصلی کی نقل ہی نہیں کرتے تھے بلکہ نئی وصلیاں اپنی پسند کی تحریر کر کے آقا سے منسوب کر دیتے تھے۔ قدردان نئی اور نادر آغا رشید کی قلمی وصلی سمجھ کر بڑے شوق و اصرار کے ساتھ خرید لیتے تھے۔ نئے نئے انداز سے وصلی پر آقا کا نام اور سنِ تحریر بھی لکھتے تھے جو بلاشبہ کے فروخت ہو جاتی تھی۔

بدرالدین مہرکن بدرالدین مہرکن نہایت ذہین و فہیم اور باعلم و ہنر تھے "مرصع رقم" ان کا خطاب تھا۔ چھ قسم کے خط بہترین لکھتے تھے۔ مہرکنی میں ایسے ماہر تھے کہ ان کے ہم عصروں میں کوئی شخص اُن کا نظیر نہیں تھا۔ بہادر شاہ ظفر جہاں ان کے قدردان تھے وہاں گورنر جنرل بھی ان کے فن کا مداح تھا۔ چنانچہ ۱۹ دسمبر ۱۸۴۳ء کو بدرالدین صاحب نے زمرد کا ایک نگینہ جس پر نواب گورنر جنرل کا نام کھدا ہوا تھا۔ گورنر کو نذر کے طور پر پیش کیا جس کے صلے میں گورنر کی طرف سے ان کو خلعت پارچہ عطا کیا گیا۔ ان کے متعلق صاحب آثار الصنادید لکھتے ہیں:۔

"خطِ نستعلیق لکھنے میں شاگرد ہیں سید امیر صاحب کے اور مہر کنی کے فن میں تمام ہندوستان میں اس سر گروہ اہلِ کمال کا نظیر نہیں، مہر حکامِ وقت کی، نواب گورنر جنرل بہادر کی اسی یگانۂ روزگار کے ہاتھ کی کھدائی کرتی ہے جو دائرہ ان کے قلم سے نکلتا ہے ہزار حرف ان کی یگانگی پر اپنی دہن سے ادا کرتا ہے۔"

مرزا عبداللہ بیگ

مرزا صاحب بھی میر پنجہ کش کے شاگرد تھے۔ نستعلیق کے ماہر تھے۔ آنا جان کے بعد ان کے مرتبہ پر کوئی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ بقول سرسید مرحوم:۔

"اہلیت و سعادت مندی جو ان کے مزاج میں تھی، قلم و زبان کی طاقت نہیں کہ اس کا بیان کر سکے۔"

محمد یعقوب

محمد یعقوب دہلی کے باشندے تھے۔ ان کو بھی میر پنجہ کش کا تلمذ حاصل تھا ان کا خطِ نستعلیق استادِ خط سے بالکل ملتا جلتا تھا۔ ان کی ایک قلمی وصلی نہایت نفیس منشی رام چند رجواہر رقم جے پوری کے پاس محفوظ ہے۔

امام الدین احمد خاں

آپ کے والد مرحوم نواب دبیر الدولہ خواجہ زین العابدین خاں مصلح جنگ تھے نستعلیق خط میں ان کو کمال حاصل تھا اخوند عبدالرسول قندھاری اور میر پنجہ کش کے شاگرد تھے۔ ان کا ہاتھ اس خط کے لئے اس قدر موزوں تھا کہ تھوڑی سی مدت اور مختصر سے وقفہ میں اپنے ہم عصروں پر فوقیت لے گئے تھے۔

اخوند عبدالرسول قندھاری

اخوند صاحب قندھار کے رہنے والے تھے، قندھار سے آنے کے بعد دہلی میں

سکونت اختیار کی۔ اس سر زمین سے ایسے وابستہ ہوئے گویا سات پشتوں سے یہیں کے رہنے والے تھے۔ اپنی وطن کی محبت کو یک قلم دل سے بھلا دیا تھا خط نستعلیق اور شفیعا میں بے نظیر تھے۔ دہلی میں ان کے کافی شاگرد تھے۔

محمد جان آپ میر کلن خوش نویس کے شاگرد تھے، بے بدل خوش نویس اور بے نظیر خوش قلم تھے۔ خط نستعلیق و شکستہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے جب تک زندہ رہے ان کے سامنے کسی ہم عصر کی نہیں چلی اور نہ کسی کو یارائے دم زدن تھا۔ آثار الصنادید کی تالیف سے بیس سال قبل فوت ہو گئے تھے۔

مولوی حیات علی۔ آپ کا خاندان دہلی کا قدیم سے رہنے والا تھا۔ خط شکستہ و نستعلیق میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ نستعلیق میں انھوں نے ایک نئی طرز نکالی تھی، خط شکستہ کی شان بھی ان کی نرالی تھی۔ سر سید نے ان کے بارے میں لکھا ہے:۔

"طرفہ یہ ہے کہ اس شان کی صدہا کتابیں مختصر اور مطول ان کے قلم اعجاز رقم سے نکلی ہوئی ہیں کہ ہر حرف ان کی کتابوں کا ایک قطعہ شمار ہوتا ہے"

پنڈت شنکر ناتھ۔ ان کا شمار دہلی کے بہترین خوش نویسوں میں ہوتا تھا خط شکستہ مولوی حیات علی اور خط نستعلیق و شفیعا میں مولوی غلام محمد دہلوی کے تلمیذ تھے۔ شاعری کا بھی ذوق تھا موجد تخلص کرتے تھے۔

بہادر شاہ ظفر آخری تیموریہ خاندان کا بادشاہ بہادر شاہ ظفر بھی اعلیٰ درجہ کے خوش نویس تھے ظہیر دہلوی کے جد امجد میر امام بادشاہ کے استاد تھے، خط نسخ انھوں نے ان سے سیکھا تھا۔ اس فن میں بہادر شاہ ظفر کے بھی کافی شاگرد تھے ظہیر دہلوی نے یہاں تک لکھا ہے کہ دہلی میں جتنے اس فن کے خوشنویس تھے وہ بہادر شاہ کے شاگرد تھے اور میرے والد شاہ جلال الدین بہادر شاہ کے شاگرد تھے۔

مرزا محمد دارابخت۔ بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد اول مرزا محمد دارابخت سب

ے بڑے لطے کے تھے جن کو تصوف سے گہرا تعلق تھا مولوی مہر الدین کے مرید ہی نہیں
ی کے خلیفہ بھی تھے۔ شاعری میں شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے۔ خطِ نسخ اور
ستعلیق میں مولانا عماد الدین سے تلمذ تھا۔ پچاس سال کی عمر میں ۱۱ جنوری ۱۸۶۳ء
وفات ہوئے۔ کلام میں استاد کا رنگ پایا جاتا ہے ؎

قصۂ فرہاد و مجنوں اور ہے
عشق کی میری کہانی اور ہے

شاہجہاں آباد کے قدیم اطبا

شاہجہاں نے دہلی میں جہاں ایک نیا شہر شاہجہاں آباد ۹ محرم ۱۰۴۹ھ میں بسایا، اور تاریخی کارنامہ انجام دیا وہاں شاہجہاں آباد عالموں، پنڈتوں، شاعروں، مصوروں، خوش نویسوں، ویدوں اور طبیبوں وغیرہ کا مرکز بنا جس میں ان لوگوں کی قدر و منزلت ہوتی تھی۔ اس مضمون میں شاہجہاں آباد کے قدیم اطباء کے حالات زندگی تحریر کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض اطبا وہ ہیں۔ جو شاہ جہاں کے عہد سے پہلے ہی دربار شاہی سے متعلق رہ چکے تھے۔

شاہجہاں کے عہد میں جن اطبار نے شہرت حاصل کی وہ یہ ہیں حکیم میر محمد ہاشم، حکیم شیخ محمد، حکیم علیم الدین حکیم صدرالدین، حکیم ابوالقاسم، حکیم رکن الدین، حکیم محمد شاہ شیرازی، حکیم فتح اللہ، حکیم رزق اللہ خاں، شیخ قاسم، حکیم خوشحال خاں ولد حکیم ہمام گیلانی وغیرہ۔

حکیم میر محمد ہاشم حکیم ہاشم خلف میر محمد قاسم گیلانی نے بارہ سال حرمین شریفین میں گزارے۔ وہاں منقولات شیخ محمد عربی محدث الشیخ عبدالرحیم حساتی، ملا علی نبیرہ ملا عصام الدین سے معقولات میر نصیر الدین حسین پسر زادہ میر غیاث الدین منصور۔ مرزا ابراہیم ہمدانی سے تحصیل کرنے کے بعد ہندوستان آئے۔ طب و ریاضی حکیم علی گیلانی سے پڑھی۔ اور درس و

تدریس میں مشغول ہو گئے۔ آپ کی ذہانت و قابلیت کا شہرہ جب شاہجہان نے سُنا تو اپنے دربار میں طلب کیا اور شاہی طبیب مقرر کیا۔ اور عالمگیر کی تعلیم کے لئے مامور ہوئے۔ تفسیر بیضاوی کا حاشیہ لکھا، جس کو شاہجہاں کے نام سے معنون کیا۔

شیخ محمد حکیم شیخ محمد نبیرہ حکیم شمس الدین گیلانی مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے وہاں سے ہندوستان آئے۔ شاہجہاں کے دربار میں رسائی ہوئی۔ قابلیت کے جوہر کھلے تو حکیم الملک کا خطاب ہوا۔ شاہی طبیبوں، دانش وروں اور خردمندوں میں شمار ہونے لگا۔ وظیفہ بھی مقرر ہوا اور آگرہ کے میر عدل کا اعزاز ملا۔ چنانچہ مصنف بادشاہ نامہ ان کے بارے میں لکھتا ہے:

> "بر طالع خود را بدرگاہ آسمان جاہ کہ ما من دانشوران و ممار خردمنداں است رسانید و چون پرہیزگاری و شائستہ کرداری او با دیگر فضائل بغرض مقدس رسید درخور استعدادش وظیفہ مقرر نمودہ میر عدل دار الخلافہ گردانیدند۔"

حکیم علیم الدین حکیم علیم الدین ملقب بہ وزیر خاں عربی اور فن طب کی کتابوں کی تحصیل کے بعد شاہجہاں کے درباریوں میں شامل ہوئے۔ دانائی، معاملہ فہمی اور ذہانت کی وجہ سے شاہجہاں کی اتنی قربت حاصل ہوئی کہ دیوانی بیوتات مرحمت ہوئی اور پنج ہزاری ذات، پنج ہزار سوار کے رتبۂ عالی پر پہنچے اور پنجاب کی صوبیداری سونپی گئی۔

حکیم صدر الدین حکیم صدر الدین المعروف حکیم صدرا، خلف حکیم فخر الدین محمد شیرازی کو شاہ طہماسپ والئے ایران حکیم مرزا محمد کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اکثر متداولات شیخ بہاؤ الدین، محمد جبل عاملی اور علم طب حکیم محمد باقر پسر حکیم عماد الدین سے ایران میں حاصل کیا۔ ہندوستان

میں آنے کے بعد شاہجہاں کے دربار میں باریاب ہوئے اور حکیم علی گیلانی جو جہانگیر کے عہد کے مشہور طبیب تھے۔ ان سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ طب کے علاوہ دوسرے علوم کے بھی ماہر تھے۔ چنانچہ ان کی قابلیت ولیاقت سے شاہجہاں بے حد متاثر ہوئے۔ تو ان کو مسیح الزماں کا خطاب ہوا۔

شاہجہاں نے اپنی تخت نشینی کے جلوس چہارم سنہ ۱۰۴۰ھ میں حکیم مسیح الزماں ملا خواجہ خان مخاطب خواجہ جہان کے ذریعے پانچ لاکھ روپے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے سادات عظام، شرفا کرام اور محتاجوں میں تقسیم و عطا کرنے کے لئے دیئے۔ چار سال کے بعد آٹھویں جلوس شاہجہانی سنہ ۱۰۴۴ھ میں حکیم مسیح الزماں نے حرمین کریمین سے بصرہ کے راستے سے مراجعت کی تو بندر لامری پہنچے حکیم صاحب نے جو چار گھوڑے عربی بصرہ سے شاہجہاں کو پیش کرنے کے لئے خریدے تھے اور پانچ گھوڑے عربی علی پاشا حاکم بصرہ نے شاہجہاں کو تحفہ کے طور پر دینے کے لئے حکیم مسیح الزماں کو دیئے۔ جب دربار میں حکیم صاحب و خواجہ صاحب پہنچے تو وہ نو گھوڑے شاہجہاں کو پیش کئے۔ بادشاہ کی طرف سے حکیم صاحب کو خلعت و منصب سہ ہزاری، پانصد سوار، ایک ہاتھی اور بیس ہزار روپے نقد دیئے اور حکومت بندر سورت عطا کی۔ طبیعت موزوں پائی تھی۔ شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ الٰہی تخلص رکھتے تھے۔ صاحب صبح گلشن ان کے بارے میں یہ تحریر کرتے ہیں :-

"حکیم صدرالدین ہندوستانی از اطبائے جہانگیری و شاہجہانی است معزز بخطاب مسیح الزماں و از اتقیاء عصر و صلحا دوراں بودہ برائے تحصیل شرف حج و عمرہ کرۂ آہنگ حجاز فرمودہ در انشاء نظم و کلامش دلپذیر"۔

برگ گل فتاد چشم تو در عالم خمار کیفیت از شراب فزوں شد گلاب را

حکیم ابوالقاسم گیلانی

حکیم ابوالقاسم گیلانی ابن حکیم شمس الدین ہندوستان میں پیدا ہوئے اور یہیں متداول علوم حاصل کئے اور حکمت میں بھی مہارت حاصل کی۔ شاہجہاں کا تقرب حاصل کر لیا تھا کہ پہلے منصب ہزار پانصدی و دو صد پنجاہ سوار ہوا خطاب حکیم الملک عطا ہوا اور اس کے ساتھ پانچ ہزار روپیہ انعام ملا۔ اس کے بعد دو ہزاری کا منصب عطا ہوا۔ جب یہ حج کو جانے لگے تو شاہجہاں نے ان کو آٹھ ہزار روپیہ حجاز مقدس کے مستحقین کو تقسیم کرنے کے لئے عطا کئے۔

حکیم رکن الدین

حکیم رکن الدین عرف حکیم رکنا ابن حکیم نظام الدین کاشان کے باشندے تھے۔ ان کے اجداد کا اصل وطن شیراز تھا۔ وہاں سے منتقل ہو کر کاشان میں مقیم ہو گئے۔ شاہ عباس سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ چند بار بادشاہ بھی ان کے گھر پر آیا۔ ایک مرتبہ اس کا ایک فاضل سے مناظرہ ہو گیا۔ شاہ عباس مخالف کے طرف دار رہے۔ ان کو اس بات کا بہت رنج ہوا۔ اس بنا پر کاشان سے ہندوستان چلے گئے۔ اس زمانے میں اکبر بادشاہ کی حکومت تھی۔ ان کی مصاحبت میں رہے اور کافی سرمایہ جمع کر لیا۔ جہانگیری دور میں بھی عزت حاصل کی۔ حیدرآباد پہنچے میر محمد مومن استر آبادی سے ملاقات کی تعلقات قائم ہو گئے تھے کسی بات پر شکر رنجی ہو گئی۔ بیجاپور پہنچے اور مہابت خاں کے ہاں ملازمت کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ شاہجہاں ۱۰۳۷ھ میں تخت پر جلوہ فگن ہوئے تھے۔ ان کو ابتدائے عمر سے ہی شعر و شاعری کا شوق تھا۔ تخلص مسیح تھا۔ اس بابرکت موقع پر انھوں نے شاہجہاں کی شان میں یہ قطعہ کہا ؎

بادشاہِ زمانہ شاہجہاں	خرم و شاد کامراں باشد
حکم او بر ممالکِ عالم	ہمچو حکم خدا رواں باشد

بہر سال جلوس اد گفتم   درجہاں بادتا جہاں باشد

حکیم رکن الدین نے ۱۰۶۱ھ میں اپنی ضعیفی کا عذر کر کے مشہد مقدس جانے کی شاہجہاں سے درخواست کی جس کو بادشاہ نے منظور کر لیا اور پانچ ہزار روپے دے کر رخصت کیا۔ ایک سو پانچ سال کی عمر میں یہ وطن پہنچے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ جناب مسیح کے بارے میں صاحب صبح گلشن تحریر فرماتے ہیں :-

"درحذاقت فن طب عیسی النفس، ودر انواع علوم فلسفہ ثانی معلم اول، در سخن سنجی وشیرا بیانی ثانی انوری وخاقانی نہ

نالہ از دست کارم تا نفس باشد مرا
نالہ ہم فریاد رس باشد مرا
عمر اگر امان دہد بہ نیت خزاں درین چمن
نیم شبی تقضا کنم نالہ عندلیب را

حکیم مومنائی شیرازی

حکیم مومنائی حکمت میں ید طولیٰ رکھتے تھے خلیق و مہذب انسان تھے ہندوستان میں آئے۔ اور مہابت خاں سے منسلک ہو گئے اور جہانگیر کے آخری زمانے میں دربار سے متعلق ہوئے۔ شاہجہاں کے عہد میں ان کو چھ سو روپے سالانہ ملنے لگے۔ اس کے بعد ہزار روپے سالانہ مقرر ہو گیا تھا۔

حکیم فتح اللہ

حکیم فتح اللہ ابن حکیم ابوالقاسم شیرازی حکمت و طب میں کمال رکھتے تھے۔ پہلے امام قلی خاں پسر اللہ وردی خاں حاکم توران کے شاہی حکماء میں شمار ہونے لگے۔ ان سے پہلے حکیم ابوالفتح ہندوستان آئے تھے اور جہانگیر کے عہد میں کافی مدت تک شاہی طبیب کی حیثیت سے خدمت کرتے رہے۔

شیخ قاسم شیخ قاسم عبدالرحیم برادر مقرب خاں تھا۔ جراحی کے فن میں مہارت رکھتا تھا۔ طب کے علم کے علاوہ دیگر فنون سے بھی واقف تھا اور ریاضی میں بھی مہارت حاصل تھی۔

حکیم محمد حاذق حکیم محمد حاذق پسر حکیم ہمام گیلانی شاہجہانی عہد میں ہزار پانصدی پانصد سوار تھا، اور شاہجہان کے قابل اعتماد مصاحبوں میں تھا۔

امام قلی خاں والئے توران نے جہانگیر کی زندگی میں یہ عریضہ بھیجا تھا کہ شاہ عباس قندھار پر قابض ہو چکا ہے۔ اگر بادشاہ زادہ شاہجہاں کو قندھار پر قبضہ کرنے کی مہم پر روانہ فرمائیں تو ہم دونوں بھائی جن کو آپ اپنا فرزند مانتے ہیں آپس میں مل کر قندھار کو تصرف میں لا کر ماوراء النہر اور بدخشاں پر بھی قابض ہو سکتے ہیں۔ آپ ان مفتوحہ شہروں میں جو بھی مجھ کو عنایت فرمائیں گے۔ اس پر قناعت کروں گا اور ہمیشہ آپ کی امداد و اعانت کرتا رہوں گا۔

جہانگیر اس عریضہ کو دیکھ کر لشکر بھیجنے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس کی موت ہو گئی باوجودیکہ اس کے بھائی نذر محمد خاں نے کابل پر حملہ کیا تھا۔ مگر امام قلی خاں نے یہ تحریر کیا اور خواجہ عبدالرحیم توران سے شاہجہاں کے پاس آیا۔ چونکہ خواجہ اس عرصہ میں فوت ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی۔ کابل پر حملہ کرنے کے معاملہ کو رفع دفع کرنے کے واسطے شاہجہاں نے اس کا جواب لکھا تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "آپ کا گرامی نامہ ملا۔ اس کے جواب میں دو وجہ سے تاخیر ہوئی۔ اول خواجہ عبدالرحیم کی موت، دوم نذر محمد خاں کا ناتجربہ کاری کی وجہ سے کابل پر تاخت و تاراج کرنا۔ امید ہے کہ ہمیشہ ہی برادرانہ تعلقہ ہمارے اور تمہارے درمیان جاری رہے گا۔

شاہجہاں نے یہ خط اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ کے جواہرات و آلات مرصع اور نقد حکیم حاذق پسر حکیم ہمام کے ہاتھ روانہ کئے اور خواجہ محمد صادق پسر خواجہ عبدالرحیم کو دس ہزار روپیہ صاحب قران کے روضہ کے مجاوروں کے لئے دے کر حکیم حاذق کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اس زمانہ کے شاہی حکیم علاج ومعالجہ کے ساتھ ملک کی دوسری خدمات انجام دینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

حکیم ضیاء الدین پانصدی صد سوار تھے۔ حکیم خوشحال پسر حکیم ہمام گیلانی کو ہزار و پانصدی ذات و دو صد سوار کے ساتھ خلعت اور ایک گھوڑا عنایت ہوا اور صوبہ دکن کا بخشی اور واقعہ نویس مقرر کیا۔ وہ بعض دوسرے معاملات کی بھی نگرانی کرتے تھے۔ حکیم ابوالفتح پانصدی صد سوار، حکیم عبدالوہاب ابن حکیم علی پانصدی و پنجاہ سوار تھے اور اسی عہد میں حکیم حیدر علی تھے جو خان زماں کے ہاں ملازم تھے، وہ نقیب دار کے عہدے پر مامور تھے۔ اطباء کے ساتھ جراح بھی۔ چنانچہ بندرابن جراح نے شاہجہاں کے آخری ایام میں پیشاب کھل کر آنے کا علاج کیا تھا۔

عالمگیر اطباء میں نعمت خان عالی، حکیم مہدی، حکیم محمد احسن، حکیم الملک حکیم معصوم، حکیم صالح، حکیم محمد رضا، حکیم محمد امین سالوجی، حکیم بجالی اور حکیم حاذق وغیرہ تھے۔

حکیم نعمت خان عالی

حکیم نعمت خان کا نام مرزا نورالدین محمد ہے۔ یہ شیراز کے ایک حکیم خاندان کے فرد تھے۔ عالی کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی یہاں سے وہ حکیم فتح الدین کے ہمراہ شیراز گئے۔ ان کی تعلیم وہیں ہوئی۔ ان کے استادوں میں ملا شفیعا دانشمند خان تھے عالی کی شہرت گیارھویں صدی ہجری کے آخر میں شروع ہوئی جب وہ شاہی

فوج کے ہمراہ بحیثیت ایک وقائع نگار کے دکن گئے۔ کچھ دنوں کے بعد عالی واپس دہلی آگئے۔ یہاں انھوں نے سنہ ۱۱۰۱ھ مطابق ۹۰-۱۶۸۹ء میں ایک گھر تعمیر کرایا اور اس کی یہ تاریخ کہی ؂

زملک دکن آمدم سوئے دہلی
چو از ظلمت آید کسی جانب ضو
بنا کردم ایں جا و تاریخ گفتم
الٰہی مبارک کنی خانۂ نو

دو سال کے بعد انھوں نے دہلی میں سنہ ۱۱۰۳ھ مطابق ۱۶۹۱ء میں ایک ایوان خانہ کی تعمیر سااس کے لیے بھی انھوں نے یہ تاریخی قطعہ کہا ہے ؂

الحمد لواہب العطایا	اتمام نمودم ایں بنا را
ہاتف پئے سال آں ندا داد	ایں خانہ ہمیشہ باد آباد

سنہ ۱۶۹۵ء میں عالی کو شاہی مطبخ کا ناظم مقرر کیا گیا اور نعمت خان خطاب عطا ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد ان کو شاہی جواہرات کا نگران بنایا گیا اور مقرب خاں کا خطاب عطا ہوا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب اعظم اور معظم میں جنگ ہوئی اور معظم کی فتح ہوئی تو انھوں نے تمام جواہرات معظم کی تحویل میں دے دیئے۔ معظم اس بات سے بہت خوش ہوا۔ اس نے ان کو سرکاری تاریخ نویس مقرر کیا۔ تین ہزاری منصب اور دانشمند خان کا خطاب عطا کیا۔ عالی کا انتقال سنہ ۱۷۰۸ء میں ہوا۔ جائے وفات کوئی دہلی لکھتا ہے کوئی لاہور اور کوئی حیدرآباد۔ عالی نے طبابت کی مناسبت سے پہلے حکیم تخلص اختیار کیا۔ بعد میں عالی بدلا۔ ایک قصیدہ میں عالی نے حکیم تخلص استعمال کیا ہے:

باز بیامد حکیم بر سر نعت رسولؐ ‏ ‏ طرز سخن تازہ کرد کلک زباں دان او

حکمت میں ان کا خاندان ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ ان کے والد کے علاوہ ان کا بیٹا حکیم حاذق خاں حکمت میں مشہور تھا۔ ہندوستان کے فارسی ادیبوں اور شاعروں میں نعمت خاں عالی سب سے بڑے طنز نگار اور ہجو نویس تھے۔ انھوں نے شاعروں اور ادیبوں کی ہجو نہیں کی بلکہ حکیموں اور طبیبوں کی خوب خبر لی ہے۔ ایک مضمون مناظرہ اطبار کے نام سے لکھا ہے جس میں طبیبوں کی طبابت اور اندھا دھند علاج کا خاکہ اڑایا ہے۔ دیوان میں کسی حکیم طاہر کی وفات پر ایک طنزیہ مرثیہ کہا ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

طرفہ کاری حکیم طاہر کرد
در طبابت وقوف ظاہر کرد

حکیم مہدی

پانچویں جلوس عالمگیری کے تیسرے دن عالمگیر کا مزاج کچھ ناساز ہوا جس کا علاج فصد سے کیا گیا۔ خون نکل جانے سے کمزوری پیدا ہوگئی اور بادشاہ پر غشی طاری ہوگئی۔ مرض نے طول کھینچا۔ دسویں ذیقعدہ تک بادشاہ کی یہی حالت رہی۔ حکیم مہدی اور حکیم محمد امین نے معقول طریقہ پر علاج کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کا مرض دفع ہوا اور بیسویں ذیقعدہ کو بادشاہ نے غسل صحت لیا۔ اسی روز عید الاضحیٰ تھی نماز عید الاضحیٰ پڑھنے کے لئے بادشاہ نے مسجد کا رخ کیا۔ رعایا نے دہری عید کی خوشیاں منائیں۔

حکیم حاذق

۱۱۱۶ھ میں دفعتہً عالمگیر بیمار پڑ گئے۔ تمام اعضاء میں جوڑوں کا درد شدت کے ساتھ اٹھا۔ ایک دو بار بادشاہ پر غشی طاری ہوگئی۔ حکیم حاذق نے نہایت تندہی و مستعدی کے ساتھ علاج کیا اور جالینوس ودیسی سینا کو شرمایا۔ حکیم صاحب کی تجویز و مشورہ پر بادشاہ نے دارچینی کھانا شروع کر دی۔ تین چار ہفتہ تک دوا پی۔ جب دوا کا سلسلہ ختم ہوگیا تو حکیم حاذق کو بادشاہ

نے اشرفیوں میں تلوا کر حکیم الملک کا خطاب دیا۔

منجھلے شہزادہ محمد اعظم شاہزادہ والاجاہ کو ۱۱۱۳ھ میں مرض استسقا ہوا جس کے آثار تین سال پہلے نمودار ہو چکے تھے۔

اور حکیم معصوم نے شاہزادہ سے کنایۃً اس مرض کے بارے میں کہہ دیا تھا لیکن اس وقت انھوں نے توجہ نہیں کی۔ اور مرض عود کر آیا۔ ہرچند حکیم محمد شفیع، حکیم محمد رضا اور حکیم محمد امین سالجی نے کوشش کی مگر مرض میں شدت پیدا ہوتی چلی گئی۔ حکیم الملک نے معجون الذہب دی۔ اس کے استعمال سے ورم میں کمی ہوئی اور چند دن کے بعد مکمل شفا ہو گئی اور علاج بے حد کامیاب ثابت ہوا تو حکیم الملک ہزاری ذات کے بعد چار ہزاری بنائے گئے۔ نیز دو ہزار اشرفی خلعت و فیل بطور انعام عطا ہوا۔

حکیم سبحان

۱۰۸۳ھ کی بات ہے کہ حسن ابدال میں دولت خانہ شاہی کے زیر دیوار ایک ضعیفہ رہتی تھی جس کے پاس ایک پانی کی چکی تھی جس سے لوگوں کا آٹا پیستی تھی۔ یہ اس کی معاش کا ذریعہ تھی۔ چکی اس پانی سے چلتی تھی جو باغ سے نکل کر نالے میں گرتا تھا۔ ملازمین نے پانی کی گزرگاہ بند کر دی تھی جس کی وجہ سے چکی چلنی بند ہو گئی۔ جب اس واقعہ کا عالمگیر کو علم ہوا تو انھوں نے حکم دیا کہ پانی کی گزرگاہ کھول دی جائے اور ضعیفہ کی روزی کے سد راہ نہ بنا جائے۔ چنانچہ اس کو دوسری چکی دی گئی۔ اور اس کا پانی کھول دیا گیا اور اس کو عالمگیر نے پانچ اشرفیاں بھجوا کر حکم دیا گیا کہ پالکی بھیج کر اس ضعیفہ کو شاہی محل میں لایا جائے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل ہوئی۔ جب ضعیفہ عالمگیر کے سامنے پیش ہوئی تو عالمگیر نے اس کا حال معلوم کیا تو اس نے بتایا اس کی دو غیر شادی شدہ نوجوان لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں جو فاقہ کش سر دیا برہنہ ہیں اور

آوارہ گردی میں زندگی بتا رہے ہیں۔ عالمگیر نے اس کو پہلی مرتبہ دوسو روپے اور دوسری مرتبہ دو ہزار روپے عطا کیے اور شاہی محل میں شہزادیوں نے زیورات، لباس اور طرح طرح کی پوشاکیں دیں۔ معلوم ہوا کہ ضعیفہ کی آنکھیں کمزور ہیں۔ بینائی میں کمی آگئی ہے تو اس کی آنکھوں کا علاج کرنے کے لئے حکیم سبحان کو مقرر کیا گیا کہ وہ گھر جاکر آنکھوں کا علاج کریں۔ چنانچہ علاج ہونا شروع ہوا اور حکیم سبحان اس کے گھر جاکر دوائیاں کرتے رہے۔ علاج سے ضعیفہ کو فائدہ ہوا، اور بینائی میں جو کمی آگئی تھی وہ پوری ہوگئی۔

حکیم قدرت اللہ قاسم

حکیم میر قدرت اللہ قاسم دہلی کے رہنے والے تھے حضرت مولانا فخر الدین صاحب کے مُرید تھے۔ انھیں سے عربی کتب تحصیل کی تھیں۔ علم طب میں مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ صاحب "گلستانِ سخن" ان کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"کامل طبیب، زبدہ حکمائے، دوراں شہر نے ان کی ذات سے رُتبہ حکمت لیا اور مجاز نے مرتبہ حقیقت جالینوس اس کی شاگردی سے صاحب دانش و دید، اور بقراط اس کے تلامذہ کی سلک میں"

مسلم الثبوت شاعر تھے۔ اُستادوں میں ان کا شمار تھا۔ ان کا دیوان بڑا ضخیم تھا، اس میں مثنوی واسوخت، مناقب، مراثی مخمس و مسدس اور رباعی وغیرہ تھی علی الخصوص معراج رسالت مآب جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حقائق پر روشنی ڈالی ہے ۱۲۳۶ھ میں فوت ہوئے۔

حکیم ثناء اللہ فراق

حکیم ثناء اللہ فراق دہلوی برادر ہدایت اللہ خاں ہدایت بقول صاحب تذکرہ سرور در فن طبابت دخیل کلی وارد دہلی کے مشہور طبیب تھے۔ صاحب گلستانِ سخن بھی ان کی

حکمت کے مدارج تھے۔ ان کے بارے میں انھوں نے حکیم جالینوس فطرت طبیب بقراط لکھا ہے۔

حکیم اکمل خاں

حکیم اکمل خاں کے آبا و اجداد کا وطن کاشغر تھا۔ اس خاندان کا مورثِ اعلیٰ بابر بادشاہ کے ہمراہ تقریباً ۱۵۲۶ء میں ہرات سے ہندوستان آیا۔ اور سندھ میں مقیم ہوا۔ اس خاندان کے دو بزرگ خواجہ ہاشم، خواجہ قاسم حیدرآباد سندھ میں مشہور درویش گزرے ہیں ان دونوں حضرات کے بعد ملا نورالدین علی قاری نے جو اس وقت کے امام تھے اپنی حکیمہ کی وجہ سے شہرتِ دوام پائی۔ انہی قاری علی کے صاحبزادے حکیم محمد فاضل کے سب سے پہلے میدانِ طبابت میں قدم رکھا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے محمد واصل خان عہد عالمگیری میں آگرہ سے دہلی آئے اور شاہی عہدہ طبابت پر فائز ہوئے۔ انھوں نے محمد شاہ کے عہد میں وفات پائی۔ ان کے دو بیٹے حکیم اکمل خان اور اجمل خاں ہوئے حکیم اکمل خاں نہ صرف یہ کہ اپنے باپ کے منصب طبابت اور دو لاکھ کی جاگیر سرفراز ہوئے۔ بلکہ حاذق الملک کے خطاب سے مرید ان کو عزت بخشی۔ بادشاہ کو ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ شاہی خاصے پر روزانہ حکیم صاحب کی مہر لگتی تھی۔ محمد شاہ کی وفات کے بعد جب احمد شاہ تخت نشین ہوا تو کسی بنا پر عتاب شاہی کے ماتحت جاگیر ضبط ہوگئی۔ اور حکیم صاحب گوشہ نشین ہوگئے۔ لیکن چند ہی روز کے بعد فرمانِ عفو جاری ہوا۔ مگر حکیم اکمل خاں نے انکار کر دیا اور شاہی دربار میں آنا جانا بند کر دیا۔

حکیم اکمل خاں صاحب کے دو فرزند حکیم محمد شریف خان اور حکیم محمد سعید خاں تھے۔ انھیں حکیم شریف خاں نے ایسی شہرت پائی کہ آگے چل کر ان کا سلسلۂ خاندان شریفی کے نام سے مشہور ہوا۔ حکیم شریف خاں امام طب ہونے کے علاوہ مختلف علوم

کے عالم وفاضل تھے۔ دربارِ شاہی میں ان کو بڑا اعزاز حاصل تھا۔ ان کو اشرف الحکماء کا خطاب اور ضلع پانی پت میں ۲۵ ہزار کی جاگیر عطا ہوئی۔ آپ نے ۱۸۰۵ء میں وفات پائی۔

حکیم شریف خاں کے چھ صاحبزادے ہوئے ان میں حکیم صادق علی خاں بڑے پائے کے طبیب تھے جو ۱۲۶۴ھ میں فوت ہوئے۔ ان کے تین صاحب زادے حکیم غلام محمد خاں، حکیم غلام محمود خاں اور حکیم غلام مرتضیٰ خاں ہوئے۔ حکیم غلام محمود خاں اپنی علمی خصوصیات، طبی کمالات اور باطنی خوبیوں کے باعث ایسے مقبول وہر دلعزیز ہوئے کہ ان کے طریقۂ علاج کی حکایتیں اور واقعات آج تک مشہور ہیں۔

حکیم محمود خاں کے بھی تین فرزند حکیم عبدالمجید خاں، حکیم واصل خاں، اور حکیم محمد اجمل خاں ہوئے۔ اوّل الذکر نے مطب کی شہرت و عزت کو برقرار رکھا۔ بلکہ اپنی دُور بینی سے اُنھوں نے طبِ یونانی کی ترقی و استحکام اور خدمتِ خلق کے لیے ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ یہ باب طبیہ کالج کا قیام تھا جو اب تک قائم ہے۔ آپ کا انتقال ۱۹۰۱ء میں ہوا۔

بھائی کے انتقال کے بعد حکیم واصل خاں کا آفتابِ حکمت اور خدمت چمکا۔ آپ نے ہی مطب کی آبائی مسند اور بڑے بھائی کی قائم کردہ درس کی گدی پر بیٹھ کر اپنی حکمت اور بے لوث خدمات سے مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچایا۔ آپ ۱۹۰۴ء میں فوت ہوئے۔ حکیم اجمل خاں ۱۷ شوال ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ اپنی غیر معمولی ذہانت، قابلیت و شخصیت کی وجہ سے بچپن ہی سے فنِ طب میں ممتاز ہوتے۔ حکیم صاحب کو اپنے آبائی طب کے علاوہ منطق، طبیعات، ادب، فلسفہ، حدیث و تفسیر و فقہ پر بھی پورا عبور حاصل تھا۔

حافظ قرآن ہونے کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے خطاط، ادیب اور صاحب دیوان شاعر
تھے۔ اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ؎

وفا اس سے جفا مجھ پر، ستم یوں بھی ہے اور یوں بھی
عدو پر میرے دلبر کا کرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

ستایا کچھ فلک نے ہے، ستم کچھ آپ کا بھی ہے
مری آنکھوں میں اشک خوں بہم یوں بھی ہے اور یوں بھی

تعصب برطرف مسجد ہو یا ہو کوئی بت خانہ
رہ دلدار میں جاتا قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

وہ لیلیٰ تھی مگر جذب محبت میں ہوئے مجنوں
کتاب عشق میں شیدا رقم یوں بھی ہے اور یوں بھی

حکیم حاذق خاں | حکیم حاذق تھے ان کا حکمت میں شہرہ ہوا۔ باپ
کی وجہ سے محمد شاہ کے دربار میں رسائی ہوئی تو
اُن کو حکیم الملک خطاب عطا ہوا اور پانچ ہزاری کے منصب پر پہنچے۔

حکیم محسن خاں | حکیم محسن نعمت اللہ خاں عالی کے چچا زاد بھائی
تھے۔ شہزادہ اعظم کی سرکار سے پہلے وابستہ تھے۔
یہاں ان کو تقرب خاں کا خطاب ملا۔ بعد میں وہ کام بخش کے وزیر ہو گئے۔
اور طبابت کا پیشہ بھی جاری رکھا۔

حکیم محمد اشرف خاں | حکیم محمد اشرف خاں دہلوی ابن حاذق الزما
حکیم محمد شریف خاں اپنے عہد کے اطبا
بے نظیر تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے دربار میں طبیب تھے۔ انھیں کے حکم پر مرزا جہا
کے ہمراہ الٰہ آباد آگئے اور جب تک مرزا جہانگیر زندہ رہے اُن کے پاس ان کا

قیام رہا۔ ان کی وفات کے بعد دہلی چلے آئے۔ صاحب تذکرۂ سروران کی حکمت کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔

"در فضائل و کمالات و فن طبابت بے مثل و مانند ست ایشان ہم در علم طبابت بہ مرتبہ اقصی مہارت دارند و در معالجہ و نسخۂ خریف الفاس مسیحی بہ کاری برند چنانچہ ازحضور انور بہ خطاب حکیم مسیح الزمانی سرفراز گردیدہ، جوانے خلیق و یار باش و خوش گفتار ست" (۲۲۱)۔

حکیم مسیح الزماں نے اکبر ثانی کے عہد میں قضا کی۔ آپ حکیم محمود خاں کے حقیقی چچا تھے۔ حکیم اسد علی خاں مضطر ان کے پوتے بڑے نازک خیال اور مشاق شاعر تھے۔

حکیم غلام نجف خاں

حکیم غلام نجف خاں کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ شیخ قطب الدین ان کے اجداد میں تھے جو حضرت سلیم چشتی فتح پور سیکری کے پوتے تھے۔ شیخ قطب الدین کا شمار اکبر کے امرا میں بھی تھا لیکن جہانگیر سے جس قسم کا قریبی تعلق تھا وہ اکبر سے نہ تھا۔ جہانگیر کو ان کی والدہ نے ایام طفولیت میں پرورش کیا تھا جس کی وجہ سے جہانگیر ان سے اپنے بھائیوں کی طرح محبت کرتا تھا اور انتہائی قابل اعتماد ساتھی اور دوست سمجھتا تھا۔ اکبر کے انتقال کے بعد جب جہانگیر نے شیخ قطب الدین کو اپنی عنایات سے نوازنا شروع کر دیا پنج ہزاری کا منصب اور خلعت فاخرہ عطا کرنے کے بعد بنگال اور اڑیسہ کا صوبیدار مقرر کیا۔ اور روپوں کی بوچھاڑ کرنی شروع کر دی۔ جب شیخ قطب الدین کی والدہ کا انتقال ہوا تو جہانگیر نے ان کی نعش کو کندھا دیا اور چند روز اس نے کھانا نہیں کھایا اور کپڑے بھی نہیں پہنے۔

شیخ قطب الدین کے صاحبزادے شیخ فرید تھے جو عہدِ جہانگیری اور
شاہجہاں کے اُمرا میں تھے۔ منصب پنج ہزاری پنج ہزار سوار سے سرفراز تھے۔
ان کی خواہش کے مطابق جہانگیر نے چار ہزار بیگھہ آراضی بموضع مولیا میں سکونت
اور آباد کرنے کے لیے ان کو مرحمت فرمائی۔ اس زمین میں انھوں نے ایک قلعہ
تعمیر کیا اور اس کا نام جہانگیر کے نام پر شیخو پور رکھا۔ شیخو پور ضلع بدایوں میں ہے۔
شیخ فرید اپنے باپ کی طرح جنگ جُو تھے۔ انھوں نے عہدِ شاہجہانی میں کافی
معرکوں میں حصہ لیا۔ شیخ فرید صاحب کا انتقال شیخو پور میں ہوا۔

حکیم غلام نجف خاں شیخو پور میں پیدا ہوئے۔ اپنے خالو میر سید علی صاحب
کے ساتھ پانچ سال کی عمر میں شیخو پور دہلی چلے آئے اور کٹرہ دینا بیگ گلی قاسم
جان لال کنواں دہلی میں مقیم ہوئے۔ حکیم صاحب نے کتب طب حکیم حاذق علی خاں
سے تحصیل کیں اور نسخہ نویسی و علاج معالجہ کے گر حاذق الملک حکیم احسن اللہ خاں
کی خدمت میں سیکھے۔ ان کی حکیم صاحب سے قریبی قرابتداری تھی۔ حکیم صاحب
کی بہن ان سے بیاہی گئی تھیں۔ حکیم احسان اللہ خاں صاحب کی کوششوں سے
حکیم غلام نجف خاں شہر کے مشاہیر اطبا میں شمار ہونے لگے۔ اور بہادر شاہ ظفر کے دربار
سے "عضد الدولہ اعتماد الملک حکیم غلام نجف خاں بہادر" کا خطاب پایا۔ اس کے
بعد سرکار کمپنی بہادر سے عہدہ طبابت پر مامور ہوئے۔ اللہ رب العزت نے
آپ کے ہاتھ میں شفا دی تھی۔ جن امراض کو ڈاکٹر لاعلاج کہہ دیتے تھے۔ آپ کی معمولی
توجہ سے ختم ہو جاتے تھے۔ حکیم صاحب کے مرزا غالب سے اچھے تعلقات تھے۔ حکیم
صاحب مرزا غالب کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے۔

حکیم غلام نجف خاں کے صاحبزادے حکیم ظہیر الدین صاحب نے دہلی
میں حکمت میں بڑا نام پایا تھا اور لقمۂ اجل بننے والے مریضوں نے اللہ کے

کرم وفضل سے ان کے ہاتھ سے شفا پائی۔ حکیم ظہیرالدین صاحب نے دو شادیاں کیں۔
پہلی شادی شیخوپورہ میں اپنے خاندان میں کی ان سے حکیم رضی الدین احمد صاحب
کی بہن نورجہاں سے کی ایک لڑکے ریاض الدین ہوئے۔ حکومت کی طرف سے ان کو
خان صاحب خطاب ملا تھا۔ آنریری مجسٹریٹ بنائے گئے تھے۔ میونسپل کمیٹی کے
ممبر بھی کئی سال تک رہے۔ انھوں نے شادی نہیں کی تھی، اپنے والد کی حیات میں
جوانی میں فوت ہوگئے تھے۔

حکیم رضی الدین صاحب ۱۸۶۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا دہلی کے
معززین اور رؤسا میں شمار ہوتا تھا۔ فارسی و عربی کے بہترین ماہر تھے۔ ۲۹ سال
تک دہلی میونسپل کمیٹی کے ممبر اور ۱۲ سال تک آنریری مجسٹریٹ رہے۔ پنجاب یونیورسٹی
اور اینگلو عربک ہائی اسکول کمیٹی کے ممبر عرصہ تک رہے۔ عمدۃ الحکما کی کلاسوں
کے پرچے معائنہ کرتے تھے۔ آٹھ سال تک سیکنڈ کلاس اور ایک سال فرسٹ کلاس
مجسٹریٹ رہے۔ سب رجسٹرار آفس میں بھی کام کیا۔ شفاء الملک کا خطاب
حکومت برطانیہ کی طرف سے ملا تھا۔ بقول صاحب واقعات دارالحکومت دہلی ہمدرد
دواخانہ کے سرپرست بھی حکیم شفاء الملک رضی الدین خاں رہے۔ حکیم صاحب کا
انتقال ۸۴ سال کی عمر میں ۱۹۱۶ء دہلی میں ہوا۔ حکیم صاحب کے صاحبزادے حکیم
ناصرالدین عرف چنو میاں تھے جو نوجوانی اور شباب کے عالم میں جوان صالح کا
ایک نمونہ تھے۔ لوگوں کو نہ صرف اپنے بے نظیر اخلاق بلکہ اپنے لاجواب علاج و معالجے
ممنون کیا تو اس کو فراموش ہوتے ہوئے بن آئی۔ شروع میں نواب فیض محمد خاں رئیس
جھجر کے ہاں منسلک ہوئے نواب صاحب کی وفات کے بعد صاحب عالم مرزا
فخرو بہادر کی سرکار میں عہدۂ طبابت پر مامور ہوئے۔

حکیم فتح اللہ خاں حکیم فتح اللہ خاں کے آباؤ اجداد دہلی کے باشندے

تھے۔ یہ خاندان علمی خاندان تھا۔ حکیم صاحب کے حقیقی بھائی حکیم نصر اللہ خاں صاحب تھے۔ اپنے بھائی سے طب سیکھی۔ کافی عرصہ تک نواب اکبر علی خاں رئیس پٹودی کی سرکار میں عہدۂ طبابت پر مامور رہے۔

حکیم عبدالحق

حکیم محمد عبدالحق بن محمد حسن بخش دہلی کے رہنے والے تھے۔ راجہ ناہر سنگھ والئ بلبھ گڑھ نے دیوانی پر مامور کیا تھا۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے فائلوں میں ہے کہ وہ بہادر شاہ کے ایڈی کانگ بن گئے تھے۔ کئی سو سواروں کا دستہ ان کے ماتحت تھا۔ وہ دربار میں آتے جاتے تھے۔ بہادر شاہ کے مقدمے سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ بلبھ گڑھ نے ۲۷ اگست کو ایک عرضی میں مختلف آدمیوں پر الزام لگایا تھا کہ وہ روپے لے کر دہلی چلے گئے۔ روپیہ دس لاکھ تھا۔ عبداللطیف کے روزنامچہ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں لکھا ہوا ہے۔

۲۴ ذی الحجہ مطابق ۱۹ اگست ۱۸۵۷ء کو مرزا عبداللہ پسر مرزا شاہ رخ شاہزادہ، ہدایت افزا مرزا الٰہی بخش بہادر، مرزا افضل بیگ، اعتماد الدولہ ولد میر حامد علی خاں بہادر کے ساتھ حکیم عبدالحق نے لشکر کی تنخواہ تقسیم کرنے کے لئے مہاجنوں اور تجارت پیشہ لوگوں سے روپیہ اکٹھا چاہا۔ اس الزام پر انگریزوں نے ان کو پھانسی کی سزا دی۔

حکیم مولوی احمد علی

حکیم مولوی احمد علی صاحب دہلوی دہلی کالج میں فارسی پڑھانے پر مامور تھے۔ تمام علوم دینی کی تحصیل کر چکے تھے۔ دہلی کے مشہور طبیب تھے اور فارسی کے اچھے شعراء میں ان کا شمار تھا۔ صاحب گلستانِ سخن ان کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں:-

"فنِ طبابت میں ید طولیٰ اور تشخیص امراض میں حدس صائب ایسا کہ بیمارئ نرگس کی علت اور سوسن کی گنگی زبان کا سبب دریافت کرنا

ایک کارِ سہل ہے۔ سوائے تکمیل مدارجِ علمی کے اخلاق پسندیدہ
اور اوصافِ حمیدہ اس طرح ان جمیع کمالات کی ذات میں فراہم ہیں"۔

حکیم عزت اللہ خاں عشق

حکیم عزت اللہ خاں عشق فرزند حکیم قدرت اللہ قاسم حکمت میں مہارت رکھتے تھے۔
کتب درسی خصوصاً طب کو اپنے والدِ ماجد سے بکمالِ تحقیق و تدقیق حاصل کیا۔ بقول صاحب
گلستانِ سخن: "معالجہ مرض کو حدِ اعجاز تک پہنچایا"۔ صاحبِ دیوان تھے۔ میر محمد خاں
مؤلفِ تذکرہ ان کے بڑے مداح تھے۔ چنانچہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"ہوائے است بہ لباس صلاح و تقویٰ آراستہ و بہ زیورِ علم و
حیا پیراستہ بہ سبب موزونیِ طبع قابلیت کہ ارشاد دارد فکر شعر گوئی می
کند۔ شخصے حلیم و متواضع و مؤدب است"۔

حکیم میر سید محمد تعشق

حکیم سید محمد تعشق دہلی کے قدیم باشندے تھے۔ علوم مشرقی میں معلومات تمام حاصل تھیں۔ دہلی کالج میں
نو روپے ماہانہ پر فارسی و عربی پڑھاتے تھے۔ طب میں مولوی رشید الدین خاں اور
حکیم قدرت اللہ خاں قاسم کے شاگرد تھے۔ حکیم عزت اللہ عشق کے داماد اور شاعری میں
شاگرد تھے۔ علاج و معالجہ میں کافی تجربہ تھا۔ ان کو دانائی کا دعویٰ تھا۔ کسی دہلی کے
حکیم کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور فی الحقیقت جامع الکمالات انسان تھے۔ آخر عمر میں
شعر گوئی ترک کردی تھی۔ پھر بھی شوق کا یہ عالم تھا کہ اچھا شعر سن کر بے تاب ہو جاتے تھے۔
۷۵ برس کی عمر پا کر ۱۲۸۲ھ میں فوت ہوئے قادر الکلام شاعر تھے ؎

تجھ کو اس میری آہ و زاری پر
رحم اے فتنہ گر نہیں آتا
دیدۂ شام تو کیا ہے و لے
کچھ وہ آتا نظر نہیں آتا

حکیم خیرالدین یاس | حکیم خیرالدین یاس دہلی کے رہنے والے تھے۔ طب میں جالینوس زماں اور بقراط دوراں تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں کی توجہ سے مہارت تامہ اور معالجہ امراض میں دستگاہ کلی بہم پہنچائی تھی۔ شعروشاعری کا ذوق رکھتے تھے کبھی مومن خاں سے اور کبھی ذوق سے اصلاح لیتے تھے ؎

ربط غیروں سے بڑھا مجھ سے وفا چاہتے ہو
دل میں سمجھو تو یہ کیا کرتے ہو کیا چاہتے ہو

اکثر جاگیردار آپ کے بہت معتقد تھے۔ ۱۲۸۱ھ کو آپ کا انتقال ہوا آپ کو شعروشاعری کا بھی شوق تھا۔ آشفتہ تخلص تھا۔ حکیم مومن خاں مومن کو اپنا کلام دکھاتے تھے ؎

سنا تھا ہم نے آشفتہ کو کوئی دم کا مہماں ہے
کئی دن ہو گئے اس کو نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے

غیر اچھا ہے یا بُرے ہم ہیں
اپنے دل ہی سے پوچھئے صاحب

اجل تو نے کیا کیسا مجھے شرمندہ قاتل سے
تماشا تھا اسے میرے تڑپنے کی اذیت کا

ابھی دل ربائی تو کیا جانتا ہے
ستم کو وہ بدخو ادا جانتا ہے

حکیم غلام حیدر خاں | حکیم غلام حیدر خاں دہلی کے قدیمی باشندے تھے۔ آپ نے علوم دینی مولانا عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا رفیع الدین اور مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی سے تحصیل کئے۔ علم طب

حکیم شریف خاں صاحب سے سیکھا۔ آپ سر سید احمد خاں صاحب کے استاد تھے۔ چنانچہ سر سید آثار الصنادید میں لکھتے ہیں :۔
"راقم کو حضرت موصوف کی خدمت میں نسبت شاگردی ہے"

حکیم غلام حسن خاں | حکیم غلام حسن خاں کے حقیقی بھائی حکیم غلام حیدر تھے۔ حکیم غلام حسن خاں نے فن طب کی تکمیل حکیم شریف خاں کی خدمت میں کی آپ کو حکمت کی کتابوں پر پورا عبور حاصل تھا اور علاج معالجہ میں بڑا تجربہ رکھتے تھے۔ ان کے فرزند ارجمند حکیم محمد یوسف خاں تھے۔ فقہ و حدیث و تفسیر کی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے اور فن طب میں مہارت رکھتے تھے۔ باوجود ان کمالات کے پسندیدہ اخلاق اور پاکیزہ روزگار تھے۔ ان کے دوسرے فرزند حکیم عبدالحکیم عرف ابو خاں تھے۔ کتب درسیہ آخوند شیر محمد کی خدمت میں اور طبی کتابیں اپنے والد حکیم غلام حسن خاں سے پڑھیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے ایسا دست شفا دیا ہے کہ جن بیماروں کے علاج سے بڑے بڑے ڈاکٹر و حکیم عاجز ہو جاتے تھے وہ ان کے ہاتھ سے شفا پاتے تھے۔

حکیم اکرام اللہ | حکیم اکرام اللہ دہلی کے قدیمی باشندے تھے جامع مسجد کے قریب ان کا مکان تھا۔ ان کے والد ماجد حکیم ہدایت اللہ خاں تھے۔ علوم دینی اور علم طب اپنے چچا حکیم سعادت اللہ سے سیکھا۔ مومن و ذوق کے ہم عصر تھے۔ کلام میں شگفتگی ہے ؎

آرزوئے وصل کی ستائی تھی
کیا ہوا اگر مٹا دیا دل کو
مرے رنج دل کو تم ہر گز نہ پوچھو دیکھ لو
جائے آنسو کے رواں خون جگر ہونے لگا

حکیم رضی الدین خاں

غیاث الدولہ عمدۃ الملک حکیم رضی الدین خاں سنہ جنگ دہلی کے مشہور طبیب تھے۔ ان کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی نواب فرخ آباد کے علاج کے لیے حکیم امام الدین کو تجویز کیا جانے لگا تو احسن الاخبار کے ایڈیٹر نے اس سے اختلاف کیا۔ وہ خبر جو اخبار میں شائع ہوئی جو یہ تھی۔

"صاحب کلاں بہادر کے نام شقہ روانہ کیا گیا کہ حکیم امام الدین بہادر نواب زینت محل بیگم کے علاج معالجہ میں مصروف ہیں ان کو نواب صاحب فرخ آباد کے علاج کے واسطے روانہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ان کو رخصت کر دیا جائے گا تو بیگم صاحب کے علاج میں مشکل واقع ہو جائے گی۔ خاکسار ایڈیٹر کی یہ رائے ہے کہ حکیم امام الدین کے بجائے حکیم رضی الدین خاں بہادر کو بھیج دیا جائے کہ یہ بڑے معالجہ کا مذاق رکھتے ہیں۔ مایوس مریضوں کو بھی ان کے علاج سے شفائے کلی حاصل ہوئی ہے دہلی میں تو ان کی تشخیص اور علاج لوگوں کو بہت راس آگیا ہے" حکیم رضی الدین صاحب نے عملی طور پر دہلی کی جنگ آزادی میں حصہ لیا اور بہادر شاہ ظفر کے ساتھ میدان جنگ میں کود پڑے تھے۔ جب دہلی میں قتل عام ہوا تو کسی انگریز کی گولی سے شہید ہوئے چنانچہ غالب نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ "کیونکر لکھوں حکیم رضی الدین خاں کو قتل عام میں ایک خاکی نے گولی مار دی"۔ ان کے چھوٹے بھائی حکیم احمد حسن خاں بھی اسی دن شہید ہوئے۔

حکیم حسین بخش خاں

حکیم حسین بخش خاں کے آباو اجداد تھانیسر کے رہنے والے تھے لیکن حکیم صاحب دہلی میں پیدا ہوئے۔ تمام علوم وفنون مثلاً معقول ومنقول وحکمت وہندسہ وہیئت میں مہارت رکھتے تھے اور طبی کتب قانونچہ سے لے کر قانون شیخ الرئیس تک ان کو ازبر یاد تھیں

ان کے ساتھ کوئی مناظرہ و مباحثہ نہیں کر سکتا تھا۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی کی ہمت آپ سے مناظرہ کرنے کی نہ ہوئی تھی۔ اپنے آباؤ اجداد کے نام کو انھوں نے قائم ہی نہیں رکھا، بلکہ چار چاند لگائے۔ آپ کو حکیم محمود خاں کی طرح قومی کاموں سے بھی دلچسپی تھی۔ ۱۹۱۵ء میں اردو کانفرنس دہلی میں ہوئی۔ اس کے روحِ رواں تھے۔ آپ ہی دہلی میں آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر عرصہ تک رہے۔ اس کے بعد والیٔ حیدرآباد کے طبیبِ خاص مقرر ہوئے ۱۹۴۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کو یونانی اینڈ آیورویدک انڈین بورڈ آف میڈیسن کا ممبر نامزد کیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ساؤتھ انڈیا کا دورہ کیا۔ اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں گئے اور گورنمنٹ کو رپورٹ پیش کی دہلی کے طبیہ کالج کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہے۔ آخر میں ہندوستان کے پہلے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد کے آنریری فزیشن مقرر کیے گئے۔ تاحیات اس اعزاز پر قائم رہے۔ حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی اور حضرت روشن چراغ دہلی سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ ۲۲ جون ۱۹۵۸ء کو فوت ہوئے۔ وصیت کے مطابق درگاہ روشن چراغ دہلی میں دفن ہوئے۔

حکیم پیر بخش خاں

حکیم پیر بخش خاں کا سلسلہ نسب والدہ صاحب کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک اور والدہ ماجد کی جانب سے حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے آباؤ اجداد تھانیسر میں رہتے تھے۔ حکیم پیر بخش خاں دہلی میں پیدا ہوئے۔ علم طب کی تحصیل حکیم نصیر اللہ خاں صاحب کی خدمت میں کی اور طب میں کامل دستگاہ پہنچائی اور دہلی میں بحیثیت طبیب شہرت پائی۔ اکبر شاہ ثانی کے دربار میں رسائی ہوئی تو حکیم دوراں کا خطاب پایا۔ اس کے بعد نواب بہادر جنگ رئیس

بہادر گڑھ کی سرکار میں عہدۂ طبابت پر مامور ہوئے۔ وہاں کے لوگوں کو آپ کی ذات سے بڑا فائدہ پہنچا۔ سرسید احمد خاں سے برادرانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں لکھا ہے "نہ ان کے خلق کی صفت بیان میں آسکتی ہے اور نہ کمال کی تعریف لکھی جا سکتی ہے۔"

حکیم ذکاء اللہ

حکیم ذکاء اللہ کے جد امجد حکیم بقاء اللہ دہلوی مغلیہ دور کے شاہی طبیب اور اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ ممتاز حکیم تھے۔ یہ خاندان دہلی میں آنکھوں کے علاج میں شہرت رکھتا تھا۔ حوض قاضی کے سامنے ایک گلی حکیم بقائی کے نام سے مشہور ہے۔ انھوں نے عہد مغلیہ میں حوض قاضی سے متصل اور تھانہ حوض قاضی کے قریب دو منزلہ مسجد تعمیر کرائی جس کا دس سیڑھیوں کا زینہ ہے اور اس کے نیچے سات دکانیں ہیں۔ آپ کی مشہور تصنیف مجموعہ بقائی ہے جو کافی ضخیم اور دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

آپ کے صاحبزادے حکیم محمد اسماعیل اور حکیم ذکاء اللہ تھے۔ "مجموعہ بقائی" جو محمد اسماعیل صاحب کی نگرانی میں چھپا تھا۔ شیخ ابوالرضا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ اور اپنے دور کے مشہور حکیموں میں ان کا شمار تھا۔ حکیم ذکاء اللہ اپنے فن میں مسلمہ روزگار تھے۔ "قرابادین کائی" آپ کی یادگار تصنیف ہے جس سے آج تک ہزاروں طالبان فن فیضیاب ہوئے ہیں۔ یہ کتاب چھٹی مرتبہ منشی نولکشور نے جنوری ۱۹۰۱ء میں چھاپی تھی۔ مؤلف وقائع عبدالقادر خانی نے حکیم صاحب کی اس تصنیف کا ذکر کیا ہے۔ حکیم ذکاء اللہ کو حاذق الملک کا خطاب عطا ہوا تھا۔ تشخیص اور علاج میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے بعد حکیم ذکاء اللہ صاحب کے صاحبزادے حکیم حسام الدین عرف

سے فن طب کو بھی ترقی ہوئی حکیم منیر الدین صاحب اور اُن کی اہلیہ سائیں توکل شاہ کی مرید تھیں۔ حکیم سراج الدین صاحب بھی اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ کا سلسلہ حکیم ذکاءاللہ صاحب سے ملتا ہے۔ ان کا نیشنل دواخانہ نیو سیلم پور دہلی میں ہے اس میں عرصہ سے حکیم صاحب مطب کرتے ہیں۔ خلیق، ملنسار اور ہمدرد قابل حکیم ہیں۔ آپ کا مطب اللہ کا فضل و کرم سے بہت مقبول اور ہر دل عزیز ہے اور اللہ تعالےٰ نے آپ کے ہاتھ میں شفا دی ہے۔ نیو سیلم پور کے لوگ آپ سے مخلصانہ اعتقاد رکھتے ہیں۔

حکیم امام الدین حکیم امام الدین کے والد ماجد حکیم غلام رضا اور نمے ساں کا دہلی کے حاذق اطبا میں شمار ہوتا تھا۔ ان کے بزرگ نے توسط کار بادشاہی میں اونچے عہدے اور مراتب ملے اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ان کو شاہی طبیب مقرر کیا گیا تھا۔ اس وقت ان کو پانچ سو روپے تنخواہ ملتی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں یہ شاہی خاندان خصوصاً زینت محل کے معالج مقرر ہوئے تھے۔ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ تھی۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانہ میں گھر بیٹھے رہے۔ جب لوگ شہر چھوڑ کر چلے گئے تو یہ بھی دہلی سے نکل کھڑے ہوئے لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد یہ صاحب کے حکم سے اپنے مکان میں آگئے۔ بعد میں جان و مکان نے ان کو شہر بدر کیا تو قطب صاحب میں رہنے لگے۔ پھر بنارس چلے گئے۔ ۱۸۵۹ء میں والیٔ ٹونک کی طلبی پر ٹونک چلے گئے۔ سر سید احمد خاں نے اپنی تصنیف آثار الصنادید میں ان کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

”قطع نظر کمالاتِ طبی سے جامع معقول و منقول حاوی فروع و اصول درس ایسا ہے۔ نبض شناسی ویسی ہے۔ اگر بالفرض انقلابِ روزگار سے تمام عالم سے نسخ معتبر گاؤ خورد ہو جاویں اور رسائلِ جہلا سے کتب سلف دریا برد ہو جاویں، اس گروہ ارباب فضل کے حافظہ کی مدد

سے پھر کتب خانہ روزگار معمور ہو سکتا ہے۔"

حکیم مرزا منور علی خاں

حکیم مرزا منور علی خاں کے جدِ امجد نواب علی مردان خاں صاحب، رئیس قندھار، شاہجہاں کے اصرار پر ہندوستان آئے۔ دارا شکوہ نے شاہجہاں کے ارشاد کے مطابق ایک لاکھ روپیہ علی مردان خاں پر سے نچھاور کئے۔ آپ کے ساتھ تین ہزار پیشہ ور اور اہل ہنر دستکار اور ڈیڑھ سو علماء آئے انہی ایرانی دستکاروں کے ہاتھوں جامع مسجد دہلی اور تاج محل کی تعمیر ہوئی۔ انہی کاریگروں کے ہاتھ سے لاہور میں نہر لائی گئی —، جب کابل سے ہوتے ہوئے ۱۰۴۸ء کو نواب علی مردان دہلی پہنچے تو بادشاہ نے نیم قد ہو کر مصافحہ فرمایا اور ہزاری ہزار سوار کے اضافے سے معزز فرمایا اور سرکاری مکانات میں سے ایک عالی شان مکان عطا کیا۔ ڈھائی مہینے کے بعد صوبہ کشمیر سے آکر لاہور میں قدم بوس ہوئے تو ان کو خلعت و منصب، ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار سے سرفراز کیا گیا۔ ۱۰۵۱ھ کو شاہجہاں بادشاہ علی مردان خاں صاحب کے دہلی کے مکان پر تشریف لے گئے اور ان کو بیس ہزار روپے عطا کئے۔ ۱۰۵۷ھ کو مردان علی خاں کا کابل میں انتقال ہوا آپ نہایت منکسر المزاج صاحب سخاوت امیر تھے۔ نجوم کے ماہر تھے۔ ایک کتاب "الشمس والقمر" تصنیف کی جو نواب رام پور کے کتب خانہ رضا لائبریری میں ہے۔ ۱۲ ذی الحجہ سنہ ۱۰۵۹ھ کو علی مردان خاں کے چھوٹے صاحبزادے محمد علی خاں کو نیابت کابل عطا ہوئی۔ سنہ ۱۰۶۷ھ کو علی مردان خاں کے بڑے بیٹے محمد ابراہیم خاں ہندوستان آئے۔

علی مردان خاں صاحب کے خاندان کے ایک فرد حکیم منور علی خاں تھے ان کے والدِ ماجد مرزا شہسوار خاں معتمد الملک ثابت جنگ تھے۔ حکیم صاحب نے فارسی کی کتب مولانا امام بخش صہبائی سے اور عربی علوم مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی اور علم طب حکیم محمد احسن اللہ خاں صاحب سے تحصیل کیا۔ حکیم احسان اللہ خاں صاحب آپ پر

کام کرے شبنم غنچہ کو نفخ سے بچالے، طلا شبنم اگر ان کی تدبیر سے ہوتا رنگ گل
میں خون نہ مرتا اور اگر نخلچہ گل ان کی تجویز سے گل میں آتا تو بلبل کا مرض دماغ
آتنا طول نہ پکڑ جاتا"

آپ نے متعدد رسائل بحران، دریافت مزاج، نسخہ مرکب وغیرہ میں تصنیف کئے۔ پہلے
نواب فیض محمد خاں رئیس جھجر کی سرکار میں طبابت کے عہدے پر مامور ہوئے۔ اس کے
بعد نواب عبدالرحمٰن رئیس جھجر کی خدمت میں اسی عہدہ پر سرفراز ہے۔

حکیم دون اگسٹن ڈسلوا مفتون حکیم دون اگسٹن ڈسلوا ابن دون
حکیم النتین ڈسلوا پرتگیزی قوم سے
تعلق رکھتا تھا اور پرتگال کا قدیم باشندہ تھا۔ اس کے اجداد میں ایک شخص علم طب
میں ماہر تھا۔ پرتگال کے شاہ پیڈرو نے اس کو "دن روسلوا تیس روروتور" کا خطاب
عطا کیا تھا۔

حکیم دون کسی تقریب سے دہلی آیا۔ محمد شاہ بادشاہ کے ایک مصاحب جلیانہ
کی معرفت شاہی طبیب مقرر ہوا۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہی مصاحب سخت بیمار
پڑ گیا۔ اس کو اس کے علاج سے شفا ہوئی تو محمد شاہ نے خوش ہو کر اس کو فرزند
کا خطاب، پالکی جھالردار اور منصب ہفت ہزاری عطا کیا۔ راجہ جے پور نے
بادشاہ سے درخواست کی کہ اس کو میرے ساتھ جے پور بھیج دیا جائے۔ درخواست
منظور ہوئی اور یہ راجہ جے پور کے ساتھ چلے گئے اور زمرۂ اطبا میں منسلک ہوگئے

حکیم محمد پناہ حکیم محمد پناہ بان ابن سید محمد شریف دہلی کے باشندے
تھے۔ خواجہ میر درد سے تلمذ کا شرف حاصل تھا۔ دہلی میں ان
کی حکمت کی کافی شہرت تھی۔ ان کا تخلص پہلے بیتاب تھا۔ حکمت کی شہرت کی وجہ سے
حکیم تخلص ہوا۔ کلام میں درد اور اثر ہے سہ

ہم ہی صنم کے غم میں نہ ایماں سے گئے
کتنے ہی بندگانِ خدا جان سے گئے

حکیم احسن اللہ خاں

حکیم احسن اللہ خاں کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے جدِ اعلیٰ حضرت خواجہ زین الدین ہراتی رضی اللہ عنہ ہیں جن کے ہاں پیری مریدی کا سلسلہ جاری تھا اور ہزاروں لوگ ان سے مرید ہوئے تھے۔ آپ کے فیض باطنی سے معلوم ہوتا تھا کہ آپ غوث اور قطب کا درجہ رکھتے تھے۔ آپ کی ہرات کے حاکم سے ناچاقی ہوگئی تو آپ نے ہرات کو خیرباد کہہ دیا اور کشمیر میں آکر قیام کیا وہیں آپ فوت ہوئے اور چشمہ ڈل کے کنارے آپ کا مزار ہے اور زینہ ارشاد کے نام سے مشہور ہے۔ حکیم صاحب کا موروثی پیشہ طبابت نہ تھا بلکہ آپ کے والد حکیم محمد عزیز اللہ خاں نے یہ پیشہ اختیار کیا اس علم کو حاذق الملک محمد ذکا اللہ صاحب سے تحصیل کیا اور شہر کے اطبا پر فوقیت حاصل کی۔

حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے فنونِ حکمت و ہندسہ اور ہیئت کو فضلاء عصر سے حاصل کرکے اپنے والد ماجد سے فن طب کی تکمیل کی۔ پہلے آپ نے فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں والئے فیروزپور جھرکہ کی ملازمت اختیار کی تو ترکے باعث منصب پر مامور ہوئے فخر الدولہ کی رحلت کے بعد اسد الدولہ نواب نجف محمد خاں والئے جھجر کے پاس سابقہ منصب پر مقرر ہوئے اور اسد الدولہ کی زندگی تک اس منصب کے فرائض کو انجام دیتے رہے۔ ان کا انتقال ہوگیا تو کچھ عرصہ کے لئے گوشہ نشین ہوگئے۔ جب ان کی حکمت و قابلیت کی شہرت ہوئی تو اکبر ثانی نے اپنے دربار میں بلایا اور عطائے خلعت اور عنایت خطاب عمدۃ الملک حاذق الزماں سے مشرف فرما کر خاص اپنے معالجہ کے لئے متعین کیا۔ حکیم صاحب نے اکبر ثانی کی ملازمت

اس ذمہ داری کو نبھایا۔ اکبر ثانی کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر نے جب حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو حکیم احسن اللہ خاں صاحب اپنے سابقہ اعزاز پر فائز کر گئے اور ان کو احترام الدولہ عمدۃ الحکما، حاذق الزماں ثابت جنگ کا خطاب عطا ہوا جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے آخر دنوں تک آپ نے بہادر شاہ ظفر کا ساتھ دیا۔

شاہجہاں آباد کے

قدیم مدارس اور اصحاب درس

شاہجہاں بادشاہ کابل سے ہوتے ہوئے ذی الحجہ ۱۰۴۸ھ کو دہلی پہنچے۔ ۹ محرم ۱۰۴۹ھ کو لال قلعہ کی بنیاد رکھی جو آٹھ سال میں بن کر تیار ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ایک وسیع سرائے و مسجد فتحپوری تعمیر کرائی۔ اور رمضان شریف ۱۰۶۶ھ میں جامع مسجد دہلی بن کر تیار ہوگئی۔ جامع مسجد کے شمالی کونے میں ایک ہسپتال دارالشفا تعمیر کرایا۔

مدرسہ دارالبقاء

دارالشفاء کے ساتھ جنوبی کونہ میں شاہ جہاں نے ایک مدرسہ دارالبقاء کی تعمیر کرائی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ایک سنگھاڑہ تھا جو اب سڑک میں آگیا ہے ۔۔۔ اس مدرسہ کی خدمت تدریس شاہ جہاں بادشاہ نے مولانا ابو یوسف بیابانی کے سپرد کی۔

دارالبقاء میں قدیم زمانہ سے طلباء رہتے تھے اور کتب معقول و منقول پڑھایا کرتے تھے۔ دور و دراز سے طلبا رہتے تھے اور اہلِ علم کا ہجوم رہتا تھا۔ جب یہ مدرسہ خراب و خستہ حال ہو گیا تو مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی کو اللہ نے توفیق عطا فرمائی۔ انھوں نے زرِ کثیر خرچ کر کے از سرِ نو تعمیر کرایا۔ اس کے طلباء کو تعلیم بھی دی۔ اور طلباء کے کپڑے اور کھانے کا بھی انتظام کیا چنانچہ سر سید احمد خاں اپنی تصنیف

آثار الصنادید میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اگلے زمانے میں اس میں طالب علم رہا کرتے تھے اور معقول و منقول پڑھا کرتے تھے۔ یہ مدرسہ بالکل خراب و برباد ہو گیا تھا اور بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ چونکہ زمانہ اہل اللہ سے خالی نہیں اور ہر وقت میں کوئی نہ کوئی صاحب ہمت عالی اور فطرت بلند ہوتا ہے اور یہ ہمت اور دل اور داد و سخا سوائے اس کے جس پر اللہ تعالےٰ کا سایۂ رحمت ہو اور کسی کو میسر نہیں ہوتا۔ اس جزو زمانہ میں اللہ تعالےٰ نے جناب مولانا مولوی صدر الدین خاں بہادر صدر الصدور شاہجہاں آباد کو ہمت بلند اور فطرت ارجمند عنایت کی کہ شاید اگلے زمانے میں کسی کو نہیں ہو گی۔ جناب نے اپنی عالی ہمتی سے اس دار البقار کو زر خطیر صرف کرا کر از سر نو مرتب کیا ہے۔ اور شاہجہانی طور پر جو حجرے اس کے ٹوٹ گئے تھے ان کو نئے سرے سے بنا لیا ہے اور مدرس نوکر ہیں اور طالب علم پڑھتے ہیں۔ ان کی خبر گیری نان و پارچے کی ان کی سرکار عالی سے ہوتی ہے۔ سبحان اللہ غور کرو کیا چشمۂ فیض ہے کہ ان کی ذات فیض آیات سے جاری ہے اور شجر ہائے بر بار دین کو پانی دیتا ہے۔ دنیا میں بجز نیک نامی کے کچھ نہیں رہتا اور عقبیٰ میں بجز اعمال کے کچھ نہیں جاتا۔ یہ دونوں باتیں اللہ تعالےٰ نے انھیں کے لئے پیدا کی ہیں۔ اللہم زد فزد۔"

مولانا ابو یوسف بیابانی آپ فقہ و حدیث اور علوم عقلیہ کے مشہور علماء میں سے تھے۔ شاہ جہاں نے ان کو اپنے لشکر کا میر عدل مقرر کیا تھا۔ حدیث پر اُن کی خصوصی نظر تھی۔ اپنے درس میں فاضل سیالکوٹی کی طرح تنقید

کرتے تھے۔ آپ کی تصانیف الخیر الجاری فی شرح البخاری المسلم، المصطفیٰ فی شرح المو اور دوسرے حواشی تحریر فرمائے۔

بختاور خاں نے مراۃ العالم میں لکھا ہے کہ عالمگیر نے بھی ان کو لشکر کا ناظم عدل مقرر کیا تھا۔ ۱۰۹۸ھ کو دہلی میں فوت ہوئے اور اپنے گھر میں مدفون ہوئے۔ ؎۱

مولانا مفتی صدرالدین صاحب نے دارالبقاء میں طالب علم کو تعلیم دلانے کے لئے جو معلّم و اُستاد مقرر کئے تھے ان میں سے وہ حضرات یہ تھے:

حاجی مولوی محمدؐ صاحب جو تپور کے رہنے والے تھے حج کرنے کے بعد دہلی میں آئے اور مولانا اسحاق صاحب سے کتب حدیث پڑھیں۔ اگرچہ دوسرے فنون سے بھی واقف تھے لیکن فن حدیث سے پوری طرح باخبر تھے۔ انتہائی نیک سیرت اور متقی عالم تھے جناب مولانا سرفراز صاحب معقول و منقول حکمت، ہندسہ اور ہیئت پڑھاتے تھے۔ ان علوم میں ان کو کمال حاصل تھا۔ انھوں نے کتب حدیث مولوی صدرالدین صاحب سے پڑھی تھی ؎۲

اس مدرسہ کو جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے منہدم کر دیا تھا۔

مدرسہ درگاہ رسول نما

حضرت سید حسن رسول نما نے اس درگاہ میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ اس مدرسہ کے ایک طالب علم مولانا سید طفیل بلگرامی بن سید شکر اللہ حسنی تھے۔ جو ذی الحجہ ۱۱۳۷ھ کو اترولی آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے چچا سید حسن اللہ ان کو دہلی

؎۱ نزہت الخواطر ص ۲۴۳

؎۲ آثار الصنادید ص ۲۹۶

اپنے ہمراہ لائے جہاں آپ نے سید حسن المقلب بہ رسول نما سے میزان الصرف کو پڑھنا شروع کیا۔ پھر ملا جامی تک اپنے چچا سید جان محمد بلگرامی سے پڑھا۔ بلگرام پہنچے، سید مزمل متوفی ۱۱۱۵ھ حاجی سید سعد اللہ متوفی ۱۱۳۹ھ تلمیذ ملا عبدالرحیم مراد آبادی، قاضی علیم الدین پہندوی متوفی ۱۱۴۵ھ اور سید قطب الدین شمس آبادی سے مختلف علوم تحصیل کئے۔ پھر ستر برس تک علوم کو زندہ کیا۔ شادی نہیں کی تھی۔ آپ شعر بھی کہتے تھے۔ عالم، فاضل، عارف کامل، فقیہہ، ادیب، جامع علوم نقلیہ و عقلیہ تھے۔ ۱۱۸۵ھ کو بلگرام میں فوت ہوئے "تلخ مذہب" تاریخ وفات ہے [1]

سید حسن رسول نما

حضرت رسول نما حضرت کاظمؒ کی اولاد میں تھے۔ آپ ولی کامل اور صاحب کرامت بزرگ تھے زیارت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کرا دیتے تھے۔ اس لئے رسول نما مشہور ہوئے۔ آپ اپنے والد ماجد کے ساتھ بخارا سے ہندوستان آئے اور موضع موہان میں جو لکھنؤ کے قریب ہے سکونت پذیر ہوئے۔ پھر آگرہ چلے گئے، وہاں جامع مسجد آگرہ کے متصل ایک مقام پر چلہ کشی کی۔ پھر وہاں سے نارنول اپنے عم بزرگوار میراں تاج الدین شیر سوار چشتی کی خدمت میں آگئے اور ان سے فیض حاصل کیا۔ عالمگیر کے عہد میں دہلی آئے۔ آپ کبھی کسی امیر کے گھر نہیں گئے۔ دولت مندان کے ہاں آتے تو ناخوش ہوتے تھے۔ درویشوں، مسکینوں اور مسافروں کی خاطر مدارات کرتے تھے۔ ۱۱۰۳ھ میں عالمگیر کے عہد میں فوت ہوئے اور اپنے مدرسہ کے صحن میں دفن ہوئے۔ [2]

مدرسہ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی

شیخ صاحب کی پیدائش

---

[1] حدائق الحنفیہ صفحہ ۴۴۲

[2] مزارات اولیا دہلی صفحہ ۱۶۰

سنہ کے مطابق ۱۷۰۷ء میں ہوئی تعلیم پانے اور سند سے فارغ ہونے کے بعد غالباً ۱۷۱۹ء میں عالمگیر کے عہد میں اپنا مدرسہ جامع مسجد کے قریب خانم کے بازار میں قائم کیا جس میں آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ شاہ صاحب کی علمی شہرت بہت جلد تمام ملک میں پھیل گئی اور دور دور سے طلباء آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ چنانچہ صاحب شجرۃ الانوار نے اس سلسلہ میں لکھا ہے۔

"بہت سے طلبا ان کی خدمت میں آکر رہتے اور علم حاصل کرتے تھے۔ ان کو کھانا اور کپڑا بھی سرکار سے ملتا تھا"

شاہ صاحب حدیث کا درس دیتے تھے اور اس میں خاص دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ مرزا مظہر جان جاناں ایک مرتبہ آپ کے مدرسہ میں رونق افروز ہوئے تھے دیکھا کہ آپ بخاری کے درس میں مشغول تھے[1] حضرت شیخ اورنگ آبادی نے بھی اسی مدرسہ میں علوم دینی کی تعلیم پائی تھی۔

شیخ صاحب تعلیم پر زیادہ زور دیتے تھے اور اپنے مریدوں کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے بلکہ اوقات تعلیم بھی مقرر فرما دیتے تھے چنانچہ آپ اپنے ایک خط میں اپنے ایک مرید کو تحریر کرتے ہیں :۔

"شریعت را احکام باید نمود۔ یاران اہل علم را درس تفسیر و حدیث و عبادات و فقہ درمیان ظہر و عصر و بعد از صبح بگوئید و اہل شوق کہ اندکے تعلیم آشنا باشد درس لمعات و لوائح و امثال آں بہر حال مراتب تمکین یہ از مراتب تلوین است"

اس مدرسہ میں جہاں اور اصحاب نے تعلیم پائی وہاں آپ کے صاحبزادے محمد ہاشم

---

[1] انوار العارفین صفحہ ۴۲

کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :-

"ایشاں را اذن و اجازت الٰہ آباد دادہ کہ رخصت الہ آباد نمودند ایں جا محمد ہاشم بہم رسید، چوں بہ ہفت سالگی رسید۔ درگذشتند حالا خانقاہ روضہ پدر آنجا است مزار متبرک۔ ایں فرزند بہ تحصیل علم مشغول شدہ بہ دہلی آمدہ ہفت ہشت سال[1] در مدرسہ دہلی مشغول شدہ تا بعضے مردم از ایشاں فارغ شدند چوں بسیار صالح و فقیر زادہ بود۔ ایں عقد منعقد شد"

مدرسہ شاہ ابو الرضا شاہ ابو الرضا رحمۃ اللہ علیہ شاہ وجیہ الدین کے صاحب زادے، شاہ عبد الرحیم صاحب کے بڑے بھائی اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے تایا تھے۔ آپ نے حافظ نصیر سے تمام علوم ظاہری حاصل کئے جو شاہ جہاں کے عہد کے ایک بڑے نامور اور مشہور فاضل اور جامع علوم فنون تھے۔ شاہ ابو الرضا کی پوری زندگی درس و تدریس میں گذری۔ آپ نے شروع ہی سے طلباء کو ہر قسم کے علوم و فنون کا درس دینا شروع کر دیا تھا۔ لیکن آخر عمر میں سوائے تفسیر بیضاوی اور مشکوٰۃ شریف کے یعنی قرآن و حدیث کے علاوہ کسی علم کا درس دینا پسند نہیں کیا۔ کیوں کہ آپ کی طبیعت علم رسمیہ سے ہٹ کر قرآن و حدیث کی طرف مائل ہو گئی تھی اور انہی دونوں کے مطالعہ اور اس سے خاص دل چسپی لیتے تھے[2]۔ شاہ صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی شیخ عبد الرحیم صاحب کو چار سال کی عمر میں تعلیم و تربیت دینی شروع کر دی تھی۔ جو علمی کمالات شیخ عبد الرحیم کو حاصل ہوئے، وہ انہی کی تعلیم و تربیت

---

[1] حیات ولی۔ صفحہ ۱۸۲

کا اثر تھا حضرت شاہ محمد پھلتی جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے نانا تھے۔ انھوں نے حضرت شاہ ابوالرضا رحمۃ اللہ علیہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ [۱]

حضرت شاہ ابوالرضا

شاہ ابوالرضا صاحب دہلی میں شاہجہاں کے عہد میں ۱۰۴۰ھ میں پیدا ہوئے [۲] اس زمانے میں ان کے والد ماجد کی حالت اچھی نہیں تھی معمولی تھی بعد میں حالات نے پلٹا کھایا تو عالمگیر کے زمانہ میں آپ کے والد ماجد شاہ ابوالرضا نے حافظ بصیر سے تعلیم کی تکمیل کی۔ فوائد المعرفۃ میں لکھا ہے :-

"شاہ ابوالرضا مستعد علم و فنون میں اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتے تھے جسے فطرت کی بخشش اور عنایت سمجھنا چاہیے۔ آپ کا ذہن و حافظہ اس بلا کا تھا کہ ایک مختصر زمانہ میں مختلف علوم و فنون حاصل کر لئے تھے"

شاہ صاحب تعلیم پانے کے بعد حضرت خواجہ باقی باللہ کے فرزند جناب خواجہ خرد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور کمالات باطنی سے فیضیاب ہوئے۔ آپ کو شاہی دربار سے ایک عہدہ تفویض کیا گیا جس کو آپ نے قبول نہیں کیا اور عزلت نشینی اختیار کی۔ حتیٰ کہ عزیز و اقارب سے بھی ملنا جلنا ترک کر دیا۔ اور فیروزآباد کی مسجد کے قریب ایک تنگ و تاریک حجرہ میں سکونت اختیار کی۔ اس زمانہ میں آپ پر تین تین دن کے فاقے گذر جاتے تھے اور کھانے کے لئے صرف جو کی روٹی اور چھاچھ

---

[۱] حیات ولی۔ ص ۱۹

[۲] واقعات دارالحکومت دہلی دوم ص ۴۵۸

میسر ہوئی تھی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد خدائے تعالیٰ کا کرم ہوا۔ اور دیکھتے دیکھتے ایک خوشنما اور عالی شان حویلی آپ کے لئے تیار ہو گئی۔ اور معاشی حالت بھی بدل گئی ہے۔

فضل و کمال کے اعتبار سے شاہ ابوالرضا جس درجے کے عالم تھے ہندوستان کی تمام مجلسیں ایسی شخصیت سے خالی تھیں۔ وہ کون سا علم تھا جس میں آپ کو تجربہ نہ تھا۔ علوم نقلی و عقلی پر آپ کو تمام و کمال عبور حاصل تھا۔ آپ کا دستور تھا کہ نماز جمعہ کے بعد وعظ فرمایا کرتے تھے۔ ہر درجے اور ہر رتبے کے آدمی جن میں طالب علم، علماء، صوفیا، رئیس اور شہزادے وغیرہ شرکت کرتے تھے۔ آپ کے وعظ میں بلا کا اثر تھا۔ سامعین کے دلوں پر ایک چوٹ سی لگتی تھی۔ اور سب کے دل کانپ اٹھتے تھے اور اس شدت سے گریہ وزاری کرتے کہ سکوت و خاموشی کی فضا میں زلزلہ پڑ جاتا تھا۔ سنگ دلوں کو نرم دل کر دینا اور عباد و زہاد کے دلوں کا مالک بن جانا یہ شاہ صاحب کے نزدیک کوئی بات نہ تھی۔ لہ

آپ کے مزاج میں حد درجہ کا استغنا تھا۔ ہر شخص سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتے تھے لیکن دولت مندوں سے نفرت کرتے تھے۔ عالمگیر جیسے بادشاہ نے کئی مرتبہ درخواست کی کہ اگر اجازت ہو تو در دولت پر حاضر ہو کر سعادت دست بوسی حاصل کروں لیکن آپ نے آنے کی اجازت نہیں دی۔ متمول لوگوں کی طرف التفات نہ کرتے اور تحفے و تحائف قبول نہیں فرماتے تھے۔ البتہ اگر کوئی غریب مسلمان چار پانچ پیسے ہدیۃً پیش کرتا تو اسے بڑی مسرت کے ساتھ لیتے اور اس کے حق میں دعائے خیر فرماتے۔ شاہ صاحب صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ شیخ معظم چلپی نقل کرتے ہیں کہ اورنگ زیب کے عہد میں شامی کے کفار نے ایک مقام پر قبضہ کر لیا تھا جس کا قبضہ واپس لینے کے لئے مسلمان فوج بھیجی گئی ایک

لہ حیات ولی صفحہ

خطرناک جنگ ہوئی جس میں مشہور ہوگیا کہ لشکر کفار نے مسلمانوں کی فوج کو بے حد نقصان پہنچایا اور کفار کا ایک آدمی بھی مارا نہیں گیا۔ اس خبر سے حکام میں عام بے چینی پھیل گئی۔ شاہ صاحب کے رفقاء نے دعا کی درخواست کی آپ نے دعا فرمائی۔ کچھ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ شاہ صاحب نے نہایت مسرت سے فرمایا کہ الحمدللہ مسلمانوں کی فتح ہوگئی اور مخالفوں کا لشکر شکست کھا کر بھاگ گیا۔ آپ کے رفقاء جب آپ کی محفل سے اٹھے تو تمام شہر میں اس فتح کی خبر پھیلا دی۔ رفتہ رفتہ عالمگیر تک بھی یہ خبر پہنچائی لیکن شہر میں کیسے پھیل گئی تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ شیخ ابوالرضا نے کشف کے ذریعہ یہ خبر دی ہے۔ آپ کے پاس دربار سے ایک معتمد آدمی پہنچا۔ شاہ صاحب نے اس کو جنگ کے مفصل حالات بتائے۔ چند روز کے بعد جب یہ حالات مخبروں کی معرفت دربار میں پہنچے تو ان واقعات و حالات میں اور شاہ صاحب کے بتائے ہوئے حالات میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں تھا۔

ایک دفعہ مسجد میں ایک عورت کا جنازہ لایا گیا۔ شاہ صاحب سے نماز جنازہ پڑھانے کے لئے کہا گیا۔ آپ جنازہ کے قریب پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ یہ عورت تو زندہ ہے ایسی صورت میں نماز پڑھانا جائز نہیں ہے۔ عورت کے ورثاء نے اصرار کیا یہ عورت مر چکی ہے ہم نے اچھی طرح معلوم کرلیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ آپ کی معلومات درست نہیں ہے۔ یہ عورت زندہ ہے۔ آخر کار جب جنازہ کھول کر دیکھا گیا تو عورت زندہ تھی۔ جنازہ اٹھا کر لے گئے اس کے ایک روز کے بعد عورت مر گئی۔

آپ کا انتقال ۷ ارمحرم ۱۱۰۱ھ کو دہلی میں ہوا۔ آپ کی قبر درگاہ بستی حضرت نظام الدین اولیاء میں ہے۔ آپ کے وصال کی تاریخ "آفتاب حقیقت" ہے۔ علاوہ آپ کے مزار کے اس جگہ آپ کے اہل وعیال اور دیگر بزرگوں کی قبریں بھی تھیں [1]

[1] واقعات دارالحکومت دہلی دوم صفحہ ۴۵۹

ملک کو ۱۹۲۲ء میں آزادی ملی۔ اور اس کا ثمرہ یہ ملا کہ حضرت شاہ صاحب اور ان کے بزرگوں کے مزارات پر اور برائے ہوسٹل تعمیر ہوا ہے۔

مدرسہ رحیمیہ مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب نے عالمگیر کے عہد میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مدرسہ رحیمیہ مہندیوں میں قائم کیا۔ اس میں علوم دینی کی تعلیم دینی شروع کی تعلیم کا اثر اس قدر ہوا کہ دور دراز شہروں سے جوق در جوق طلبا رحدیث پڑھنے کے لئے آنے لگے۔ اور لوگوں میں ایک طرح کی تحریک پیدا ہوگئی[۱] اور یہاں درس وتدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مروجہ نصاب میں اصلاح کرکے اپنا نصاب جاری کیا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی تصنیف الجزء اللطیف میں یہ نصاب رحیمیہ تحریر کیا ہے:۔

"کافیہ شرح جامی، شرح شمسیہ، قطبی، شرح مطالع، شرح ہدایت الحکمت، شرح عقاید نسفی (مع حاشیہ جلالی) شرح مواقف وشرح وقایہ، ہدایہ کامل، مسائل اندلسی قدرے توضیح تلویح، مختصر مسطول مشکوٰۃ المصابیح، شمائل ترمذی، کسی قدر صحیح بخاری بیضاوی عوارف، رسائل نقشبندیہ، شرح رباعیات جامی، مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد النصوص"۔

شاہ عبدالرحیم صاحب نے اپنے صاحبزادے شاہ ولی اللہ کو پندرہ سال کی عمر میں بیعت کیا۔ دو سال کے بعد ان کے والد فوت ہو گئے تو سترہ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد کے مدرسہ رحیمیہ میں علوم دینی کی تعلیم دی طبیعت میں اجتہادی قوت ازل سے ودیعت کی گئی تھی نئے نئے نکات نکالے۔ زمانے میں شہرت حاصل کی مسلم الثبوت استاد مانے گئے۔ حتیٰ کہ موافق ومخالف سب آپ کے اقوال

---

[۱] ہندوستان کی قدیم درسگاہیں صفحہ ۹۲

سے سند پڑھنے لگے [1]

۱۱۴۳ھ میں حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ ۱۱۴۵ھ میں دہلی واپس آئے۔ مدرسہ رحیمیہ میں تفسیر کا درس دینا شروع کیا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بعد آپ نے علم حدیث کو فروغ دیا۔ اطراف و اکناف ہندوستان میں آپ کی حدیث دانی کا شہرہ ہوگیا۔ گروہ در گروہ طلباء آنے لگے۔ پرانی دہلی دارالحدیث بن گئی۔ آپ نے ہر ایک فن کے لئے ایک قابل شخص کی تعلیم و تربیت کی۔ اور پھر ان فنون کی تعلیم اس کے سپرد کی۔

شاہ صاحب ہر ایک طالب علم کے ساتھ خواہ کسی رتبہ اور درجہ کا ہوتا تھا۔ اخلاق اور فیاضی سے پیش آتے تھے اور سب کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کرتے تھے۔ اور نہایت محنت و جفاکشی سے تعلیم دیتے تھے۔ ان کے ضروری حوائج رفع کرنے میں انتہا سے زیادہ ساعی ہوتے تھے بلکہ بعض مفتی اور قابل طلباء کو اپنی ذات سے امداد دیتے تھے اور بہت ہی دلجوئی سے اس کو خوش رکھتے تھے جس کی وجہ سے مدرسہ کی شہرت ہونے لگی۔ اور طلباء کے جمگھٹے ہونے لگے تھے [2]

اس درس نے حضرت شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالغنی، شاہ محمد اسحاق، مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی وغیرہ جیسے حضرات پیدا ہوئے۔ بہادر شاہ اوّل اور محمد شاہ کے عہد میں حضرت شاہ عبدالرحیم کے مدرسہ کو حضرت شاہ ولی اللہ کے درس سے بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اور شاہ عبدالعزیز کے زمانہ سے

---

[1] ہندوستان کی قدیم درسگاہیں صفحہ ۹۶ [2] حیات ولی صفحہ ۲۳۱

[3] حیات ولی صفحہ ۲۳۱

اکبر شاہ ثانی تک اس درس کی کافی شہرت ہوئی۔

محمد شاہ نے شاہ عبدالعزیز کو بلا کر کلاں محل کے قریب جو شہر کا حصہ تھا ایک عالی شان مکان بنوا دیا جس میں آپ نے مدرسہ قائم کیا جو مدرسہ شاہ عبدالعزیز کے نام سے مشہور رہا۔ اس مدرسہ کے قائم ہونے کے بعد مدرسہ رحیمیہ ختم ہو گیا۔

خلیق احمد نظامی صاحب کو اس مدرسہ کے بارے میں غلط فہمی ہوئی جو انھوں نے اپنی تصنیف "مشائخ چشتیہ" میں یہ تحریر فرما دیا۔

یہ وہی مدرسہ ہے جس کی نسبت مولوی بشیر الدین صاحب مرحوم لکھتے ہیں :-

"اب اس مدرسہ میں چھوٹے مکان بن گئے۔ چوہان، کسان وغیرہ غریب لوگ رہتے ہیں۔ یہیں ایک چھوٹی سی مسجد آپ (شاہ ولی اللہ) ہی کے نام سے مشہور ہے جس میں آپ نماز پڑھا کرتے تھے اب چونکہ یہ کل جائیداد رائے بہادر لالہ رام کشن صاحب کی ہے اس لئے اس گلی پر "مدرسہ رائے بہادر لالہ رام کشن داس" کا تختہ لگا دیا گیا ہے۔"

(واقعات دار الحکومت دہلی جلد دوم صفحہ ۱۹۷)

خلیق صاحب غلطی سے اس مدرسہ کو مدرسہ رحیمیہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ حالانکہ یہ عبارت شاہ محمد اسحاق کے مدرسہ کے بارے میں "واقعات دار الحکومت" میں لکھی گئی ہے۔ اسی طرح جس چھوٹی مسجد کا حوالہ واقعات دار الحکومت دہلی میں دیا گیا ہے وہ شاہ اسحاق صاحب سے منسوب کی گئی ہے نہ کہ شاہ ولی اللہ صاحب سے منسوب کی گئی ہے۔ شاہ عبدالرحیم صاحب کا مدرسہ رحیمیہ مہندیوں میں تھا نہ کہ بازار سوئیوالان میں۔

مدرسہ غازی الدین خاں یا دہلی کالج

شاہ عالم بادشاہ بن عالمگیر کے عہد میں ۱۷۱۰ء سے قبل اس مدرسہ کی عمارت تعمیر ہو چکی تھی۔ اور یہ عمارت میر شہاب الدین خاں المخاطب بہ غازی الدین خاں فیروز جنگ نے اپنی زندگی میں بنوادی تھی۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے "مرحوم دہلی کالج" میں تحریر فرمایا ہے:۔

"مدرسہ غازی الدین خاں کی ابتداء ۱۷۹۲ء میں ہوئی"

صحیح نہیں ہے:۔

۱۷۱۰ء سے قبل اس مدرسہ میں تعلیم ہونی شروع ہو گئی تھی اور ۱۷۲۰ء تا ۱۷۳۲ء کے درمیان محمد شاہ کے عہد میں احمد ابن مرزا محمد اسحاق جو اپنے زمانہ کے محدث تھے۔ ہرات سے دہلی آئے پہلے آپ غازی الدین خاں کے مدرسہ کے امام اور بعد میں مدرس مقرر ہوئے۔ آپ کے زمانہ میں مرزا جان اس مدرسہ کے متولی اور مولوی نذیر محمد مدرس تھے جن سے آپ کے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات ہو گئے تھے۔

چنانچہ صاحب وقائع عبدالقادر خاں تحریر کرتے ہیں:۔

"احمد سید سے دہلی پہنچے۔ کچھ عرصہ تک ان کو کسی نے نہ پوچھا۔ یہاں تک کہ جو سرمایہ پاس تھا خورد و نوش میں ختم ہو گیا، بغیر دستگیری کے مدرسہ غازی الدین میں امامت کی جگہ مل گئی اور مولوی نذیر محمد مدرس اور مرزا جان (متولی) سے دوستانہ بلکہ برادرانہ راہ و رسم پیدا ہو گئی (۴۷)"

تذکرہ کاملان رام پور کے مؤلف لکھتے ہیں:۔

"محمد شاہ بادشاہ نے آپ کی قابلیت و لیاقت کی وجہ سے نواب

غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ کے مدرسہ میں مدرس اعلیٰ مقرر کردیا - (۱۷۹۲ء)

مدرسہ غازی الدین خاں میں ۱۸۲۴ء میں مولوی عبداللہ مدرس تھے - ان سے صرف نو طالب علم تعلیم پاتے تھے - ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ دہلی کالج میں تبدیل ہوگیا تھا ٹو مسٹر جے - اے ٹیلر مقامی مجلس کے سکریٹری ایک سو چھتر روپے ماہانہ پر پرنسپل مقرر ہوئے ہیڈ مولوی کی تنخواہ ایک سو بیس روپے قرار پائی اور دو اور مولوی پچاس پچاس روپے کے رکھے گئے - باقی بیس بیس اور تیس تیس روپے پر تھے طلباء کے لئے بھی وظائف مقرر ہوئے [1]-

جب کالج میں انگریزی جماعت کا اضافہ ہوا تو اس سے دہلی کے لوگوں میں بڑی بے چینی پھیلی ہندو مسلمان دونوں نے اس کی مخالفت کی دین دار بزرگوں کا خیال تھا کہ یہ نوجوانوں کے مذہب کو بگاڑنے اور اندر ہی اندر عیسائی مذہب پھیلانے کی ترکیب ہے۔

دہلی کالج میں وظیفوں کا کیا معیار تھا اور داخلہ کن طریقوں سے ہوتا تھا۔ وہ دہلی اردو اخبار کے ۲۵ اپریل ۱۸۴۱ء کے تراشے میں پڑھیئے۔

گورنمنٹ نے آگرہ اور دہلی کے مدرسوں کے طالب علموں کے لئے واسطے زر مفصل ذیل بطریق وظیفہ از راہ عنایت کے معین فرمایا ہے - آگرہ ۵۸۵ روپے ماہواری دہلی ۳۳۸ روپے ماہواری - یہ تمام روپیہ بطریق ذیل کے تقسیم کیا جائے گا تفصیل آگرہ اور دہلی کے وظیفہ داروں کی جو گورنمنٹ سے مقرر ہونگے وظیفہ داران ادنیٰ ۲۲ چار روپے ماہانہ، یہ وظیفہ چند برس تک جاری رہے گا، اور ہر سال آٹھ آٹھ وظیفہ دار خارج داخل ہوا کریں گے۔ وظیفہ داران اعلیٰ

---

[1] مرحوم دہلی کالج صہ ۱۶

۱۲ نفران میں سے آٹھ نفر سولہ سولہ اور چار اٹھارہ اٹھارہ روپے ماہانہ پایا کریں گے۔
اور اس درجہ میں تین برس تک رہیں گے۔ اور ہر سال ان میں سے چار چار شخص داخل
خارج ہوا کریں گے۔ دہلی کے مدرسہ میں عربی اور فارسی افضل طلبا کو تین حصے سنسکرت
اور ہندی کے اکمل طلبار کو ایک حصہ عنایت ہوگا تفصیلِ زرِ عطیہ نواب اعتماد الدولہ
بہادر وظیفہ داران ادنیٰ سولہ نفر جس کا چار چار روپے ماہانہ، چار برس تک رہے گا۔
اور ان میں سے سال بہ سال چار چار نفر خارج اور داخل ہوا کریں گے۔ وظیفہ داران
اعلیٰ نفر بیس بیس روپے ماہانہ تین برس تک پائیں گے۔ اور ہر سال اُن میں سے ایک
ایک شخص خارج داخل ہوا کرے گا۔ یہ وظیفہ صرف عربی اور فارسی کے افضل طالب
علموں کو مرحمت ہوگا۔ آگرہ کے مدرسہ میں ماہ ستمبر کے آخر کو، اور دہلی کے مدرسہ میں
ماہ اکتوبر کے اول میں امتحان ہوا کرے گا۔ اس وقت وظیفہ مذکور کے امید
واروں میں جو افضل پایا جائے گا داخل ہو سکے گا بشرطیکہ وظیفہ دار ادنیٰ کی عمر
سولہ برس سے سوا اور وظیفہ دار اعلیٰ کی عمر ۲۰ برس سے زیادہ نہ ہو۔ جو کہ امتحان میں
سب سے افضل ہوگا وہ پوری میعاد میں مقرر رہے گا اور جو اس سے کم ہوگا کم میعاد میں
مقرر کیا جائے گا۔ اس وضع پر کہ یہ آئندہ ہر سال میں خارج داخل اوپر کے سلسلے
کے موافق ہوگا۔ لیکن جو کم میعاد میں داخل کیے جائیں گے سو آئندہ امتحان میں پھر پوری
میعاد کے لائق ہو سکیں گے۔ ۱ سال گذرنے کے بعد وظیفہ داروں کی معین ہونے کی
شرائط جب کہ انتظام قرار واقعی ہوگا مشتہر کیے جائیں گے جو طالب علم کہ عمر مناسب
اور کچھ علم سے بہرہ یاب ہوں اُن کے فوراً داخل کرنے کا مدرسہ مذکورین کے پرنسپل
یعنی صاحبان مہتمم کو اختیار ہوگا اور در صورتیکہ عمر بیس برس سے زیادہ نہ ہو اور کتب
مفصلہ ذیل امتحان دے سکے یعنی عربی اور فارسی کے مدرسوں میں ہدایت النحو،
الف لیلیٰ یا نفحتہ الیمن گلستان اور انشار مادھو رام لئے، سنسکرت کے درجے میں

لکھو کہ ہو پریذیڈنٹ کو ایسے طالب علموں کا تین تین روپے ماہانہ واسطے قوت بسری کے ہوگا۔ مگر یہ مشاہرہ ماہ ستمبر اور ماہ اکتوبر کے امتحان تک فقط بحال رہے گا۔ اور یہ بھی شرط ہے کہ مشاہیر مذکور کا مصارف زر مرقومہ بالا سے متجاوز نہ ہو جو شخص مدرسہ میں داخل ہونے کا امیدوار ہو آگرہ کے مدرسہ میں بٹلر صاحب پرنسپل اور دہلی کے مدرسہ میں بوٹروس صاحب پرنسپل کی خدمت میں اپنی اپنی درخواست گزارے، ماہ ستمبر اور ماہ اکتوبر آئندہ میں وظیفہ داروں کا امتحان ہوگا۔ اس کی کیفیت تفصیل ذیل سے واضح ہوگی کہ امیدواران وظیفہ عربی اور فارسی کے امتحان کے لئے عربی، صرف و نحو، عروض نفحۃ الیمن، تاریخ تیموری، مقامات حریری، فارسی، انشاء ابوالفضل، انوار سہیلی سکندر نامہ فارسی یا اردو کا ترجمہ عربی اور فارسی میں طبع زاد مضمون تحریر کرے، کسی علم کو بیان کرے جیسی واسطے آگرہ اور دہلی کے مدرسوں کا منتظم آگرہ ۸ راپریل ۱۸۴۱ء۔

اس کالج میں انگریزی، عربی، فارسی، سنسکرت اور اردو کی تعلیم دی جاتی تھی، وظیفہ ملنے کی وجہ سے طلبا تعلیم میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے ۱۸۳۲ء میں طلبا کی کل تعداد ۲۸۸ تھی اس میں وظیفہ پانے والے ۲۵۹ تھے ۱۸۳۶ء میں پچاس طالب علم کم ہوگئے، دوسرے سال ۱۱۶، اور کم ہوگئے۔ ۱۸۳۸ء میں بھی اور کمی ہوئی نتیجہ یہ ہوا کہ یا تو ۱۸۳۳ء میں ۲۳۱ طالب علم تھے یا ۱۸۴۲ء میں ۱۱۱ رہ گئے یعنی نصف سے بھی کم ہوگئے۔ اس کی وجہ وظیفہ کا بند ہو جانا تھا۔

دہلی کالج کا تعلیمی معیار بلند تھا لیکن دہلی والوں کی نظروں میں یہ کالج بہت کھٹکنے لگا تھا اس لئے کہ عیسائی مشنریوں کا یہ مرکز بن گیا تھا۔ اس میں عیسائی مشنری اور خاص طور پر کالج کا پرنسپل ٹیلر عیسائیت کی حقانیت کا بے پناہ پروپگنڈہ کرتا تھا جس کا نتیجہ کہ ۱۱ جولائی ۱۸۵۲ء کو ماسٹر رامچندر اور چمن لال عیسائی ہوگئے یہ کالج کے اساتذہ تھے۔ اس خبر کے شہر میں پہنچتے ہی کالج کا داخلہ بند ہوگیا۔ اور کالج لڑکوں نے فوراً کالج

سے اپنے نام کٹوا لئے۔ کالج کی اس خطرناک فضا کے بارے میں ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ایک لیکچر میں روشنی ڈالی ہے:۔

"سائنس کی صدائیں در و دیوار میں پڑی گونج رہی تھیں بلکہ ایک وقت تو ایسا آیا کہ گرجتے گرجتے ڈھول بجنے لگے یعنی سائنس کے پروفیسر ماسٹر رامچندر صاحب جو ذات کے کائستھ تھے اور جنہوں نے "میکسما اینڈ منا" تصنیف کر کے تمام یورپ میں اپنی ریاضی دانی کا سکہ بٹھا دیا تھا اصطباغ لینے پر آمادہ ہوئے۔ وہ علمی سوسائٹی میں بڑے نامی آدمی تھے اور انھوں نے ڈنکے کی چوٹ پر عیسائی ہونا چاہا تو تمام شہر میں ڈھنڈورا سا پٹ گیا۔ اور جابجا مباحثے کی مجلسیں گرم ہوگئیں۔ مذہبی جماعتوں، مولویوں اور طالب علموں کے ساتھ مجھے آئے دن جوڑ ہوتی رہتی تھی۔ میں دیکھتا تھا کہ مولوی چپ تو نہیں ہوتے تھے۔ کچھ نہ کچھ کہے ہی جاتے تھے مگر وہ سمجھنے والے کے نزدیک لاجواب ہونے کے برابر تھا۔ اس لئے کہ یہ لوگ عیسائی مذہب کے کونے کھدرے سے محض ناواقف تھے۔ ان کو خبر ہی نہ تھی کہ عیسائیوں میں کہاں کہاں پانی مرتا ہے ورنہ ترا معاوضہ بالمثل ماسٹر صاحب کو بند کرنے کے لئے بس کرتا تھا۔ غرض بات کہوں صاف، سائنس کے زہر نے باوجودیکہ میں نے اس کو ذرا چکھا ہی تھا۔ میرے ایمان کو ڈانواں ڈول کر دیا تھا" ۱؎

ابتدا سے دہلی کالج مدرسہ غازی الدین خاں میں تھا۔ ۸ اپریل ۱۸۴۱ء کو کتب خانہ دارالشکوہ میں تبدیل ہوگیا۔ ۱۸۵۶ء میں طلبا کی تعداد ۳۷۲ تھی۔ شعبہ شرقی میں فارسی کی تین جماعتیں تھیں۔ ہر ایک جماعت کے دو فریق تھے اور چار عربی

۱؎ ڈپٹی نذیر احمد کے لیکچروں کا مجموعہ صفحہ ۳۲

کی جماعتیں تھیں۔ شعبہ فارسی میں ۹۶، اور شعبہ عربی میں ۳۹ طالب علم تھے۔ ان کے جماعتوں کے علاوہ سائنس کی بھی جماعتیں تھیں جن میں مغربی سائنس اردو زبان کے ذریعہ پڑھائی جاتی تھیں۔

دہلی کالج عیسائی مشنریوں کا مرکز تھا۔ یہ بات تمام ہندوستان میں مشہور ہوگئی تھی۔ اور ماسٹر رام چندر اور ڈاکٹر چمن لال نے عیسائی مذہب اختیار کرنے سے اس بات کو اور شہرت ملی۔ چنانچہ جب ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی میں مجاہدین راجگھاٹ سے داخل ہوئے۔ انگریزوں کو قتل کرنے کے ساتھ ڈاکٹر چمن لال کو بھی قتل کیا اور ماسٹر رام چندر کی کھوج میں رہے، وہ بچ نکلے۔ دہلی کالج پہنچے اس کو لوٹا اور کالج کے پرنسپل کو قتل کر دیا۔[1]

جب انگریز دہلی پر قابض ہوگئے تو کالج پر فوجی افسروں نے قبضہ کر لیا۔ کالج یکم مئی ۱۸۶۴ء کو کھلا۔ اپریل ۱۸۷۷ء کو دہلی کالج کے وجود کا خاتمہ کر دیا گیا اور اس کا اسٹاف لاہور کالج میں بھیج دیا گیا اور اس کالج کو لاہور کے کالج میں ضم کر دیا۔ یہ کالج ۱۸۴۱ء سے ۱۸۵۷ء تک کتب خانہ دارا شکوہ میں رہا۔ غازی الدین خاں کی عمارت میں جو گل کھلے گئے وہ یہ تھے:-

کتب خانہ دارا شکوہ میں ۱۸۴۱ء کی منتقلی کے بعد غازی الدین خاں کی عمارت پرنسپل کی تفویض میں رہی جو طلبا کے لئے بورڈنگ ہاؤس کی حیثیت سے کام آئی۔ اس کے بعد یہ عمارت پرنسپل سے لے کر اس میں کلکٹر صاحب ضلع نے ایک ہندوستانی دوا خانہ کھولا جس کا نام دارالشفائے یونانی رکھا۔ اس کے لئے ایک طبیب مقرر کیا گیا جو مریضوں کو مفت دوا تقسیم کرتا تھا۔ اور طلبا کے کمرے میں مریضوں کو رکھا گیا۔

---

[1] تاریخ صحافت اردو جلد اوّل ص ۱۲

غرض کہ جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد جب دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو اس عمارت پر پولیس نے قبضہ کرلیا۔ جو فروری سنہ ۱۸۹۰ء تک جاری رہا۔[1]

فروری سنہ ۱۸۹۰ء میں جب یہ عمارت مدرسہ کو دے دی گئی تو کمرے درست کرائے گئے۔ سنہ ۱۹۰۸ء کو تمام کمروں کے دروازوں کی تیریاں چڑھائی گئیں۔ سنہ ۱۹۱۰ء تک مدرسہ میں انٹرینس تک تعلیم دی جاتی تھی۔ سنہ ۱۹۲۲ء یا سنہ ۱۹۲۳ء میں ایف، اے کی کلاس کھولی گئی۔

اس کالج میں ہندوستان کی مشہور معروف شخصیتوں سرسید احمدؒ، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، ماسٹر رام چندر، منشی ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد صاحب، مولوی کریم الدین پانی پتی، مولوی ضیاء الدین دہلوی، ماسٹر پیارے لال آشوب دہلی، حکم چند، ناصر علی ایڈیٹر صلائے عام دہلی، مدن لال ایڈوکیٹ، ماسٹر نند کشور، پیرزادہ محمد حسین، مسٹر آصف علی بیرسٹر، ماسٹر جانکی پرشاد، ماسٹر کیدار ناتھ، لالہ سری رام ایم۔ اے، مؤلف خم خانۂ جاوید وغیرہ نے تعلیم پائی۔ اور اس کے اساتذہ میں مولوی رشید الدین صاحب، مولوی مملوک علی صاحب، مولانا امام بخش صہبائی، ماسٹر بھیروں پرشاد اور پنڈت رام کشن دہلوی وغیرہ تھے۔

سنہ ۱۸۵۷ء میں یا اس کے بعد جس طرح اس کالج سے انگریزوں نے انتقام لیا تھا۔ کانگریسی حکومت نے بھی سنہ ۱۹۴۷ء کی آزادی کے بعد وہی سلوک اس کالج کے ساتھ کیا۔ فروری سنہ ۱۸۴۸ء تک اس کالج میں مدراس رجمنٹ رکھی اور اب دہلی کالج کا نام ختم کرنے کے لئے اس کالج کا نام ڈاکٹر ذاکر حسین کالج رکھا گیا ہے جس طرح سنہ ۱۸۵۷ء میں دہلی کالج کو انگریزوں نے لاہور کالج میں ضم کر دیا تھا۔

---

[1] واقعات دارالحکومت دہلی۔ دوم ص ۵۷

مسجد و مدرسہ اکبر آبادی

فیض بازار کے مشرق کی جانب ایک ڈاک بنگلہ تھا جس کے پاس اکبر آبادی مسجد تھی یہ اعزاز النساء نے سنہ ۱۱۵۸ھ مطابق سنہ ۱۷۴۵ء میں تعمیر کرائی تھی جس کے متعلق سرسید نے آثار الصنادید میں لکھا ہے:-

"یہ مسجد دلکش، دلربا، فرحت بخش اور روح افزا ہے پاؤں تک سنگِ سرخ کی تھی۔ اور اس کے گرد مکانات اور طالب علموں کے رہنے کے لئے حجرے بنے ہوئے تھے۔ ضلع غربی سے ملحق کرسی دے کر مسجد بنائی ہے۔ اس مسجد کے تین برج اور سات در ہیں مسجد کی عمارت ۴۳ گز طویل اور ۱۷ گز عرض میں تھی۔ ایک چبوترہ اس پر سرخ رنگ کا کٹہرہ لگا ہوا تھا۔ اس کے آگے ایک حوض تھا جس میں نہر کا پانی آتا تھا۔"

اس مسجد میں جہاں عبادتِ الٰہی ہوتی تھی۔ وہاں درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ چنانچہ اس مسجد پر کتبہ لگا ہوا تھا۔ اس میں "طلبہ علم رسانند" بھی تحریر تھا۔ اس کے ایک کمرہ میں شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر نے پوری عمر گذاری۔ اس میں شاہ صاحب وعظ کے ساتھ درس بھی دیتے تھے حضرت سید احمد بریلوی شہید جب دہلی آئے تو اسی مسجد میں مقیم ہوئے اور شاہ عبدالقادر صاحب سے تحصیل علم کیا۔ دور دراز سے جو طلباء دینی علوم حاصل کرنے کے لئے اس مسجد میں آتے تھے، ان کی آپ خدمت بھی کرتے تھے۔ اسی مسجد میں شاہ اسمٰعیل شہید نے شاہ عبدالقادر سے دینی کتب پڑھیں۔ اور اخوند شیر محمد اور مولوی امان علی وغیرہ نے اس مسجد میں شاہ صاحب سے تعلیم پائی۔

مولوی شیر محمد افغانستان میں پیدا ہوئے۔ علوم کی تحصیل کے لئے ہندوستان

آئے۔ دہلی میں آکر اسی مسجد اکبر آبادی میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب سے حدیث پڑھی۔ آپ مولانا اسماعیل شہید کے ہم سبق تھے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ حکیم غلام حسین خاں کے مکان میں مقیم ہوئے۔ شیخ غلام علی صاحب مجددی سے بیعت کی خلافت کا رتبہ پایا۔ حج بیت اللہ کے لئے بے چین رہتے تھے۔ امید بر آئی روانہ ہوئے اور راستہ میں ہی ماہ صفر ۱۲۵۷ھ میں فوت ہوئے۔

مولوی امان علی سادات صحیح النسب تھے۔ مولانا عبدالقادر صاحب سے کتب حدیث پڑھیں طبیعت میں استغنا تھا روزگار کی طرف سے بے پرواہ تھے۔ رزاق انس وجان کے خزانۂ تقدیر سے شب و روز جو وظیفہ پہنچتا تھا۔ اسی پر قناعت کرتے تھے۔ طبابت میں مہارت رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں شفا دی تھی۔ سر سید احمد خاں اُن سے عقیدت رکھتے تھے۔ [1]

مسجد اکبر آبادی کے نزدیک کشمیری کٹڑہ تھا جس میں زیادہ تر کشمیری لوگ بستے تھے۔ کشمیری کٹڑہ کے نزدیک ہونے سے اس کو کشمیری کٹڑہ کی مسجد بھی کہا جاتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں نمایاں طور پر حصہ لیا تھا۔ اکبر آبادی مسجد دہلی کے مجاہدین کا مرکز بنی ہوئی تھی چنانچہ جب دہلی کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ناکام ہوئی اور انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا تو انھوں نے ان مقامات کو جو بغاوت کے مرکز تھے تباہ و برباد کیا جس میں اکبر آبادی مسجد بھی تھی۔ اس مسجد کی تباہی کا ذکر مرزا غالب نے اپنے کئی خطوط میں کیا ہے تحریر فرماتے ہیں:-

---

[1] آثار الصنادید صہ ۲۵۴

[2] تاریخ تعلیم صہ ۲۸۲

"کشمیری کٹرہ کی مسجد زمین کا پیوند ہوگئی۔ سڑک کی وسعت دوچند ہوگئی۔ اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں۔"

مسجد و مدرسہ روشن الدولہ

نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں محمد شاہ کے عہد میں دہلی کو خوب لوٹا۔ سید محمد بلگرامی نے اپنی کتاب تبصرۃ الناظرین میں لکھا ہے کہ نادر شاہ نے قتلِ عام کا حکم مدرسہ روشن الدولہ میں بیٹھ کر دیا تھا۔ دوسرے مورخین نے بھی لکھا ہے کہ یہ حکم مسجد روشن الدولہ میں بیٹھ کر دیا گیا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ روشن الدولہ نے مسجد و مدرسہ دونوں بنوائے تھے۔ یہ مسجد چاندنی چوک میں کوتوالی کے متصل اور فوارہ کے مقابل ہے[۱] جس کو سنہری مسجد کہا جاتا ہے۔

مدرسہ و مسجد شرف الدولہ

یہ مدرسہ و مسجد بازار دریبہ کلاں میں سرراہ ہے جس کو نواب شرف الدولہ نے ۱۱۳۵ھ میں محمد شاہ کے عہد میں بنوایا تھا۔ یہ مسجد دو منزلہ ہے نیچے دوکانیں ہیں، اوپر مسجد ہے۔ ۱۹۱۹ء میں اس کے متولی نواب سعید خاں اور نواب رشید خان صاحبان تھے۔ اس مسجد کا جو مدرسہ تھا اس کو بھی نواب شرف الدولہ محمد شاہی نے ۱۱۳۵ھ مطابق ۲۳-۱۷۲۲ء میں بنوایا تھا۔ اس میں طلبا کو تعلیم دی جاتی تھی مسجد کی پیشانی پر جو کتبہ ہے اس میں مسجد و مدرسہ دونوں کا ذکر ہے۔

در زمانِ شہِ خورشید سریر

ظلِّ حق ماہ زمین، شاہ زماں

ناصر الدین کہ محمد شاہ است

تیغ او کفر شکن در دوراں

۱۔ واقعات دار الحکومت، دوم صفحہ ۱۴۴

نصرت الدولہ بنا نمودہ

مسجد و مدرسۂ عالی شان

ایں دو بیت الشرف عمل

ہمچو سعدین فلک کردہ قرآن

سال تاریخ بنا گفت خرد

قبلۂ حج ارادت کیشاں

۱۱۳۵ھ

مدرسہ شاہ عبدالعزیز

محمد شاہ نے جب نئی دہلی کلاں محل میں ایک عالی شان مکان شاہ عبدالعزیز
کو دیا تو انھوں نے اس میں ایک مدرسہ قائم کیا جس میں شاہ عبدالعزیز صاحب نے
درس دیا کرتے تھے۔ اس مدرسہ نے وہ نام پیدا کیا کہ تمام ہندوستان میں اس
کی شہرت ہوگئی۔ دور دور سے اس مدرسہ میں لوگ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آنے
لگے جلیل القدر علماء نے اس مدرسہ سے فیض حاصل کیا حضرت کے بے شمار
انگنت شاگرد تھے۔ ان کے مشہور شاگرد حسب ذیل علماء ہیں۔

حضرت شاہ رفیع الدین، حضرت شاہ اسحاق جو شیخ محمد افضل کے
فرزند اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے حقیقی نواسے تھے۔ مفتی صدرالدین
خاں آزردہ دہلوی، حضرت شاہ غلام علی صاحب، جناب مولوی مخصوص اللہ
صاحب جو حضرت شاہ رفیع الدین کے صاحبزادے اور آپ کے حقیقی بھتیجے
تھے۔ مولوی عبدالحی آپ کے داماد، مولوی رشید الدین دہلوی، مولوی کریم اللہ
صاحب دہلوی، مولوی محمد اسماعیل شہید، مولانا میر محبوب علی صاحب
مولوی محمد یعقوب آپ کے دوسرے نواسے، مولوی عبدالخالق صاحب۔

جو علما دلی کے رہنے والے نہیں تھے وہ یہ ہیں:-

مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، مولوی فضل حق خیرآبادی، مولوی حسن علی صاحب لکھنوی، مولانا حسین احمد صاحب ملیح آبادی اور حافظ عبداللہ وغیرہ[۱]۔

ہفتہ میں دو مرتبہ منگل و جمعہ کو اس مدرسہ میں شاہ صاحب کا وعظ ہوتا تھا آپ کی جادو بھری اور سحر آمیز تقریر میں وہ اثر تھا کہ مخالفین گھروں سے ارادہ کرکے جاتے تھے کہ وعظ میں مخالفت کریں گے۔ لیکن وہاں جاکر ان کے منہ پر مہر سکوت لگ جاتی تھی[۲]۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے تقریباً تمام صاحبزادوں نے اس مدرسہ میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا جب صاحبزادوں میں سے کوئی نہیں رہا تو مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب نے مدرسہ کو چلایا۔ جب آپ ۱۲۵۷ھ میں ہجرت کرکے حجاز مقدس تشریف لے گئے تو مولانا مخصوص اللہ اور مولانا محمد موسیٰ خلف مولانا شاہ رفیع الدین اس کی نگرانی فرمانے لگے ان حضرات نے جب ۱۲۷۰ھ میں انتقال فرمایا تو مولوی محمد موسیٰ کے ایک صاحبزادے میاں عبدالسلام اور ایک صاحبزادی چھوٹی عمر کی رہ گئیں۔ خاندان میں کوئی ایسا نہ رہا جو عبدالسلام صاحب کو پڑھاتا لکھاتا۔ غرض جو سلسلہ علم کئی پشت سے اس خاندان میں چلا آتا تھا بند ہوگیا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے مکانات کو گرادیا۔ اب اس عالی شان مدرسہ میں ایک گلی آباد ہوگئی ہے جس کا نام مدرسہ شاہ عبدالعزیز ہے[۳]۔

---

[۱] بالاستشفاع والتوسل ص۱۱۶ [۲] حیات ولی ص۳۲۷

[۳] واقعات دارالحکومت دہلی جلد دوم ص۱۷۲

مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء، و مشائخ سے آپ
نے ملاقات کی۔ مدارس میں بھی گئے۔ چنانچہ آپ شاہ عبدالعزیز صاحب کے خاندان
کے ایک عالم مولوی ظہیر الدین صاحب سے ملے اور دہلی گلی شاہ عبدالعزیز میں ان
کے مکان پر تشریف لے گئے۔ اس وقت مدرسہ کی کیا حالت تھی اور شاہ عبدالعزیز
صاحب کے خاندان کی کیا حیثیت تھی اس کے بارے میں آپ نے اپنے سفرنامے
میں تحریر کیا ہے:

"مدرسہ میں پہنچ کر میں نے مولوی سید ظہیر الدین کو تلاش کیا۔ وہ زنان
خانے کے پاس کسی مکان کی تعمیر کرا رہے تھے، میں وہاں گیا اور حضرت
شاہ صاحب کے زنانہ مکان کی باہر سے زیارت کی۔ اس کے
بعد مولوی صاحب سے تعارف ہوا۔ اور وہاں سے گھر میں آ کر بیٹھے
یہ بزرگ شاہ صاحب کے خاندان سے اس طور پر واسطہ رکھتے
ہیں کہ ان کے دادا جناب شاہ رفیع الدین صاحب کے چھوٹے صاحبزادے
تھے۔ مولوی مخصوص اللہ، مولوی موسیٰ، مولوی مصطفیٰ وغیرہ ان میں سے
اب کسی کی اولاد نہیں ہے۔ ایک صاحبزادی تھی بی بی امت
اللہ۔ اُن کے دو صاحبزادے تھے۔ سید ناصر الدین اور سید ظہیر الدین
آخر الذکر مولانا اسحاق کے داماد تھے۔ جو مولانا نصیر الدین کے نام
سے مشہور ہیں۔ ان کی کوئی اولاد نہ ہوئی اور اول الذکر کے ایک صاحبزادے
تھے، سید معز الدین، ان کے صاحبزادے سید ظہیر الدین ہیں۔ انھوں
نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ان حضرات کی تصانیف شائع کی
جائیں، چنانچہ اکثر رسالے چھپوائے اور باقی چھپ رہے ہیں۔ ایک
پریس بھی قائم کیا۔ ابتدا میں خاص مولانا علیہ الرحمۃ کے مدرسہ میں

ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ مگر ابنائے زمانہ کی بے التفاتی سے وہ ختم ہو گیا۔"

مدرسہ شاہ فخر الدین

شاہ صاحب اورنگ آباد دکن میں ۱۱۲۶ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد مولانا شاہ نظام الدین اورنگ آبادی خلیفہ شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی تھے۔ آپ نے نہایت اعلیٰ پیمانہ پر تعلیم پائی تھی تعلیم پانے کے بعد فوج میں ملازمت کی۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے پر مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کا شوق ہوا۔ تمام کاروبار اپنے بھائیوں کے سپرد کر کے ۱۱۶۵ھ میں دہلی تشریف لائے۔ کٹڑے جلیل میں ایک حویلی بغرض رہائش کرائے پر لی۔ اس میں اپنا مدرسہ قائم کیا۔ غازی الدین خاں مؤلف "مناقب فخریہ" تحریر فرماتے ہیں:-

"محلہ کٹڑہ جلیل میں کچھ روز قیام کر کے اس مدرسہ میں (مولانا فخر) نے رہنا اختیار کیا جو احقر کے والد کا بنایا ہوا مدرسہ ہے۔ یہ اجمیری دروازہ کے باہر ہے اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔"

اس کی تائید صاحب وقائع عبد القادر خانی فرماتے ہیں:-

"عہد عالمگیر میں غازی الدین خاں ایک امیر تھے، جنہوں نے اپنے نام پر مدرسہ غازی الدین خاں کے والد کا ہے جس کو لوگ ملا نا فخر الدین کا مدرسہ کہتے ہیں۔"

یہ مدرسہ کس مقام پر تھا اس کی نشان دہی مولوی بشیر الدین صاحب نے اپنی تصنیف "واقعات دار الحکومت دہلی" کی جلد دوم میں مدرسہ غازی الدین خاں کی عمارت کے ذکر میں کی ہے۔

"اس عمارت کے سامنے تا بہ خندق ایک وسیع میدان اجمیری گیٹ

کے دروازے کے باہر تھا۔ شمالی مغرب اور جنوب کی طرف دوسری
شاندار عمارتیں اور امرا کے مقبرے تھے جن کے نشانات اب تک
کچھ کچھ باقی ہیں۔ انھیں عمارتوں میں مولانا فخرالدین کا مدرسہ بھی تھا
جہاں وہ خود درس دیا کرتے تھے۔ اور جہاں انھوں نے ۱۱۹۹ھ میں
انتقال کیا اور غسل کے بعد قطب صاحب میں دفن ہوئے"

جس مقام پر (صحن مدرسہ) آپ کو غسل دیا گیا وہ جگہ بڑی متبرک خیال کی جاتی ہے۔
بہرحال شاہ فخر نے اس مدرسہ میں درس تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس مدرسہ
میں دور دور سے طلبا آنے لگے۔ آپ نے صرف درسی کتابیں ہی نہیں پڑھائیں بلکہ
حقائق و معارف کے دریا بھی بہائے۔ جس کا نقشہ مولف "مناقب فخریہ" نے
ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

"سینے حقائق کے خزانوں سے معمور ہو گئے جو سو رہے تھے جاگ
اٹھے جو بے ہوش تھے وہ ہوش میں آ گئے۔ جو بے خبر تھے باخبر ہو گئے۔
عشق و محبت الٰہی کا بازار گرم ہو گیا۔ ذوق و شوق کا دریا موجیں مارنے
لگا۔ دل کے پیمانے اور آنکھوں کے ساغر آنسوؤں کی شراب سے مزین
ہو گئے۔ سینے کا آتش کدہ روتی کے شعلوں سے روشن ہو گیا۔ ایک
زمانہ کے بعد آسمانوں کے کانوں میں "یاہو" کی صدا پہنچی اور ایک
مدت کے بعد زمین کو پاؤں مارنے کا سودا ہوا۔ دہلی کے تیمردوں پر بجلی
کے کوندے آنکھ ماری۔ ہر شمع نے مجلس کو آفتاب وار آتش کر دیا۔ لطیف
ہوائیں گرمی سے آشنا ہو گئیں۔ دماغوں کو الشکر کی آواز اور محبت کی
خوشبو پہنچی اور کانوں کو محبت کی لے پسند آئی"

آپ حدیث و تفسیر کی تعلیم دیتے اور کتاب سفرالسعادت بھی پڑھاتے تھے۔ چنانچہ

آپ نے ایک دفعہ فرمایا۔ دوستوں میں سے کوئی سفر السعادت پڑھے گا۔ شیخ الدین تو بخاری شریف پڑھتے ہیں اور سید احمد مسلم۔

سید نور الدین حسینی مولف فخر الطالبین نے عرض کیا۔ اگر حکم ہو تو یہ کمترین اس دولت سے سرفرازی حاصل کرے۔ فرمایا بہتر ہے مگر دو نوں کا پڑھنا مشکل ہے۔ ایک بات یہ ہے کہ اس کے دیکھنے سے جو شبہ ہو اس کو صاف کرے۔ دوسرے یہ کہ اس کو شروع سے پڑھے گا۔ میں نے عرض کیا۔ جس طرح ارشاد ہو اس طرح پڑھنے کو تیار ہوں۔ فرمایا اطمینان رکھو دوسری کتاب موجود ہے۔ منگا تا ہوں پڑھنا شروع کر دو۔ [۱]

جب آپ درس دیتے تو طلبا آپ سے علمی مسائل بھی دریافت کرتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ حدیث پڑھا رہے تھے۔ اس اثنا میں یہ مسئلہ آ گیا کہ بعض عورتیں آپس میں جنسی تلذذ کے لئے اختلاط کیا کرتی ہیں۔ ایک طالب علم نے پوچھا کہ شرع میں اس کی کیا سزا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ اس کی حد (سزا) کتاب وفا میں لکھی ہے۔ ایک اور طالب علم نے عرض کیا کہ لواطت کی حد کیا ہے۔ فرمایا حرق (جلانا) ہے۔ [۲]

آپ بچوں کو بھی تعلیم دیتے تھے۔ چونکہ آپ کے پاس کافی ہجوم رہتا تھا۔ جب آپ بچوں کو سبق دیتے تھے تو دروازہ بند کر دیا کرتے تھے تاکہ ہجوم نہ ہو سکے اور بچے آزادی کے ساتھ بلا شرم و جھجک سبق لیتے رہیں۔ مولانا طالب علموں کی تربیت پر خاص توجہ فرماتے تھے۔ اور سبق دیتے وقت بہت نرمی اختیار کرتے تھے۔ رمضان شریف میں آپ ہر قسم کے سبق موقوف کر دیا کرتے تھے۔ صرف

---

[۱] ملفوظات و حالات شاہ فخر دہلوی ص۲۱

[۲] فخر الطالبین ص۱۴۳

حدیث شریف کا سبق جاری رہتا تھا۔ ۲ ۔ رمضان میں مدرسہ کی مسجد میں جو وہیں تھی اعتکاف فرماتے تھے۔ اس کے آخری عشرہ میں حدیث شریف کا درس بھی آپ کے یہاں پڑھائے جاتے تھے۔ ایک دن سید نورالدین مولف فخر الطالبین نے عرض کیا کہ آپ فوائد الفوائد کیوں نہیں پڑھاتے۔ تو آپ نے فرمایا کہ مجھ کو اپنے سلسلے کی کتاب پڑھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ شاہ فخر کے اکثر مرید اسی مدرسہ کے طالب علم تھے ساتھوں نے اسی مدرسہ میں تعلیم پائی جن کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ قابل ذکر حضرات میں شاہ نیاز احمد بریلوی کا نام سر فہرست ہے۔

مولانا شاہ نیاز احمدؒ

شاہ صاحب ۱۱۶۳ھ کو سرہند میں پیدا ہوئے ان کے والد ماجد شاہ رحمت صاحب تھے۔ جو آپ کے بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ ان کی پرورش والدہ نے کی۔ اس کے بعد ظاہری و باطنی تربیت کے لئے مولانا فخر صاحب کے سپرد کیا۔ شاہ صاحب ذکی اور فہیم نوجوان تھے سترہ سال کی عمر میں علوم معقول اور منقول، حدیث و تفسیر اور فقہ وغیرہ سے فارغ ہو کر دستار فضیلت حاصل کی[1] اور حضرت شاہ فخر سے بیعت ہوئے۔ بریلی پہنچ کر شاہ نیاز احمد صاحب نے اپنی خانقاہ قائم کی جو بہت جلد "معدن فیوض ربانی اور مرکز انوار سبحانی بن گئی حقیقت یہ ہے اٹھارویں صدی میں چشتی نظامیہ سلسلہ کو ہندوستان میں جو کچھ فروغ ہوا وہ مولانا شاہ فخر الدین کے مریدوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ شاہ نور محمدؒ صاحب نے پنجاب میں اور شاہ نیاز احمدؒ صاحب نے یوپی میں اس سلسلہ کو خوب پروان چڑھایا[2]

---

[1] تذکرہ اولیاء جلد دوم صفحہ ۱۳۸
[2] تاریخ مشائخ چشت صفحہ ۲۹۳

شاہ نیاز احمد[1] صاحب نے کافی عرصہ تک دہلی میں اپنے پیر شاہ فخر کے مدرسہ میں درس و تدریس میں وقت صرف کیا۔ جناب غلام ہمدانی مصحفی نے اپنے زمانہ طالب علمی میں ان کی شانِ علم دیکھی تھی۔

شاہ صاحب شعر بہت کم کہتے تھے۔ اُن کے اُردو اور فارسی کے دیوان بہت مختصر ہیں جس میں انھوں نے تصوّف کے باریک نکات کو انتہائی دلکش انداز میں پیش کیا ہے ؎

مُبارک رہے تجھ کو واعظ بہشت
میاں ہم تو طالب ہیں دیدار کے
کہاں فصل گُل ہے، کہاں وہ بہار
چلو بل کے رو دیں گلے خار کے

کہیں عاشق نیاز کی صورت
سینہ بریان و دل جلا دیکھا
پھک چکے تھے ہم تو اے یارو ابھی
گر نہ ہوتا اس گھڑی احسانِ اشک
کہاں تک کہوں لُطف احسانِ عشق
کہ جوں جوں گھٹا میں بڑھایا مجھے
یہاں تک دیا مجھ کو حُسنِ عروج
کہ بندے سے مولا بنایا مجھے

---

[1] فخر الطالبین ص۱۵ [2] مناقب فرید ص۳۶

میر بدیع الدین | میر صاحب جہان آباد کے صحیح النسب سید تھے ان کے آباؤ اجداد نجند کے رہنے والے تھے۔ بخارا کے سیدوں میں تھے ان کا نسلی سلسلہ سید سعد الدین قتیل تک پہنچتا ہے جو حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کے خلیفہ تھے۔ دہلی میں ان کی اولاد کا شمار معززین میں ہوتا تھا۔ سید واٹے کے نام سے ان کا محلہ مشہور تھا جہاں یہ بھی رہا کرتے تھے۔ انھوں نے پہلے حافظ گل محمد سے قرآن مجید حفظ کیا۔ مولانا فخر سے عقیدت پیدا ہوئی۔ ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے مولانا نے ان پر خاص توجہ کی اور ان کو قادریہ سلسلہ میں بیعت فرمایا اور میزان سے لے کر صحیح بخاری تک تعلیم دی۔ مولانا کے احباب میں ان کو خاص اعزاز حاصل تھا۔ ان کے دو بھائی تھے۔ ایک حقیقی میر ضمیر الدین دوسرے خالہ زاد بھائی شفیع الدین تھے [1]

خواجہ نور محمد صاحب مہاروی | خواجہ صاحب ۱۴ رمضان المبارک ۱۱۴۲ھ کو چوطالہ (بہاولپور) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام ہنسوال تھا۔ کھرل قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی عمر پانچ سال کی تھی کہ حافظ محمد مسعود کی خدمت میں قرآن مجید کا درس حاصل کرنے کے لئے بیٹھے اور انھیں سے قرآن مجید حفظ کیا۔ کچھ عرصہ کے لئے موضع پیلانہ میں تحصیلِ علم کے لئے گئے ڈیرہ غازی خاں اور لاہور میں بھی تعلیم پائی۔ لاہور سے دہلی کا رخ کیا۔ اس زمانہ میں نواب غازی الدین خاں کے مدرسہ کی بڑی شہرت تھی۔ اس میں داخلہ لیا۔ اور حافظ برخوردار صاحب جو اس مدرسہ میں درس دیتے تھے۔ اُن سے کافیہ پڑھنی شروع کی حافظ صاحب کے بارے میں خواجہ نور محمد صاحب

---

[1] فخر الطالبین ص ۱۵

[2] مناقب فرید ص ۲۶

فرمایا کرتے تھے "میاں برخوردار اچھے آدمی تھے اور صاحب نسبت تھے" [1]
حافظ صاحب چشتیہ سلسلہ میں بیعت تھے۔ خواجہ نور محمدؒ صاحب کو ساتھ کھلاتے
تھے۔ انھوں نے اپنے عزیز شاگرد کو قطبی کا درس دینا شروع کیا۔ ابھی تکمیل نہیں
ہوئی تھی کہ ان کو گھر جانا پڑا۔ اور خواجہ نور محمدؒ صاحب کا سلسلۂ تعلیم رکھا گیا تو آپ
شاہ فخر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے قطبی کی تکمیل کرائی۔ تحصیل علم کے
بعد ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۱ء میں حضرت شاہ فخر سے بیعت کی۔ بیعت کے کچھ
عرصے کے بعد حضرت شاہ فخر نے پاک پٹن کا سفر کیا۔ اس میں خواجہ نور محمدؒ صاحب
بھی ان کے ہمراہ تھے۔ خواجہ صاحب کو خرقہ خلافت عطا کرنے کے بعد حضرت
شاہ فخر نے پاک پٹن کی زیارت کی۔ حضرت خواجہ شاہ نور محمدؒ صاحب کی وجہ سے
پنجاب میں سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کی خوب تبلیغ ہوئی۔ ۳ ذی الحجہ ۱۲۰۵ھ مطابق
۱۷۹۱ء کو فوت ہوئے۔ تلحۂ سرور (بہشتی چشتیاں) میں آپ کا مرقد ہے۔
کسی نے یہ تاریخ وفات لکھی ہے

حیف وا ویلا کہ جان نور رب گشت

۱۲۰۵ھ

خواجہ محمدؒ عاقل

خواجہ صاحب حضرت خواجہ نور محمدؒ میاں مہاروی کے
خلیفہ تھے۔ فاروقی خاندان سے تعلق تھا۔ ان کے اجداد کی
خاندانِ مغلیہ میں رسائی تھی بزرگوں میں حضرت محمود الصمد مخدوم کی قربانی کو دیکھ کر
سیدزادی کو چھوڑ دیا۔ شاہ فخر کے انتقال کے بعد ان کے مدرسہ کا کام سید احمد صاحب
غلام چشتی اور حاجی لال محمدؒ صاحب نے سنبھالا۔ اور اس کے علمی فیض کو جاری رکھا۔ [2]

---

[1] مناقب فریدی ص ۳۶ [2] فخر الطالبین ص ۱۱۸

سید احمد صاحب

سید احمد صاحب مکہ معظمہ کے سیدوں میں تھے۔ ان کی عرفیت "سید صاحب" تھی ان کے والد ماجد محمد احسن تھے جن کا مصری حکومت سے تعلق تھا شہر مکہ کے بدوؤں کی جماعت ان ہی کے ماتحت تھی۔ بارہ سال کی عمر سے مولانا فخر کے پاس آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ ان سے بیعت ہوئے۔ مولانا کی خاص توجہ ہوئی اور ان کا مولانا کے قابل اعتماد دوستوں میں شمار ہونے لگا۔ اخراجات اور روزمرہ کا کام اُن کے سپرد ہو گیا تھا۔ ایک روز ان سے مولانا فخر نے فرمایا کہ آپ کو علوم ظاہری سے بھی واقف کرانا چاہیے۔ چنانچہ ان کو مولانا نے میزان شروع کرائی۔ اللہ کا کرم ایسا ہوا کہ تمام طالب علموں میں بڑے ذہین اور مستعد ثابت ہوئے۔ صحیح مسلم مولانا سے پڑھی، اس کے بعد مولانا کے حکم سے تمام دن پڑھانے میں مشغول رہتے تھے۔ اور طالب علموں کو معقول اور منقول کا سبق دیتے تھے اور مقررہ وقت پر باطنی شغل بھی جاری رکھتے تھے۔ مولانا کے رازداروں میں تھے۔ ذاتی صفات کے علاوہ ہر قسم کی وضعداری اور شرافت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ مولانا فخر کے انتقال کے بعد مدرسہ کا اہتمام انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے کیا۔

مولانا حاجی لعل محمد

لال محمد صاحب حضرت شاہ فخر کے ارشد خلفاء میں سے تھے۔ انھوں نے اپنے پیر کے انتقال کے بعد ان کی روایات کو قائم رکھا اور مدرسہ رحیمیہ کا سلسلہ جاری رہا چنانچہ صاحب شجرۃ الانوار تحریر فرماتے ہیں۔

"مریدان و خلفاء بسیار دارند، ذات گرامی صفات حضرت لعل محمد صاحب، در مدرسہ در شہر است از منتخبات است"

حاجی صاحب نہایت منکسر المزاج آدمی تھے بڑی بڑی ریاضتیں کیں بارہ سال

تک خواجہ معین الدین کے آستانہ پر حاضر رہے، تین یگ کئے۔ ان کی روحانی طاقت بہت زیادہ تھی۔ ایک مرتبہ شاہ عبدالقادر صاحب کے ایک مرید جامع مسجد میں مراقبہ کر رہے تھے جب آنکھ بند کرتے تو آنکھ کھل جاتی۔ آخر کار معلوم کیا کہ اس وقت اس مسجد میں مولا فخر کے مریدوں میں سے کوئی موجود ہے۔ پتہ لگا کہ حاجی لعل محمد صاحب مسجد کے گوشہ میں وظیفہ پڑھ رہے تھے [۱] ۱۲ رمضان المبارک ۱۲۲۹ھ میں انتقال ہوا حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار کے قریب آپ کا مزار ہے۔

مدرسہ و مسجد محتسب پھاٹک حبش خاں کوچہ مولوی ہاشم میں یہ مدرسہ و مسجد ۱۱۳۶ھ مطابق ۱۷۲۳ء کو محمد شاہ بادشاہ کی حکومت کے وقت میں تعمیر ہوئی۔ اس کا صحن بہت وسیع ہے جس کے مشرق رو طلباء کے حجرے اور مدرسہ ہے۔ اس مسجد کے بانی ابوسعید تھے۔ جو زمانہ شاہجہاں میں دہلی کے محتسب تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ محمد تقی چلپی تھے۔ ان کے صاحبزادے کو صدر محتسب کی خدمت موروثی طور پر دی گئی تھی کہ ان کے خاندان کے لوگ ہی اس خدمت پر مامور کیے جائیں گے۔ پیش طاق پر پانچ شعر کا ایک تاریخی کتبہ ہے جس کے اول و آخر میں یہ شعر ہیں۔ [۲]

در زمان داور عالم پناہ دادرس	بادشاہ دین محمد شاہ غازی جم حشم
از پئے تاریخ اتمامش سروش غیب گفت	کعبۂ ثانی بنائے بوسعید باکرم

محمد عاقل راوت خاں وزیر شاہجہانی عاقل کا مرید تھا۔ شاہجہاں نے ان کو پانچ ہزار بیگہ آراضی اخراجات کے لئے دی تھی۔ خواجہ محمد عاقل کے والد

---

[۱] مناقب حافظیہ صفحہ ۲۹

[۲] واقعات دارالحکومت دہلی دوم صفحہ ۲۰۳

باجد مخدوم محمد شریف محمد شاہ دوران تھے خواجہ صاحب نے بہت تھوڑی سی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور اپنے والد کے علاوہ حضرت شاہ فخر سے شرح عبدالحق اور سوار السبیل کا درس لیا اور حدیث کی سند لی [1]

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے کوٹ مٹھن میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس مدرسہ میں بڑے بڑے عالم ملازم تھے خواجہ صاحب سو سے زیادہ طلبہ کو درس دیتے تھے۔ ان کے بزرگوں میں حضرت محبوب الصمد مخدوم نور محمد صاحب بھی تھے۔

مدرسہ میں جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں وہ یہ تھیں:۔ مشکوٰۃ، احیاء العلوم صحیح بخاری، لوائح و شرح قصیدہ، سوار السبیل، تسلیم و خصوص الحکم، شرح وقایہ مع حواشی، ہدایہ شرح مواقف شرح ہدایہ، الحکمۃ، میر ہاشم، شرح عقائد خیالی مطول وغیرہ۔

خواجہ محمد عاقل صاحب کا لنگر ابتدا ہی سے جاری تھا۔ طلباء و فقراء کو اس سے کھانا ملتا تھا۔ اکبر شاہ ثانی نے شاہزادہ جہان خسرو اور کا درس مشکوٰۃ کو خواجہ صاحب کا مرید کرایا تھا [2]۔

بہادر شاہ ظفر کو آپ سے بہت عقیدت تھی جس کا انھوں نے اپنے ایک شعر میں اظہار کیا ہے ؎

دل فدا کرتے ہیں نام فخر دیں پر اے ظفر
ہم ہیں عاقل، ربط عاقل سے دلی رکھتے ہیں

---

[1] مناقب محبوبیہ صـ۸۵
[2] تکملہ سیر الاولیاء صـ۱۸۲

خواجہ صاحب چار ماہ علیل رہ کر ۱۲۲۹ھ میں فوت ہوئے۔ شدائی سے کوٹ مٹھن لاکر دفن کیا گیا۔ کسی شاعر نے یہ تاریخ وفات کہی ؎

سر ز حبیب بے خودی میر کرد و گفت
روز ہشتم بود از ماہ رجب

۱۲۲۹ھ

میاں مجیب میاں مجیب مولانا فخر کے قدیم دوست تھے۔ حضرت سلطان المشائخ کے ہمشیر زادوں کی اولاد میں تھے۔ مولانا فخر کے ارشاد کے مطابق حضرت سلیم چشتی کی درگاہ میں ذکر و شغل بھی کرتے تھے۔ مولانا فخر سے شرح ملا جامی پڑھتے تھے۔ رمضان المبارک کے دن آئے۔ تو مولانا نے ایک روز ان سے فرمایا کہ تم اپنا سبق اس وقت موقوف کر دو صبح وظیفہ کے بعد آکر پڑھ لینا کیوں کہ کل سے اعتکاف کا ارادہ ہے اس وجہ سے دوسرے طالب علموں سے بھی عذر کر دیا ہے[۱]

حاجی ضیاء الدین میاں ضیاء الدین صاحب شاہ شریف خلیفہ حضرت نظام الدین شاقی کے نواسے تھے۔ انھوں نے شاہ فخر سے تعلیم پائی تھی۔ اور ان کے چھوٹے بھائی بھی میاں عماد الدین شاہ فخر کے شاگرد تھے[۲]۔

مولوی محمد اکرم صاحب مولانا فخر کے عاشقوں میں تھے مولانا کو بھی ان کی عقیدت و محبت پر پورا بھروسہ و اعتماد تھا۔ یہ آپ کے شاگرد بھی تھے۔ اکثر مطالعہ

---

[۱] حالات شاہ فخر دہلوی ص۷۲

[۲] فخر الطالبین ص۱۱۸

میں مشغول رہتے تھے۔ علومِ متداولہ (علومِ جاریہ) اور خاص طور پر فقہ میں ان کو یدِ طولیٰ
حاصل تھا۔ سادات اور اہلِ بیت سے بے پناہ محبت تھی۔ احمد شاہ درّانی کے
تسلّط کے وقت جب قتلِ عام ہو رہا تھا۔ ایک سیدانی کو فوجی پکڑ کر لے گئے۔ لوگوں
نے ہر چند فوجیوں کو سمجھایا مگر وہ نہ مانے۔ میاں ان حالات کو بچشمِ خود دیکھ رہے تھے کہ
انھوں نے احمد شاہ کے فوجیوں سے ان کی رہائی کے لئے کہا۔ سادات کی عظمت بتائی
پر انھوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ تو آخر انھوں نے اپنی بیوی کو پیش کر دیا کہ انکے بدلہ
میں انکو لیلو اور سیدزادی کو رہا کر دو چنانچہ فوجیوں نے اس قربانی کو دیکھ کر سیدزادی کو چھوڑ دیا۔
اسی شب آقائے نامدار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میاں جی صاحب [illegible] کے خواب میں آئے
اور فرمایا تم نے میرے خاندان کی ایک معصوم عورت کی جان بچائی ہے۔ اس کے
بدلے میں قیامت کے روز تمہاری بخشش کی سفارش اللہ تعالیٰ سے کروں گا۔ اور دنیا
میں بھی تم کو عزت و عظمت ملیگی۔ سبحان اللہ کیسے عاشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے۔
جنھوں نے اپنی اہلیہ کو سیدانی کے بدلہ میں جان دینے کیلئے پیش کر دیا۔ عشقِ رسولؐ ایسا ہی ہونا چاہئے۔

مدرسہ مسجد نواب قطب الدین

یہ مسجد [illegible] بوہلہ پیاؤ [illegible]
پر [illegible] مطابق [illegible]

کو محمد شاہ کے عہد میں پہلے اس میں مدرسہ کا مکان تھا۔ جو
اب شکستہ ہو گیا۔ مسجد کی چھت کی دیوار میں یہ کتبہ لگا ہوا ہے:۔

”مسجد المعروف بہ نواب قطب الدین خاں مرحوم“۔

اور ایک پتھر صحن میں ۱۹۱۹ء میں رکھا ہوا تھا جس پر یہ کتبہ تھا۔

سالِ مکانِ بزرگ ساختہ با زیب و زین
مدرسہ و مسجدے کردہ بنا شاہ حسین

۱۱۴۸ھ

شاہ حسین نواب قطب الدین کے استادوں میں تھے غالباً نواب صاحب نے اس مسجد میں ترمیم کرائی ہوگی جو آپ کے نام سے مشہور ہے۔ شاہ حسین صاحب کی قبر صحن میں تھی جس کے اطراف میں سنگ سرخ کی جالیاں تھیں جو صاف کردی گئیں۔ ؎۱

مدرسہ شاہ غلام علی آپ موضع ذبالہ پنجاب کے رہنے والے تھے، آپ کا اصلی نام عبد اللہ اور عرف غلام تھا۔ آپ ۱۱۵۲ھ میں پیدا ہوئے سولہ سال کی عمر میں آپ کے والد ماجد دہلی آئے بائیس سال کی عمر میں آپ نے حضرت مظہر جان جاناں سے بیعت کی۔ سالہا سال اپنے پیر و مرشد کی خدمت کی اور خانقاہ میں تفسیر و حدیث کا درس دیتے تھے۔ جو لوگ اس درس کے سننے والے تھے وہی بتا سکتے تھے کہ اس میں کیا کیفیت تھی۔ اور پڑھنے پڑھانے، سننے سنانے والوں کی کیا حالت ہوتی تھی۔ جہاں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی آیا، بے تاب ہو جاتے تھے اور اس بے تابی کی وجہ سے حاضرین پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ظہر کی نماز کے بعد بھی حدیث و تفسیر فقہ و تصوف کے درس میں مشغول و مصروف ہو جاتے تھے ؎۲ آپ کے انتقال کے بعد حضرت مولانا شاہ ابو سعید اور ان کے صاحبزادے شاہ احمد سعید صاحب نے خانقاہ میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ شاہ احمد سعید صاحب کو علم حدیث و تفسیر و فقہ میں درجۂ کمال حاصل تھا۔ دن رات درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ یہ دونوں باپ بیٹے حضرت شاہ غلام علیؒ سے بیعت تھے۔

؎۱ واقعات دار الحکومت دہلی دوم ص ۲۲۴

؎۲ آثار الصنادید ص ۱۱۴

مدرسہ میر جملہ اورنگ زیب عالمگیر کے ایک معتمد رئیس میر جملہ نے ایک مدرسہ تعمیر کیا تھا جس کا اب کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ لیکن "مدرسہ میر جملہ" کے نام سے لال کنواں پر ایک گلی اب تک ہے یہ مدرسہ اسی مقام پر بنا تھا۔

میر محمد سعید عرف میر جملہ میر محمد سعید اردستانی اصفہان کے سادات سے تھا۔ ایک الماس فروش تاجر نے اس کو ملازم رکھا اور گولکنڈہ میں لایا وصیت کے مطابق اس کا مال و اسباب اس کو ملا اپنے محنت سے بحری تجارت میں ترقی کی اور کافی دولت کمائی اور ایشیا کے تمام درباروں میں جانے لگا۔ سلطان عبد اللہ قطب شاہ والی گولکنڈہ نے اس کی ذہانت کی وجہ سے اس کو اپنا وزیر مقرر کیا اور میر جملہ کا خطاب عطا کیا۔ امور مملکت کا دارومدار اسی کی رائے پر ہوتا تھا اس نے کرناٹک میں ایک مقام جس کا طول ایک سو پچاس اور عرض تیس کوس تھا جس میں ۴۰ لاکھ روپئے اور الماس کی کانیں تھیں اور مضبوط قلعے تھے اپنی فراست سے فتح کئے

اب تک قطب الملک کے اسلاف میں سے کسی کو اس مقام پر قابض ہونے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ اس کی اس کامیابی پر ایک طبقہ مخالفت کرنے لگا۔ اور قطب الملک کے کان بھرنے لگا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو توقعات میر جملہ کو قطب شاہ سے تھی وہ پوری نہیں ہوئی۔ اس وقت شاہزادہ اورنگ زیب دکن میں صوبہ کا انتظام کر رہے تھے ان کو کہلا کر بھیجا کہ مجھ کو بلوالیں۔ شاہزادہ نے اپنے والد ماجد شاہجہان کو ان کے بلوانے کے بارے میں لکھا انھوں نے میر جملہ کو منصب پنجہزاری پنج ہزار سوار عطا کیا۔ اور قاضی محمد عارف کشمیری کی معرفت قطب الملک کے پاس

• تاریخ ہند ذکاء اللہ مفتم صفحہ ۲۶۶

زبان بھیجا کہ وہ اس کو اور اس کے متعلقین کو بھیجنے میں کسی قسم کا تعرض نہ کریں قطب الملک نے اس فرمان کو دیکھ کر میر جملہ کے بیٹے محمد امین اور اس کے متعلقین کو قید کر لیا۔ اس سلسلہ میں ایک لمبی جنگ ہوئی۔ آخر قطب شاہ کی ہار ہوئی، بادشاہ نے تقصیر معاف کی۔

میر جملہ شاہ جہاں کے پاس آیا۔ اس کو منصب شش ہزاری شش ہزار سوار اور معظم خاں کا خطاب مع وزارت قلمدان اور پانچ لاکھ روپے نقد عنایت کیے۔ شاہجہاں سے رخصت ہو کر میر جملہ اورنگ زیب کے پاس پہنچے اور اس کے ساتھ بیجاپور میں ایک مستحکم جگہ پر ہے گھیر کر فتح کیا[1] اس طرح میر جملہ اورنگ زیب کا مشیر اور ہمدم اور ہمراز بن گیا اورنگ زیب نے اس کو خانخاناں کا خطاب کیا[2] اور بنگال کی صوبیداری مستقلاً ان کے نام کر دی گئی۔ آسام کی مہم پر بھیجے گئے کوچ بہار کو فتح کیا۔ اس کا نام عالمگیر نگر رکھا۔ کورخی کے قلعوں کو تسخیر کیا قلعہ بھیم گڑھ اور قلعہ گھر گانو کو فتح کیا آسام میں طوفانی بارش ہوتی ہے وہاں کے درخت بھی زہریلے ہیں اور مسموم ہوا تھی جس کی وجہ میر جملہ اور معظم خاں اور خان خاناں بیمار پڑے اور ۲ رمضان المبارک ۱۰۷۳ھ مطابق ۱۶۶۳ء کو خضر پور کے دو کوس کے فاصلے پر انتقال ہوا تاریخ وفات "مسند آرائی بہشت" ہوئی[3]

چھٹا جلوس مطابق یکم شوال ۱۰۷۳ھ کو منعقد ہوا جشن کی تقریبات گنگا کے کنارے ادا کی گئیں اورنگزیب کو خانخاناں کے انتقال کا ایسا رنج تھا کہ جشن کے بعض مراسم موقوف کر دیئے اور بادشاہ نے شاہزادہ محمد معظم کو، سعد خاں کے ساتھ خانخاناں کے بیٹے محمد امین خاں کے گھر بھجوایا کہ ماتم پرسی کر کے اسے اپنے ہمراہ لیتے آئیں جب وہ حاضر ہوا تو بادشاہ نے اس کے منصب میں اضافہ اور ترقی دی اور خلعت عطا کیا

---

۱ سفرنامہ برنیر اول ص ۲۰۹

۲ منتخب اللباب سوم ص ۱۶۲

۳ منتخب اللباب سوم ص ۱۶۳

خاندانِ میر درد کی خدماتِ زبان و ادب

حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کے آباؤ اجداد و خاندان کے افراد جہاں صوفیائے کرام میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ وہاں علم و ادب کے میدان میں بھی ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ ان کی تصانیف بڑی پایہ کی ہیں۔ اس خاندان کی وجہ سے علوم و فنون اور زبان و ادب کی بڑی خدمت ہوئی ہے۔

حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کے دادا نواب ظفر اللہ خان روشن الدولہ رستم جنگ تھے جو عالمگیر بادشاہ کی سرکار میں ایک معزز عہدہ پر مامور تھے۔ ان کی یادگار دہلی میں دو عظیم الشان مسجدیں ہیں۔ ایک سنہری مسجد فیض بازار اور دوسری سنہری مسجد فوارہ چاندنی چوک میں موجود ہیں۔ خواجہ میر درد کے والد ماجد حضرت خواجہ محمد ناصر عندلیب تھے جن کا سلسلہ روحانی و علم و ادب حضرت شیخ سعد اللہ عرف شاہ گلشن مجددی سے ملتا ہے۔ شاہ گلشن اس پایہ کے شاعر و صوفی تھے کہ آپ کے حضرت عندلیب اور اردو کے شاعروں کے باوا آدم ولی بھی شاگرد تھے۔

حضرت خواجہ ناصر نے گلشن کے لحاظ سے اپنا تخلص عندلیب رکھا۔ کیونکہ جہاں گل و گلشن کی بہار ہو وہاں عندلیب کیوں نہ ہو۔ اس عندلیب کے لحاظ سے خواجہ میر درد نے اپنا تخلص درد تجویز کیا۔ عندلیب کے لئے درد پیدا کرنا ضرور

ہے۔ اس درد کے خیال سے خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی نے اپنا تخلص اثر مناسب سمجھا تاکہ دنیا کو معلوم ہو کہ درد میں اثر ہوتا ہے۔ ان تخلصوں کا پاس آپ کی اولاد میں برابر جاری رہا۔

حضرت عندلیب کی ایک عظیم الشان یادگار کتاب نالۂ عندلیب ہے جو علوم و فنون اور توحید کا ایک سمندر ہے جس کے ہر قطرے میں لاکھ جلوے اور ہر جلوے میں لاکھ انوار معرفت ہیں۔ حضرت خواجہ عندلیب اپنے زمانہ کے شعراء میں کسی سے کم درجہ نہیں رکھتے۔ ان کے کلام کا بڑا شہرہ تھا۔ ان کا ایک دیوان بھی موجود ہے۔ تبرکاً ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

یار در خانۂ خود دارم و آرام نیست
چکنم دیدۂ من حلقۂ بیرون است

اسی طرح خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف بھی بڑے پایہ کی ہیں۔ اُردو فارسی دیوانوں کے علاوہ رسالہ اسرار الصلوٰۃ، واردات اور اس کی شرح میں علم الکتاب ایک معرکۃ الآرا تصنیف فرمائی ہے جس میں گیارہ متفرق رسالے نالۂ درد، آہِ سرد، دردِ دل، سوزِ دل، شمع محفل اور حرمت غنا وغیرہ ہیں جس کے مطالعہ سے بہت سے دل معرفت اور حقیقت سے لبریز ہو جائیں گے اور حقیقت ایمان اور کنہ عرفان و ایقان کھل جائیں گے اور طریق اولیت محمدیہ خالصہ کے فیضان سے بہرہ یاب ہو کر مراد کو پہنچ جائیں گے کیونکہ یہ تمام امت کی ہدایت اور تربیت کے واسطے مُدوّن کروائی گئی ہے اور بیعت سے فیضان ظاہری اور برکات باطنی اور تائیدات جلیلہ اور تاثیرات قویہ تمام مخلوقات کی منفعت کے لئے اس میں ودیعت کئے گئے ہیں۔

لہ گلِ رعنا صـ ۲۰۸

تصوف کے رموز و اسرار سے واقف ہونے کے علاوہ علم موسیقی میں بھی خواجہ میر درد کو کمال حاصل تھا۔ اس فن کے تمام قواعد اور اصول آپ کے نوک زبان تھے۔ بڑے بڑے استاد گویے اور قوال آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر تال اور سروں کی تحقیق کیا کرتے تھے اور آپ چھ راگ چھتیس راگنیوں اور ان کے بتر بیار جا اور دھنوں کو اس طرح بیان کرتے تھے۔ ہر مت کی تفریق اور تفصیل الگ الگ ہو جاتی تھی اور نائک آپ کے قدم چوم لیتے تھے۔ موسیقی میں آپ کی معلومات صرف زبانی نہ تھی بلکہ آپ اس فن کے کامل بھی تھے۔ فیروز خاں گویہ کے ساتھ کبھی تخلیہ میں صحبت ہوا کرتی تھی اور وہ حضرت کے تفنن کو دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا اور کہتا تھا حضرت آپ سے تا نا دادا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس طرح آپ اپنے کنٹھ سے راگ راگنیاں ادا کرتے ہیں اور ان کا روپ سروپ دکھاتے ہیں۔ آج اس طرح بشر و رمی سنگیت نہیں کہہ سکتے

علوم و فنون اور زبان و ادب کی خدمت کا سلسلہ آپ کے زمانہ تک ہی ختم نہیں ہوا بلکہ مسلسل سید ناصر نذیر فراق تک یہ سلسلہ جاری رہا جس کی مختصر سی روئیداد پیش کی جاتی ہے۔

اثر سید محمد میر خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی اور شاگرد تھے۔ علوم متداولہ و مروجہ اور خاص طور پر علم ریاضی کی تحصیل خواجہ احمد دہلوی سے کی[1] خواجہ احمد مرزا خیر اللہ مہندس کے شاگرد تھے۔ یہ وہی مرزا خیر اللہ ہیں جن کے اہتمام میں دلی میں محمد شاہی رصد قائم ہوئی تھی۔ اور زیچ محمد شاہی کے مصنف ہونے کی حیثیت سے وہ دنیا میں کافی شہرت رکھتے ہیں[2]

---

[1] گلِ رعنا صفحہ ۲۰۸   [2] گلِ رعنا صفحہ ۲۰۸

نکاتِ علومِ باطن و تصوف جو اس خاندان میں سینہ بسینہ چلے آتے ہیں۔ ان کو انھوں نے اپنے برادرِ بزرگ خواجہ میر درد سے حاصل کیے۔ خواجہ میر درد کے بعد آبائی سجادہ نشینی کو زینت بخشی اور مدتِ دراز تک اپنے ظاہری اور باطنی کمالوں سے لوگوں کو فیض یاب کیا۔

بڑے بھائی خواجہ میر درد سے محبت ہی نہیں بلکہ حسنِ عقیدت و ارادت میں بے حد بڑھے ہوئے تھے۔ بھائی کی طرح نہیں بلکہ ان کی پیری کی طرح عزت کرتے تھے۔ چنانچہ ایک ترکیب بند ان کی شان میں انھوں نے لکھا ہے جس کا آخری شعر اس ترکیب بند کا ملاحظہ ہو۔ لہ

بسکہ بخود نخست آن جناب مرا
بندۂ درد بستہ خطاب مرا
بندۂ من تویی و پیر تویی
ناصرم تو و خواجہ میر تویی

اردو کلام میں بھی اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے ؎

ہے غلامی اثر کو حضرت درد
بدل و جان تیری جان کے بیچ

بے درد تو کیوں کر رہ سکے گا
یہ حضرت درد کا اثر ہے

خواجہ میر درد کو بھی اپنے چھوٹے بھائی خواجہ اثر سے محبت تھی۔ خواجہ میر درد کی عالمِ ضعیفی میں ان کے مرید نے عرض کیا کہ دنیا دارِ فانی ہے اور حضرت کا وقتِ آخر

لہ مے خانۂ درد ص۱۷۱

ہے حضور ہدایت فرمائیں کہ آپ کے بعد کس کو آپ کا جانشین بنایا جائے آپ یہ سُن کر آبدیدہ ہو گئے اور جواباً فرمایا ؎

تا قیامت نہیں مٹنے کے دلِ عالم سے

دردؔ ہم اپنے عوض چھوڑے اثرؔ جاتے ہیں

خواجہ میر دردؔ اپنے والد کی وفات کی مہینے کی ہر دوسری تاریخ پر محفلِ راگ قائم کرتے تھے۔ چونکہ خواجہ میر دردؔ کا انتقال ۲۴ ویں کو ہوا تھا اس لئے خواجہ میر اثرؔ نے دوسری اور چوبیسویں مہینہ کی تاریخوں میں محفل کا سلسلہ قائم کیا۔ خواجہ میر اثرؔ کو خواجہ میر درد کی طرح موسیقی میں نہایت دخل تھا۔ آپ نے ایک رسالہ دارد مسمی تو اندا تالیف کیا تھا۔ ؎[1]

میر اثرؔ نے شعر کا طرز بھی بھلا کا پسند کیا۔ ان کے چھوٹے بحروں کے اشعار نہایت موثر اور پُر لطف ہوتے تھے۔ اور جو کچھ کہتے شگفتہ بحر میں کہتے تھے جس سے اہلِ دل کے دل بھر آتے تھے۔ ان کا کلام آورد سے پاک، آمد سے لبریز اور لطف انگیز ہے تعقید کا نام نہیں ہے۔ تصوف کے رموز سے خوب ماہر تھے۔ تصوف کی چاشنی سے کلام میں اور جان پڑ جاتی تھی۔ کلام میں محاورے کی دوش اسلوب کو زیادہ خیال رکھتے تھے۔

صاحب تذکرہ گلشن ہند کی آپ کے کلام کے بارے میں یہ رائے ہے۔

"سچ تو یہ ہے کلام ان کی چاشنی سے درد و اثر کی آشنا ہے درد و اثر کے ساتھ نہایت طبیعت ہموار کی تھی"

عبد الغفور نساخ اپنے تذکرہ "سخن شعراء" میں فرماتے ہیں اشعار ان کے پُر درد ہوتے ہیں۔ میر حسن کا ارشاد ہے "صاحب سخن است موثر" شیفتہ "گلشن بیخار" میں لکھتے ہیں۔

---

[1] میخانہ درد ص۱۷۰ ؎[2] تذکرہ میر حسن ص۱

"خیالات ایشان بقصدے کہ غایت درد مندانہ دلپذیر

مطبوع واقعہ شدہ"۔

میر اثرؔ کا اردو فارسی دونوں زبانوں میں دیوان ہے۔ مثنوی "خواب وخیال" میں عشق و محبت کی داستان بیان کرنے کے لئے تین ہزار اشعار ہیں جو بڑی شہرت کے مالک ہیں اور لاجواب ہیں۔ صوفیا ان پر جان دیتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ تصوف سے لبریز ہیں۔

ایک صاحب تذکرہ کی رائے مثنوی کے بارے میں یہ ہے [1]

"مثنوی ایشان شہرت تمام دارد کہ بنلسے آن بر محاورہ است۔

وازیں مرغوب عوام"

مولانا حالی مثنوی شوقؔ کو بدر منیر پر ترجیح دیتے ہوئے اس کے فخر کا باعث خواجہ اثر کی مثنوی "خواب وخیال" کو قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں :۔

"خواجہ میر اثرؔ دہلوی نے جو ایک مثنوی لکھی ہے جس کا نام غالباً "خواب وخیال" رکھا تھا اور جس کی شہرت ایک خاص وجہ سے زیادہ تر یورپ میں ہوئی تھی اس مثنوی کے جیسا کہ ہم نے بعض احباب سے سُنا ہے تقریباً ۴۰۔ ۵۰ شعر اس قسم کے ہیں جیسے شوقؔ نے بہار عشق میں اختلاط کے موقع پر ان سے بہت زیادہ لکھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شوقؔ کو ایسی صاف زبان برتنے کا خیال اس مثنوی کو دیکھ کر پیدا ہوا اور چونکہ وہ شوخ طبع آدمی تھا اور بیگمات کے محاورے پر اس کو زیادہ عبور تھا اس نے مثنوی کی بنیاد خواب وخیال کے ۴۰۔ ۵۰ شعروں پر رکھی ہے"۔

---

[1] گلشن بیخار صفحہ ۱۹

مثنوی "خواب و خیال" کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے:۔

بعد حمدِ خدا و نعتِ رسول — کچھ کہے ہے یہ اب ظلوم و جہول
بے محابا کلام ہے یعنی — بیشتر ہیچ پوچ و بے معنی
نوزشیں گفتگوئے مستانہ — ہمگی ہلئے و ہوئے دیوانہ
کچھ نہ قصہ نہ کچھ حکایت ہے — کچھ نہ شکوہ، نہ کچھ شکایت ہے
بات ہے بے رشتۂ اصل — ہجر کیدھر کا اور کہاں کا وصل
جلوہ پردازی جہان مثال — نام اس کا یہی ہے "خواب و خیال"

مثنوی میں معشوق کے سراپا کا نقشہ کھینچتے ہیں ؎

ناک ہے یا کہ ایک توتا ہے — چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے
نتھنے ایسے تب بھڑکتے ہیں — جانور وحشی جیوں بھڑکتے ہیں
ذائقہ میں تو جیسے یہ لب ہیں — شہد و شربت جو کچھ کہو سب ہیں
دانت جب مجھ کو یاد آتے ہیں — دل کلیجا سبھی چباتے ہیں
دیکھ کر آنکھیں ابدا کو یہاں — لوٹ جاتا ہے گوہر غلطاں
گر کبھی اس کے جی میں آوے ہے — مسی دو انگلیاں لگاوے ہے
دانت بھر دیں یہ چمکتے ہیں سارے — رات اندھیری میں جوں جیسے تارے
جب خیال آئینے پہ گردش کا — یہاں ڈھلک جائے ہے میرا منکا
کیوں نہ کھینچے وہ سب آپ کو دور — جس میں ایسا بھرا ہوا ہو غرور
دھیان میں جب وہ بازو آتے ہیں — ہاتھ پاؤں اپنے بھول جاتے ہیں
کیا خوش آئندہ یہ کلائی ہے — اس کو دل لینے کو کمل آئی ہے

خواجہ اثر نے صفر ۱۲۰۹ھ میں انتقال فرمایا اور خواجہ میر درد کے پہلو میں مغرب کی طرف دفن ہوئے۔ خواجہ محمد ناصر اور خواجہ میر درد کے مزار پر جو کتبے ہیں وہ آپ نے ہی کندہ

روا کر لگائے تھے اور خواجہ میر درد کے پہلو میں اپنا سرداب اپنے جیتے جی تیار کرا کر اس سرداب کے سرہانے یہ کتبہ کندہ کرا کر نصب کروا دیا تھا ؎

از بسکہ غلام خواجہ میریم اثر
زیر اقدام خواجہ میریم اثر

از رحمتِ حق زندۂ جاوید شویم
ہرگاہ بنام خواجہ میریم اثر

کلام کا نمونہ ؎

بے وفا تیری کچھ نہیں تقصیر
مجھ کو میری وفا ہی راس نہیں

تو ہی بہتر ہے ہم سے آئینہ
ہم تو اتنے بھی روشناس نہیں

یوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر اثر کی تو ہم کو آس نہیں

عاشقی اور عشق کی باتیں
سب جہاں سے اثر کے ساتھ گئیں

جی میں ہے از سرِ نو جور ترے یاد کریں
تیرے یا نہ سنے نالہ و فریاد کریں

یاں تغافل میں اپنا کام ہوا
تیرے نزدیک یہ جفا ہی نہیں

وہی میں ہوں وہی اثر اے دل
اب خدا جانے کیا ہوا مجھ کو

غرض آئینہ داریٔ دل سے
تیرا جلوہ تجھے دکھاتا ہے

دوست ہوتا جو وہ تو کیا ہوتا
دشمنی پر تو پیار آتا ہے

کبھی دوستی ہے کبھی دشمنی
تری کون سی بات پر جائیے

تیری عیاریوں کی باتیں اثر
سب سمجھتا ہے گو دوانہ ہے

حال پر اپنے مجھ کو آپ اثر
رحم بے اختیار آتا ہے

یہ جو بن رات جو گزری ہے جانوں یا خدا جانے
تجھے تو کب ہوئی ہوگی خبر تیری بلا جانے

نہ قصد اپنا کہ دل دیجئے نہ قصد اس کا کہ جی لیجے
مصیبت کیا بیاں کیجے بلائے ناگہانی کی

غم میں بیٹھوں کہاں تلک بت کے
اب اٹھا وے کہیں خدا مجھ کو

الم | خواجہ میر الم دہلوی خواجہ میر درد کے اکلوتے بیٹے تھے آپ نے علوم دینیہ اور خاندانی کمالات اپنے والد ماجد خواجہ میر درد علیہ الرحمتہ سے حاصل کئے اور خواجہ میر اثر اپنے چچا جان کی وفات کے بعد سجادہ مقرر ہوئے بیس برس کی عمر میں خواجہ میر درد صاحب نے آپ کو اسلامی ملکوں اور ہندوستان کی سیاحت کے لئے اپنے ایک مرید فتح علی کے ہمراہ روانہ کیا۔ بارہ برس سیر و سفر میں گزارے جہاں

آپ نے صوفیائے کرام سے ملاقات کی اور مزارات مقدسہ کی زیارت کی۔
۱۱۹۴ھ میں مرشد آباد تشریف لے گئے تھے۔ راجہ دلارام کی قدردانی سے کچھ روز وہاں قیام کیا[1] پھر کچھ دن عظیم آباد اور فیض آباد رہے۔ رند مشرب تھے، لباس فقیری میں زندگی بسر کی ۱۱۷۹ھ میں آپ عالم شباب تھا۔ آپ کی طبیعت شاعری میں خاندانی خوبیاں رکھتی تھیں۔ کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ شعر اچھا کہتے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو میں ان کا کلام ہے مصحفی نے ان کو جرات میں دیکھا ہے اور اُن کے متعلق یہ رائے قائم کی۔

"جوانے است حلیم و سلیم بتفضلے موزونی طبع کہ موروثی است
گاہ گاہے فکر رباعی یا مطلع یا حسن مطلع می کنند"۔

مرزا علی لطف ان کی سیرت اخلاق سے متاثر ہوئے۔ لکھتے ہیں:۔

"درویش صاحب حقیقت اور پہچاننے والے رموز معرفت کے ہیں، شاہجہاں آباد میں توکل اور قناعت کے ساتھ اوقات شریف بسر کرتے ہیں"۔

حضرت الم صاحب دیوان ہیں اور بقول حضرت فراق دہلوی آپ کی تصانیف کے متعدد رسالے جو بے بہا جوہر تھے غدر میں تلف ہوگئے۔ آپ کا ۲۱ جمادی الآخر ۱۲۱۵ھ میں انتقال ہوا۔ آپ خواجہ میر درد کی پائیں میں دفن ہوئے۔ آپ کے ایک صاحبزادے پیر محمد بخش اور ایک صاحبزادی بی اماں بیگم تھیں۔ نمونہ کلام۔

اب تو اس بت کو رام کیا
بس خدا تجھ کو بھی رام کیا

---

[1] گلشن ہند صد ۳۹

چھوڑتا کب ہوں اب یہ دامن بے

تیری خاطر یہ گو غبار ہوا

دھمکاتے ہیں بس مجھ کو فقط آپ اکڑ کر

بانکے ہو تو مونڈھا چلو مونڈھے سے اکڑ کر

جب نام خدا دور سے وہ جلوہ نما ہو

مر جائیں صفوں کی صفیں حیرت سے بچھڑ کر

آجاتا ہے دکھ درد بھلانے کو الم یہاں

کیا اس سے مزاحم ہو اٹھاتے ہو بھلا لڑ کر

الم صاحب کی رباعیوں سے بھی لطف اندوز ہوں ۔

نے دل کو قرار بے قراری کے سبب

نے چشم کو خواب اشکباری کے سبب

واقف نہ تھے ہم ان بلاؤں سے کبھو

یہ کچھ دیکھا سو تیری یاری کے سبب

کیا کہیے الم اک گھڑی چین نہیں

معلوم ہوا کہ جیتے جی چین نہیں

میں تو بے چین ہوں پر ہے تحفگی یہ

بن میرے ستم گر اس کو بھی چین نہیں

سودا کب تھا اسے یہ کب تھی وحشت

بس دیکھ کے تجھے ہوا پریشان حالت

زلفوں کے دام میں اُلجھ سا آزاد
آ کر پھنس جاوے یوں خدا کی قدرت

شاعر میر کلو اکبر آباد کے رہنے والے تھے میر نعمان بدخشانی کی اولاد میں سے ہیں۔ ان سے خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کی چھوٹی صاحبزادی زینت النساء صاحبہ بیاہی گئی تھیں۔ شاعری میں حضرت میر درد کے شاگرد تھے۔ بعض تذکرہ نویسوں مثلاً گلشن بیخار نے اُن کا تخلص کلو لکھا ہے لہ میر کلو علم و عمل سے پیراستہ تھے تو انت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی منکسر مزاج تھے۔ بیٹا بھی اگر غلطی کرتا تو اس کو سزا دینے سے گریز نہیں کرتے تھے سنجیدہ طبیعت پائی تھی۔ زہد و ورع میں غضب کے تھے۔ خاندان کے تمام افراد اور غیر خاندان کے اپنے تحفے تحائف دیکھنے آتے تھے۔ دہلی وغیرہ دہلی کے امراء اور اقربا ملنے آتے تھے تو ہر ایک سے بے نفسی کے ساتھ ملتے تھے۔ ان کا کلام درد و الم کی تصویر اور صحیح نقشہ ہوتا ہے۔ چنانچہ میر حسن فرماتے ہیں:۔

"جوانی است، بہ کمالِ صلاحیت آراستہ، و علم و عمل پیراستہ اہلِ دل، منصف، متواضع۔ مودب بزرگ و بزرگ زادہ فکر عاشق رسا و سخن متوانیش خوش، ساجشتر رباعیات بہ طور میر سوز عمدا گفتہ"۔

صاحبِ "گلشن ہند" بھی ان اوصاف کی تصدیق کرتے ہیں:۔

" بہ سلامت ذہن و درستی سلیقہ انصاف دارد از موزونانِ عہد شاہ عالم بادشاہ است"۔

لہ سخن شعراء ص ۲۳۸

میر حسن، جب فیض آباد میں نواب سالار جنگ کے مصاحب تھے، اس وقت میر
کلو میر آثم کے ساتھ فیض آباد گئے اور میر حسن سے ان دونوں حضرات کی ملاقات ہوئی۔
میر کلو کا دیوان ضخیم ہے لیکن مصحفی کو تذکرہ لکھتے وقت دستیاب نہیں ہو سکا۔ انھوں
نے برائے یادگار ایک شعر میر کلو کا اپنے تذکرہ ریاض الفصحا میں نقل کیا ہے:۔

گریباں پھاڑ کر کیدھر نکل جاویں ہم اے وحشت
ہوئی ہے زندگی ناحق گلے کا ہار کیا کیجے

مذکورہ شعر کی بقایا

ہمارا دل لیے جاتا ہے، وہ خونخوار کیا کیجے
سوائے صبر کچھ چارہ نہیں، ناچار کیا کیجے

وہ سچا جانتا ہے جھوٹے موتی بھی ہرگز نہیں سُنتا
حقیقت ہی اپنے شخص سے اظہار کیا کیجے

مثل مشہور ہے شاعر کہ سوتے لوٹ جاتے ہیں
جو کوئی جاگتا ہے اُسے بیدار کیا کیجے

صدا فقیروں کی گر تم سُنو گے کیا ہو گا
ذرا دعا بھی نظر پھینکنا بھلا ہو گا

گر نہ ہو ظلم و ستم لی تو کیا مزہ
ظالم تجھی سے لطف ہے ہر دم تری رہے

ہم دیکھتے ہیں یوں کے لئے یار جہاں میں
اک تو ہی تو اس بات کے قابل نظر آیا

گر کبھی خمک بھی مرا کیجیے گا
پھر جو جی چاہے کہا کیجیے گا

اپنے مطلب کی کہے جائیں گے ہم
گرچہ سو بار نہیں کیجئے گا
وصل لاکھ جفا ہے، یہ ہمیں
ایک گر وعدہ وفا کیجئے گا
تری زلف آن اُلجھی ہے مرا دل
کسی سے آج تک اُلجھا نہیں ہے

رنج | خواجہ میر درد کی دو صاحبزادیاں تھیں۔ بڑی براتی بیگم اور چھوٹی زینت النسا صاحبہ۔ براتی بیگم کی شادی مولوی عبدالحی صاحب سے ہوئی جو خواجہ میر درد کے چچازاد بھائی تھے اور دوسری بیٹی کی شادی میر کلو سے ہوئی۔ میر کلو کے جدِ امجد میر نعمان اکبر آبادی شیخ عبدالقدوس گنگوہی چشتی صابری کے خلیفہ تھے۔ میر نعمان کا عظیم الشان مقبرہ آگرے میں موجود ہے۔ دہلی آگرہ میں اب تک ان کے معتقد ہیں اور زائرین کا ہجوم آپ کے مزار پر رہتا ہے۔

شاہ کلو کے فرزند شاہ محمد نصیر رنج ۱۱۹۹ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدا سے طالب خدا تھے۔ بچپن ہی میں حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کی خدمت میں رہنے لگے اور توجہ لیتے تھے بلکہ اسی زمانے میں خواجہ میر درد سے بیعت کی تھی جب آپ کی عمر دس برس کی ہوئی خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ نے وفات پائی اور آپ کو اپنے نانا کی وفات کا بہت صدمہ ہوا۔ آپ کو اکثر علوم میں اور علی الخصوص ریاضیا میں کمال حاصل تھا۔ علم موسیقی کے بھی ماہر تھے تال اور لے سے ایسے واقف تھے کہ اس فن کے بڑے سے بڑے استاد ان کے سامنے زانوئے ادب طے کرتے تھے۔

علم حساب میں بھی بڑا عبور حاصل تھا۔ بڑے مشکل مسائل بہت آسانی سے حل
کر دیتے تھے۔ اسی فن میں جمیع اعمال میں تنصیف سے جبر و مقابلہ تک یک لخت
قواعد جداگانہ اور علیحدہ ان قواعد سے جو کتب متداولہ میں ثبت اور مرقوم
ہیں ایجاد کیے اور ہر عمل کے واسطے نیا طریق مقرر کیا اور ان ضوابط مخترعہ
سے کئی رسالے مرتب کیے[1] چنانچہ فن تال میں ایک رسالہ لکھا ہے جس سے یہ معلوم
ہوتا ہے کہ اس فن میں یکتائی کا دعویٰ انہی کو سزاوار ہے۔ آپ نے خواجہ میر درد
میر اثر اور خواجہ الم کے ملفوظات اور حالات بھی لکھے تھے۔ اس کے علاوہ تصوف
ریاضی اور علم موسیقی میں متعدد کتابیں تصنیف کی تھیں[2]

آپ نے کمالاتِ باطنی خواجہ میر اثر سے حاصل کیے۔ خواجہ میر اثر کا انتقال
ہوا تو میر درد کے صاحبزادے خواجہ الم سجادہ نشین ہوئے۔ ان کے فوت ہونے
کے بعد آپ سجادہ نشین مقرر ہوئے۔ ہر مہینے کی دوسری اور چوبیسویں کو دستور
کے مطابق حضرت میر درد کے مزار پر مجلس بین سازی منعقد کراتے تھے۔ شمت
خاں قوال و گویا جو دھرپد کے گانے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا اور آگے رس علی
جو بین نوازی میں یکتائے روزگار تھا اور میر ناصر احمد جو نغمہ سرائی اور بین نوازی
میں بے مثل تھا۔ یہ تینوں اہل کمال ہر مہینے کی دوسری اور چوبیسویں کی مجلس سازی
میں لازمی طور پر شامل ہوتے تھے۔ محرم کی تیسری تاریخ کو مرثیہ خوانی بھی ہوتی تھی۔
شہر دہلی کے اکثر مرثیہ خواں اس محفل میں شامل ہوتے تھے[3]

---

[1] گلستانِ سخن صفحہ ۲۸۵

[2] مے خانہ درد صفحہ ۱۹۶

[3] طبقات الشعراء صفحہ ۵۰۰

دُنیا کی ان کے نزدیک ذرّے کے برابر بھی قدر نہیں تھی۔ نہ دُنیا کی جاہ و حشمت کے آنے کی خوشی اور نہ جانے کا غم، بسا اوقات مشاہدہ ہوا کہ جو کچھ پاس آیا مستحقین کو تقسیم کر دیا اور آپ بالکل خالی ہاتھ رہ گئے۔

مومن خاں مومنؔ جو اپنے وقت کے صاحبِ کمال تھے کہا کرتے تھے کہ "خواجہ محمد نصیر جیسا عالم فاضل دہلی میں کوئی نہیں"۔

سر سید مرحوم نے آثار الصنادید میں لکھا ہے:۔

"خواجہ محمد نصیر کو صبر میں درجہ کمال حاصل تھا اور دنیا سے مطلق لگاؤ نہ تھا۔ اوصافِ حمیدہ آپ کے لاتعداد ہیں میری طاقت ان کے بیان کی نہیں"۔

شیفتہ صاحب، مؤلف گلشن بیخار بھی سر سید کی تائید کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"بہ اکثر صفاتِ حسنہ موصوف و بجمیع رموز موسیقی معروف صاحب زہد بجمعیت دلکش و دل کشادہ ذہن تیز و بے برکت صحبت ایشان دریافتہ است و ندا و شعر و سخن دیوان مدون درشناختن شعر سلیقہ خوشی دارد"۔

خواجہ محمد نصیرؒ نے یکشنبہ دوسری شوال ۱۲۶۱ھ کو وفات پائی[1] اور مومن خاں صاحب نے آپ کی تاریخ وفات کہی ؎

شیخ زمانہ شد ز دہر و زیں ملال وفات
فکر بلندم رہ جنت ما وی گرفت
گفت بمومن ملک خواجہ محمد نصیر
۔۔۔۔۔۔ در قدم ناقہ ۔۔۔ و زرد کو جا گرفت
۱۲۶۱ھ

[1] نسیم سخن صفحہ ۱۳۰

شعر کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے:۔

خط دیکھ کر ادھر تو مرا دم اُلٹ گیا
قاصد ادھر بدیدۂ پُر نم اُلٹ گیا

یقیں ہو گیا دیکھ کر اس کا قامت
کہ بے شک قیامت دیدار ہو گا

کھڑکی نکال جانب دشمن نہ بام پر
کوٹھے چڑھی جو بات کھلی خاص و عام پر

یاد دلوا کے جو ہم بستری یار لُٹے
سو وہ تصویر نہالی ہے تعصب کا دشمن

دل جس کے لئے پہلو میں تپاں رہتا ہے
یوں سنتا ہے اسے بھی خفقان رہتا ہے

دیکھی نہیں حالت یہ جدائی میں کسی کی
ہے طور جدا اپنا جدائی میں کسی کے

ٹھہرا نہ یہاں تو کار خانہ اپنا افسوس ڈالا
وہاں دیکھے ہوئے کیا ٹھکانا اپنا ہی طور پرا

استادہ تھا جس سے بیگانہ ہے نادانی سے
بیگانہ وہ تھا کہ جس کو جانا اپنا کیا قہر کیا

کان کا موتی نہیں عاشق کا اشک
سرد مہری سے تری یوں تم رہا

یاد میں اس گلبدن کے صبح تک
اشک سے تکیہ مرا سب نم رہا

زندگی تھی و ناگوار ہوئی
آنکھ سے آنکھ جب دو چار ہوئی

بعد مردن بھی نہ چھوٹا ہم سے ذوق مے کشی
خاک سے اپنی سبو سے مے کی ساغر بنی

محزون میر ناصر جان دہلوی سید محمد نصیر رنج کے فرزند تھے۔ آپ نے علوم ظاہری اور کمالات باطنی اپنی والد ماجد سے حاصل کئے اور مولانا فضل خیر آبادی سے منطق پڑھی۔ نواب فرید الدین احمد خاں صاحب بدائی دہلوی سے ریاضی حاصل کی۔ فن ریاضی میں آپ بہت مشاق تھے لہ صاحب گلشن بخاراں کی ریاضی دانی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"کتب درسی نیک مستحضر دارد خصوصاً در ریاضی امروز مہارتے کہ اوراست دیگر نیست دریں ہنگام بہ ممالک شرقی رفتہ بافقیر طریقہ شناسائی سلوک دراست"۔

ضلع کا کلکٹر آپ کی ریاضی دانی کا کمال سُن کر ملنے کا مشتاق ہو گیا اور پیش بھیج کر بلایا۔ ولایت سے چند ریاضی کے سوال حل کرنے کے لئے آئے تھے۔ آپ کے سامنے رکھے۔ آپ نے وہیں بیٹھ کر منٹوں میں حل کر کے کلکٹر صاحب کو دے دیئے۔ وہ حیران رہ گیا اور حاکم بالا کو اس کی قابلیت کے بارے میں لکھا صدر سے آپ کے لئے مقام گڑھی کی منصفی کا عہدہ تجویز ہوا۔ کلکٹر صاحب نے آپ کو کلکٹر منصفی کا پروانہ دے دیا۔ آپ نے کلکٹر کے اصرار پر منصفی منظور کی۔ سنہ بعد اپنے والد میر رنج کے بعد خواجہ میر درد کی خانقاہ کے سجادہ نشین رہے ہے۔

لہ گلستانِ سخن صد ۲۲۲

سٰہ میخانہ درد صد ۲۰

میر محزوںؔ نے اپنے بزرگوں کی تمام کتابیں شائع کرنے کا ارادہ کیا چنانچہ اس کے لئے پریس بھی خرید لیا۔ کام شروع کرنا چاہتے تھے کہ آپ کو ایک مقدمہ کے لئے جانا پڑا اور یہ ضروری کام رک گیا۔

کافی عرصہ آپ عظیم آباد رہے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی سے اقرباء اور احباب کا نامہ و پیام کا سلسلہ بند ہو گیا تو دل برداشتہ ہو گئے۔ اور اس بے وطنی کی زندگی کا خاکہ ایک شعر میں ہے ؎

نہ تو نامہ ہی نہ پیغام زبانی آیا

حیف محزوںؔ مجھے یارانِ وطن بھول گئے

عظیم آباد میں ملازمت کے ایام گزار رہے تھے کہ درد گردہ کا عارضہ ہوا۔ علاج ہوا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ دوسری رمضان ۱۲۲۹ھ کو فوت ہوئے۔ آپ کے والد میر رنجؔ زندہ تھے۔ ان کو صدمۂ عظیم برداشت کرنا پڑا۔

عظیم آباد سے جنازہ دہلی لایا گیا۔ درگاہ خواجہ میر دردؔ کے احاطے میں مدفون ہوئے جس دن آپ نے انتقال فرمایا اسی دن شام کو صدر الصدوری کا پروانہ آپ کے نام آیا۔

مرزا قادر بخش صاحب مؤلف "گلستانِ سخن" نے میر محزوںؔ کا عالمِ پیری دیکھا تھا۔ ان کے عظیم آباد جانے، وہاں بیمار پڑنے اور دہلی میں ان کی میت کے آنے کا جو نقشہ انھوں نے کھینچا ہے، اس سے میر محزوںؔ کی شخصیت اور اس زمانے کی لوگوں کی ان سے عقیدت کا پتہ چلتا ہے اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں :۔

"عرصہ ہوا کہ سواد شاہجہاں آباد سے عظیم آباد کی طرف تشریف فرما ہو کر چندے اس سر زمین کو اپنے قدم فیض توام سے رشکِ گلزار کیا۔ ناگاہ درد گردہ کا عارض ہوا۔ اور چونکہ قرا بادین مشیت میں اس

مرض کی دوائی ترکیب نہ پائی تھی۔ استعمال ادویہ مفید نہ ہوا۔
چند روز کے بعد آسمان تقدیس سے ندائے ارجعی پہنچی اور کشادہ
پیشانی معارف نامتناہی کا بدرقہ لئے ہوئے، گلشن جناں کی طرف
راہی ہوئی اور والد ماجد کو درد جُدائی سے "موتوا قبل ان تموتوا" کے
مضمون سے موصوف کر دیا۔ آپ کا جنازہ اس راہ دراز سے شاہجہاں
آباد میں لائے اور جسم اطہر اور بدن مقدس کو درگاہ خاک پائیگاہ کے
احاطہ کے اندر حضرت کے قدم کے نیچے مدفون کیا۔"

کہا ہے لب سخن می کشاید[1]

جھوٹ ہے اور سے کب میں نے لڑائی آنکھیں
تم نے بے فائدہ رو رو کے سجائی آنکھیں
شاید اس وقت گیا آپ کا دھیان اور کہیں
بات کرنے میں جو تم رابطِ سخن بھول گئے
تھی جس سے نہ ایک دم گوارا فرقت
دکھلائی فلک نے پھر دوبارا فرقت
اب زیست تلک بھی اس سے ملنا معلوم
گردن پہ ترے خون ہمارا فرقت

سلطان

خواجہ میر درد کے دادا نواب ظفر اللہ خاں کے دو بیٹے خواجہ محمد ناصر اور خواجہ مظفر تھے۔ خواجہ مظفر کے صاحبزادے خواجہ محمد یار خاں اور اُن کے فرزند ارجمند مولوی عبدالحی صاحب تھے گویا مولوی عبدالحی صاحب خواجہ میر درد کے چچازاد بھائی ہوئے۔ خواجہ عبدالحی کی بہن جانی بیگم تھیں جو نواب حسین علی خاں رئیس عظیم آباد سے بیاہی گئی تھیں۔ اُن کے تین صاحبزادے تھے جن میں

خواجہ سلطان بھی تھے اور ان کا نام طلعتی خاں تھا۔

سلطان صاحب بھی موسیقی کے ماہر تھے، گویا ان کو ورثے میں ملی تھی۔ فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے، اُن کے تین دیوان ہیں:

لکھنؤ کی بھی اُنھوں نے سیر کی، اس کے بعد کلکتہ چلے گئے۔ عرصہ تک وہاں قیام کیا اور وہیں ۱۲۷۲ھ میں فوت ہوئے۔ وہاں ان کا جانا راس نہ آیا۔

صاحب سخن شعرا مولوی عبدالغفور نساخ سے اُن کے دوستانہ تعلقات تھے اُنھوں نے سلطان صاحب کی تاریخ وفات کہی ؎

خواجہ سلطان جاں کہ رحلت کرد وائے
دوستاں را کرد باندوہ جفت
سال مرگ او چو جستم از سر دشش
خواجہ سلطان جاں بمرد افسوس گفت

۱۲۷۲ھ

نمونۂ کلام ؎

دام بلائے عشق میں، ہم بے سبب پڑے
کم بخت دل پہ ہائے خدا کا غضب پڑے
تم کو پردے سے فقط بنا آتی ہے
یا کبھی چاند سی صورت بھی دکھا آتی ہے
اے بتو ہر مومن دکا فر کی لگتی ہے نظر
ہے خدا حافظ، تمہارے مصحف رخسار کا
بوئے عطر خس تھی سلطان یار کے زباں میں
اس نے جو پوچھا پسینہ سبزۂ رخسار کا

کمر لچکی تو وہ گل ہنس کے بولا
بھرا ہے پھولوں سے دامن ہمارا

دل کی جا سینے میں میرے اس کا پیکاں رہ گیا
میزباں جاتا رہا اور گھر میں مہماں رہ گیا

مرنے کے بعد بھی نہ گئیں بے قراریاں
عالم ہے برق کا مرے سنگِ مزار پر

رندوں نے آج نشہ میں کیا دھج نکالی ہے
مینا بغل میں سر پہ سبو جام دوش پر

افتادگی پسند تھی طفلی ہی سے مجھے
آیا نہ ایک دم کبھی آرام دوش پہ

چاہیے عاشق و معشوق میں گرما گرمی
وصل کی رات نہیں خوب یہ شرما شرمی

تاب کس کی جو کرے بات اس بت مغرور سے
حور بھی دیکھے تو لے اس کی بلائیں دور سے

پڑھی جو بادہ کشوں نے نماز استسقا
تو جھوم کر طرف قبلہ سے گھٹا آئی

دفن جس کوچے میں ہم عاشق ناشاد ہوئے
جتنے بے رحم تھے، وہاں غیرت فرہاد ہوئے

ناصر — سید ناصر وزیر خواجہ میر درد کی نواسی نصیرہ بیگم کے نواسے اور سید ناصر امیر کے بڑے صاحبزادے تھے۔ اگرچہ آپ اپنے والد ماجد کی جگہ سجادہ نشین ہو سکتے تھے مگر مشائخ اور دہلی کے روساء نے پھر

بھی بی اماں امانی بیگم صاحبہ سے اس گدی پر بٹھانے کی اجازت لی اور انھیں سجادہ نشین بنا دیا۔

خواجہ ناصر میں طفولیت کے زمانے سے ہی رشد و ہدایت کے آثار ظاہر تھے۔ اس لئے آپ نے سجادہ نشینی کی اہم ذمّہ داری کو بڑی قابلیت سے نبھایا خاندانی سلوک کے علاوہ مولانا رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو خانقاہ مرزا جان جاناں کے سجادہ تھے۔ موسیٰ زئی تشریف لے جا کر اخون دوست محمد صاحب قندھاری سے مجددیہ سہروردیہ، قادریہ چشتیہ اور نقشبندیہ کی نسبت حاصل کی۔ فقہ اور حدیث پڑھی۔ حافظ امیر الدین صاحب دہلوی جو مشہور خطاط تھے اُن سے خط نسخ سیکھا۔ آپ خط شکستہ، نسخ، شفیعہ، نستعلیق اور ناخن وغیرہ کے ماہر تھے۔

آپ بہت لاغر اندام اور خوبصورت تھے اس کے باوجود جسم میں زور اور طاقت خدا داد تھی۔ [1]

آپ نے دو حج کئے تھے۔ آپ کی بہت سی کرامتیں زبانوں پر ہیں۔ بارہ دری سے ملحق جو خواجہ میر درد صاحب کی مسجد ہے یہ بہت بوسیدہ ہو گئی تھی۔ آپ نے اس کو از سرِ نو تعمیر کرایا۔ آپ کے وقت میں بھی بزرگوں کے عرس شاندار طریقے سے ہوتے تھے۔

دوسرے حج سے جب آپ واپس تشریف لائے تو آپ کو اسہال شروع ہو گئے۔ علاج کیا مگر شفا نہ ہوئی۔ ماہِ شعبان ۱۳۲۹ھ کو آپ نے انتقال فرمایا۔ اور خواجہ میر درد کے پائیں میں دفن ہوئے۔ مولانا الطاف حسین

---

[1] میخانہ درد ص۲۱۰

صاحبِ حالی نے یہ تاریخ وفات کہی ؎

جب ہوئے ناصر وزیر راہیِ ملکِ بقا
سب ہوئے اندوہگیں شہر کے برنا و پیر
دل نے کہا ہر جگہ پھبتی ہے چیز اک جدا
باغ میں نسرین و گل، چراغ پر ہے سیر منیر
عیش میں شعر و غزل، سوگ میں تاریخ مرگ
غیب سے آئی ندا، خلد میں ناصر وزیر

۱۲۹۸ھ

خواجہ ناصر وزیر، مرزا قربان علی بیگ سالک تلمیذ مرزا غالب کے شاگرد تھے۔[1]

ناصر خواجہ حبیب خواجہ میر درد کے نواسے تھے۔ خواجہ محمد نصیر رنج کی بیٹی انجمن النساء صاحبہ کی شادی مومن دہلوی سے ہوئی تھی۔ مومن کی صاحبزادی محمدی بیگم تھیں جن کی پیدائش پر مومن نے تاریخ پیدائش کہی تھی ؎

دخترِ روشن رواں ہوئی پیدا
کیا ہی چمکا ہے اخترِ مومن
نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے
کہی تاریخ دخترِ مومن

---

[1] میخانۂ درد صفحہ ۲۱۰

محمدی بیگم مولوی عبدالغنی صاحب وکیل سیتاپور سے بیاہی گئی تھیں۔ مولوی صاحب مولانا محمد فصیح بانیٔ سلسلۂ فصیحی کے صاحبزادے تھے۔ ان کے ایک بھائی محمد امانت اللہ مشہور واعظ گزرے ہیں۔ مولوی صاحب کے صاحبزادے ناصر حبیب تھے۔ یہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ پرورش و تربیت سیتاپور میں ہوئی۔ ناصر صاحب مومن کے نواسے تھے۔ چنانچہ اس تعلق کا ذکر فخر کے ساتھ انھوں نے اپنے ایک شعر میں اظہار کیا ہے ؎

کیونکر یہ کہوں کسی سے اچھا ہوں میں
میں آپ سمجھتا ہوں کہ جیسا ہوں میں
لیکن مجھے نہ کیوں فخر ہو اے ناصر
جب حضرت مومن کا نواسہ ہوں میں

آپ کا حلیہ یہ تھا:۔

گورا رنگ، سڈول اعضا، خاندانی انداز کے بموجب بہت کشیدہ قامت، وجیہہ صورت، سفید نورانی داڑھی تھی، صاف ستھرے کپڑوں کے شوقین تھے۔

فراق سید ناصر نذیر فراق سید محسن بن فیاض علی کا سلسلۂ نسب حضرت ابوالفرح واسطی سے ملتا ہے جو حضرت امام زید شہید بن امام زین العابدین کی اولاد میں تھے۔ سید ابوالفرح واسطی کے بیٹے سید عوض سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں ہندوستان آئے بلگرام اور بارہ تک پھیلے۔ آپ کے جد اعلیٰ کی جاگیر سکندر لودھی کے عہد میں قصبہ لونی سے گڑھ مکتیسر تک تھی اور آپ کے اکثر بزرگ منصب دار ہفت ہزاری و پنج ہزاری گزرے ہیں چنانچہ محمد شاہ کے عہد میں ہفت

ہزاری منصب دار تھے، اور آپ کے دادا سید فیاض علی تک جاگیر داری باقی تھی جب مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہوئی اور ان کے امراء اخلاقی طور پر گرتے چلے گئے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں اس جاگیر کا خاتمہ ہوا۔

جناب فراق کے والد ماجد سید محسن علی صاحب کے پاس سندات اور فرامین شاہی موجود تھے۔ انھوں نے پریوی کونسل لندن میں مسٹر جوزف فرانسیس وکیل کی معرفت استغاثہ دائر کر دیا تھا لیکن اسی اثناء میں جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء دہلی میں شروع ہو گئی اور مسٹر جوزف مجاہدین کے ہاتھوں مارے گئے۔ لندن سے کاغذات منگوانے والا کوئی نہ تھا وہیں رہ گئے۔ فراق کے والد سید محسن علی صاحب نے اپنے والد سے نستعلیق سیکھا جو میر پنجہ کش رضوی کے شاگرد تھے۔ مولانا نذیر حسین محدث دہلوی سے کتب حدیث پڑھیں۔ موسیقی میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔ اس فن کو آپ نے میر ناصر احمد صاحب سے سیکھا۔ اس وقت ان کے اجداد کی سکونت پھاٹک حبش خاں میں تھی میر محسن علی خاں صاحب کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے کئی برس بعد رئیس دھرم پورہ نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔

سید محسن علی صاحب کی شادی خواجہ میر درد کے خاندان میں شمس النساء بیگم سے ہوئی۔ شمس النساء کی والدہ عمدہ بیگم دختر مولوی ناصر جان بن خواجہ محمد نصیر تھیں۔ اور مولوی ناصر جان کی اہلیہ، خواجہ میر درد کی پوتی اور خواجہ میر اثر کی صاحبزادی اماں بیگم تھیں۔ عمدہ بیگم ناصر نذیر فراق کی نانی اور شمس النساء بیگم والدہ تھیں۔ میر محسن علی صاحب نے نقشبندیہ سلوک کو اپنے خسر میر امام الدین ناصر اور شاہ احمد سعید، شاہ عبدالغنی مجددی سے حاصل کیا۔ شعر و شاعری سے دلچسپی بچپن سے تھی۔ اردو و فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی کا کلام اپنے والد سید فیاض علی کو اور اردو کا کلام مومن خاں دہلوی کو دکھلاتے تھے۔

فلک تخلص تھا۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل آپ نے دو دیوان ایک اُردو دوسرا فارسی کا مرتب کر لیا تھا۔ فراق صاحب کو اولیائے کرام اور بزرگانِ دین سے بے پناہ عقیدت تھی، درویش جو فراق صاحب کے مکان میں رہتے تھے۔ ان سے انھوں نے کہا مجھے حضرت علیؓ کی زیارت کرا دیجیے۔ اُنھوں نے کہا یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ دیکھو آج جب تمہارے والد سو جائیں تو چپکے سے ان کے منھ سے چادر ہٹا کر دیکھنا تم کو حضرت علیؓ کی زیارت ہو جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ میں تو اپنے والد کا منھ روزانہ دیکھتا ہوں میں تو حضرت علیؓ کی زیارت کرنی چاہتا ہوں۔ درویش صاحب نے کہا تمہارے باپ کی صورت حضرت علیؓ جیسی ہے۔ رات کو ہمارے کہنے کے مطابق عمل کرو چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اپنے والد کے منھ سے چادر اُٹھائی تو حیرت زدہ رہ گئے۔ چیخ اُٹھے چیخ کی آواز سے ان کے والد اُٹھ گئے تو انھوں نے ان کو حقیقت سے آگاہ کیا۔ چنانچہ آپ اسی عقیدت کی بنا پر حضرت اللہ بخش تونسی سجادہ نشین خواجہ محمد سلیمان تونسی کی خدمت میں تونسہ گئے اور اُن سے بیعت کی۔

فراق صاحب مخزن کے ابتدائی دور کے لکھنے والوں میں تھے جب مخزن بند ہو گیا تو انھوں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ سر عبدالقادر کی فرمائش پر ایک ناول "المور" لکھنا شروع کیا۔ مخزن بند ہوا تو ان کی صحت بھی ٹوٹ گئی۔ پھر لوگوں کے اصرار پر اسے مکمل بھی کر لیا۔ مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ البتہ مولانا محمد حسین آزاد کا ناتمام "ڈرامہ اکبر" کی تکمیل ان کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ ساقی کے لئے بھی انھوں نے لال قلعہ کی جھلک قسط وار لکھی بڑی پیاری زبان لکھتے تھے۔

آپ شاعری اور نثر نگاری میں مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کے شاگرد تھے۔ آپ کی نظم و نثر کی دھوم غیر ممالک تک میں ہو گئی تھی۔ آپ نے اُردو کی جو خدمت کی ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ آپ کے قدر دان ہندوستان کے علاوہ عدن، جدہ، افریقہ

اور دیگر ممالک میں تھے۔ آپ نے دہلی کی قدیم تہذیب مغلیہ دور پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔
"دہلی کا آخری دیدار" تو آپ کی مایہ ناز تالیف ہے جس میں اب سے سو سال پہلے دہلی کی سوسائٹی، دہلی والوں کے رسم و رواج، شہزادوں، شہزادیوں اور امراء کے مشاغل اور غربا کی طرز معیشت، لال قلعہ کی چہل پہل، چوک کی گہما گہمی، برسات کی تفصیل رات میں پھول والوں کی سیر جس میں بادشاہ رعیت ہندو مسلمان برابر کا حصہ لیتے تھے۔ تہواروں کی رنگ رلیاں حتیٰ کہ سودا سلف بیچنے والوں کی صدائیں تک ہیں۔

اس کتاب کے علاوہ آپ کی تصانیف دہلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ، ایک جھلک، ساتھ ملاقاتوں کی کہانیاں، بیگموں کی چھیڑ چھاڑ، چاند دلی کی پری، مضامین فراق، اور میخانہ درد ہے۔ موخر الذکر تصنیف میں حضرت خواجہ میر درد کے خاندان کے حالات درج ہیں:

حضرت فراق کا سرخ و سپید رنگ، سفید کھلواں داڑھی، گول چہرہ، بھاری ڈیل ڈول، انگشتیا نکندے پڑا ہوا فرغل۔ سر پر کبھی صافہ کبھی ٹوپی، پاؤں میں سلیم شاہی جوتی پہنتے۔ آخر عمر میں رعشہ آگیا تھا۔ باوجود رعشے کے خود ہی لکھتے تھے ان کی تحریر قیمت کی تحریر ہوتی تھی جو پڑھنے میں نہیں آتی تھی۔ جناب فراق کا انتقال فالج کے مرض میں ۱۲ فروری ۱۹۳۳ء کو ہوا۔

جناب فراق کا ایک اردو کا قلمی دیوان بھائیوں کے صاحبزادے سید ناصر خلیق کے پاس تھا لوگوں نے اس کو طبع کرانے پر بہت اصرار کیا لیکن انھوں نے اس پر عمل نہیں کیا جس کی وجہ سے ان کا اردو کلام نایاب ہو گیا ہے۔ میخانہ درد پر تاریخی قطعہ فارسی میں کہا ہے۔ وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

تاریخ طباعتش جستم از شوق و تکلف می گفتم	این نسخہ لیسان سنبل ریحان غیرت دردم طبع شدہ
خود درد جناب خواجہ گفتہ پاس ادب بگذار فراق	از جانب بن تسفیر کن میخانہ دردم طبع شدہ

۱۳۴۴ھ

شاہجہاں آباد کی اردو شاعرات

شعر و شاعری کا ذوق قدرت نے کسی ایک طبقہ یا ایک شخص کے لیے مخصوص نہیں رکھا ہے بلکہ قدرت جس کو چاہتی ہے اس ذوق سے نوازتی ہے۔ مردوں نے اگر شاعری کی ہے تو عورتوں نے بھی اس میں کمالات دکھائے اور بعض عورتیں صاحب دیوان بھی گزری ہیں لیکن یہ مردوں کے مقابلہ میں ان شاعرات میں دہلی کی شاعرات بھی نظر آتی ہیں اور خاص طور پر شاہجہاں آباد کی شاعرات کے یہ ضمیمہ انہی شاعرات کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ ان کے حالات زندگی حروف تہجی کے حساب سے نہیں، بلکہ عہد اور ادوار کے لحاظ سے تحریر کئے گئے ہیں۔

جینا جینا بیگم مرزا بابر کی صاحبزادی تھی اور جہاندار شاہ ولی عہد شاہ عالم کی اہلیہ تھی۔ اس شاعرہ کے حالات بہت کم دستیاب ہیں۔ بعض دوسری مغل بیگمات اور شاہزادیوں کی طرح جینا بیگم کو بھی شاعری کا بہت شوق تھا۔ اور فی الجملہ خوش مذاق اور تیز طبع تھی شیفتہ نے اپنے تذکرہ میں اس کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے۔

"عاشقش چون جانش در پردہ استغنا ہا۔ اقتضائے کمال آستری ہست"

تذکرہ ہندی (مصحفی)، تذکرہ شمیم سخن

اور سخن شعرا میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

یا الٰہی یہ کس سے کام پڑا
دل تڑپتا ہے صبح و شام پڑا

روٹھنے کا عبث بہانہ تھا
مدعا تم کو یاں نہ آنا تھا

ڈبڈبائی آنکھ آنسو تھم رہے
کاسۂ نرگس میں جوں شبنم رہے

نہ دل کو صبر، نہ جی کو قرار رہتا ہے
تمہارے آنے کا نت انتظار رہتا ہے

یہ کس کی آتشِ غم نے جگر جلایا ہے
کہ تا فلک مرے شعلے نے سر اٹھایا ہے

مصحفی نے اس شعر کو اس طرح نقل کیا ہے ؎

یہ کس کی آتشِ پنہاں نے جی جلایا ہے
کہ تا فلک مرے شعلے نے سر اُٹھایا ہے

شوخ | گنا بیگم زوجہ نواب عماد الملک غازی الدین خاں کے والد علی قلی خاں ششش انگشتی تھے۔ نواب عماد الملک حضرت شہاب الدین سہروردی علیہ الرحمۃ کی اولاد میں تھے۔ احمد شاہ بن محمد شاہ کے عہد میں بخشی الملک اور عالمگیر ثانی کے زمانے میں وزیر الممالک کا خطاب عطا ہوا تھا۔ فارسی اور اُردو میں شعر کہتے تھے۔ ترکی اور عربی زبانوں میں بھی آپ کی غزلیں ہیں۔ فارسی کا ایک ضخیم دیوان اور ایک مثنوی چھوڑی ہے جس میں مولانا فخر الدین کی کرامتوں کا ذکر ہے اور کچھ اور مثنویاں بھی ہیں۔ پہلے آصف تخلص تھا۔ بعد میں نظام بدلا۔ کالپی میں انتقال ہوا۔ صاحب گلشن ہند ان کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"بالجملہ در شجاعت و مہارت بعض از فنون و سرعت فہم از امرائے این عہد ممتاز است خط را زیبا می نویسد و زبانش با اکثر محاورہ آشنا" ؎

نے رونق گلشن ہیں نہ زینت کسو سر کے
مشغل گل بازی نہ ادھر کے نہ اُودھر کے

آیا نہ کبھو خواب میں بھی وصل میسر
کیا جانئے کس وقت مری آنکھ لگی تھی

شوخ چنچل ہی نہیں بلکہ انتہائی نازک بدن تھیں۔ ان کو کئی مرتبہ تولا گیا تو وزن میں نو سو روپے بھر یعنی سوا گیارہ سیر تھیں۔ ہمیشہ عروس نوسالہ دکھائی دیتی تھیں۔ انھوں نے میر قمرالدین منت کے علاوہ میر سوز اور مرزا سودا سے بھی اصلاح لی مجمع شعرا میں ان کا تخلص خنجر لکھا ہے۔ ایک شاعر نے ان کا نام زیب النسا لکھا ہے جو غلط ہے۔ شوخ صاحبہ بڑی حاضر جواب تھیں کبھی موقع و محل پر چوکتی نہیں تھیں۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ نواب عماد الملک باغ میں تشریف رکھتے تھے۔ بیگم صاحبہ بھی وہاں موجود تھیں کہ نواب صاحب نے فرمایا چلو بارہ دری میں بیٹھ کر سیر کریں۔ جواب ملا کہ حضور تشریف لے چلیں۔ لونڈی بھی حاضر ہوتی ہے۔ غرض نواب صاحب تو جا لیٹے۔ فوراً باغ کی ٹھنڈی ہوا نے سلا دیا۔ اتنے میں بیگم صاحبہ وہاں پہنچ گئیں۔ ان کو سوتے دیکھ کر واپس آئیں تو ان کے پاؤں کی آہٹ سے نواب صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ نواب صاحب نے معاً یہ مصرعہ کہا ع

آکر ہماری نعش پہ کیا یار کر چلے

اس حاضر جواب نے کہا ؏

خواب عدم سے فتنہ کو بیدار کر چلے

ایک روز نواب صاحب نے یہ شعر کہا ؎

سر سے پاؤں تک سفیدی آگئی تس پر یہ حال
شمع سے ہم نے نہیں دیکھی کوئی بوڑھی چھنال

اس کا جواب جناب شوخ نے فی البدیہہ دیا ؎

پردۂ فانوس میں رکھتی ہے عصمت کو سنبھال
کاٹ لو اس کی زباں جو شمع کو بولے چھنال

مصحفی ان کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"بہ نسبت شعر و شاعری امتیاز داشتند در آں ایام بیگم زکور کلام شکستہ دلبستہ خود را بحکم نواب بہ نظر ایشاں می گزرانید"۔ جناب شوخ صاحبہ کے کلام میں روانی اور درد ہے۔ یہ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتی تھیں۔ جب شوخ صاحبہ کے صاحبزادے فوت ہوئے تو نواب صاحب نے ان کے بارے میں معلوم کیا تو انھوں نے جواب میں یہ شعر لکھ کر بھیج دیا ؎

از حال ما مپرس کہ دل چاک کردہ ام
لختِ جگر بریدہ تہ خاک کردہ ام

اُردو کے کلام سے بھی لطف اٹھایئے ؎

ابر چھایا ہے مینہ برستا ہے
جلد آجا کہ جی ترستا ہے

لے اُڑی طرز فغاں بلبل نالاں ہم سے گل نے سیکھی روشِ چاک گریباں ہم سے

رقیبوں سے وہ جس دم ہنس رہے تھے روبرو میرے
مری ہر قطرہ اے درد جگر موتی پروتی تھی
ترے منھ کی تجلی دیکھ کر کل رات حیرت سے
زمیں پر لوٹتی تھی چاندنی اور شمع روتی تھی
نیم بسمل نہ چھوڑ جانا تھا ہاتھ اک اور بھی لگانا تھا
جس طرح لگی دل کو مرے چاہ کسو کی
اس طرح نہ لگیو مرے اللہ کسو کی
شمع کو چہرۂ دلدار سے کیا ہے نسبت
کیونکہ یہ ہے گریۂ خنداں وہ ہے رونی صورت
شمع کی طرح کوئی رو جانے
جس کے جی کو لگی ہو سو جانے
فوارہ زہر گوشہ گوشہ شرارہ برزند
از تار ترشح کرہ گوہر زند
نے نے غلط کہ در رگ ورید آب
فصاد ہوا ہزار جا نشتر زد

بجیبن یہ شاعرہ میر تقی میر کی ہم عصر تھی۔ دہلی کے اردو بازار میں رہتی تھی رند مشرب لوگوں کی چہیتی اور اردو بازار کی رونق تھی جس کی گفتگو شوخی میں مردوں کی ضلع جگت کو مات کرتی تھی۔ ایک غزل پان کے تلازمے میں کہی تھی اس کا کلام کسی نے محفوظ نہیں رکھا صرف ایک شعر ملا ہے
ٹک دیکھیو بعد مرگ مرے انتظار کو
نرگس نے چھا لیا ہے ہمارے مزار کو

جعفری دہلی کی ایک ذی علم شاعرہ تھی، کاملہ بیگم اس کا نام تھا۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں تھی۔ شاہ نصیر دہلوی کی شاگرد تھیں ان کو اپنا کلام دکھاتی تھیں سلائی کا ذکر تذکرہ نادر (مستورات) تذکرہ شمیم سخن مستورات میں ہے ؎

تصور اس صنم کا دل میں لائے جس کا جی چاہے
ہماری بات سن کر آزمائے جس کا جی چاہے

محبت کے محل میں عاشق جانباز رہتا ہے
نہیں خالہ کا گھر اس میں جو آئے جس کا جی چاہے

کہا منصور نے سولی پہ چڑھ کر مشق بازوں سے
یہ اس کے بام کا زینہ ہے آئے جس کا جی چاہے

غرور حسن پر ہم سے وہ ناحق جھانجھ کرتا ہے
یہ نوبت چند روزہ ہے بجائے جس کا جی چاہے

ساقیا مجھ کو ترا ساغر پلانا یاد ہے
کلمۂ لاتقنطو سے دل جھکانا یاد ہے

معیت یہ دہلی کی رہنے والی عیسائی عورت تھی جس کی والدہ ہندوستانی اور باپ انگریز تھا میجر آر جسٹس سے اس کی شادی ہوئی۔ اس کی کئی بیٹیاں تھیں علم موسیقی میں اس کو کمال حاصل تھا۔ دہلی سے آگرہ پہنچی۔ وہاں اس کا کلام بہت مقبول اور آگرہ کے گویوں میں بہت مرغوب ہوا۔ انگریزی فارسی اور بھاشا میں اچھی مہارت رکھتی تھی۔ برج بھاکا میں بولیاں اور کبت وغیرہ کہتی تھی، اردو اور بھاشا میں شعر کہتی ہے ؎

خدا کے روبرو جانا ندامت مجھ کو بھاری ہے، کوئی نیکی نہ بن آئی اسی کی شرمساری ہے

مقسوم کی خوبی ہے یہ قسمت کا ہے احسان

رہتا ہے خفا مجھ سے جو دلبر کئی دن سے

روٹھا ہے ہمارا جو وہ دلبر کئی دن سے

اس واسطے رہتی ہوں میں مضطر کئی دن سے

رعنائی یہ شاعرہ محمد شاہ رنگیلے کی بیوی اور احمد شاہ کی ماں تھی۔ اس کا اصل نام ادھم بائی تھا۔ یہ بڑی بیدار مغز، ہوشیار، دقیقہ سنج اور ہوش مند خاتون تھی۔ بات بات میں وہ نکتے پیدا کرتی کہ بڑے بڑے عقلمند دنگ رہ جاتے تھے۔ مگر افسوس کہ محمد شاہ کی عیاشیوں اور بدمستیوں نے اس کے عادات و فضائل کو تباہ کر دیا۔ اور یہ شب و روز مے و مینا کے نشے میں مست رہنے لگی تھی۔ اس نے دہلی میں ۱۱۶۲ھ مطابق ۱۷۴۸ء میں کشمیری دروازے کے باہر قدسیہ باغ بنوایا تھا۔ باغ کے جنوب مشرق میں ایک مسجد بھی تھی۔

قدسیہ بیگم جس طرح لاثانی حسن کی مالکہ تھی۔ یہ فارسی کے علاوہ اُردو زبان میں بھی طبع آزمائی کرتی تھی۔ اس کا یہ شعر بہت مقبول ہوا۔

ہم جانتے تھے آنکھ لگی دل کو سکھ ہوا

کم بخت کیسی آنکھ لگی اور دکھ ہوا

عزیز یہ دہلی کی رہنے والی شاعرہ بڑی سلیقہ مند تھی۔ بچپن سے شعر و شاعری کا ذوق رکھتی تھی۔ یہ اکبر شاہ ثانی کے دور میں زندہ تھی اور مرزا سعادت یار خاں رنگین کی شاگرد تذکرہ نادری میں اس کے دو شعر نظر گزرے ہیں۔

تم نہ دیکھو گے گو ہمیں ایک بار

ہم تمہیں بار بار دیکھیں گے

جب کہ باغ و بہار دیکھیں گے
ایک گُل کیا ہزار دیکھیں گے

قادری قادری بیگم کوچہ چیلان کی رہنے والی یہ کاظمہ بیگم جعفری کی بہن تھی معلوم دیتا ہے کہ یہ پورا خاندان شاعر ہوگا۔ جب کہ دونوں بہنوں کو شعر و شاعری کا ذوق و شوق تھا۔ یہ بھی شاہ نصیر کی شاگرد تھی۔ تذکرہ نادری (درگاہ شاد) میں ان کی حسب ذیل ایک پوری غزل شائع ہوئی ہے ؎

شرطِ وفا یہ تھی غیر کے گھر جائیے
کچھ تو حیا کیجئے جی میں تو شرمایئے

ترس خدا چاہیے اے بت ترسا تجھے
عاشق رنجور کو اتنا نہ ترسایئے

لب سے جو کیجیے اب لب لعل کو
شرم نہ کچھ کیجئے سینے سے لگ جایئے

میں ہوں فقط اور تم نام نہیں غیر کا
پاؤں مری گود میں شوق سے پھیلایئے

ماہ یہ دہلی کی شاعرہ حضرت شاہ غلام نصیر الدین عرف میاں کالے کی مرید تھی۔ ان کو اپنے پیر سے بے پناہ عقیدت تھی۔ وہ فوت ہوئے تو یہ زیادہ دن زندہ نہیں رہی ان کی وفات کے بیس روز کے بعد فوت ہوئی لاہوری دروازے کے باہر خاص باپ کے باغ میں دفن ہوئی۔ اس نے ایک دیوان فارسی زبان میں اور دوسرا اردو میں مرتب کیا تھا جو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں تلف ہوگیا ہے۔ تذکرہ نادری کو ان کے ایک رشتہ دار نے اپنی یاد سے ان کا ایک شعر لکھوایا تھا ؎

ماہ کے دل میں جو ترا نقشِ محبت ہے یار نہ مٹے گا وہ کبھی
بلغِ جنت بھی کوئی دیوے تو درکار نہیں ترے کوچہ کے سوا

مبارک

مبارک النساء اہلیہ شاہ نجم الدین صغیر دہلوی خلف شاہ نصیر دہلوی شاعرہ تھیں (شاہ نجم الدین درگاہ صدر جہاں کے سجادہ نشین تھے) جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد گاؤں کی جو جاگیر تھی۔ اس کا عوضانہ ایک ہزار روپیہ مقرر کیا جو پنشن کی شکل میں دیا جانے لگا۔ پھر ۱۸۶۵ء میں صرف ایک موضع دیا گیا۔ پہلے اپنے والد ماجد کے ساتھ بہت سے شہروں حیدرآباد دکن، لکھنؤ اور عظیم آباد دکن، لکھنؤ اور عظیم آباد کی سیر کی۔ ان کی وفات کے بعد دہلی میں مستقل سکونت اختیار کی شعر و شاعری سے زیادہ شوق نہ تھا۔ اپنے والد کے شاگرد رشید قطب الدین مشیر کے اصرار پر کبھی کبھی شعر کہہ لیتے تھے اور انہی کو کلام دکھایا کرتے تھے۔ دنیاداری سے انھیں خاص لگاؤ نہیں تھا اور عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے صغیر صاحب کا انداز بیان شگفتہ اور موثر تھا ۵۰ برس کی عمر میں ۱۲۸۶ھ میں فوت ہوئے سے

خورشید قیامت غمِ جاناں میں قمر ہے
شامِ شبِ فرقت مجھے محشر کی سحر ہے

دوں اس میں جگہ کیوں نہ صغیر اپنے بتوں کو
کچھ اس میں اجارہ نہیں اللہ کا گھر ہے

طلسماتِ جہاں میں خود نما کا کارخانہ ہے
خدائی کر رہے ہیں بت خدا کا کارخانہ ہے

تصور جب رہے دن رات گیسوئے پریشاں کا
گماں صبحِ وطن پر کیوں ہو شامِ غریباں کا

ہے دشت کی یہ حالت اور کوہ کی وہ صورت

کہتا ہے جنوں، رستے مشکل مرے دونوں ہیں

صغیر اس بُت کو دل دینا سمجھ کر

کروگے کیا اگر اس نے دغا کی

مبارک النساء بھی شاعرہ تھیں اپنے خسر شاہ نصیر سے اصلاح لیتی تھیں۔ ان کو بھی دنیا داری سے نفرت تھی۔ بڑی عبادت گزار اور دیندار عورت تھیں۔ پنجگانہ نماز کے علاوہ اشراق و تہجد کے نفل باقاعدہ پڑھتی تھیں۔ ۱۸۵۸ء میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلی گئی تھیں۔ وہاں سے مدینہ منورہ پہنچیں۔ کافی عرصہ کے بعد مکہ معظمہ واپس آگئیں اور وہیں فوت ہوئیں۔

ایک مرتبہ انھوں نے ایک مکان خریدا تھا جس پر حق شفع رکھنے والوں نے ان پر دعویٰ کر دیا تھا جس کے بارے میں انھوں نے ایک غزل کہی جس کا آخری شعر یہ تھا ؎

گھر لینا مبارک کو یارب یہ مبارک ہو

بے فائدہ لوگوں کو ناحق جلن آتی ہے

تذکرہ مستورات نادری میں ان کے دو شعر درج ہیں ؎

عذاب گور کی سختی الٰہی کیونکر جھیلوں میں

تھکا ہارا ہوا آیا ہوں میں پہلی ہی منزل کا

مجھے کیا خوف محشر ہو، مبارک دن قیامت کا

پکڑلوں میں گوشۂ دامن خاتونِ جنت کا

موتی اس شاعرہ کا اصل وطن دہلی تھا۔ فن موسیقی میں کمال رکھتی تھی۔ ارباب نشاط کی محفلوں کی رونق تھی۔ مرزا ابراہیم بیگ قبول ان پر فریفتہ ہوگیا تو

یہ بھی ان کے ساتھ جادۂ وفاداری پر گامزن رہی۔ دغا نہیں دی۔ ان کے ساتھ لکھنؤ چلی گئی۔ چنانچہ ان کی وفاداری کے بارے میں مصحفی لکھتے ہیں :۔

"موتی نامی از ارباب نشاط در فن خود صاحب مذاق وذی اعتبار
دوازدہ سال گذشتہ کہ مرزا ابراہیم بیگ مقبول را شیفتگی بر او
شدہ بود تا امروز بالیشان بر جادۂ وفاداری قائم است"

صاحب تذکرہ شمیم سخن نے ان کا نام زینت جان اور تخلص نازک لکھا ہے اور ان کا حسب ذیل ایک شعر نقل کیا ہے ؂

ہے نالہ وزاری کا مری شور فلک تک
پر وہ بت گلفام کوئی کان دھرے ہے

صاحب تذکرہ سخن شعراء نے مرزا ابراہیم بیگ مقبول کی اسی محبوبہ کا تخلص اور نام زینت لکھا ہے ۔ اور یہ مزید تحریر کیا ہے اور اس کے دو شعر بھی نقل کئے ہیں :۔

"زینت تخلص اور نام دہلی کی ایک شاہد بازاری کا تھا جو اپنے
عاشق مرزا ابراہیم بیگ مقبول کے ساتھ ازراہ وفاداری لکھنؤ
چلی گئی بعض صاحب تذکرہ نے ان کا تخلص نازک لکھا ہے :۔

"شب مہتاب میں تا صبح زینت
خیال ماہرو ہے اور ہم ہیں
ہے نالہ وزاری کا مرے شور فلک پر
پر وہ بت مغرور کوئی کان دھرے ہے"

صاحب تذکرہ مستورات نادری نے اس شاعرہ کا تخلص نازک لکھا ہے اور حسب ذیل عبارت لکھی ہے اور اس کے یہ دو شعر نقل کئے ہیں :۔

"نازک تخلص، زینت جان نام ایک عورت اسی شہر (دہلی)

کی نزاکت فروش بازاری ۱۸۴۷ء میں موجود تھی جس کا کلام یہ ہے۔

اغلب ہے کہ رحلت کر گئی ہو۔"

یاد آتی ہے ان کی آنکھوں میں آمدہ نشہ کی

ساقی نے گلرنگ سے جب جام بھرے ہے

ہے نالہ و زاری کا مرے شور فلک تک

پر وہ بتِ گلفام کوئی کان دھرے ہے

تذکرۂ شمیم سخن مستورات، تذکرہ مستورات نادری اور سخن شعرا میں "کوئی کان دھرے ہے" والا شعر زینت نازک سے منسوب کیا ہے جس کا تخلص موتی بھی ہے لیکن اسی شعر والی پوری غزل کو مصحفی نے دوسری شاعرہ جس کا نام زینت اور نازک تخلص ہے منسوب کیا ہے اور اس کے بارے میں اپنے تذکرہ ہندی میں یہ لکھا ہے:۔

"نازک تخلص زینت نام، در فیض آباد از میر مستحسن خلیق معلوم شد مشارٌ الیہ می گوید کہ ہر گاہ من ہمراہِ لشکر رفتم بسبب الفتے کہ با من داشت۔ ایں غزل نوشتہ فرستادہ بود۔"

اس غزل کے مصحفی نے دس شعر نقل کئے ہیں جس کے مقطع کے ساتھ مذکورہ شعر بھی درج ہے۔ ملاحظہ ہوں دونوں اشعار:

ہے نالہ و زاری کا مرے شور فلک تک

پر وہ بتِ مغرور کوئی کان دھرے ہے

نازک سفرِ دور کو گویا وہ سدھارا

گرمِ طلبِ شوق کے نزدیک دھرے ہے

ان تذکروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موتی کا اصل نام زینت جان تھا اور اس کے تین تخلص موتی، نازک، اور زینت تھے۔ پھر صاحبِ تذکرہ نے اپنی معلومات سے

مطابق قدسی کا تخلص استعمال کیا ہے۔ موتی کی جو غزل تحفی نے لکھی وہ یہ ہے:؎

گلابی روبرو ہے اور ہم ہیں — بس اب جام و سبو ہیں اور ہم ہیں
سیا گر تو نے چاک جیب ناصح — تو پھر تارِ رفو ہے اور ہم ہیں
بلا سے گر نہووے دل کو وہ — ہجومِ یاس تو ہے اور ہم ہیں
شب مہتاب میں تا صبح ساقی — خیالِ ماہ رو ہے اور ہم ہیں

یہ کیا جی میں لہر آئی کہ موتی
کنارِ آب جُو ہے اور ہم ہیں

حیا — حیات النساء بیگم شاہ عالم ثانی بادشاہ (دہلی) کی بیٹی تھی۔ یہ بیگم بڑی بیگم کے نام سے مشہور تھی۔ سلاطین مغلیہ میں ایسی بھی بیگمات ہوئی ہیں جن کی شادی نہیں ہوئی، ان میں حیات النساء بھی ہیں جو غیر شادی شدہ رہیں۔ اور سن رسیدہ ہو کر مریں۔ انھوں نے شاعری کا ذوق ترکہ میں پایا تھا۔ اس لئے کہ شاہ عالم بادشاہ خود شاعر تھے اور آفتاب تخلص کرتے تھے۔ حیا صاحبہ شاہ نصیر دہلوی سے اصلاح لیتی تھیں ؎

نہ کیوں حیرت ہو یارب وہ زمانہ آگیا ناقص
حیا ڈھونڈے نہیں ملتی برائے نام سو سو کوس

اختر — نواب اختر محل دہلی کے خاندان تیموریہ کی نامی شہزادی تھی۔ ۱۲۵۰ھ میں دہلی میں اس کی شاعری کا بہت چرچا تھا۔ بقول صاحب تذکرہ "شمیم سخن مستورات" طبیعت عالی و مضمون آفرین رکھتی ہے۔ اس نے قدسی کی تعدیۂ ل پر تضمین کی تھی جو حدیث قدسی میں چھپی ہے۔ اس کے عاشقانہ اشعار کے بعد مخمس کا پہلا اور آخری بند نقل کیا جاتا ہے ؎

آستاں پر ترے پیشانی یہ گھستے گھستے — سر ہی غائب ہوا جس میں کہ ترا سودا تھا

اک آہ شعلہ بار سے دل کو جلا دیا　　لو آج ہم نے اس کا بھی جھگڑا مٹا دیا

لکھ کر جو میرا نام زمیں پہ مٹا دیا　　ان کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

خط لے کے نامہ بر سے جو ٹکڑے اڑا دیا　　غیروں نے آج ان کے تئیں کچھ پڑھا دیا

تقصیر یار کی، نہ قصور عدو ہے کچھ
اختر ہمارے دل ہی نے ہم کو جلا دیا

تیغ نگاہِ یار کا دونوں پہ وار ہے
ٹکڑے ادھر جگر ہے، اُدھر دل فگار ہے

نعتیہ تضمین کا پہلا بند اور آخری بند ملاحظہ ہو:

تجھ پہ قرباں ہوں اے ہاشمی و مطلبی
کہ ہے مشہورِ دو عالم تری عالی نسبی
دیکھ رتبہ کو ترے شوکتِ افلاک دبی
مرحبا سید مکی، مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت کہ عجب خوش لقبی

دردِ عصیاں کے سبب سے ہے مری جان چلی
اور بچنے کی نہیں سوجھتی تدبیر کوئی
عرض اختر کی بھی قدسی کی طرح سے ہے یہی
سیدی انت حبیبی وطبیب قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

اشک یہ اشعار کی صورت میں اشک بہانے والی شاعرہ شاہی خاندان کی ایک شہزادی تھیں جو استاد ذوق کو اپنا کلام دکھاتی تھی۔ ۱۲۹۰ھ میں حیات تھیں۔ عزت کے ساتھ زندگی بسر کرتی تھیں اگرچہ غریبی

نے ان کو گھیر رکھا تھا۔ کلام میں شوخی ہے:

نہ بوسہ دینا آتا ہے نہ دل بہلانا آتا ہے
تجھے اے کافر ترسا! فقط ترسانا آتا ہے
کسی عاشق کا بے شک استخواں ہے میں تو کہونگا
کہ شانہ تیرے رخ تک کیا ہی گستاخانہ آتا ہے

بنو | منشی گلاب سنگھ آشفتہ دہلوی جو کھتری برادری سے تعلق رکھتے تھے جوانی میں اس حسینہ بنو پر فریفتہ ہو گئے۔ وہ بھی ہزار جان سے ان پر فدا تھی۔ کچھ دن تو نہایت عیش و عشرت کے ساتھ ایک جگہ بسر کئے مگر ایسا بھی وقت آیا کہ ان میں جدائی ہو گئی۔ ہجر و فراق کی مصیبت و پریشانی برداشت نہ کر سکے تو ایک روز آشفتہ نے خنجر سے اپنا ہی کام تمام کر ڈالا چنانچہ اسی زمانہ میں اُنھوں نے یہ اشعار کہے۔

پوچھتے کیا ہو کہ شب آشفتہ کیوں کر مر گیا
اس میں کیا باقی رہا تھا بندہ پرور مر گیا
جان دی عاشق نے تیرے شب کو ایک نالہ کے ساتھ
آدمی تھا آخرش صدمہ اُٹھا کر مر گیا
ہے جدائی میں زبس آشفتہ جینے سے بہ تنگ
سن ہی لیگا اک نہ اک دن پھوڑ کر سر مر گیا

آشفتہ کی محبوبہ بنو کو آشفتہ کے مرنے کا بہت غم ہوا، تو صدمہ میں گھلنے لگی اور چھ مہینے کے عرصہ میں اپنے محب صادق سے جا ملی۔ اپنے اشعار میں اس نے اپنی داستانِ الم بیان کی ہے:

چھوڑ کر مجھ کو کہاں اے بتِ گمراہ چلا | تو چلا کیا کہ یہ دل بھی ترے ہمراہ چلا

چھٹ گیا غم سے مرا کشتۂ ابرو مر کر
اک چھری میرے گلے پر بھی مری آہ چلا

میں تپِ غم سے جلوں اور یہ کریں دق کا علاج
ہو سمجھ الٹی طبیبوں کی تو کیا اس کا علاج

نہ موت آتی ہے نے زیست کا یارا مجھ کو
ہائے آشفتہ تری موت نے مارا مجھ کو

موت پر بس نہیں چلتا ہے کروں کیا ورنہ
تو نہیں ہے تو نہیں زیست گوارا مجھ کو

اب کسے چین، کہاں نیند، کدھر بستۂ خواب
نہیں مخمل بھی کم از بسترِ خارا مجھ کو

کیا ہوئی ہائے فغاں کی ترے شور انگیزی
لے چلے تجھ کو نہ کیوں تو نے پکارا مجھ کو

ہے غضب وہ تو مرے اور جیوں میں پھر تو
موت آجائے تو ہو عمر دوبارا مجھ کو

ثریا | ثریا بیگم بادشاہ دہلی سراج الدین ظفر کے وظیفہ خوار مرزا علی کی بیوی تھی ۱۸۸۵ء میں اس کے شوہر نے انتقال کیا۔ اس کے بعد ثریا دہلی سے آگرہ چلی گئی اور شاعری کا مشغلہ ترک کر دیا۔ گارساں دتاسی نے اپنے خطبات میں اس کا ذکر کیا ہے کہ تصویر اور ثریا بھی شاعر عورتیں تھیں جن کا حال ہمیں باطن اور کریم کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے:

بتا دیں ہم تمہاری کاکلِ شب گوں کو کیا سمجھے
سیہ بختی ہم اپنی یا رہے کالی بلا سمجھے

جدھر دیکھا اٹھا کر نیم بسمل کر دیا اس کو

تری مژگاں کو ہم سوفار پیکانِ قضا سمجھے

حشمت — مہر بیگم دہلی میں مقیم تھی پہاڑ گنج میں سکونت رکھتی تھیں۔ سنہ ۱۲۹۱ھ میں زندہ تھی۔ کلام میں روانی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ سید احمد معروف چھوٹے صاحب نگہت سے مشورۂ سخن لیتی تھیں۔ تذکرہ مستورات شمیم سخن اور تذکرہ نادری مستورات میں اس کا ذکر ہے اور تذکرہ شمیم سخن میں اس کے چار شعر درج ہیں:-

منہ کہیں پھرتا ہے اے قاتل تری تلوار کا

خون بہہ جائے نہ جب تک بے گنہ دو چار کا

لامکاں تک جا چکی ہے بارہا آہِ رسا

پھاندنا مشکل نہیں ہے آپ کی دیوار کا

میں وہ صابر ہوں کیا شکوہ نہیں نے آج تک

چرخ کے ہاتھوں سے کیا کیا مجھ پہ جور ہو گیا

لے گیا پیغام اپنا ان کے قصدِ یار تک

مرغِ دل ہی بارہا اپنا کبوتر ہو گیا

ڈھب — مہرن نام دہلی کی ایک ہندو دوشیزہ تھی۔ نازک بدن، خوش مزاج، خوبصورت، نیک سیرت۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر تھی۔ گرچہ حرف آشنا نہ تھی مگر ہمسایہ کے موزوں طبعوں کے فیض سے شعر و شاعری ہونے لگی تھی اور کبھی کبھی معاملہ بندی کے مضامین موزوں کرتی تھی ؎

ڈھب بن گیا تو آئیں گے، دل اپنا مست کر اُٹھا

بے ڈھب لگی ہے دل پہ محبت کی تیر چوٹ

رابعہ — دہلی میں سیتا رام کے بازار میں رہتی تھی۔ شیخ زادی تھی

کسی ڈاکٹر کی بیٹی تھی۔ تذکرہ نادری کی تالیف کے وقت اس کی عمر ۳۰ برس کی تھی۔ کسی حکیم سے اس نے نکاح کر لیا تھا۔ انگریزی ڈھنگ کا کشیدہ وغیرہ خوب جانتی تھی۔ اس کے کلام میں شوخی کم پائی جاتی ہے۔ شاید اس کو کوئی استاد نہیں ملا جو اس کا کلام پختہ کرتا ہے

ہوتی نہ محبت تو یہ آزار نہ ہوتا

دل عشق کے صدموں سے خبردار نہ ہوتا

دے اپنی محبت مجھے اے بارِ خدایا

کر دور دلِ آزار کا آزار خدایا

الٰہی سب گنہ سے پاک کر کر

مجھے لے جائیو جنت کے در پر

زہرہ | نصیبن بہادر شاہ کی موسیقاروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی تھی۔ شاعر ہونے کے علاوہ موسیقی میں کمال رکھتی تھی۔ بہادر شاہ ظفر نے اس کو زہرہ کا لقب عنایت کیا تھا وہ اس کو تخلص کے طور پر استعمال کرنے لگی۔ ۱۸۵۷ء سے قبل یہ شاعرہ زندہ تھی ؎

بوسہ دیں گے نہ وہ تجھے زہرہ

منھ لگاتا ہے کون سائل کو

دل کعبے میں ہوں تو کا ہے کو کوئی بے تاب ہو

ساغر تو کس لئے یہ دیدۂ پُر آب ہو

باغ ہو آبِ رواں ہو اور شبِ مہتاب ہو

ساقی مہوش ہو مے ہو جلسۂ احباب ہو

شرارت | امیر بہن شرارت کے والد چھوٹے خان دہلوی تھے ۱۱۹۹ھ

میں اس کی عمر تیس سال کی تھی۔ علم سے بے بہرہ تھی لیکن حروف شناس ضرور تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ "گھر میں شعر کہتی تھی، مگر میاں امیر خاں صاحب منیر اکبر آبادی مقیم متھرا کی شاگردی سے یہ رتبہ حاصل ہوا کہ سو پچاس غزلیں کہہ لی ہیں" خلیق اور ملنسار تھی۔

شرارت نے متھرا، آگرہ اور ٹونک وغیرہ کی سیر کی تھی۔ آگرہ کے مجموعۂ الاشعار میں اس کی ایک غزل چھپی۔ ٹونک میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جس کا مصرعہ طرح یہ تھا۔ ع

جو نہ کرتی تھی ہمارے ساتھ وہ اس دل نے کی

شرارت ٹونک کے مشاعرہ میں شامل ہوئی وہاں اس نے اس مصرعہ طرح والی اپنی غزل سنائی۔ صاحب تذکرۃ النساء درگاپرشاد نادر شاید اس مشاعرہ میں شریک ہوئے ہوں گے۔ انھوں نے وہاں سے سن کر یہ غزل اپنے تذکرہ میں درج کی۔ سہ

ایسی مجھ پر رات مشکل فرقت قاتل نے کی
ساتھ میرے صبح مر مر کر بڑی مشکل نے کی

روسیاہی شب کو اپنی مشعل نے کی
بو گئی گل، ساقی وا جب بزم میں تتلی نے کی

آرزوئے بوسہ گر دل میں کسی سائل نے کی
ہو گئی تدبیر در پردہ لب اس کے سل نے کی

سینکڑوں منزل عدم سے آگے وحشت لے گئی
خاک اب عنقا کرے گا خاطر میرے دل نے کی

سایہ میرا مشعل برق تجلی ہو گیا
یہ نظر پر نور مجھ پر کسی مہ کامل نے کی

لنڈھائے کریں خندگان ناب شراب
قسم خدا کی اُسے کو بڑا ثواب ہوا
خدا جانے کیا بات ہے اس میں مخفی
کہ اس ظلم پر جی کو بھاتا بہت ہے

نازؔ گیتی آرا کی والدہ گمنامی خانم تھی۔ یہ شاعرہ شوخ مزاج بڑی بیباک زبان دراز چالباز اور جلتی آواز تھی۔ اس نے دلی کے ایک رئیس کی تربیت پائی تھی۔ ۱۸۸۲ء میں یہ شاعرہ بیجاپور چلی گئی۔ اس کے کچھ شعر منشی درگا پرشاد نادر صاحب تذکرۃ النساء کے ہاتھ لگے ۔۔

وصالِ یار کا سامان جہاں بنا بگڑا
ہمارا کام کچھ نہیں ہر زماں بنا بگڑا
تمہارے پاؤں کے ناخن کی ہمسری نہ ہوئی
ہلال لاکھ سرِ آسماں بنا بگڑا

ہمارے مین لکھنے پر ہزاروں صاد کرتے ہیں
میاں کی یہ عنایت ہے دم ایجاد کرتے ہیں

تم تو اترا گئے جفا کر کے — ہم نے مارا نہ دم وفا کر کے
ہم نے دکھلا دیا کمالِ عشق — ابتدا ہی میں انتہا کر کے

غلط فہمی ہے اپنی آپ کو ہم باوفا سمجھے
بڑا دھوکا ہوا نا آشنا کو آشنا سمجھے
مرا دل زلف زنجیر یا دام بلا سمجھے
ہزاروں پیچ ہوں جس میں اسے انساں کیا سمجھے

تمہیں ہم دوست سمجھے دوست کو نا آشنا سمجھے — ہمیں نادان سمجھے جب تم اپنے بجا سمجھے

ناز

ناز تخلص ایک شہزادی تیموریہ خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ مذہب امامیہ کی پیرو تھی۔ کافی سن رسیدہ ہو کر فوت ہوئی ۱۲۸۵ھ سے پہلے جوانی کی ترنگ میں شعر کہتی تھی۔ اس کو دو چار شعر یاد تھے۔ اس نے خود مؤلف تذکرہ نادری کو تذکرۃ النساء کے لیے لکھوا دیے ؎

خو ہے اس کی بے وفائی کا — بس نہیں چلتا واں رسائی کا

دام زلف سیاہ اس کی سے — نہ بنا کوئی ڈھب رہائی کا

گر غلامی علی کی تو نے ناز — ہے اگر دھیان بادشاہی کا

مجھ سے رشتہ وہ یار جانی ہے — جان جانے کی یہ نشانی ہے

نازک

یہ نازک اندام، سیہ فام، فتنِ جاں، خوش خرام و شیریں کلام مرزا شاہ رخ کی موسیقاروں میں تھی۔ وہاں سے امام خاں گویے کے ذریعے سے منا جان والدہ متن خاں کے ڈیرہ میں آئی اور ناچنے اور گانے میں مشہور ہوئی۔ یہ شاعرہ اکثر لکھنوی ڈھنگ برتتی تھی۔ مثنوی بہارِ عشق کو بہت مزے سے گاتی تھی۔ مہاراجہ شیودان سنگھ بہادر والیٔ الور کے لڑکا پیدا ہوا تو اس نے جا کر مجرا کیا۔ مجرا اتنا پسند کیا گیا کہ مہاراجہ صاحب کی طرف سے ہر روز کی حاضری کا حکم ملا۔ وقت خواب گاہ تک مثنوی سناتی رہی۔ ۱۲۹۳ھ میں اپنے فن سے توبہ کر لی تھی۔ فارسی جانتی تھی اور فقہی مسائل سے بھی واقف تھی ؎

کہتا ہوں میں خدا سے یہ اب ہاتھ اٹھائے دل
ایسا نہ ہو کہ میرا کسی بت پر آئے دل

ڈر سقہ ہو خدا سے بتو، ظلم مت کرو
ایسا نہ ہو کہ تم کو کوئی دے سزائے موت

بس جائیے یہاں سے نہ باتیں بنائیے — تلووں سے مل کے پھینکیے جو یوں ستائے دل

نازکؔ شب فراق میں اتنا نہ روئیے
اشکوں کی باڑھ کل نہ پڑیں لخت ہائے دل

جلوہ گری سے رونق یہ جلسہ وہ لاثانی ہے
چکر میں ہے جس سے فلک ہر اختر کو حیرانی ہے
کوئی بسنتی اوڑھے چادر، کوئی دوشالہ سرمئی سر پہ
سُرخ کسی کا جوڑا ہے، پوشاک کسی کی دھانی ہے
آتی ہے یہ عقدہ کشا کے لختِ جگر کی سالگرہ
ہو گئی جس کے باعث دل بستوں کی آسانی ہے
بزمِ طرب آراستہ، یہ کیا قاعدے اور آداب سے ہے
والیٔ الور کا ہے سُنا دربار بھی یہ سلطانی ہے

نزاکت

اس کا نام منیرہ تھا۔ حسینی کی بیٹی تھی۔ ۱۸۸۵ء کے قریب جے پور میں مقیم تھی۔ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی لیکن طبیعت موزوں پائی تھی۔ ستار خوب بجاتی تھی۔ میر واجد علی شگفتہ مقیم جے پور کی شاگرد تھی۔ اپنے کلام پر انہی سے اصلاح لیتی تھی۔ جب دہلی میں علاج کے لئے آئی تو ریوڑی والے کٹڑہ میں ٹھہری تھی۔

بلبلِ زار ہوں تو تیرا ہوں | میں گرفتار ہوں تو تیرا ہوں
ان فرشتوں کو واسطہ مجھ سے | میں گنہگار ہوں تو تیرا ہوں
خواہشِ دیں، نہ کام دُنیا سے | میں طلبگار ہوں تو تیرا ہوں
ہوں نہ اچھا کبھی مسیحا سے | میں جو بیمار ہوں تو تیرا ہوں
سجدہ کرنا نہ غیر کے آگے | بندۂ یار ہوں تو تیرا ہوں

ہمیں غیروں سے جلاتے ہیں آپ آرام کرتے ہیں
کسی کے کام سے کیا کام اپنا کام کرتے ہیں

نہ بوسہ رُخ کا دیتے ہیں، نہ گیسو چھونے دیتے ہیں
یونہی اک عمر گزری ہے کہ صبح و شام کرتے ہیں
ہمارے دو چار خوں گر ناگہانی سے عجب کیا ہے
وہ جب مہندی لگاتے ہیں تو قتلِ عام کرتے ہیں
جگانا ہے انھیں ناصح، اب اِن وصل کی شب میں
ابھی سونے دو گر طالع مرے آرام کرتے ہیں

یاد

دہلی کی ایک شہزادی تھی جو شعر و شاعری کا ذوق رکھتی تھی۔ غالباً اُستاد ذوق کو اپنا کلام دکھاتی تھی۔ جب اس کا انتقال ہوا تو کسی نے یہ تاریخِ وفات کہی:

جہاں میں یاد نے جب منہ چھپایا — رہا ہے کثرتِ غم سے بے ہوش
کہو تاریخ اس کی کوئی یہ ہے — ہوئی جو یاد تو از خود فراموش

یاد کا کلام تو کافی تھا مگر جو ایک قطعہ اس نے نزع کی حالت میں کہا تھا وہ درج کیا جاتا ہے:

خبردار رہنا اے اقربا — کہ دم یاد کا اب یاں سے چلنے کو ہے
سر انجام غسل و کفن کر رکھو — تنِ زار سے جان نکلنے کو ہے

شاہجہاں آباد کی فارسی گو شاعرات

شاہجہاں آباد کی فارسی میں شعر کہنے والی عورتوں کی کچھ زیادہ تعداد نہیں ہے اور جب کوئی عجلت میں عنوان لکھا جاتا ہے تو تحقیق کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملتا اور جتنی معلومات ملتی ہے، اس کو ہی قلمبند کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس مضمون میں جتنے فارسی گو شاعرات کے حالات زندگی مل سکے، وہ تحریر کر دیے گئے۔

گلشن | عہد شاہجہاں بادشاہ ۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۸ھ میں یہ شاعرہ دہلی میں اس فن میں اپنے خیالات کا اظہار کرتی تھی۔ یہ صاحب دیوان تھی۔ اس نے اپنا دیوان بھی مرتب کر کے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا جو سید غلام مصطفےٰ الہ آبادی کے پاس محفوظ تھا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران ضائع ہو گیا۔ اس کے کلام میں فصاحت، روانی، سلاست اور شائستگی پائی جاتی ہے:

گلشن ز جلوۂ تو پری خانہ گشتہ است
بوئے گل از ہوائے تو دیوانہ گشتہ است

بے رخصت خار نشاید چید گل ما را
نالۂ زاغ بود نغمۂ بلبل ما را

در جہان ہم چو چناریم کہ بادست تہی
ہرگز از جا نہ رود پائے توکل ما را

دُرخود قطرہ چو افتاد زابر نیساں
رہنما سوئے ترقی است تنزل مارا

نہانی فارسی گو شاعرات میں نہانی پانچ شاعرات کا تخلص تھا۔ ایک کا نام بیگم تھا دوسری نہانی کرمانی خواجہ افضل دیوان کی ہمشیر تھی تیسری نہانی شیرازی تھی جو ملّا جامی کے بعد ہوئی تھی چوتھی نہانی جعفر احدی کی والدہ تھی جو اکبر بادشاہ کے وقت کشمیر میں امیر بحری کی خدمت پر مامور تھا۔ پانچویں نہانی لوئی دہلی کی امیر زادی تھی اور والدہ شاہ سلیمان کی جلیس تھی، صاحب روز روشن اس کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"دختر یکے از امرا با نام ونشاں بود، بخوبروئی ونکوئی شہرت داشت ومصاحب والدۂ شاہ سلیماں در جلۂ عزت قدم می گذاشت"

نہانی نے اعلان کیا تھا کہ جو شاعر اس کی رُباعی کا خاطر خواہ جواب دے گا۔ میں اس سے شادی کروں گی، وہ رُباعی یہ ہے ؎

از مرد برہنہ روئے زر می طلبم
وز خانۂ عنکبوت پر می طلبم
وز پشہ مادہ شیر نر می طلبم

اس کے مرنے کے بعد شاہجہاں کے مشہور و معروف وزیر سعد اللہ خاں نے نہانی کی رُباعی کا یہ جواب دیا :۔ ؎

علم است برہنہ رو، تحصیل زر است — تن خانۂ عنکبوت و دل بال و پر است
زہر است جفائے علم و معنی شکر است — ہر پشہ از و پشۂ آں شیر نر است

نہانی کا ذکر مراۃ الخیال میں بھی درج ہے مگر اس کا تاریخ زمانہ معین نہیں

لیکن یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ گیارھویں صدی ہجری کے وسط کے قریب زندہ تھی۔ شاہجہاں ۱۰۳۷ھ میں تخت سلطنت پر بیٹھنے کے بیس برس بعد وزیر مقرر ہوا تھا۔ تو لازمی طور پر یہ شاعرہ ۱۰۵۷ھ میں موجود ہوگی۔ جب کہ اس کا جواب غالباً ۱۰۶۰ھ میں سعد اللہ خاں نے دیا ہوگا۔ گویا یہ شاہجہاں کے دور کی شاعرہ مانی جا سکتی ہے ؎

گر مذہب ماتو بہ زمے خانہ حرام است
زہد و دست و سبحۂ صد دانہ حرام است
یا بادہ فروشاں غم ایام حرام است
یا درد کشاں دولت بہرام حرام است
فرض است بما مجلس کہ نیز شدہ تجرید
با زاہد خود بیں مے گلفام حرام است
رنداں نظر بجلوۂ دنیا نمی کنند
جز آرزوئے ساغر و صہبا نمی کنند
قدم بخانہ چشم بند کہ جا ایں جا است
از رق تبطلہ خوباں خوش ادا ایں جا است
افتادہ براہ تو کہ باشد کہ نباشد
بر نگاہ تو کہ باشد کہ نباشد
ز ہجر درد میں ایں دیدہ خوں فشاں بستم
نظر بغیر تو حیف است سن اداں بستم
آہ ایں شاعراں نادیدہ
کہ ندارند نور در دیدہ

قد خوباں بسرو می خوانند

رخ ایشاں بماہ مانندہ

ماہ قرصیست ناتمام

سرو چوبیست ناتراشیدہ

جہانی | یہ شاعرہ دہلی کی رہنے والی تھی۔ شعر و شاعری سے ذوق رکھتی تھی فارسی میں شعر کہتی تھی۔ اچھے دولتمند خاندان سے اس کا تعلق تھا۔ اس دور کے تذکرہ نویس اس بات کا خیال نہیں کرتے اور نہ اس کو برا سمجھا جاتا تھا کہ کسی شاعر یا شاعرہ کی برائی نہ لکھی جائے۔ وہ جو شاعر میں خوبیاں دیکھتے اور اس میں جو برائی ہوتی وہ بلا جھجک تحریر کر دیتے تھے۔ چنانچہ صاحب تذکرہ روز روشن اس شاعرہ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"جہانی دہلوی نازنین از امرا بود کہ بعد وفات شوہر خود قدم کوچۂ آوارگی نہادہ"

جہانی صاحبہ کا ایک شعر اختر تاباں میں تحریر ہوا ہے ؎

گل باغ و رخ آں غنچہ دہن ہر دو یکے است

قد رعنائی وے و سرو چمن ہر دو یکے است

بیگم | بانو بیگم دہلی میں سکونت رکھتی تھی۔ اپنے ہم عصروں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ فارسی زبان میں اس کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔ بیگم کا ذکر مشاہیر نسواں اور تذکرہ روز روشن میں ہے اور ان میں اس کا ایک ہی شعر نقل ہوا ہے ؎

گر میسر شود آں روئے چو خورشید مرا | بادشاہی چہ کہ دعوائے خدائی نہ کنم

مخفی زیب النساء کا تخلص بھی مخفی تھا۔ یہ شاہ عالمگیر کی صاحبزادی تھی شاعری میں عورتوں میں کیا مردوں میں اس کی پوزیشن امتیازی تھی اور حاضر جوابی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ اس کے حاضر جوابی کے بہت سے واقعات مشہور ہیں جو غلط بھی ہو سکتے ہیں لیکن ایک دو تو صحیح ہوگا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ زیب النساء اپنی کم سنی کے زمانے میں آگرہ کے قلعہ میں محل کے اوپر کھیل رہی تھی۔ اس کی سہیلی نے ایک دیوار کے سوراخ میں ایک لکڑی ڈال دی اور کہنے لگی "نیمے درون نیمے بروں" اس پر سب لڑکیاں شور مچانے لگیں۔ زیب النساء کے دادا شاہجہاں بادشاہ جو اس وقت آنکھوں سے معذور ہو کر محل کی مسجد میں رہتے تھے، بچوں کو شور و غل مچاتے سنا تو بہت خفا ہوئے اور لڑکیاں خوفزدہ ہو گئیں کہ شاید بادشاہ نے یہ فقرہ سن لیا ہوگا سب بھاگ گئیں۔ لیکن زیب النساء کو ذرا سا بھی ہراس اور خوف نہ تھا۔ وہ دادا جان کے سامنے آئی اور اس نے کہا دادا جان ہم یہ کہہ رہے تھے: ؎

از ہیبت شاہ جہاں لرزد زمین و آسماں
انگشت حیرت در دہاں نیمے درون نیمے بروں

ایک دن اورنگ زیب نے زیب النساء کی خواصوں میں سے ایک خواص کو حکم دیا کہ مجھے نماز صبح سے قبل جگا دینا۔ اس کو اس خوف سے رات بھر نیند نہ آئی کہ اگر میری آنکھ لگ گئی تو بادشاہ کی عدول حکمی ہوگی۔ اور سزا کی مستحق بن جاؤں گی۔ اسی وجہ سے وہ جاگتی رہی سوئی نہیں۔ رات کو مرغ بانگ دیتے ہیں تو عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ صبح ہو گئی لیکن کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ مرغ درمیان شب بھی بول اٹھتا ہے۔ چنانچہ اس رات کو یہی ہوا کہ درمیان شب مرغ بول اٹھا۔ یہ خواص سمجھی کہ صبح ہو گئی۔ تو فوراً اس نے بادشاہ کو جگا دیا تو بادشاہ نے تہجد

کی نماز پڑھی اور سو گئے۔ کہ ایکا ایکی اس نے بادشاہ کو دوبارہ جگا دیا۔ اس دوبارہ جگانے کا بادشاہ کے مزاج پر بہت بُرا اثر ہوا۔ اور خواص پر بہت ناراض ہوئے اور ان کی زبان سے یہ فقرہ نکل گیا۔ سر بریدن لازم است۔ خواص بادشاہ کی زبان سے یہ فقرہ سُن کر اپنی زندگی سے مایوس ہو گئی اور زیب النساء کے پاس دوڑتی ہوئی آئی کہ اس کو جگا دیا۔ اور تمام واقعہ ماجرا اس کو سُنایا کہ میں اب حضور کے پاس آخری سلام کے لئے حاضر ہوئی ہوں۔ میرا پیمانہ عمر لبریز ہو چکا ہے۔ زیب النساء نے اس کو تسکین دی کیونکہ وہ اس کو بہت چاہتی تھی۔

حسب عادت زیب النساء علی الصباح بادشاہ کو سلام کرنے کے لئے حاضر ہوئی۔ وہ خواص بھی بادشاہ کے سامنے دست بستہ کھڑی تھی۔ زیب النساء نے پوچھا۔ آبا جان اس کے لئے حضور کا کیا حکم ہے۔ بادشاہ نے پھر وہی جملہ کہا۔ زیب النساء نے یہ شعر پڑھا ؎

سر بریدن لازم است آں مرغ بے ہنگام را
ایں پری پیکر چہ داند وقت صبح و شام را

بادشاہ مسکرائے اور کنیز کو معاف کر دیا :

زیب النساء کافی پڑھی لکھی تھی۔ علوم و فنون سے اس کو بے حد لگاؤ تھا۔ اس نے اپنی سرپرستی و نگرانی میں ایک اکاڈمی قائم کی تھی۔ جہاں علماء و شعراء کتابوں کی تصنیف و تراجم میں مشغول رہتے تھے۔ ان کتابوں کے عنوان زیب سے شروع ہوتے تھے مثلاً صفی الدین اردبیلی کی زیب التفاسیر اور مرزا خلیل کی زیب المنشآت اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ شعراء میں مُلا سعید اشرف اور نعمت خان عالی اسی سے متعلق تھے۔ اس نے فتاویٰ عالمگیری کا فارسی ترجمہ بھی کرانا شروع کیا۔

اس دارالتصنیف کے ساتھ ایک عظیم کتب خانہ اور دار المطالعہ بھی تھا جہاں

اس عہد کی تمام اعلیٰ درجہ کی علمی و مذہبی کتب فراہم کردی گئی تھیں اور ہزارہا روپیہ ان کی فراہمی پر صرف ہوا تھا۔ مآثر عالمگیری میں لکھا ہے کہ یہ کتب خانہ اپنی نوعیت اور وسعت میں اتنا عظیم و وسیع تھا کہ اس عہد میں دُور تک اس کی کوئی نظیر نہیں تھی اور اس کے تمام مصارف شہزادی خود برداشت کرتی تھی۔

زیب النساء خود تصنیف و تالیف میں دلچسپی لیتی تھی۔ اس نے ایک مُرقع مرتب کیا تھا جس میں بڑے بڑے شاعروں کے منتخب اشعار تھے۔ اس مُرقع پر مُلا رضائی راشد نے ایک دیباچہ لکھا تھا جو ایک بیاض میں محفوظ ہے۔ غالباً مغل شہزادیوں میں کسی نے علم و ادب کی اتنی خدمت نہیں کی، جتنی زیب النساء نے کی۔

سید اشرف مازندرانی کے ایک شاگرد عنایت رسا نے شہزادی کی رحلت پر جو تاریخی قطعہ لکھا تھا اس سے اس کی شاعری اور تخلص دونوں کا ثبوت ملتا ہے ؎

رخت ہستی بست چوں زیب النساء بیگم ز دہر
زیں خبر بزم جہاں چوں دیدۂ اعمیٰ شدہ

ایں کہ تاثیر کلامش در مزاج روزگار
روح بخش، جاں فزا تر از دم عیسیٰ شدہ

بود از شیریں کلامی خسرو مُلک سخن
تا ز عالم رفت، زیب از کشور معنی شدہ

خویش را اندر تخلص گرچہ مخفی می نوشت
در ہنر لیکن زیادہ شہرۂ گیتی شدہ

دل ز تاریخ وفاتش را چو پرسیدم ز عقل
از رہِ حسرت بگفت آہ جہاں مخفی شدہ

زیب النساء کے کلام کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ دلوں کو موہ لیتا تھا:۔

بشکند دستی کہ خم در گردن یاری نشد
کور بہ چشمی کہ لذت گیر دیداری نشد

صد بہار آخر شد و ہر گل بہ فرقی جا گرفت
غنچۂ باغِ دلِ ما زیبِ دستاری نشد

گرچہ من لیلیٰ اساسم، دل چو مجنوں در نواست
سر بہ صحرا می زدم لیکن حیا زنجیر پاست

پئے تفریح ایں چرخ بے مدار کن
نظر بہ شاہجہاں و جمال دارا کن

تعنا، تعنانہ شود اے عزیز من ہرگز
تو خواہ فال بہ بیں خواہ استخارہ کن

اشک در خون طپیدہ می آید
یا دل از راہِ دیدہ مے آید

در عدم ہم ز عشق شورے ہست
گل دامن دریدہ مے آید

آغشتہ خون بشام شفق از نگاہ کیست
مشعل بکف گرفتہ فلک دادخواہ کیست

روشن یہ شاعرہ زیب النساء کی کنیز تھی جو انتہائی حاضر جواب تھی۔ زیب النساءؒ کی صحبت میں رہنے کا اس پر اثر ہوا۔ موقع و محل پر اعتراض و سوال کرنے والوں کو لاجواب کر دیتی تھی۔

ایک مرتبہ زیب النساء نے روشن کو حکم دیا کہ سامنے والے کمرہ سے میری بیاض اٹھا لا۔ یہ بیاض لا رہی تھی کہ محل سرائے کا حوض راستہ میں پڑا۔

سرخ مچھلیاں چھوٹی ہوئی تھیں، یہاں کا تماشہ دیکھنے لگی۔ بیاض اس کے ہاتھ سے حوض میں گر گئی۔ شاہزادی کی خدمت میں حاضر ہو کر اس نے یہ رباعی پڑھی جس کو اس نے اسی وقت فی البدیہہ کہا تھا ؎

آں بیاضِ خاصۂ شاہی کہ در روئے ہر طرف
چوں کواکب نقطہ ہائے انتخاب افتادہ است
ایں زماں از دستِ روشن نام خاکش در دہن
چوں بیاضِ سینۂ ماہی در آب افتادہ است

زیب النساء اس رباعی کو سن کر خاموش ہو گئی۔

امانی | زیب النساء کی یہ قابلِ اعتماد و خدمت گار کنیز تھی۔ ایک روز امانی اور زیب النساء باغ میں سیر کر رہی تھیں۔ اور گل گشت چمن میں مصروف تھیں کہ یک بیک شہزادی کی زبانِ غنچہ دہن سے یہ مصرع نکلا ؏

اے امانی گل برگ چرا می خندد

اس کنیز عندلیب ہزار داستان نے دوسرا مصرع لگایا ؏

بر بقائے خود ز غفلت ہائی می خندد

زیب النساء اس مصرع کو سن کر بہت محظوظ ہوئی۔

اس قسم کی شاعرات کا کلام بہت کم دستیاب ہوتا ہے اس کی وجہ نہ معلوم ہو سکی۔ چنانچہ تذکرۃ النساء میں اس شاعرہ کا ایک ہی شعر درج ہے ؎

آں قدر روزِ ازل تیرہ نصیبم کردند
تیرگی می کلید شامِ غریباں از من

جہاں آراء اور زینت النساء کا بھی ایک ایک شعر تذکروں نے درج کیا ہے اور وہ بھی ایک شعر ان کے مزارات پر کندہ ہے۔ ان ہم کو

نقل کرتے چلے آرہے ہیں اور کوئی دوسرا شعر ان کا نقل نہیں کرتے جبکہ مصنف صبح گلشن نے زینت النساء بیگم کے بارے میں لکھا ہے:۔

"از بنات اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ عالمہ و شاعرہ و حافظ کلام اللہ بود۔ زینت المساجد بنا کردہ اشش۔"

دہلی میں

بیگمات شاہجہاں آباد کی یادگاریں

عموماً ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں اور خصوصاً مغلیہ حکمرانوں نے جہاں
ہندوستان میں بھائی چارگی کی فضا پیدا کی اور ملک کی سالمیت کی راہ دکھائی۔ ہندوستانی
تہذیب و تمدن و معاشرت میں نفاست پیدا کی اور ان کو نکھارا۔ وہاں انھوں نے
فنونِ لطیفہ میں وہ کارنامے انجام دیئے جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اسی وجہ
سے ہندوستان کے لئے طرۂ امتیاز بنے مغلیہ حکمرانوں کے ساتھ ان کی بیگمات بھی
پیچھے نہیں رہیں۔ انھوں نے بھی ہندوستان میں اپنی یادگاریں چھوڑیں۔ زیرِ عنوان
بیگمات شاہجہاں آباد کی دہلی میں یادگاروں ہی کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ اس پر
سرسری انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ چند ایسی یادگاروں کا ابتدا میں ضمناً ذکر
کیا گیا ہے جو شاہجہاں آباد سے قبل کی ہیں۔

عرب سرائے ہمایوں کے مقبرے سے بالکل ملی ہوئی حضرت نظام الدین اولیاء کی بستی میں عرب سرائے ہے۔
سرائے کو حمیدہ بانو بیگم ملقب مریم زمانی المعروف بہ نواب حاجی بیگم نے، جو
اکبر بادشاہ کی والدہ ماجدہ تھیں ۹۶۸ھ مطابق ۱۵۶۰ء میں تعمیر کرایا۔ اور

بیگم صاحبہ نے تین سو عربوں کو حرمین شریفین سے لاکر اس میں آباد کیا۔ ان عربوں میں سے سو عرب سادات عالیہ سے تھے اور سو مشائخ کبار سے، اور سو عوام الناس میں سے تھے جو انھیں لوگوں کے خدمت گزار تھے۔ یہ لوگ ناسازگاری حالات کی بنا پر رفتہ رفتہ تتر بتر ہو گئے۔ اب اس سرائے میں ہر قوم کے لوگ آباد ہیں۔

اس سرائے کے تین دروازے تھے۔ دو دروازے قابل ذکر نہیں ہیں، البتہ شمالی دروازہ عالی شان ہے۔ اس دروازے کی شناخت نہایت خوبصورت اور بے نظیر تھی۔ اس میں مستقیمۃ الزوایا نقش و نگار کے پٹے تھے جو آڑے ٹکون کو گھیرے ہوئے تھے اور آڑے ٹیڑھے کنگوروں کو سہارا دیے ہوئے تھے۔ انھیں مستقیمۃ الزوایا ٹکونوں کے اندر محراب تھی جس کی ساری پیشانی نقش و نگار سے مزین تھی۔ محراب کے برابر میں دو آگے بڑھی ہوئی سائبان دار کھڑکیاں تھیں جن میں پتھر کے توڑے سہارا دیے ہوئے تھے۔ محراب کی بلندی پر تھوڑی دور نیچے ایک نشیمن تھا جس سے چھ فٹ نیچے دروازے کی محراب شروع ہوتی تھی جو سولہ فٹ اونچی اور دس فٹ چوڑی تھی۔ یہ دروازہ چالیس فٹ اونچا ۵۰ فٹ چوڑا اور بیس فٹ عمق میں تھا۔

مقبرہ ہمایوں

حمیدہ بانو بیگم نے دوسری تاریخی عمارت "مقبرہ ہمایوں" اپنے شوہر کی یادگار کے طور پر تعمیر کرائی۔ جس کی تکمیل ۹۷۳ھ مطابق ۱۵۶۵ء میں ہوئی۔ اس پر پندرہ لاکھ روپیہ صرف ہوا جس کا بڑا حصہ اکبر کی جیب خاص کا تھا۔ گو یہ مقبرہ ہمایوں کہلاتا ہے لیکن دراصل خاندان تیموریہ کی یہ ہڑواڑ ہے۔ کسی مقبرہ کو یہ فخر حاصل نہیں ہے کہ خاندان مغلیہ کے اتنے سربرآوردہ ممتاز اور نامور اشخاص کی قبریں ہوں جتنے اس میں ہیں۔ اوپر والے شان دار چبوترے کے تہ خانے کے بیچ بیچ ہمایوں بادشاہ، ان کی بیگم حمیدہ بانو، شیر خوار شاہزادی اور دیگر میران خاندان متوسلان شاہی کی قبریں ہیں۔ شمال کی طرف کے حجرے میں سنگ مرمر کی دو قبریں ہیں جو عالمگی

ثانی اور ان کی بیوی شگی بیگم کی ہیں چبوترے کے اوپر کل چالیس اور اردگرد کے حجرے میں ڈیڑھ سو قبریں ہیں۔ یہ سب خاندانِ شاہی اور امراء کی قبور ہیں۔ دارا شکوہ کی قبر سنگِ مرمر کی ہے جس کے تعویذ پر "كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ" کندہ ہے۔

اس مقبرہ کی عمارت ایسی خوبصورت اور مرغوب ہے کہ روئے زمین پر اپنا نظیر نہیں رکھتی کسی زمانہ میں یہاں باغ تھا۔ چاروں طرف نہریں جاری تھیں۔ جگہ جگہ حوض بنے ہوئے تھے، فوارے چھوٹتے تھے۔ گنبد کی چھت پر ایک بڑا عالی شان مدرسہ تھا جس کے اساتذہ بڑے بڑے علامہ اور فاضل اجل تھے اس کے حجرے اساتذہ اور طلباء سے بھرے رہتے تھے۔ اس مدرسے کے متولی شیخ حسین اور مولانا نورالدین ترخان تھے۔ مقبرہ کے بالائی حصہ میں بھول بھلیاں تھیں جس میں آدمی جا کر الجھ جاتا تھا۔ آنے کا راستہ نہیں ملتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ دلی کے قلعہ کے دو تین گورے اس میں جا گھسے تھے جو کئی دن سرگرداں رہنے کے بعد بمشکل نکلے۔

ہمایوں کے مقبرہ کا بالائی چبوترا جس پر چوکے بچھے ہوئے ہیں ۳۱۸ فٹ x ۳۰۰ فٹ ہے۔ جس پر ایک فٹ دس انچ اونچی سنگ باسی کی جالیاں بطور کٹہرے کی لگی ہوئی ہیں۔ نیچے کا چبوترہ ۳۷۳ فٹ ۸ انچ لمبا اور ۳۲۲ فٹ ۹ انچ ہر طرف سے چوڑا اور ۴ فٹ اونچا ہے۔ اوپر کے چبوترے سے نیچے کا چبوترا ۲۲ فٹ نیچا ہے جس میں ۲۸ سیڑھیاں ہیں اور دوسرے چبوترے کی پانچ سیڑھیاں ہیں۔ چبوترے کی چاروں طرف ایک ایک دروازہ اور آٹھ آٹھ در ہیں۔ چاروں طرف سے ملاکر کل ۵۶ در ہیں اور ہر در میں قریب ہی قبریں ہیں (۱۰۸)

حمیدہ بانو بیگم عرف حاجی بیگم | حمیدہ بانو بیگم کا سلسلہ نسب چند واسطوں

سے جناب ولایت مآب ولی باخدا شیخ احمد جام ملقب بہ ژندہ پیل تک پہنچتا ہے تمام
تواریخ اس کے نسبی سلسلہ کی عظمت کے معترف ہیں۔ اخلاق و خصائل میں ممتاز تھی
اس پر اس کی نیک دلی اور فیاضی نے اس کی شہرت کو چار چاند لگا دیے تھے۔
حقیقت یہ ہے کہ حمیدہ بیگم دنیوی جاہ و حشم، اعزاز و عظمت کے لحاظ سے بڑی خوش
نصیب خاتون تھی ـــــ عقل و تدبر اور تدبیر و رائے میں بھی یکتائے روزگار تھی،
ہمایوں اس سے انتہا درجہ محبت کرتا تھا۔ حسن و جمال، خوش ادائی و رعنائی میں
بھی اپنی نظیر آپ تھی۔ اس لئے اسے ایک تاریخی شہرت حاصل ہے اور دنیا کی
نامور خواتین میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

جس وقت شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو شکست دی ہے اور وہ دس سالہ
کی فرماں روائی کے بعد ہندوستان کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوا تو اس پر انتہائی مصائب
کا ہجوم تھا۔ سولہ برس تک پریشان و سراسیمہ ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ اس
تمام مدت میں حمیدہ بیگم نے اس کی رفاقت کی اور اپنے مشوروں سے اس کا دل
بڑھاتی رہی جس کا ثمرہ تھا کہ ہمایوں ۹۶۲ھ میں دوبارہ تخت دہلی پر جلوس کرے۔
اکبر ۹۴۹ھ میں پانچویں رجب کی رات کو امرکوٹ کے قلعہ میں پیدا ہوا تھا۔ یہ وہ
زمانہ تھا کہ ہر طرف سے ہمایوں کو مصائب و آلام کے بادل گھیرے ہوئے تھے۔ حمیدہ
بانو بیگم کا شوہر ہمایوں شکست کھا کر اپنے [illegible] وہاں کو چھوڑ کر راہ فرار اختیار کر چکا تھا
لیکن اکبر پیدا ہوتے ہی اس کی تمام عسرت، عیش و عشرت سے بدل گئی۔ اس کے بعد ہی
ہمایوں کا ستارۂ اقبال کی تابانی شروع ہوئی۔ ہمایوں جب اپنے بچے کی پیشانی پر نظر
ڈالتا تو بے ساختہ کہہ اٹھتا کہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب ہی یہ ہلال بدر ہو کر چمکے گا
اور پوری دنیا اس کے جاہ و حشم کو بوسہ دے گی۔ اکبر کی پیدائش سے حمیدہ بانو بیگم کی
عزت میں اور اضافہ ہو گیا اور ہمایوں کے دل پر اس کی محبت بھری شخصیت کا نقش

ہو گیا لیکن افسوس کہ اس کو ہندوستان کی فتح یابی کے بعد یہاں زیادہ عرصہ تک حکومت کرنی نصیب نہ ہوئی اور ابھی اکبر اپنی عمر کی تیرہ بہاریں بھی دیکھنے نہ پایا تھا کہ سنہ ۹۶۳ھ میں وہ فوت ہو گیا۔

حمیدہ بانو بھی اپنے شوہر کے ساتھ بے حد محبت کرتی تھی۔ ہمایوں کی موت نے اس کی نگاہوں میں دنیا تیرہ و تار کر دی لیکن ایک بادشاہ مر چکا تھا دوسرا موجود تھا۔ اگر اکبر اس وقت اس کے آغوش مادری میں موجود نہ ہوتا تو ابھی اس کی زندگی کی بھی خیر نہ تھی۔ اکبر نے اپنی ماں کی اس قدر خدمت کی کہ وہ شوہر کے غم کو بھول گئی اور پورے عیش و آرام کے ساتھ زندگی بسر کرتی رہی۔

حمیدہ بانو بیگم کو شاعری کا بہت شوق تھا طبیعت موزوں پائی تھی اور برجستہ شعر کہتی تھی جس وقت ہمایوں قلعہ قندھار میں بیرم خاں کو متعین کر کے کابل پر حملہ آور ہوا ہے اس وقت حمیدہ بانو نے وزیر سلطنت کو حسب ذیل اشعار لکھ کر ارسال کئے جس سے اس کی طبیعت کی موزونی اور مشاقی کا ثبوت مل سکتا ہے اور سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کس پایہ کی شاعرہ تھی ؎

باز فتح ز غیب روئے نمود | مدعی دوستاں ازیں بشنود
شکر اللہ کہ باز شاد انیم | بر رخ یار دوست خنداںیم
دوستاں را بکام دل دیدم | میوۂ باغ فتح را چیدیم

بعد ازیں فکر کار بہ بست کنیم
عزم تسخیر ملک ہند کنیم

حمیدہ بانو بیگم بہت عمر رسیدہ ہو کر فوت ہوئی اور شوہر کے مرنے کے بعد پورے ۵۹ برس تک زندہ رہی۔ اُس کا سن وفات سنہ ۱۰۱۲ھ ہے جب اسے مرض موت نے دبایا تو اس وقت اکبر جہانگیر کی اصلاح کی غرض سے الہ آباد

روانہ ہو چکا تھا خبر پہنچتے ہی اس نے شاہزادۂ خرم کو پایۂ تخت روانہ کیا۔ وہاں پہنچ کر شاہزادہ نے لکھا کہ "حالت نازک ہے۔ اکبر کا یہ سننا تھا کہ وہ سب کچھ بھول گیا اور منزلیں طے کرتا ہوا آگرہ پہنچا اور سعادت دیدار حاصل کی۔ کہ حمیدہ بانو نے دم توڑ دیا جہانگیر بھی دادی کی خبر سے سراسیمہ ہو گیا اور عجلت کے ساتھ وہ آگرہ جا پہنچا کتنی خوش قسمت تھی حمیدہ بانو کہ شوہر بھی نازبردار نصیب ہوا۔ بیٹا اور پوتے بھی انتہائی فرمانبردار ملے۔ اور خدمت کو اپنا فرض سمجھتے رہے۔ دہلی میں ان کی دو یادگاریں مقبرہ ہمایوں اور عرب سرائے موجود ہیں۔

مسجد اکبر آبادی

یہ مسجد دلکش و دل رُبا فرحت بخش اور روح افزا سر سے پاؤں تک سنگ سرخ کی بنی ہوئی تھی۔ اس میں دالان اور حجرے طالب علموں کے رہنے کے لئے بنے ہوئے تھے۔ یہ مسجد اعزاز النسا بیگم شاہ جہاں بادشاہ نے سنہ ۱۰۶۰ھ مطابق سنہ ۱۶۵۰ء میں تعمیر کرائی۔ اس بیگم کا خطاب اکبر آبادی محل تھا۔ اسی بنا پر یہ مسجد اکبر آبادی مشہور ہو گئی۔ اس مسجد کے تین گنبد اور سات در تھے۔ مسجد کی عمارت ۴۳ گز طول میں اور ۱۰ گز عرض میں نری سنگ سرخ کی تھی اور اس کا پیش طاق ۷۵ گز عرض اور تین گز اونچا تھا۔ اس پر سنگ سرخ کا کٹہرا لگا ہوا تھا، اس کے آگے ایک حوض ۱۲×۱۲ گز کا تھا۔ نہر کا پانی اس میں آتا تھا۔ اس کے آگے ایک دالان تھا اور اس کے سامنے ۲۰ گز مربع کا چبوترہ تھا۔ اس مسجد کے دو مینار تھے۔ مسجد کے دروازہ پر ایک کتبہ بخط نسخ کندہ تھا جو بہت طویل ہے اس لئے درج نہیں کیا گیا۔

اس کے ایک کمرہ میں شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادرؒ نے پوری عمر گزاری اس میں وہ وعظ کے ساتھ درس بھی دیتے تھے حضرت سید احمد بریلوی شہید جب دہلی آئے تو اسی مسجد میں مقیم رہے اور شاہ عبدالعزیز

صاحب سے تحصیل علم کی، دور دراز سے جو طلبا، دینی علوم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے آپ ان کی خدمت کرتے تھے۔ اسی مسجد میں شاہ اسماعیل شہید نے شاہ عبدالقادر صاحب سے دینی کتب پڑھیں۔ اور اخوند شیر محمد اور مولوی امان علی وغیرہ نے اسی مسجد میں شاہ صاحب سے تعلیم پائی۔

مسجد اکبر آبادی کے نزدیک کشمیری کٹرہ تھا جس میں زیادہ تر کشمیری لوگ رہتے تھے۔ کشمیری کٹرہ کے نزدیک ہونے کی وجہ سے اس کو کشمیری کٹرہ کی مسجد بھی کہا جاتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے قبل لال قلعہ کے نزدیک جس قدر محلے تھے۔ ان کے رہنے والوں نے اس جنگِ آزادی میں حصہ لیا تھا۔ اکبر آبادی مسجد بھی مجاہدین کا مرکز تھی چنانچہ جب دہلی کی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء ناکام ہوئی اور انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا تو اس نے ان مقامات کو جو بغاوت کا مرکز تھے تباہ و برباد کر دیا جس میں اکبر آبادی مسجد بھی تھی۔ اس مسجد کی تباہی کا ذکر مرزا غالب نے کئی خطوط میں کیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں :-

> "کشمیری کٹرہ کی مسجد زمین کا پیوند ہو گئی۔ سڑک کی وسعت دو چند ہو گئی۔ اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں"

خاص بازار یہ بازار اکبر آبادی بیگم کا بسایا ہوا ہے جو گیارہ سو گز لمبا اور تیس گز چوڑا تھا۔ خاص بازار اور اردو بازار شہر کے ساتھ ہی ساتھ بنے تھے۔ اس بازار میں جو نہر جاری تھی وہ چار فٹ چوڑی اور پانچ فٹ گہری تھی یہ شاہجہاں کی بنائی ہوئی تھی۔ جب کبھی بادشاہ کی سواری جامع مسجد کے لئے آتی تھی تو اسی بازار سے جلوس نکلتا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب کہ ان دونوں بازاروں میں صبح سے رات گئے تک کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور دکانیں مال و اسباب سے بھری رہتی تھیں جن میں ہر قسم کا بیش قیمت سامان موجود ہوتا تھا۔ (۲۷)۔

اعزاز النساء بیگم

یہ بیگم شاہجہاں بادشاہ کی دوسری بیگم تھی۔ روشن خیالی و معاملہ فہمی میں مشہور تھی۔ اگرچہ ممتاز محل اپنی غیر معمولی صلاحیت، خلوص و وفاداری اور حُسن خداداد کی بنا پر بہت زیادہ وقار و عظمت کی حامل تھی لیکن یہ بھی کسی چیز میں کم نہ تھی اس کے خلق و مزاج میں اتنی شگفتگی و نرمی تھی کہ اس نے تمام محل سرائے کی مستورات کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ انتہا یہ ہے کہ ممتاز محل کی اولاد بھی اس سے محبت کرنے پر مجبور تھی۔ وہ نہایت نیک دل اور نیک نفس خاتون تھی۔ ابتدا میں وہ بہت خودسر اور آزادمنش تھی لیکن اس کا اکلوتا بیٹا تین برس کا ہو کر مر گیا تو اس کا دل اُلٹ گیا اور اتنا صدمہ ہوا کہ خودسری جاتی رہی۔

اس میں سب سے زیادہ قابلِ تعریف بات یہ تھی کہ رشک و حسد کا مادہ بالکل نہ تھا اور کینے سے اس کا سینہ بالکل پاک تھا۔ ممتاز محل کے اثر و اقتدار نے کبھی اس کے دل میں کوئی جذبہ پیدا نہیں کیا۔ وہ جب بھی اس سے ملتی پورے اخلاص و محبت اور سچے دل سے ملتی۔ جب کبھی شاہ جہاں اور ممتاز محل میں اختلاف پیدا ہو جاتا اور شکر رنجی کی نوبت پہنچ جاتی تو اعزاز النساء اپنے کوشش سے ملاپ کرا دیتی۔ ان دونوں میں زیادہ محبت اور خلوص پیدا ہوگیا تھا اور دونوں بہنیں معلوم ہوتی تھیں اور ایک دوسرے کو ملے بغیر چین نہیں پڑتا تھا۔ جب ممتاز محل کا انتقال ہوا تو اس کی تمام اولاد اعزاز النساء سے ایسی محبت کرتی تھی جیسی اپنی حقیقی ماں سے ہونی چاہئے۔ اس کو ممتاز محل کے برابر عزت حاصل نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے کوئی اولاد نہیں تھی اور جو پیدا ہوتی تھی وہ مر جاتی تھی۔ زندہ نہیں رہتی تھی پھر بھی شاہجہاں کو اس سے بہت محبت تھی اس کی دل جوئی کرتا رہتا تھا جب ممتاز محل فوت ہوگئی تو اس کے

اثر و اقتدار میں اضافہ ہو گیا۔

اعزاز النساء کے اخلاق و عادات اتنے پاکیزہ تھے کہ شاہجہاں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ شاہجہاں کی زندگی میں اس کی عظمت کا ستارہ درخشندہ رہا لیکن اس کے مرنے کے ساتھ ہی اس کے اقبال کا آفتاب غروب ہو گیا۔ شاہجہاں کے انتقال کے بعد یہ پورے بارہ سال تک حیات رہی اس کی دل دہی کے لئے بہت سعی کی گئی لیکن اسے دُنیوی معاملات کی طرف کوئی رغبت نہیں تھی۔ بقایا زندگی اس نے یادِ خدا میں گزاری۔ ۴ ذی الحجہ ۱۰۹۰ھ میں فوت ہوئی۔ اس کی یادگار ایک مسجد رہ گئی تھی جو فیض بازار میں تھی اس کی زمین سوبھاش پارک میں موجود ہے۔

مسجد فتحپوری

چاندنی چوک میں فتحپوری مسجد ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۵۰ء میں شاہجہاں بادشاہ کی اہلیہ نواب فتحپوری محل نے بنوائی۔ یہ مسجد سر سے پاؤں تک سنگِ سُرخ کی ہے جس کے دونوں جانب اُونچے اونچے مینار ہیں۔ سارے شہر میں یہی مسجد ایک گنبدی ہے۔ مسجد کے تین بڑے دروازے ہیں جن پر سنگِ سُرخ کا کنگورہ اور ادھر اُدھر بُرجیاں ہیں۔ مسجد کا صحن اسّی گز مربّع ہے جس میں تمام سنگِ سُرخ کے چوکے بچھے ہوئے ہیں۔ شمال اور مشرق کی طرف سے دروازہ ستائیس فٹ مربّع اور دس فٹ گہرا ہے۔ اس دروازے کی ڈیوڑھی آٹھ فٹ چوڑی اور گیارہ فٹ اُونچی ہے۔ مغرب کی طرف مسجد کے دُہرے دالان ہیں جس کے دائیں اور بائیں بڑے بڑے کمرے ہیں۔ مسجد کی ہر سہ جانب مسلسل دکانیں ہیں جس میں سے مشرق اور شمال کی طرف علاوہ دکانوں کے دو منزلہ بڑے بڑے شاندار کمرے بعد میں بنائے گئے ہیں۔ صحن مسجد میں ایک بہت بڑا حوض ۱۶ گز × ۱۲ گز ہے۔ حوض اور مسجد کے درمیان کا چبوترہ

۱۳ فٹ × ۹ فٹ ہے۔ ممبر سنگِ مرمر کا ہے جس کی چار سیڑھیاں ہیں۔

مسجد کے بعض حصوں میں کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ مسجد کی دونوں جانب سنگِ سرخ کے ستونوں کی قطاریں تھیں جس سے مسجد کے دو طرفہ دو حصے الگ الگ ہو گئے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا کہ مسجد کی چھت کی حالت مخدوش ہو گئی تھی، اسی لئے پتھر کے ستونوں کی دو قطاریں بیچ میں بطور اڑواڑ دے کر مضبوط کر دی گئی ہے، قدیم ستون سنگِ سرخ کے ہیں اور ان کے بیچ میں یہ ستون جو بعد میں لگائے گئے ہیں وہ سفیدی مائل سنگِ خارا کے ہیں۔ ذرا پتلے ہیں مگر شاندار ہیں۔ اسی طرح پیچھے وار کو دوسری قطار لگائی گئی ہے اور پچھیت کی دیوار میں بھی اڑواڑ کے ستون اس خوبی سے لگائے گئے ہیں کہ کوئی بدنما نہیں معلوم دیتے۔ جس طرح ممبر کے پاس مغربی محراب ہے اسی طرح دونوں جانب کے قطعات میں بھی ایک ایک دیوار دوز محراب ہے۔ مسجد کا درمیانی حصہ جو گنبد کے نیچے ہے چالیس فٹ مربع ہے اور اس کے دونوں جانب کے حصے کچھ زیادہ لمبے ہیں۔ مسجد کے شمالی اور جنوب میں دونوں طرف سے آنے اور جانے کا ایک ایک دروازہ بعد میں لگایا گیا۔ جو ۱۶ فٹ اونچا اور دس فٹ چوڑا ہے۔ مسجد میں جو ترمیم کی گئی ہے اس سلسلے کا ایک کتبہ پیش طاق کے اوپر سنگِ مرمر کی تختی پر کھدا ہوا ہے ؎

دید چوں ایں مسجد رفعت پناہ
پشتِ گردوں خم پئے تعظیم شد
سالِ ترمیم از سرِ لوحش بگفت
مسجد عالی نکو ترمیم شد

۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد جب کہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو مسجد کی دکانیں سرکار نے ضبط کرکے اُنیس ہزار روپے میں نیلام کردیں جن کو لالہ چھناں مل نے نیلامی میں اپنے نام چھڑا لیا۔ ۱۸۹۲ء میں انجمن راشدین صلحِ کل اسلامیہ کی طرف سے وقف جائیداد کے بارے میں تنسیخ نیلامی کی درخواست دی گئی جو منظور ہوگئی۔ گورنمنٹ نے لالہ چھناں مل کو پانچ آنے سینکڑہ سود کے حساب سے ایک لاکھ دس ہزار روپے دے کر دکانیں خریدنا چاہیں اور اس کے معاوضہ میں ایک موضع تحصیل پلول دینا چاہا مگر لالہ چھناں مل تیار نہ ہوئے اور انکار کردیا۔ ۱۸۹۵ء میں ایک لاکھ دس ہزار اصل و سود سرکار نے لالہ چھناں مل کو دے کر دکانیں چھڑا کر مسلمانوں کو دے دیں۔ مسجد کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد کردیا جس کے سربراہ اور دس مسلمان ممبر مقرر ہوئے اور نگراں ڈپٹی کمشنر دہلی مقرر کیے گئے۔

حاجی محمد تقی کی طرف سے حاجی قطب الدین و غلام محمد کے اہتمام میں مسجد کے تینوں طرف کی دکانیں تعمیر ہوئیں جن کا معقول کرایہ ہوگیا۔ آج کل مسجد فتح پوری کی یہ دکانیں دہلی وقف بورڈ کے اہتمام میں ہیں۔

۱۸۵۷ء سے قبل اس مسجد میں قرآن مجید کی تعلیم دی جاتی تھی۔ چنانچہ آثار الصنادید میں سر سید احمد خاں لکھتے ہیں "اس مسجد میں عربی و فارسی کی تعلیم دی جانے لگی جو اب تک جاری ہے" مولوی بشیر الدین نے ۱۹۱۹ء میں لکھا ہے:۔

"مدرسہ عربی میں چار مدرس فارسی ایک عربی اعلیٰ ایک مدرس قرآن مجید کل چھ مدرس ہیں۔ ڈھائی سو روپے ماہانہ کا خرچ ہے مذہبی تعلیم انتہائی درجے حدیث شریف اور فقہ معقول و منقول کی ہوتی ہے۔ بیرونجات کے طلباء کثرت سے ہیں۔ ان کے روٹی

کپڑے کا کوئی سہارا نہیں، گھر گھر سے روٹیاں مقرر ہیں۔ کھاری باولی کی طرف شمالی دروازہ ہے ادھر پندرہ درکا دو منزلہ دالان ہے جس میں مدرسہ ہے۔"

فتحپوری محل یہ بیگم انتہائی خدا ترس تھی اس کو مذہبی معاملات سے بہت دلچسپی تھی۔ فارسی و عربی میں اس کو دستگاہ رکھتی تھی۔ ذہین و فہیم بلا کی تھی۔ شاہجہاں اس کے مذہبی خیالات سے بے حد متاثر تھے۔ ان کی یادگار دہلی میں مسجد فتحپوری ہے۔

مسجد سرہندی کھاری باولی بازار کے اختتام پر لاہوری دروازہ پر یہ مسجد سرہندی سنہ ۱۰۶۰ھ مطابق سنہ ۱۶۵۰ء میں شاہجہاں کی بیوی سرہندی بیگم نے تعمیر کرائی۔ یہ مسجد نہایت مرقع بہت ہی پختہ، مستحکم سر تا پا سنگ سرخ کی بنی ہوئی تھی۔ مسجد کے تین در بنگڑی دار محراب کے ہیں جن پر کنگورا بنا ہوا ہے۔ مسجد کا طول ۴۶ فٹ، عرض ساڑھے سترہ فٹ بلند اور چھت پر کنگورا ہے۔ اس مسجد کے تین گنبد سنگ سرخ کے کلس دار ہیں۔ سد میانی گنبد ۲۰ فٹ اور ادھر اُدھر کے گنبد پندرہ فٹ اونچے تھے۔ مسجد تمیر چُونے کی پختہ بنی ہوئی تھی۔ اندرونی دیوار میں سنگ سرخ کی سلیں لگی ہوئی تھیں۔ فرش مسجد اینٹوں کا تھا جن پر گچ ہوئی وی تھی۔ سرکار کمپنی کے حکم سے یہ مسجد منہدم کردی گئی تھی۔ یہ مسجد ایک معمولی حیثیت کی رہ گئی ہے۔ اذان اور نماز اب بھی ہوتی ہے مگر سابقہ جیسی بات نہیں ہے (۵۵)۔

باغ سرہندی شاہجہاں بادشاہ کی اہلیہ سرہندی بیگم نے صرف مسجد ہی دہلی میں نہیں بنائی بلکہ اغلب یہ ہے کہ سرہندی باغ کی بھی بُنیاد ڈالی، جس کا ذکر بہادر شاہ ظفر کے روزنامچے میں ملتا ہے

اس باغ پر بہادر شاہ ظفر اور نواب حسینی بیگم اہلیہ مرزا محمد سلیم کے مابین نزاع پیدا ہو گیا تھا۔ دونوں اس کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔ اس باغ کے ساتھ چاندنی محل اور باغ روشن آرا کا بھی جھگڑا چلا اور مقدمہ بازی کی نوبت آئی۔ اس مقدمہ کی مختصر روئیداد بہادر شاہ ظفر کے روز نامچہ میں چھپی ہے جو یہ ہے:-

یکم مئی ۱۸۵۲ء کے روز نامچہ میں ہے:-

شقہ سلطانی جاری ہوا کہ روشن آرا باغ، سرہندی کے باغ اور چاندنی محل کو نواب حسینی بیگم صاحبہ بیگم مرزا محمد سلیم بہادر مرحوم کے قبضہ سے الگ کر لیا جائے پہلے ان سے خالی کرنے کی نسبت کہا جائے۔ اگر وہ نہ مانیں اور خالی نہ کریں تو ہیرا لال وکیل سے کہا جائے کہ عدالتِ عالیہ میں نالش کرنے کے لئے کارروائی شروع کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے خالی نہیں کیا تو ہیرا لال نے مقدمہ کی کارروائی شروع کر دی۔ اس درخواست پر بیگم صاحبہ کو نوٹس دیا گیا کہ وہ آٹھ روز کے اندر دونوں باغ اور محل خالی کر دیں ورنہ پولیس کے ذریعہ خالی کرایا جائے گا۔

نواب حسینی بیگم نے صاحب سیشن جج بہادر کی عدالت میں اپیل کی کہ باغ روشن آرا اور باغ سرہندی کی ملکیت کی سند میرے پاس موجود ہے پھر مجھ سے کیوں خالی کرائے جا رہے ہیں۔ صاحب جج بہادر نے مجسٹریٹ بہادر سے رپورٹ طلب کی۔ نواب منتظم الدولہ بہادر نے ایک پروانہ بتوسط ہیرا لال وکیل کے نام جاری فرمایا کہ تم صاحب جج بہادر کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرو کہ نواب گورنر جنرل کے حسب الحکم بادشاہ دہلی کو اس قسم کے مکانوں کے لینے دینے کے تمام حقوق حاصل ہیں جن کی نسبت شاہی ملکیت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ صاحب جج بہادر نے وکیل صاحب سے کہا کہ بیگم صاحبہ کا

دعویٰ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا اور نہ اُن کے پاس کوئی ثبوت موجود ہے، اس لئے بہت جلد ان باغوں پر ملازمانِ سلطانی کا قبضہ ہو جانے (۶۰) چنانچہ ۱۰ر جولائی ۱۸۴۶ء کو محکمہ ایجنٹی سے داروغہ چاندنی چوک کے نام حکم صادر ہوا کہ باغ روشن آرا اور باغ سرہندی پر ملازمانِ سلطانی کو قبضہ کر لینا چاہیے۔

اس قبضہ لینے کے حکم کے خلاف ۱۴ر اگست ۱۸۴۶ء کو نواب حسینی بیگم صاحبہ نے عدالت دیوانی میں استغاثہ دائر کیا کہ باغ روشن آرا اور باغ سرہندی کو میرے شوہر نے مہر کے بدلے میں مجھے دیا تھا۔ اب محکمہ ایجنٹی کے ذریعے یہ دونوں باغ میرے تصرف سے نکل کر کارپردازانِ سلطنت کے قبضہ میں چلے گئے ہیں۔ جناب کالبن سنجی صاحب بہادر جج نے اس بات کی صدر دفتر میں رپورٹ کی ہے کہ قابض قدیم کا قبضہ اٹھانا بغیر عدالتِ دیوانی کی ڈگری کے ناجائز ہے اور ملازمانِ سلطانی کے قبضہ میں ان دونوں باغوں کا دینا قانونی طور سے نادرست ہے۔ یہ دونوں باغ دوبارہ قابض قدیم یعنی نواب حسینی بیگم کے حوالے کئے جائیں۔ جب صاحب کلاں بہادر کو یہ خبر پہنچی تو اُنھوں نے استحقاق سلطانی کے ثبوت کے لئے کئی معقول دلیلیں ایک خط میں درج کر کے صدر دفتر میں روانہ فرمائیں۔

جب نواب لفٹننٹ گورنر نے بہادر شاہ ظفر کے خلاف مقدمہ کا فیصلہ دیا تو صاحب کلاں بہادر نے ۲۵ر ستمبر ۱۸۴۶ء کو عرضی بھیجی کہ باغ سرہندی بلکہ روشن آرا وغیرہ پر نواب حسینی بیگم زوجہ مرزا محمد سلیم بہادر کو قبضہ دیا جائے اس کام میں بہت جلدی ہونی چاہیے حضور والا تو اہلکارانِ شاہی کو اس حکم کی تعمیل کے لئے تاکید فرمائیں۔ (۸۸)

۵ر اکتوبر ۱۸۴۶ء کو بادشاہ سلامت کی طرف سے نواب لفٹننٹ گورنر

کو چٹھی لکھی گئی کہ اگر باغ روشن آرا اور باغ سرہندی نواب حسینی بیگم کے قبضہ میں دیئے گئے اور شاہی عملہ کا داخلہ کم کر لیا گیا تو اس سے بارگاہ سلطانی کی ہتک ہو گی اس لئے ان دونوں باغوں پر شاہی قبضہ برقرار رہنا چاہیئے۔ البتہ ہماری طرف سے ایک سو روپے ماہانہ خرچ اخراجات کے لئے نواب حسینی بیگم صاحبہ کے پاس ہمیشہ پہنچ جایا کریں گے۔

چنانچہ بہادر شاہ ظفر کی یہ بات وشورہ نواب لفٹنٹ گورنر نے منظور کیا اور ۲۵ دسمبر ۱۸۴۶ء کو نواب حسینی بیگم کو اپنے اس فیصلے سے مطلع کر دیا کہ ان باغوں پر تمہیں قبضہ نہیں دیا جا سکتا البتہ اس کی آمدنی تمہارے پاس بھیج دی جائے گی۔ (۱۷۶)

بازار چاندنی چوک

چاندنی چوک کا یہ عظیم الشان بازار جہاں آرا بیگم نے ۱۶۵۰ء میں بنوایا تھا۔ جہاں گھنٹہ گھر تھا کسی زمانے میں یہاں ایک ہشت پہلو حوض تھا جس کے چاروں طرف سو سو گز میں شمس بازار تھا۔ دراصل یہی چاندنی چوک تھا لاہوری دروازے سے لے کر چاندنی چوک کے آخر تک یہ بازار ۱۵۲۰ گز لمبا اور ۴۰ گز چوڑا تھا جس کے درمیان میں علی مردان کی نہر رواں تھی۔ جو چار فٹ چوڑی اور پانچ فٹ گہری تھی۔ دونوں جانب سرسبز و شاداب درخت لگے ہوئے تھے چاندنی چوک کے مکانات بلندی میں سب یکساں تھے اور دکانوں میں محراب دار دروازے اور رنگین سائبان تھے۔

چاندنی چوک کے شمال و جنوب میں دو دروازے تھے شمالی دروازے سے ایک راستہ شہر کے ایک نہایت آباد اور گنجان حصہ کو جاتا تھا۔ حوض کے اطراف کثرت سے پھل پھلاری ترکاری اور مٹھائی کی دکانیں تھیں۔ رفتہ رفتہ اس بازار کے گرد و پیش کے نام ختم ہو کر سارا بازار چاندنی چوک کہلانے لگا۔ اب نہ یہاں نہر ہے۔ اور

درخت بھی کاٹ دیئے گئے اور گھنٹہ گھر بھی گر گرا کر بے نشان ہو گیا ہے۔

باغ جہاں آرا بیگم

یہ باغ شاہ جہاں بیگم کی چہیتی صاحبزادی جہاں آرا بیگم نے ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۵۰ء میں بنوایا تھا۔
جو چاندنی چوک گھنٹہ گھر کے سامنے تھا۔ باغ کا طول ۹۷۰ گز اور عرض ۲۴۰ گز تھا
اس باغ کی چار دیواری تو اب نہیں رہی جس میں جابجا برج بنے ہوئے تھے ۱۸۵۷ء
کی جنگِ آزادی کی ناکامی اور انگریزوں کے دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد توڑ پھوڑ دیئے
گئے۔ یہ برج بیس اونچے اور تیرہ فٹ بلند چبوترے پر بنے ہوئے تھے شہر دہلی کی نہر
سارے باغ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس باغ میں عجیب و غریب مکانات، سیر گاہیں، بارہ
دریاں اور گھر بنے ہوئے تھے۔ ایک بارہ دری میں حیوانات رکھے جاتے تھے یہاں ایک
حوض تھا اس کے پاس ہی سنگِ مرمر کا حوض بھی تھا۔ اس میں وہی پتھر استعمال ہوا
تھا اس حوض میں فوارہ لگا ہوا تھا اس کے بیچ نہر رواں تھی۔ ایک طرف چھوٹا سا مکان
بنا ہوا تھا جس میں آنریری مجسٹریٹ کچہری کرتے تھے کسی زمانے میں اس مکان میں چڑیا
گھر تھا۔ اس باغ کے چھ دروازے تھے۔ ایک دروازہ فوارہ کی طرف تھا وہ منتقل کر کے
ہارڈنگ لائبریری کے سامنے لگایا تھا ۱۹۱۶ء میں اس باغ کا نام وکٹوریہ پارک
رکھا گیا۔ اب یہ اسی نام سے مشہور ہے۔

بہادر شاہ ظفر نے بھی اس باغ کی سیر سے لطف و سرور حاصل کیا تھا جس کا
ذکر خود ظفر کے روزنامچہ میں ہے۔

۲۵ مارچ ۱۸۴۸ء روز چہارشنبہ کو بادشاہ سلامت چاندنی چوک کے
باغ کے ملاحظہ کے لئے تشریف لے گئے۔ طرح طرح کے پھولوں کے معائنہ اور ٹھنڈی
ٹھنڈی ہواؤں کے اثرات حضورِ انور بہت بشاش ہوئے اور صاحب کلاں بہادر
سے فرمایا اس قدر قلیل مدت میں تم نے باغ کو اس طرح سرسبز و شاداب بنا دیا ورنہ

نمک حرام ٹھیکیداروں نے تو اس کا ستیاناس کر دیا تھا سوائے سوکھے ہوئے درختوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہماری حسن تدبیر قابل تعریف ہے کہ ان درختوں کی لکڑیاں جلانے قابل ہو گئی تھیں انھیں دوبارہ زندگی مل گئی (۴۹)۔"

سرائے جہاں آرا بیگم

یہ سرائے بھی شاہجہاں کی دختر جہاں آرا بیگم نے ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۵۰ء کو چاندنی چوک میں تعمیر کرائی۔ اس سرائے کے دو دروازے تھے۔ جنوب رُخ کا دروازہ بازار چاندنی چوک کے سامنے تھا۔ دوسرا شمال میں گویا باغ ہی کا دروازہ تھا۔ سرائے کے صحن میں دو بڑے کنویں اور ایک مسجد تھی۔ صحن کے چاروں طرف دو منزلہ بڑے بڑے کمرے تھے جن میں مسافر کثرت سے اُترتے تھے اور بکثیری والے سوداگر بھی دکانیں لگا کر سامان فروخت کیا کرتے تھے۔ برنیر نے اپنے سفرنامہ میں اس سرائے کا ذکر کیا ہے۔

"قابلِ ذکر عمارت وہ کارواں سرائے ہے جو شاہجہاں کی بڑی بیٹی بیگم صاحب نے بنوائی ہے۔ یہ بجائے پلیس رائے کی طرح ایک بڑی اور محراب دار عمارت ہے جس میں برابر کوٹھریاں اور ان کے آگے علیحدہ علیحدہ برانڈے ہیں اور یہ دو منزلی ہے اور جیسے علیحدہ علیحدہ کوٹھریاں اور برانڈے نیچے ہیں ویسے ہی اوپر کی منزل میں بھی ہیں۔ ایرانی تورانی اور پردیسی دولت مند تاجر حفاظت کی جگہ سمجھ کر اس میں آن کر ٹھہرتے ہیں کیونکہ رات کو اس کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ کاش پیرس میں بھی دس بیس جگہ ایسی عمارتیں ہوتیں تاکہ پردیسی آدمیوں کو وہاں پہنچتے ہی محفوظ اور معقول مکان کے حاصل کرنے میں اس قدر پریشانی نہ ہوتی جس قدر کہ اب ہوتی ہے۔ (۵۰)"

معلوم ہوتا ہے کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں یہ سرائے بھی بے دردی سے کام کر

بنی۔ اس کی پاداشن میں انگریزی حکمراں طبقے نے اس جنگِ آزادی کی ناکامی اور دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہونے کے بعد اس کو منہدم کرادیا۔ اور ستمبر میدان بنا دیا۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں اس سرائے کی جگہ پر دہلی انسٹی ٹیوٹ کی عمارت بنی ہوئی تھی۔

جہاں آرا بیگم

یہ بیگم سنہ ۱۰۲۳ھ کو پیدا ہوئی تو بڑی خوشی منائی گئی۔ اس کو قرآن کریم اور فقہ کی ابتدائی کتابیں پڑھانے کے بعد عربی شروع کرائی گئی۔ بلا کی ذہین تھی۔ ایک قلیل و مختصر سی مدت میں عربی اور تیز جملہ علوم متداولہ میں کامل دستگاہ حاصل کرلی۔ مذہب سے اس کا گہرا تعلق تھا۔ قرآن مجید و احادیث کے مطالعہ میں برابر مصروف رہتی تھی۔ شاہجہاں خود خدا پرست انسان تھا۔ اس لئے وہ بیٹی کے زہد و تقویٰ عبادت و ریاضت کو بہت پسند کرتا تھا۔

اگرچہ جہاں آرا ناز و نعم کی پلی ہوئی لاڈلی بیٹی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شاہزادی تھی جتنا غرور کرتی کم تھا۔ مگر اس میں غرور نام کو نہ تھا۔ ملنساری و انکساری اس کا خاص جوہر تھا۔ محل میں ادنیٰ اور اعلیٰ اس کے اچھے سلوک کی وجہ سے گرویدہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے تمام محل کے لوگوں کے دلوں کو مٹھی میں لے لیا تھا۔ جہاں آرا طرزِ معاشرت اور لباس میں سادگی کا خاص طور پر لحاظ رکھتی تھی۔ بڑے سے بڑے اہم اور پیچیدہ معاملات بہت جلد سمجھ لیتی تھی۔ شاہجہاں اہم ملکی معاملات اور مہمات میں اس سے مشورہ لیتا تھا جس کی یہ سفارش کر دیتی تھی شاہجہاں اس کی سفارش کو ٹالتا نہیں تھا اور جہاں کسی کی سفارش کام نہ آتی تھی وہاں جہاں آرا ہی کی سفارش کام آتی تھی۔

شاہجہاں شاہزادہ اورنگ زیب سے ایک مرتبہ ناراض ہوگئے۔ بالآخر لوگوں نے اس معاملہ میں شاہجہاں سے سفارش کی لیکن شاہجہاں نے ایک کی

بھی نہیں سنی۔ آخر شاہزادہ کی والدہ اور دیگر بیگمات نے جہاں آرا سے سفارش کرائی تو شاہجہاں نے نہ صرف یہ کہ اُسے معاف کیا بلکہ موردِ الطافِ شاہی بناکر منصب پنج ہزاری پر فائز کیا۔ اور دس ہزار سوار دے کر اس کی جاگیر میں بھیج دیا۔ یہ جہاں آرا کا اتنا بڑا احسان تھا کہ اورنگ زیب اسے کبھی نہیں بھولا اور شاہجہاں کے انتقال کے بعد بھی اسے اسی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتا رہا۔ اور ہر طرح اس کی دل جوئی کرتا رہا۔

محمد امین بندر سورت کے متصدی کے بارے میں شاہجہاں سے شکایت کی گئی کہ یہ شخص رعایا پر ظلم کرتا ہے اور رشوت لئے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ تحقیقات پر یہ الزام صحیح ثابت ہوئے تو حکم ہوا کہ اس ظالم و راشی کو گرفتار کر کے دربار میں حاضر کیا جائے۔ یہ جب شاہجہاں کے سامنے آیا تو اس نے حکم دیا کہ اس کو بچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی لیکن جب کوئی کامیابی نہیں ہوئی تو جہاں آرا تک رسائی حاصل کی اور اس سے ایک سفارشی خط حاصل کیا۔ شاہجہاں نے جب اس کو پڑھا تو اس کے قتل کے حکم کو منسوخ کر کے قید کا حکم دیا۔ جب جہاں آرا شاہجہاں کے سامنے آئی تو شاہجہاں نے اس سے کہا:-

"پیاری بیٹی! جس شخص کی تم نے سفارش کی ہے اس کی یہ حالت ہے کہ اس نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے رعیت پر اس قدر سختی کی ہے کہ غریب و مفلس رعایا نے پریشان و مجبور ہو کر اپنے کم سن بچوں کو نصرانیوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس کے تنور شکم کے لئے ایندھن مہیا کیا ہے۔ اول تو یہ سختی خدائے قدوس کو ناپسند ہے، مجھ سے اس کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ دوسرے بندرگاہ صورت ہفت اقلیم کے افراد کی آمد و رفت کا مرکز ہے۔ دور دراز کے ملکوں کے لوگ یہاں کی رعایا بدحالی کا معائنہ کریں گے تو لازم ہے کہ وہ اپنے ملک میں جاکر

اس کا ذکر کریں گے اس سے کس درجہ بدنامی ہوگی۔ رعیت بھی برباد، خدا کی ناخوشی اور حکومت کی بدنامی بھی۔ اس لئے اس موذی کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا دینا قرینِ مصلحت ہے اور خدائے قدوس کی خوشنودی بھی اسی میں ہے۔"

جہاں آرا بیگم کو جب ان حقائق کا پتہ چلا تو اس نے اپنی بے جا سفارش پر معذرت کی۔ جب اورنگ زیب نے شاہجہاں کو قلعۂ آگرہ میں نظربند کیا تو جہاں آرا نے محلوں کی زندگی کو خیرباد کہہ کر باپ کے ساتھ رہنا پسند کیا اور سات سال تک معذول باپ کے پاس رہی جب شاہجہاں کا انتقال ہو گیا تو دہلی آ گئی۔

جہاں آرا کو صوفیائے کرام سے بڑی عقیدت تھی وہ خاندانِ چشتیہ میں مُرید تھی۔ اس نے فارسی میں ایک کتاب "مونس الارواح" لکھی ہے جو کہ حضرت غریب نواز کی سوانح عمری ہے۔ اسی اعتقاد کی بنا پر اس نے اپنے دفن کے لئے درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء رح کے پیرزادگانِ درگاہ کو ایک رقم دے کر زمین کا ایک حصہ خریدا اور خود تمام خطیرہ سنگِ مرمر کا بنوایا۔ ۳ رمضان المبارک ۱۰۹۲ھ مطابق ۱۶۸۱ء کو دہلی میں فوت ہوئی اور اسی زمین میں دفن ہوئی چنانچہ یہ جگہ جہاں آرا کے نام سے مشہور ہے، اس کے مزار پر جو کتبہ لگا ہے اس پر یہ شعر کندہ ہے:

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا
کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

روشن آرا باغ

دہلی کے قدیم باغوں کے بارے میں ۱۸۵۷ء سے قبل کی تاریخیں دیکھی گئیں اور خصوصیت کے ساتھ آثار الصنادید مؤلفہ سر سید احمد خاں کا مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ دہلی کے قدیم باغات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اور سرسری گفتگو کے بھی قابل اعتبار نہیں سمجھا گیا۔ اسی بنا پر ان باغات کے تفصیلی حالات نہیں لکھے اور سر سید نے صاف طور پر یہ تحریر کر دیا:

"واضح ہو کہ بیرون کشمیری دروازہ شہر پناہ کے باغات مثل روشن آرا، وسر ہندی و تعلدار خاں اور شالامار کہ شاہجہانی باغ ہے باغات قدیم ہے اور باغ نواب حامد علی خاں اور باغ جناب مولانا صدر الدین خاں بہادر وغیرہ باغات جدید ہے ہیں لیکن چونکہ ان کے لکھنے میں بجز طوالت کے اور کچھ فائدہ نہ تھا اس واسطے فروگذاشت کیا گیا۔"

جب شاہجہاں نے دہلی کی بنیاد ڈالی اور اپنے امراء اور اعزا کو مختلف مقامات پر قطعات و آراضی آباد کرنے کے لئے دیے تو اپنی بیٹی روشن آرا کو بھی سبزی منڈی کے باہر ایک آراضی دی جس پر وہ ایک باغ بنائے۔ چنانچہ اس نے ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۵۰ء میں روشن آرا باغ بنوایا۔ باغ کی اب اصلی حالت تو باقی نہیں ہے جو شاہان مغلیہ کے زمانے میں تھی۔ اب تو صرف بڑے بڑے پرانے درخت کھڑے سر دھن رہے ہیں۔ باغ کے اندر چوڑی چوڑی سڑکیں نکال دی گئی ہیں۔ کرنل کریک رافٹ کمشنر دہلی نے پرانی عمارت کو گروا دیا تھا البتہ روشن آرا کا مجرا جو اس باغ میں ہے وہ کچھ اچھی حالت میں ہے۔

روشن آرا بیگم

روشن آرا بیگم شاہجہاں کی بیٹی اور عالمگیر کی بہن تھی۔ اس کی پاکیزہ عادات اور مستحسن خصائل کی بنا پر شاہجہاں اس سے محبت کرتا تھا۔ مورخین نے اس کے خصائل کی تعریف میں صفحات کے صفحات سیاہ کئے ہیں اور لکھا ہے کہ شرافت انسانی اور جود و سخا میں اس بیگم کو بہت شہرت حاصل تھی۔ برنیر لکھتا ہے کہ عالمگیر کی یہ بہن سیرت اور صورت و عقل و فراست میں اپنی بہن جہاں آرا سے کم نہ تھی لیکن سر ایڈورڈ سلیوان نے تحریر کیا ہے کہ روشن آرا بڑی خوش مزاج اور بلند حوصلہ تھی اور اپنی بہن سے کسی بات میں کم نہیں تھی۔

عالمگیر روشن آرا کا خیال رکھتا تھا اور موقع بہ موقع تحائف سے نوازا
کرتا تھا۔ سنہ ۱۶۵۸ء میں عالمگیر نے راجہ کرہ کی مہم پر روانہ ہونے سے پیشتر ایک جشن
کیا تھا اور امراء اور اعیانِ سلطنت کو خلعت فاخرہ اور انعامات تقسیم کیے گئے
جب روشن آرا اس کے سامنے آئی تو اسی وقت عالمگیر نے اسے دو ہزار اشرفیاں
پیش کیں۔ روشن آرا کو عالمگیر سے محبت تھی وہ اپنے باپ شاہجہاں پر بھی اس
کو فوقیت دیتی تھی۔

جب عالمگیر نے دارا شکوہ کو آگرہ سے ۹ میل کے فاصلہ سموگڑھ پر شکست دیکر
اور اپنے باپ شاہجہاں کو تخت سے اتار کر نظر بند کر دیا تو شاہجہاں کی ایک بیٹی
جہاں آرا باپ کی طرف ہو گئی اور دوسری بیٹی روشن آرا عالمگیر کی ہم نوا بنی اور
عالمگیر کا ساتھ دیا۔ یہ بیٹی عالمگیر کو شاہجہاں کے حضور میں جانے سے روکتی تھی۔ اسی
کے صلاح و مشورہ سے دارا شکوہ کا قتل کیا گیا۔

روشن آرا بیگم کا ۷ جمادی الاول سنہ ۱۰۸۲ھ مطابق ۱۶۷۱ء میں انتقال
ہوا۔ عالمگیر بہت متحمل اور مستقل مزاج فرمانروا تھا۔ روشن آرا کی موت
کی خبر سن کر بہت ضبط کئے بیٹھا رہا لیکن نعش پر نگاہ پڑتے ہی تجہیز و تکفین کے
بعد خیرات کے طور پر کثیر روپیہ خرچ کیا۔

مسجد نیچابی کٹرہ

یہ مسجد نیچابی کٹرہ میں کوڑیا پل کے پاس تھی۔
اس کو نواب اورنگ آبادی بیگم اہلیہ عالمگیر
بادشاہ نے بنوایا تھا۔ یہ مسجد سنگِ سرخ کی نہایت خوش وضع اور خوبصورت تھی۔
اس میں ایک نہایت پاکیزہ حوض تھا۔ اس مسجد کا صحن پہلے بہت وسیع تھا۔
لیکن لوگوں نے اپنے اپنے مکان بنا کر بہت سی زمین دبا لی لیکن پھر بھی دلی کی بہترین
مسجدوں میں شمار ہوتا تھا۔ یہ مسجد ریلوے میں آ گئی ہے اب اس کا نشان

تک باقی نہیں رہا۔ یہ مسجد اس جگہ تھی جہاں پرانی دلی کا بڑا ریلوے اسٹیشن ہے۔ مولوی بشیر الدین مؤلف واقعات دارالحکومت کے نانا اس مسجد کے امام تھے۔ ان کی زندگی تک گورنمنٹ سے پندرہ روپیہ ماہانہ پنشن امامی کی ملتی رہی۔ مگر عمارتِ مسجد کا کچھ معاوضہ نہ ملا اس لئے کہ وہ شاہی عمارت تھی۔ اس مسجد میں مولوی عبدالخالق اور مولوی نذیر حسین محدث دہلوی درس و تدریس فرماتے تھے جس میں دن رات قال اللہ وقال الرسول کا ذکر رہتا تھا۔

اورنگ آبادی محل

یہ بیگم نہایت بیدار مغز، ہوش مند اور ظاہری و باطنی فنون سے آراستہ تھی، اورنگ زیب کو اپنی اس چوتھی بیگم سے بہت محبت تھی اتنی کہ سفر و حضر میں اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا۔ گو کہ یہ ایک باخدا بادشاہ تھا اور شاہانہ عیش و عشرت سے اس کو ایک گونہ نفرت تھی لیکن اس کے باوجود اس بیگم کو دیکھے بغیر چین نہیں پڑتا تھا۔ بعض اوقات دن میں کئی کئی مرتبہ دیکھنے آتا تھا اور ذرا سی دیر کی جدائی بھی گوارا نہ تھی۔

اورنگ آبادی محل کے بطن سے مہر النساء بیگم پیدا ہوئی جو نہایت فہم و فراست کی مالک تھی اور بلا کی ذہین تھی۔ بہت جلد ضروری علوم سے فارغ ہو گئی تھی اورنگ زیب نے اس کی شادی مراد بخش کے بیٹے ایزد بخش سے کر دی تھی۔ مہر النساء گفتگو میں بڑی تیز تھی۔ کوئی اس کے سامنے ٹکتا نہیں تھا۔ بحث جب زیادہ پیچیدہ ہو جاتی تھی تو اورنگ زیب خود فیصلہ کرتا تھا۔

محل کے اندر مستورات کے بڑے بڑے اجتماع میں گھنٹہ گھنٹہ، ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ مسلسل تقریر کرتی رہتی تھی۔ ان تقریروں کا اثر یہ ہوا کہ بدعت رسوم محل میں رواج پا گئی تھیں۔ اس کا سدِ باب بڑی حد تک ہو گیا تھا اور تمام غیر شرعی رسمیں یک لخت دور ہو گئی تھیں۔ اورنگ آبادی محل بھی شرع کی بڑی پابند تھی۔ شرک و

بدعت کو پسند نہیں کرتی تھی خلاف شرع رسومات کو دور کرنے میں اس نے بھی حصہ
لیا۔ اسی نے پنجابی کٹڑہ کی مسجد تعمیر کرائی تھی۔

زینت المساجد دریا گنج میں گھاٹ کے پاس یہ مسجد زینت النساء بیگم دختر عالمگیر بادشاہ نے ۱۱۱۹ھ مطابق ۱۷۰۷ء
میں تعمیر کرائی تھی۔ یہ دل کش عمارت ہے جس کے لال لال مینارے دور سے دکھائی
دیتے ہیں اور مسجد کوسوں سے نظر آتی ہے اوّل تو کرسی بہت بلند ہے پھر دریا کی
طرف اس کے آگے اور کوئی عمارت نہیں تھی۔ اس مسجد نے خداداد حسن پایا تھا اور
مسجد کی فضا اور منبت کاری اور پچی کاری سازی کی بہار گرد سبزہ زار اور فصیل شہر
سے دریا کا ٹکراتے ہوئے بہنا اور موجوں کا بل کھانا عجب عالم دکھاتا تھا۔ سر سے
پاؤں تک سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے۔ تینوں برج سنگ سرخ کے ہیں اس میں
سنگ موسیٰ کی دھاریاں بنائی ہیں تاکہ نظر بد سے محفوظ رہے اور برجوں پر نہایت
خوش نما سنہرے کلس ہیں۔ اس مسجد کے سات در ہیں۔ بہت خوش نما بیچ
کا در بہت بڑا ہے اور ادھر ادھر کے چھوٹے ہیں۔ صحن کے بیچ میں ایک حوض ہے
اس مسجد کے پاس ایک کنواں تھا جس کا پانی حوض میں آیا کرتا تھا۔ اس مسجد میں
زینت النساء کا مزار تھا۔ اس کے مزار کے پاس ایک چھوٹا برج تبرکات کے لئے
بنایا گیا تھا۔ اس کے نیچے دو حجرے تھے ایک حجر سنگ یاسی کا تھا۔ دوسرا سنگ مرمر کا
تھا۔ قبر کے سرہانے آیہ کریمہ قل یا عبادی الذی اور یہ عبارت کندہ ہے

"مونس ما در لحد فضل خدا تنہا بس است
سایۂ از ابر رحمت قبر پوش ما بس است

امیدوار حسن خاتمہ فاطمہ زینت النساء بیگم بنت بادشاہ محی الدین محمد عالمگیر
غازی انار اللہ برہانہ ۱۱۲۲ھ"

جب دہلی میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ناکام ہوگئی اور انگریزوں کا دہلی پر قبضہ ہوگیا تو اس مسجد میں عرصہ تک توپ خانہ رہا۔ پھر برسوں تک اس میں گوروں کے میس کا گودام بھی رہا جس سے مسجد کی رہی سہی وقعت بھی جاتی رہی۔ زینت النساء بیگم کا مقبرہ بھی اسی زمانہ میں بہ اغراض فوجی ڈھایا گیا۔

۱۹۴۷ء کی آزادی کے بعد دہلی کی اوقاف پر جمیعۃ العلماء کے حضرات کا قبضہ ہوگیا تھا۔ اس نے دہلی کی مسجدوں اور قبرستانوں کی بے حرمتی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، ان کی غفلت اور بے توجہی کی وجہ سے اس مسجد کی اور بھی حالت خراب ہوگئی۔

زینت النساء بیگم

زینت النساء بیگم عالمگیر کی صاحبزادی تھیں وہ نہایت بے باک اور حق گو تھیں۔ جب ۱۸ ربیع الاول ۱۱۱۹ء کو جاجو کے مقام پر شہزادہ محمد اعظم اور محمد معظم کی جنگ ہوئی اور محمد اعظم مارا گیا تو فیروز میں ایک ماتم برپا ہوگیا۔ امیر الامراء، سعد اللہ نے اعظم شاہ کی سگی بہن زینت النساء بیگم کی خدمت میں لے آیا۔ زینت النساء بھائی کے ماتم کا لباس پہنے رہی اور آداب تہنیت جیسی بجا لائی۔ یہ امر بادشاہ کو ناگوار گزرا۔ اس کے باوجود اس کا سالیانہ مقرر کیا اور دہلی روانہ کر دیا۔

زینت النساء بیگم کا بھتیجا جہاندار شاہ تھا۔ اس کے عہد میں فسق و فجور نے زور پکڑا۔ قوالیں، ڈوم ڈھاڑیوں کے ٹھٹے اور راگ کا بازار گرم ہوا۔ ایک کسبی لال کنور تھی جہاندار شاہ اس کے عشق میں دیوانہ تھا۔ اس کو امتیاز محل کا خطاب عطا کیا۔ لال کنور تھی۔ جہاندار شاہ اس کے عشق میں دیوانہ تھا۔ اس کو امتیاز محل کا خطاب عطا کیا۔ لال کنور کے سگے بھائی خوش حال خاں کو صوبہ داری اکبر آباد اور منصب پنج ہزاری سہ ہزاری سوار مرحمت ہوا۔ اور اس کے چچیرے بھائی کو بھی منصب عطا کیا گیا۔ زینت النساء بیگم نے اپنے بھتیجے کی ضیافت کی۔ جہاندار کو تو بلایا مگر "لال کنور" کو شریک

نہ کیا بلکہ اس کے آنے کی ممانعت کر دی۔ جہاندار کو بہت بُرا لگا لیکن اس نے اس کی چنداں پرواہ نہیں کی۔ زینت النساء بیگم ۲۷ رجب ۱۱۳۳ھ کو اسّی سال کی عمر میں فوت ہوئی۔

قدسیہ باغ

یہ باغ کشمیری دروازے سے باہر ۱۱۶۱ھ میں نواب قدسیہ بیگم اہلیہ محمد شاہ بادشاہ نے بنوایا تھا۔ باغ کے تین دروازے تھے۔ صدر دروازہ مغرب کی طرف تھا۔ اس کے علاوہ اور دو دروازے تھے ایک احاطے کی شمالی دیوار میں بارہ دری کے پاس دوسرا مغربی کونے میں تھا جن کا اب نام و نشان نہیں باغ کے جنوب و مشرق کے کونے میں ایک مسجد تھی۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے ایام میں اس پر توپوں کے گولے اس کثرت سے برسے کہ اس کا وجود باقی نہیں رہا۔ یہ مسجد نہایت خوش وضع اور شاندار از سر تا پا سنگِ سرخ کی بنی ہوئی تھی۔ تمام صحن میں پختہ فرش تھا۔ در و دیوار میں عمدہ پچیکاری کا کام تھا جس میں نہایت دیدہ زیب بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ اس کی تعمیر میں زرِ کثیر صرف ہوا تھا۔ صحن کے وسط میں ایک حوض بھی تھا۔ جس کی ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۸۳۳ء میں بہادر شاہ ظفر نے مرمت کرائی تھی۔ اس عمارت کی شمالی دیوار میں سنگِ مرمر پر یہ کتبہ تھا ؂

"ہوالمشتاق" سال ترمیم ایں بنائے قدیم

اے ظفر جد وجہد اجرِ عظیم

شاہِ مرداں یا علی گنج

کربلا کے احاطے سے آگے ایک بہت بڑا فصیل نما احاطہ دکھائی دیتا ہے جو شاہِ مرداں یا علی گنج کے نام سے مشہور ہے۔ نواب قدسیہ بیگم نے ۱۱۳۷ھ مطابق ۱۷۳۲ء میں بنوایا تھا۔ قدسیہ بیگم شیعہ مذہب تھیں ۱۱۳۷ھ مطابق ۱۷۲۴ء میں قدسیہ بیگم

کے پاس ایک ایسا پتھر آیا جس پر حضرت علی کرم اللہ وجہ کے قدم مبارک کا نقش تھا۔ قدسیہ بیگم نے اس نقشِ قدم کو ایک سنگِ مرمر کے حوض میں نصب کرایا۔ اسی وجہ سے اس جگہ کو علی گنج یا شاہِ مرداں کہتے ہیں۔ نواب قدسیہ بیگم نے ۱۱۶۲ھ کو جاوید خاں خواجہ سرا کے اہتمام میں چار دیواری، مجلس خانہ مسجد اور حوض بھی بنوائے تھے۔ اور علی گنج کا شمالی دروازہ تعمیر کرایا تھا۔ یہ دروازہ کنگورا ملا کر ۳۰ فٹ اُونچا اور ساڑھے چودہ فٹ چوکیوں دار تھا۔ یہ دروازہ دہرا تھا۔ آگے پیچھے دروازہ۔ بیچ میں گنبد دار چھت تھی۔ ڈیوڑھی میں دونوں طرف دو منزلہ سہ دریاں تھیں۔ ابھی تک اس کے قدیم چوبی کیواڑوں کی نشانیاں موجود ہیں۔ اس کی پیشانی پر سنگِ مرمر کی تختی پر یہ کتبہ لگا ہوا تھا۔

"قال محمدؐ حبیب اللہ وانا مدینۃ العلم و علیؓ بابہا ۱۱۶۲ھ در عہد مبارک احمد شاہ بہادر بادشاہ غازی بموجب ارشاد نواب قدسیہ حضرت صاحبہ زمانیہ با ہتمام نواب بہادر جاوید خاں صاحب بہ سر راہی خاکسار لطف علی خاں تعمیر قلعہ و مجلس خانہ و مسجد و حوض در یک سن کمر تب شد۔"

سُنہری مسجد

لال قلعہ کے قریب یہ سنہری مسجد نواب قدسیہ بیگم نے ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۱ء میں تعمیر کرائی۔ یہ مسجد سر سے پاؤں تک سنگ باسی کی بنی ہوئی ہے۔ دو مینار بھی سنگ باسی کے بنے ہوئے ہیں۔ اس مسجد میں بے پناہ تغیر و تبدل ہو گیا ہے شرقی دروازے کے اوپر اُدھر ایک ایک مینار بھی تھا جو جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے تڑوا دیا تھا۔ اس مسجد کا منبر جہاں تھا اس کا کچھ نشان رہ گیا منبر ندارد ہے۔ یہ مسجد فوجی حدود میں تھی۔ انگریزوں نے اس میں اذان دینا منع کر دیا تھا۔

اس مسجد کے بائیں طرف ایک کاٹھ کا دالان بنا ہوا تھا۔ اس میں تبرکات رکھے ہوئے تھے ہر برس ان کی زیارت ہوتی تھی اور دائیں طرف بہت خوبصورت حوض تھا جس میں فوارہ لگا ہوا تھا۔ اس حوض میں نہر کی موج سے پانی آتا تھا تبرکات خدا جانے کہاں چلے گئے حوض کا نشان ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملتا۔ دروازے کی پیشانی پر سنگِ مرمر کی پانچ تختیاں لگی ہوئی تھیں جن پر سنگِ موسیٰ کی پچیکاری سے یہ اشعار کندہ تھے ؎

شکرِ حق در عہدِ احمد شاہ غازی بادشاہ

خلق پرور دادگر شاہانِ عالم را پناہ

مسجدے کردہ بنا نواب قدسی جاہ و جاہ

باد دایم فیض عام آں ملائک سجدہ گاہ

سعی نواب بہادر صاحب لطف و کرم

ساخت تعمیر چنیں جاوید عالی دستگاہ

چاہ و حوض صاف صحنش آبروئے زندگیست ‍ ‍ ‍ ‍ ہر کہ از پیشِ طہارت کرد شد پاک از گناہ

سال تاریخش بہ حرم یافت از الہام غیب ‍ ‍ ‍ ‍ مسجد بیت مقدس مطلع نور اللہ

نواب قدسیہ بیگم

اس بیگم کا اصل نام ادھم بائی تھا جو محمد شاہ کی بیوی تھیں۔ احمد شاہ کے عہد میں اوّل نواب بائی اور پھر قدسیہ صاحب الزمانی کا خطاب ملا۔ ابتدا میں دقیقہ سنج ادرہوش مند خاتون تھی لیکن محمد شاہ کی عیاشیوں اور بدمستیوں نے اس کی عادات و خصائل کو بھی تباہ کر دیا۔ اور یہ شب و روز مے میناء کے نشے میں مست رہنے لگی اور اس کے ذہن کی ساری جودت فہم و ذکا کی تمام خوبیاں برباد ہو کر رہ گئیں۔

یہ زمانہ حقیقتاً سلطنتِ مغلیہ کے زوال کا زمانہ تھا۔ پہلے اسے مرہٹوں نے نقصان پہنچایا پھر نادر شاہ نے لوٹ مچائی اور قتل و غارتگری کا بازار گرم کیا۔ اسّی کروڑ روپے لوٹ کر لے گیا۔ محمد شاہ کو کباب و شراب کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ قدسیہ بیگم جس قدر لاثانی حسن کی مالک تھی اسی طرح اس کی طبیعت بھی موزوں تھی۔ فارسی کے علاوہ اُردو زبان میں بھی شعر کہتی تھی۔ اس کا تخلص بیگانی تھا۔ اس کا یہ شعر بہت مشہور ہوا اور زبان زد عوام تھا ؎

ہم جانتے تھے آنکھ لگی دل کو سُکھ ہوا
کم بخت کیسی آنکھ لگی اور دُکھ ہوا

نواب قدسیہ بیگم کی یادگار قدسیہ باغ اور شاہِ مرداں ہے جو آج تک کسی نہ کسی صورت میں قائم اور باقی ہیں۔

(صابرہ خاتون)

دہلی کی قدیم سرائیں

دہلی میں راجوں مہاراجوں اور بادشاہوں نے مسافروں کی سہولت و آرام اور ٹھہرنے کے لیے سرائیں نہ بنوائی ہوں یہ بات تو ناممکن ہے۔ ہر دور میں دہلی میں سرائیں تعمیر ہوئیں۔

کالو کی سرائے

چنانچہ خان جہاں فیروز شاہی کے عہد میں سنہ ۷۹۹ھ مطابق سنہ ۱۳۷۷ء قدیم دہلی بیگم پور میں کالو کی سرائے تھی جس کے قریب کالو سرائے کی مسجد تعمیر ہوئی۔

سرائے مغلیہ

اسی طرح پرانے قلعے کے جنوب میں ایک بڑا فصیل نما کنگورے دار احاطہ جو دکھائی دیتا ہے وہ عظیم گنج کے نام سے مشہور ہے۔ اور سرکاری کاغذات میں سرائے مغلیہ کے نام سے درج ہے لیکن اس کی تعمیر کی تاریخ تحریر نہیں ہے۔

یہ عمارت قلعہ نما بہت پختہ اور پرانی ساخت و طرز کی ہے جس کی فصیل کی بلندی کنگورا چھوڑ کر ۲۱ فٹ ہے۔ اور ساڑھے سات فٹ کنگورے کو ملالیں تو ساڑھے اٹھائیس فٹ ہوتی ہے۔ دراصل یہ عہد مغلیہ کی قدیم بہت بڑی آباد سرائے تھی۔ سرائے اتنی بڑی اور اتنی وسیع تھی کہ اس کے چار عالی شان دروازے چاروں سمت میں تھے جس میں صدر دروازہ پہچان کی

طرف ہے یہ دروازہ شان و عام پر درست حالت میں ہے، جنوب کا دروازہ گر گیا اور شمال کا آدھا گرا ہے۔ اب لے دے کے ایک دروازہ مشرق کا رہ گیا ہے وہ بھی گرا پڑا ہے اسی میں سے آمد و رفت ہے، چاروں کونوں پر چار نصف دائرے کی شکل کے حجرے ہیں باقی ہر طرف وسیع مستحکم اور پختہ چونے اور پتھر کی شناخت کے حجرے ہیں، یہ سرائے اندر سے ۲۰۴ فٹ مربع ہے، درمیان میں ایک مسجد تھی جو بالکل منہدم ہو گئی ہے۔ اس کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ قدیم زمانے کی سراؤں کے درمیان ایک مسجد ہوا کرتی تھی۔ چاروں دروازوں کی بغل میں دونوں طرف اوپر چڑھنے کی سیڑھیاں ہیں۔ اس کے گرد ایک سو دس کوٹھڑیاں تھیں، ۲۳ فٹ مربع تھیں۔ کوٹھڑیوں کی چھت پر سے کنگورے کی اونچان ساڑھے سات فٹ تھی بشیر الدین صاحب اپنی مشہور تصنیف "واقعات دار الحکومت دہلی" میں لکھتے ہیں:-

"اب اس کے بعض حجروں میں غریب لوگ مزدور پیشہ اپنے بچوں کے رہتے ہیں۔

شیخ فرید کی سرائے

جہانگیر کے دور ۱۰۱۰ھ مطابق ۱۶۰۱ء فیروز شاہ کوٹلے کے سامنے شیخ فرید الدین بخاری نے ایک سرائے تعمیر کرائی تھی۔ پرانی دہلی کے ساتھ یہ سرائے بھی ویران ہو گئی یہاں تک کہ عالمگیر ثانی اور شاہ عالم ہی کے وقت میں بالکل ویران ہو گئی تھی انگریزوں کو جیل کے لئے اس سے بہتر اور موزوں عمارت نہ ملی۔ اس سرائے کی مرمت کرا کے جیل کے قابل بنا دیا ۱۹۱۹ء تک اس سرائے کا دروازہ بہت بلند اور عالی شان تھا۔ اس پر ایسے معقول مکان بنے ہوئے تھے کہ جیل کا داروغہ اس میں بفراغت رہتا تھا۔ یہ جیل آزادی ۱۹۴۷ء کے چند سالوں کے بعد منہدم کر دی گئی۔ جس کی جگہ آزاد میڈیکل کالج تعمیر کیا گیا ہے۔

شیخ فرید الدین بخاری ابن سید احمد بخاری اوائل عمر میں اکبر بادشاہ کی ملازمت میں میر بخشی کے عہدے پر سرفراز ہوئے اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر کے جاں نثار دل میں رہے۔ آپ ہی نے شہزادہ خسرو کو دریائے بیاس کے کنارے شکست دی تھی اور اس کے صلہ میں مرتضیٰ خاں کا خطاب ملا اور گجرات کے صوبہ دار مقرر ہوئے اس کے بعد پنجاب کے صوبہ دار بنائے گئے۔

شیر شاہ سوری کے بیٹے سلیم شاہ نے سلیم گڑھ ۹۵۳ھ مطابق ۱۵۴۶ء میں تعمیر کرایا۔ یہ قلعہ نصف دائرہ کی شکل کا بنا ہوا تھا۔ اور ایک زمانہ میں اس میں مختلف جسامت کے اُنیس برج تھے اس کی تعمیر میں چار لاکھ روپے صرف ہوئے۔ اور ۵ سال کے عرصہ میں صرف اس کی فصیل تیار ہوئی تھی کہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا اور قلعہ کی تعمیر رہ گئی۔

اسی برس کے بعد شیخ فرید الدین بخاری کو یہ قلعہ بطور جاگیر عطا کیا گیا اس نے اس قلعہ میں بہت سے مکانات تعمیر کرائے ۱۸۲۶ء تک یہ تمام عمارات گر کر کھنڈر ہو گئی تھی۔

شیخ فرید الدین نے فرید آباد بھی بسایا تھا۔ ان کا پاک پٹن شریف میں جلوس سنہ جہانگیری ۲۵ سنہ مطابق ۱۹۱۵ء میں انتقال ہوا بیگم پور میں مدفون ہوئے۔ قبر کے سرہانے پندرہ سطر کا یہ کتبہ لگا ہوا تھا جس کے آخر میں یہ تاریخی قطعہ درج ہے ؎

"مرتضیٰ خاں جو بحق واصل شد
گشت اقلیم بقا مفتوحش
باد بر نور الٰہی روحش"

یہ روایت مشہور ہے کہ لوح مزار کا پتھر اچھا اور خوبصورت دیکھ کر اکھاڑ کر لے گیا۔ جس نے اُسے اپنی حویلی میں لگانا چاہا، رات کو دست لگے اور مر گیا۔ صبح ہی پتھر جوں کا

توں لاکر نصب کر دیا۔

سرائے جہاں آرا بیگم

شاہ جہاں کے دورِ حکومت میں شاہجہاں کی بڑی بیٹی جہاں آرا بیگم نے چاندنی چوک دہلی میں ایک سرائے ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۵۰ء میں بنوائی۔ طول و عرض میں ۱۸۶ گز تھی جس میں نوے حجرے اور چار برجیاں تھیں حجروں کے آگے ایوان او ایوانوں کے آگے چبوترے تھے۔ اس کے دُو دروازے تھے؛ ایک دروازہ بازار کی طرف اور دوسرا دروازہ باغ کی جانب تھا جس کا نام صاحب آباد تھا۔ اس کے کمرے دو منزلہ تھے۔ اور اس میں ایک مسجد تھی۔ اس سرائے میں مسافر کثرت سے آتے جاتے اور پھیری والے سوداگر بھی دوکانیں لگاکر مال فروخت کیا کرتے تھے۔ برنیئر اپنے سفرنامہ میں اس کے بارے میں لکھتا ہے۔

"شاہجہاں کی بڑی بیٹی معروف بیگم نے یہ سرائے بنوائی تھی۔ یہ پیلیس رائل کی طرح ایک بڑی اور محراب دار مربع عمارت ہے جس میں برابر کوٹھریاں اور ان کے علیحدہ علیحدہ برانڈے ہیں اور یہ دو منزلی ہے جیسے علیحدہ علیحدہ کوٹھریاں اور برانڈے نیچے ہیں۔ ویسے ہی اوپر کی منزل میں بھی ہیں۔ ایرانی تورانی اور دولتمند پردیسی تاجر، حفاظت کی جگہ سمجھ کر اس میں آکر ٹھہرتے ہیں کیونکہ رات کو اس کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ کاش پیرس میں بھی دس بیس جگہ ایسی عمارتیں ہوتیں تاکہ پردیسی آدمیوں کو وہاں پہنچتے ہی محفوظ و معقول مکان کے حاصل کرنے میں اس قدر حیرانی نہ ہوتی جس قدر کہ اب ہوتی ہے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کو یہ سرائے دہلی میں تھی لیکن جنگ کی ناکامی کے بعد انگریزی حکومت نے اس کو منہدم کرا دیا۔ ۱۹۱۹ء میں سرائے کی جگہ دہلی انسٹی ٹیوٹ کی عمارت بنی ہوئی تھی۔ جہاں آرا ممتاز محل کی سب سے بڑی بیٹی تھی جو ۱۰۲۳ھ مطابق ۱۶۱۴ء کو پیدا ہوئی۔ اس وقت شاہجہاں نے

شاہزادگی کے عالم میں چتوڑ فتح کرنے گیا تھا۔ اس تقریب پر اس کے دادا جہانگیر نے بہت خوشی منائی۔ ہوش سنبھالنے پر جہاں آرا کو مذہبی تعلیم دی گئی۔ اس نے فارسی و عربی کی دستگاہ حاصل کی، یہ شاہزادی اپنے باپ کو بہت عزیز تھی۔ شاہزادی ہوتے ہوئے اس کو غرور نام کو نہ تھا، ملنساری، انکساری کی وجہ سے ادنیٰ اور اعلیٰ سب اس کے اخلاق پر گرویدہ اور ثناخواں تھے، چھوٹے بڑے سب اس کی راہ میں آنکھوں کا فرش بچھاتے، یہ شاہزادی فیاض، مہمان نواز اور بُردبار تھی۔ طرز اور لباس میں سادگی کا خاص طور پر لحاظ رکھتی تھی۔ جہاں آرا اس قدر غالب التر آئے تھی کہ اس فہم و فراست کی عورتیں اس ملک میں کم مذہب کی سخت پابند تھیں۔ قرآن شریف کی تلاوت اور حدیث کا مطالعہ کبھی ناغہ نہ ہوتا۔ خدا ترسی اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ انشا پردازی اور شعر گوئی کا بھی ذوق تھا۔ زیادہ تر فارسی اور کبھی کبھی عربی میں بھی طبع آزمائی کرتی تھی۔ اس کا فارسی کلام فصاحت اور سلاست کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کا زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ ایک روز شاہزادی باغ کی سیر کو گئی۔ میر صدی طہرانی لب بام کھڑا تھا۔ اس نے بلند آواز سے اپنا یہ مطلع پڑھا ؎

برقعہ برخ افگندہ برد ناز بباغش
تا نکہت گل بیختہ آید بدماغش

شہزادی سُن کر مسرور ہوئی اور پانچ سو روپے انعام دیئے۔

شاہجہاں کو عالمگیر نے جب کنج عزلت میں بٹھا دیا تو جہاں آرا نے اپنی بہن روشن آرا کے خلاف دنیاوی جاہ و ثروت کو لات مار کر اپنے بوڑھے باپ کا ساتھ دیا اور اس کی خدمت گزاری سے سعادت دارین حاصل کی۔ جہاں آرا کو صوفیائے کرام سے بڑی عقیدت تھی۔ خاندانِ چشتیہ میں مرید تھی۔ اس نے فارسی میں ایک کتاب "مونس الارواح" لکھی جو کہ حضرت غریب نواز کی لاجواب سوانحِ عمری

ہے۔ جہاں آرا بیگم نے دہلی میں ۳ رمضان المبارک ۱۰۹۲ھ مطابق ۱۶۸۱ء میں انتقال کیا۔ درگاہ حضرت سلطان المشائخ میں آرام فرما ہیں۔ اس کے اوپر ایک خوش خط کتبہ لگا ہوا ہے۔ اس میں اس کا یہ شعر درج ہے ؎

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا
کہ قبر پوش غریبان ہمیں گیاہ بس است

سرائے خاص محل

پرانے قلعہ کے جنوب رخ پر کوئی دو سو گز کے فاصلے پر سرائے خاص محل ۱۰۵۲ھ مطابق ۱۶۴۲ء کو شاہجہاں بادشاہ کے عہد میں شاہجہاں کے کوکا اور فوجی سردار زین خاں نے اپنی بیٹی خاص محل کے لیے بنوائی تھی۔ سوائے حجروں اور ایک دروازے کے اس سرائے کا نام و نشان اب باقی نہیں ہے۔ صرف ایک ٹوٹا پھوٹا دروازہ مغرب کی طرف تھا۔ بقول سرسید احمد خاں جس پر حسب ذیل کتبہ لگا ہوا تھا ؎

بدور شاہجہاں صاحب قران ثانی
کہ در جہانست جہاں پرور سپہر جناب
بنا نہاد ہمیں زمانہ خاص محل
دریں زمیں کہ مہتت زین خاں در باب
ہمیشہ باد بزیر سپہر بوقلموں
تبی ضمیر منیرش پے صلاح و صواب
اگر انسان بنا لیس شود سوال ترا
حساب تیغ سرائے محل خاص جواب

۱۰۵۲ھ

اس عمارت کو اچھن مچھن کی سرائے بھی بتلایا جاتا ہے۔ جو دو بھائی تھے۔ اس

عالی شان اور وسیع عمارت کی موجودہ حالت یہ ہے کہ پرانے قلعے اور اس عمارت کے
درمیان اب کوئی اور عمارت باقی نہیں رہی، سارا میدان صاف ہے۔ البتہ یہاں سے
وہاں تک جا بجا قبروں اور گری پڑی عمارتوں کے ملبے کے نشانات ہیں جس سے معلوم
ہوتا ہے کہ یہ ٹکڑا خالی نہ تھا بلکہ عمارتوں سے پٹا ہوا تھا۔ صاحب واقعات دارالحکومت
نے اس سرائے کا نقشہ کھینچا ہے جو ان کے زمانے میں تھی، اس مکان کے شرقی رخ
کی دیوار جس میں صدر دروازہ ہے چونے پتھر کی کھڑی ہے جس میں چھ حجروں کی دوہری
قطار ہے یعنی آگے پیچھے ایک حجرے کا رخ اندر وار ہے دوسرے کا باہر دونوں کی
چھت کی دیوار ملی ہوئی ہے اور یہ حجرے دو منزلہ ہیں یعنی اوپر بھی ایسی ہی دوہری قطار
ہے بس ایک رنگ میں اوپر نیچے کے حجرے ملا کر ۲۴ ہوئے اور اسی طرح صدر دروازے
کے دونوں طرف چھ چھ حجروں کی قطار باقی ہے اور یہ سلسلہ دور تک دونوں طرف
چلا گیا ہے۔ اس کے محاذ میں بیچ کافی جگہ چھوڑ کر سرائے کی اصلی عمارت کے کھنڈر
ہیں جس میں اب تیرہ حجرے موجود ہیں۔ یہ بھی دو منزلہ تھے، چنانچہ اب بھی دو حجرے
دو منزلہ کھڑے ہیں باقی کی بالائی منزل گر گئی۔ یہ سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ اس طرح
چاروں طرف حجروں کی قطاریں تھیں جو اب باقی نہیں مگر نشان ضرور ہیں۔ حجروں کی پہلی
منزل ۱۴ فٹ ہے۔ یہ سارے حجرے لداؤ کے تھے جن کی چھتیں گنبد وار ہیں۔ اس کا
صدر دروازہ شرق کی طرف اب موجود ہے۔ قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح کے
چاروں دروازے ہوں گے۔ صدر دروازے کی نوعیت یہ ہے کہ ۱۴ فٹ چوڑا اور
یہ ۲۶ فٹ بلند ہے۔ جس کے ادھر ادھر دوہرے حجروں کی قطاروں کا سلسلہ چلا گیا ہے
یہ دروازہ ۳۶ فٹ گہرا ہے، دروازے کے دونوں رخوں پر چینی کا کام تھا جس کا بہت
تھوڑا حصہ کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ چنانچہ دروازے کی محراب کے اندر باہر اوپر دار کو
دو طرفہ طغریٰ کلمۂ طیبہ کا ہے۔ دروازہ دوہرا لداؤ کا ہے۔ اس پر کتبہ ضرور تھا مگر اب

نہیں ہے اور جس جگہ تھا وہ جگہ بھی دروازہ کی پیشانی پر موجود ہے۔ (۲۵۴)۔

سرائے بنگش یہ سرائے مسجد فتحپوری کے قریب تھی۔ عہدِ محمد شاہ میں اس کی تعمیر ہوئی تھی۔ رابعہ بیگم محل خاص نواب محمد خاں غضنفر جنگ بنگش کو عمارات کا شوق تھا۔ چنانچہ نواب فیض اللہ خاں کے اہتمام اور نگرانی میں بیگم صاحبہ نے کئی ایک سرائیں، مسجدیں، پُل اور محلات وغیرہ بنوائے تھے جس میں ایک سرائے یہ بھی تھی۔ اب اس سرائے کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں لالہ رائے داس کے قبضہ میں تھی۔ اس میں مختلف قسم کی دوکانیں ہیں اس کا دروازہ جو اب سڑک بازار کھاری باؤلی میں تھا بجست عالیشان تھا جو بجائے خود ایک عمارت کے تھا جس کے آگے ہشت پہل صحن تھا۔

نواب فیض اللہ خاں بنگش کے خاندان والے سب سے پہلے ہندوستان میں شاہ عالم اوّل کے زمانے میں آئے اُن لوگوں کا عروج محمد شاہ کے عہد میں ہوا۔ نواب محمد غضنفر جنگ بنگش فرخ آباد، آگرہ اور الہ آباد کے صوبہ دار تھے جو مقرر ہوئے اور یہ وہی علاقہ ہے جس پر آگے چل کر ان ہی کے صاحبزادے نواب احمد خاں غالب جنگ خود مختارانہ حکومت کرنے لگے۔

فیض خاں بنگش، نیک نام خاں بنگش کے صاحبزادے تھے جو محمد خاں کی سرکار میں سب سے بڑے پایہ کے آدمی تھے۔ آپ میر عمارت تھے محمد خاں کی وفات کے بعد بیگم صاحبہ ہی مالک و مختار بن گئیں۔ اور کل کاروبار فیض اللہ خاں بنگش کے سپرد ہو گیا اور فیض اللہ خاں ہی دربار شاہی میں بیگم صاحبہ کی طرف سے وکیل تھے۔ بازار سوئیوالان میں جو بنگش کا کمرہ ہے وہ بھی فیض اللہ خاں بنگش نے ایک بڑی رقم خرچ کر کے بنوایا تھا جو ان کی یادگار باقی ہے۔

مردہ اکرام کی سرائے لاہوری دروازہ کی مسجد سرہندی کے قریب

یہ سرائے ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں تعمیر ہوئی، اس سرائے کی تاریخ جو اس کے دروازہ پر کندہ تھی اس کا مادہ یہ تھا ع

امشب کر کے کس برائے اکرام

یہ سرائے ایسی آباد تھی کہ ہجوم خلائق کی کثرت، آمد و رفت کی وجہ سے تل دھرنے کی جگہ نہیں ملتی تھی۔ اور اس سرائے کے دروازے کے باہر شام کو سودا بیچنے والوں کا ہجوم کثرت کے ساتھ ہوتا تھا جو بڑا بازار معلوم ہوتا تھا اور وہاں انواع و اقسام کی چیزیں ملتی تھیں اور خریداروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے لیکن اب اس سرائے کا اس بازار میں کوئی وجود نہیں۔ (۵۰۵)۔

مور سرائے

موری دروازے کے علاقہ میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل یہاں کاغذی محلہ تھا۔ ۱۸۶۱-۶۲ء میں ہملٹن صاحب کمشنر نے ایک لاکھ پانچسو ستر روپیہ خرچ کر کے یہ سرائے بنوائی تھی۔ ابتدا میں اس کا نام ہملٹن سرائے مشہور ہوئی۔ اس کے بعد مور صاحب انجینئر نے اس کی برجی پر مور کی تصویر لگائی جس کی وجہ سے لوگوں نے مور کی سرائے کہنا شروع کر دیا۔ ۱۸۹۱ء میں دہلی میونسپل کمیٹی نے ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ میں ایسٹ انڈیا ریلوے کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس میں ریلوے کے ملازمین رہتے ہیں۔ عمارت بہت وسیع اور پختہ تھی۔ اس بازار میں تین اور سرائیں تھیں۔ عثمن کی چھوٹی سرائے، توپ خانے کی سرائے اور برف خانے کی سرائے تھی۔ ان تینوں سراؤں کے بارے میں فی الحال معلومات حاصل نہیں ہوئی۔

سرائے احمد پائی

یہ سرائے شیخ احمد پائی پنجابی نے ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۵ء دہلی ریلوے اسٹیشن کے پاس تعمیر کرائی تھی۔ اس کا صدر دروازہ ملکہ وکٹوریہ کے باغ کے غربی دروازے کے سامنے تھا جو ۲ فٹ عمیق اور گیارہ فٹ عریض بہت بلند اور عالی شان تھا جس کے اوپر

کمرہ ہے اور دروازہ کے دونوں جانب ایک سہ درا ہے۔ صدر دروازہ کی پیشانی پر ایک سنگِ مرمر کی تختی پر صرف "سرائے شیخ احمد پائے" کندہ ہے۔ دونوں سہ دریوں شمالی صحن چی اور جنوبی صحن چی پر یہ اشعار لکھے ہوئے تھے

سرائے شیخ احمد پائی ازبس

اعوذ بکلمات اللہ تامۃ من

اگر تاریخ تعمیرش بپرسی

خجستہ بر بنا شد بہجت آباد

کل شیطان لامۃ غیر لامۃ

تبفرزند سرائے جاں فزا باد

جب یہ عمارت دلکشا بن چکی

اعوذ بکلمات اللہ التامۃ من

سال یوں لکھ از سر جان خرد

یا حق اسد م طرح پر مجھ سے کہا

کل شیطان الحاسۃ و من لامۃ

احمد پائی کی ہے یہ سرا

۱۳۰۲ھ

سرائے کے اندر مغرب میں دس کوٹھریاں نیچے اور اسی قدر اوپر ہیں۔ سامنے برآمدہ ۷۰ ۔ ۷ فٹ ہے جس کی دونوں جانب شمال جنوب میں چھ چھ کوٹھریاں دو منزلہ تھیں۔ ان کے سامنے بھی ۳۵ فٹ اور ۷ فٹ کا برآمدہ تھا۔ صحن ۱۰۰ ۔ ۱۰۰ فٹ تھا، صدر دروازے کے دائیں طرف لب سڑک پانچ دوکانیں اور اوپر کمرہ ہے، سرائے سے لگی ہوئی ایک مسجد ہے جو احمد پائی کی مسجد کہلاتی ہے۔ اس کے کنوئیں پر سنگ

کی تختی پر یہ کتبہ ہے :-

مسجد و چاہ موقوفہ شیخ احمدؐ پانی۔

۱۲۳۰ھ

یہ مسجد سرائے کے ساتھ بنی تھی۔ ۱۹۱۹ء میں اس سرائے و مسجد کے متولی شیخ حاجی محمدؐ یعقوب سوداگر خلف شیخ احمد پانی مرحوم تھے۔ (۳۵۰)

پھوس کی سرائے

تیس ہزاری میدان کے پاس سینٹ، اسٹیفنز زنانہ ہسپتال کے قریب یہ سرائے تھی جس کا اب کوئی نشان نہیں ہے، کب تعمیر ہوئی، یہ بھی نہ معلوم ہوسکا البتہ یہ سرائے کسی زمانے میں بہت بڑی رہی ہوگی یہاں اب متفرق کٹڑے بن گئے ہیں۔ ایک چھوٹی مسجد جو قدیمی مسجد ہے یہ پہلے سرائے سے متعلق تھی مسجد کے باہر ایک بڑا اور پختہ کنواں بھی تھا۔

دہلی کی بہت سی سرائیں ایسی بھی ہیں جن کے نام مشہور ہیں لیکن ان کے حالات نہیں ملتے۔

دہلی کی قدیم باؤلیاں

دہلی کو قدیم زمانہ میں پانی کی بہت قلت تھی۔ اِس قلت کو دُور کرنے کے لئے باؤلیاں اور کنویں تعمیر کے جاتے تھے۔ تاکہ مخلوقِ خدا اس سے مستفید ہو اور اپنی پیاس بجھا سکیں اور ضروری کام کو انجام دے لیں۔

جب سے دہلی قائم ہوئی ہے باؤلیاں اور کنویں بننے شروع ہو گئے ہوں گے لیکن ہماری سرسری معلومات میں حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کی باؤلی دہلی کی قدیم باؤلی ہے جو ۷۲۱ھ مطابق ۱۳۲۱ء میں بن کر تیار ہو گئی تھی۔

باؤلی درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء

جس زمانہ میں حضرت نظام الدین اولیاء یہ باؤلی بنوا رہے تھے اسی زمانہ میں بادشاہ غیاث الدین تغلق بھی قلعہ بنوا رہا تھا۔ مزدوروں کی قلت تھی اس بنا پر بادشاہ نے مزدوروں کو منع کر دیا تھا کہ وہ کہیں کسی اور کے کام پر نہ جائیں۔ مزدور بے چارے حکم حاکم مرگ مفاجات دن میں تو قلعہ کی تعمیر میں مصروف رہتے اور رات کو باؤلی کی تعمیر میں لگ جاتے۔ سلطان غیاث الدین نے جب سُنا کہ باؤلی کا کام بدستور رات کو چل رہا ہے تو اس نے غصہ میں درگاہ کا تیل بند کر دیا۔ حضرت کی کرامت سے پانی تیل کا کام دینے لگا۔ آپ نے اس کا تذکرہ سید محمود بخارے کیا وہ بھی ایک خام اور شکستہ دیوار بنوا رہے تھے۔ یہ سُن کر آپ نے دیوار گروا کر

زمین کے برابر کروادی اور فرمایا لو ہم نے اس کی سلطنت ہی مٹادی۔ اس باؤلی کی کھدائی پہلے پہلے حضرت نے اور ان کے مُریدوں نے کی۔

جب باؤلی بن کر تیار ہو گئی تو آپ نے اللہ میاں سے دُعا کی کہ اس کا پانی نفع بخش ہو چنانچہ اب تک اس پانی سے مخلوقِ خدا مستفید ہوتی ہے اور بہت سے خواص اس سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ یہ باؤلی ۱۰۰ فٹ × ۱۲۰ فٹ ہے جس کے چاروں طرف بھاری پختہ دیوار بنا بندش ہے اور شمال کی جانب کی سیڑھیاں جو باؤلی تہہ تک چلی گئی ہیں۔ سیڑھیاں اس قسم کی ہیں کہ ہر تین چھوٹی سیڑھیوں کے بعد ایک بڑی اور بہت چوڑی سیڑھی ہے۔ پانی سے عموماً چالیس سیڑھیاں کھلی رہتی ہیں اور انہی سیڑھیوں میں سے ایک سیڑھی پر پتھر کی ایک بہت بڑی چٹان رکھی ہے جس کو "نمازی پتھر" کہتے ہیں اور یہ خاص نماز پڑھنے کی غرض سے رکھا گیا ہے۔ باؤلی جب صاف ہوئی تو دیکھا گیا۔ اس کے اندر چار ستون ہیں جن کے نیچے چاروں طرف سے سیڑھیاں شروع ہو کر ایک بشت پہل سیڑھی پر ختم ہوئی ہیں اور پھر اس کے نیچے سے مدوّر سیڑھیاں شروع ہو کر کنویں پر ختم ہو گئی ہیں۔ یہ کنواں آٹھ گز سے آٹھ گز مدوّر ہے اور تقریباً اسی قدر گہرا بھی ہے اور باؤلی میں عموماً سولہ سترہ گز پانی رہتا ہے۔ پانی کے اوپر ایک بہت بڑا طاق ہے اور دو طاق اس سے چھوٹے ہیں۔ یہ طاق جنوبی دیواریں ہیں اور چار طاق شرقی اور غربی دیواروں میں ہیں، جن میں بخوبی دس آدمی کھڑے ہو کر نہا سکتے ہیں۔ اور ان طاقوں سے کوئی گز بھر نیچے ایک تہہ آدھ گز چوڑی چاروں طرف بنی ہوئی ہے جس کے اوپر پھر کر باؤلی کے پانی کا بخوبی طواف کر سکتا ہے۔ یہ باؤلی از سر تا پا سنگِ خارا کی عظیم الشان ڈلیوں سے نہایت مستحکم بنی ہوئی ہے۔

اس باؤلی کی چھت سے کود کر لوگ باؤلی میں گرتے ہیں اور تیر کر کمالات دکھاتے ہیں۔ باؤلی میں مقابلے ہوتے ہیں اور تیرنے والے اپنے کرتبوں سے لوگوں کو محظوظ کرتے ہیں۔

چھوٹے چھوٹے لڑکے یہ کمال دکھاتے تھے کہ لوگوں سے کہتے تھے کہ تم باؤلی میں پیسہ پھینکو ہم اس کے ساتھ کودتے ہیں اور پیسے کو لا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایسا ہی کرتے۔

بستی خاں کی باؤلی

بستی خاں نے سنہ ۹۰۹ھ مطابق ۱۵۰۳ء کو درگاہ حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے ایک میل کے فاصلہ پر ایک باؤلی، ایک مسجد، ایک دروازہ اور ایک مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ بستی خاں خواجہ سرا سکندر لودی کے زمانہ میں ایک باوقعت امیر تھا جس نے موضع نظام پور کی حدود میں یہ چاروں چیزیں بنوائی تھیں۔

یہ باؤلی بہت بڑی اور بہت گہری ۱۱۲ فٹ × اور ۳۱ فٹ تھی۔ اس باؤلی کی وجہ سے اُس کے بانی بستی خاں کے نام سے یہاں جو بستی تھی وہ بستی باؤلی کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ اگلے زمانہ میں باؤلی کو باؤڑی یا بائیں کہا کرتے تھے۔ اب یہاں نہ کوئی بستی اور گاؤں ہے۔

اس باؤلی کی سنہ ۱۹۱۹ء میں یہ حالت تھی، باؤلی کے چوطرفہ نہایت خوشنما دالان بنے ہوئے تھے۔ آمنے سامنے کے کچھ دالان تو رہے نہیں مگر ان کا ملبا باؤلی کے اندر آٹ گیا ہے۔ داہنے بائیں یعنی شمال کی طرف ایک سہ دری کھڑی ہے جو ۱۱ فٹ مربع اور ۱۱ فٹ اونچی ہے۔ اس میں کا بھی ایک ایک اونچا در بڑا در جس میں زینہ تھا گر پڑا ہے۔ مشرق کی طرف کا دالان تو اب رہا نہیں مگر اس رُخ پر لاؤ لگا کر پانی کھینچا جاتا تھا۔ چنانچہ لاؤ کی کڑیاں کھڑی کرنے کے لئے پتھر کی دو کڑیاں دائیں بائیں موجود ہیں جن میں ایک ایک سوراخ ہے۔ اس باؤلی کے اوپر مغرب کی طرف ایک مسجد ہے اور یہ باؤلی گویا اس مسجد کا حوض ہے۔

غرض یہ باؤلی جب راست حالت میں ہو گی تو ایک پُرلطف اور دلچسپ سیرگاہ ہو گی۔ باؤلی کی بندش کی دیواریں ۷۰ فٹ بلند ہیں۔ باؤلی کی سیڑھیاں لب آب تک تھیں۔ ۷۱ میں کو باقی رہ گئی تھیں وہ بھی شکستہ ہیں اور باقی ملبے میں دب گئی ہیں۔ باؤلی کے شکم میں اب

اس قدر جنگل اور جھاڑی ہو گئی ہے کہ سوائے ایک گڑھے کے باؤلی کی صورت پہچاننا بھی مشکل ہے۔ (۱۱۷)

حافظ داؤد کی باؤلی

حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے علاقہ میں پانی نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف ہوتی تھی۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ندیم الدولہ حافظ داؤد خاں نے یہ باؤلی ۱۲۶۰ھ سے بنانا شروع کی جو ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء میں ختم ہوئی۔

یہ باؤلی ۹۹ فٹ لمبی اور ۴۲ فٹ چوڑی اور ۷۰ فٹ گہری ہے۔ اس باؤلی میں عموماً چالیس فٹ گہرا پانی رہتا ہے۔ اور موسم بارش میں اس سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ باؤلی میں مغرب اور جنوب کی طرف سیڑھیاں پانی کے اوپر ا گئیں جو تہ تک ملی گئی ہیں مغرب کی طرف صدر دروازہ ہے جس میں دو منزلہ محراب دار حجرے ہیں جو نو فٹ اونچے اور سات فٹ چوڑے ہیں جن کی تعداد اور عرض حسب گنجائش ہے۔

حافظ داؤد صاحب

ندیم الدولہ خلیفۃ الملک حافظ محمد داؤد خاں بہادر داؤد دستقیم جنگ دہلوی سے بہادر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر نے استفادہ کلام حاصل کیا۔ حافظ صاحب نہایت عالی حوصلہ سخی اور باہمت رئیس تھے۔ ان کو بہادر شاہ ظفر کے حضور میں خاص درجہ تقرب حاصل تھا جو اور کو میسر نہیں۔ یہ خود ابتدائے تخت نشینی بہادر شاہ ظفر سے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے اختتام تک دارو غگی نذرونیاز اور علاقہ مالی شاہی سے مشرف رہے۔ سرسید احمد خاں صاحب ان کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

"اوصافِ حمیدہ اور اخلاقِ پسندیدہ ان کے اس سے سوا ہیں جو لکھتے ہیں۔ آدمی اور اوصاف ان کے اس سے بہتر ہیں جو کہے جاویں۔ سراسر خیر مجسم ہیں اور ہر دم اور ہر لحظہ حصول ثواب پر نیت مصروف رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے با خلاق عالی ہمت کو سلامت رکھے۔ ان سے ہر شخص کو فائدہ پہنچتا ہے۔"

بہادر شاہ ظفر کے روزنامچے سے منکشف کیا کہ حافظ داؤد قدسیہ باغ کے بھی داروغہ تھے ۹ جنوری ۱۸۴۶ء کو بادشاہ سلامت قدسیہ باغ میں تشریف لے گئے اور سیر و تفریح میں وقت گذارا تو حافظ داؤد نے بہادر شاہ ظفر کو دو ڈالیاں نذرانہ کے طور پر پیش کیں۔ حکم شاہی ہوا کہ تم روزمرہ کا خرچ اور مودی خانہ کا خرچ اپنے ذمہ لے لو۔ حافظ داؤد نے عرض کیا حکم عالی سر آنکھوں پر ہے انشاء اللہ حضور اقدس کے فرمان پر عمل کروں گا۔" (۴۳)

۱۲ مئی ۱۸۵۰ء کو سید احمد خاں بہادر منصف دہلی اور حافظ داؤد خاں صاحب خیر خواہ قوم اور دیدہ ور آدمی ہیں۔ ان کی نیک خیالی کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ نمازیوں کی تکلیف کے انسداد کے طور پر مجسٹریٹ دہلی سے رپورٹ کی ہے کہ جامع مسجد کے حوض میں رہٹ کے کنوئیں سے پانی آتا ہے مگر یہ پانی اس قدر کھاری ہے کہ اس سے کلی کرنا دشوار ہے اور لوگوں کو اس سے سخت اذیت ہوتی۔ اگر اجازت مل جائے تو ہم اپنے خرچے سے لال ڈگی کے تالاب سے پانی کا انتظام کر لیں کیونکہ یہاں کا پانی میٹھا ہے مجسٹریٹ نے موقعہ ملاحظہ فرمایا اور اجازت دیدی۔"

حافظ داؤد کی چار غزلیں حافظ قطب الدین مشیر (جو ان کے عزیز تھے) کے مشورے سے کہیں تھیں۔ حافظ داؤد صاحب کا ۱۲۸۵ھ میں انتقال ہوا۔ طبیعت ان کی موزوں تھی۔

نگہ سے ناز سے غمزہ سے اور ادا سے بھڑے
بزور عشق نہ ہم کونسی بلا سے ہٹے

گو بظاہر نہ منہ دکھاؤ گے
کیا کبھی خواب میں نہ آؤ گے

مرچکا داوڑ کب کا اس کے غم میں ہم نشیں

دُم چرانے کا ابھی اس صنم کو دھیان ہے

کھاری باؤلی

کوچہ نواب مرزا میں جو قدیم مسجد شیر شاہ کے زمانہ ۱۵۲۵ء کی بنی ہوئی ہے اس کے احاطے کی شمالی دیوار سے ملی ہوئی یہ باؤلی تھی۔ اسلام شاہ بن شیر شاہ کے عہد میں عماد الملک خواجہ عبداللہ نے ایک کنواں بنایا تھا پھر اس کے بعد ۹۵۸ھ مطابق ۱۵۵۱ء میں اس کنویں کو باؤلی بنا دیا۔ جب شاہجہاں نے شہر بسایا تو یہ باؤلی بھی شہر میں آگئی اور یہ دہلی کا ایک مشہور بازار بن گیا۔ یہ باؤلی دو کانوں میں دب گئی ہے۔ اس باؤلی پہ عبارت کندہ تھی، کتبہ دروازہ

یا اللہ۔ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

کتبہ اندرونی پیشانی چوکھٹ:۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ و بہ اتفقی رب بعونت تمام ایں باؤلی و چاہ در رمضان سنہ نہ صد و پنجاہ و ہشت ہجری بروح محمد مصطفیٰ رسول درگاہ حضرت الدوادرزمان عادل اسلام شاہ بن شیر شاہ بنا کردی کار کردیں۔ از جملہ بستے خواجہ عماد الملک عرف عبداللہ للاذر قریشی بندگان کی باوری امیدوار عنایت مرتبتک گردد۔ بایں سرے یا فتک۔

کتبہ دیوار شمالی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ در عہد زمانی سلطان السلاطین ابوا لمنظفر اسلام شاہ بن شیر شاہ سلطان خلد اللہ ملکہ و سلطانہ بنا کرد ایں چاہ بتوفیق بروح رسول اللہ عماد الملک عرف خواجہ عبداللہ للاذر قریشی بدار الملک حضرت دہلی فی سنۃ اثنے دسیں و تسعات۔

راجوں کی باؤلی

قطب صاحب کی لاٹ کے قریب جنوب و مغرب میں کوئی پانچ منٹ کے راستے پر ادھم خاں کے مقبرے کے جنوب میں ایک عالیشان مکان تھا جس کو ۹۱۲ھ مطابق ۱۵۰۶ء میں سکندر شاہ لودی کے عہد میں ایک امیر

دولت خاں نے بنوایا تھا۔ اس مقام پر ایک باؤلی ہے کسی زمانہ میں اس باؤلی کے مکانوں
میں راجہ بستے تھے جب سے راجوں کی باؤلی مشہور ہو گئی۔

باؤلی کے شمالی رخ پر سیڑھیاں تھیں جو پانی کی تہ تک چلی گئی تھیں جن میں شاود
تو پانی کے اوپر تھیں اور نو پانی میں دکھلائی دیتی تھیں جن میں چار قطاریں محراب دار حجروں
کی تھیں جو عرض و طول میں یکساں تھیں مگر تعداد میں مختلف

اگرسین کی باؤلی

جنتر منتر کی رصدگاہ کی کوئی پانچ سو گز کے فاصلہ پر یہ ایک عظیم الشان
و شاندار باؤلی اور اس کے ساتھ ایک مختصر سی مسجد ہے
جو سڑک کی داہنی طرف ہے۔

اگرسین جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کوئی ہندو تھا مگر معمولی شخص نہ تھا بلکہ
معزز شخص تھا۔ جب ہی اس نے ایسی عظیم الشان باؤلی تعمیر کرادی۔ باؤلی کے پاس
مسجد کے ہونے سے شبہ ہوتا ہے کہ اس کا بانی شاید کوئی مسلمان ہوگا۔ صحن حسین
کو اگرسین کر لیا ہوگا مگر یہ حقیقت نہیں ہے دراصل یہ دونوں عمارتیں اگرسین کی بنوائی
ہوئی ہیں کیونکہ بہت سی ایسی مثالیں موجود ہیں۔ امام باڑے، درگاہیں اور چلے ہندوؤں
نے تعمیر کرائے ہیں اور انھوں نے مذہب کو تفریق مدِ نظر نہیں رکھا۔ باؤلی کے اوپر کا
چبوترہ جسے مسجد کا دوسرا صحن بھی کہہ سکتے ہیں۔ ۴۰ فٹ × ۲۷ فٹ ہے۔ چبوترہ خام تھا مگر
گردش بندش پختہ ہے۔ باؤلی مستطیل ۱۰۰ فٹ × ۲۲ فٹ ہے۔ اور ادھر سے ادھر
لمبائی لو تو ۲۲۰ فٹ ہے۔ پہاڑ کا پہاڑ کھڑا ہے۔ اندر اترتے ہوئے ڈر لگتا ہے پانی
سے لبریز رہے جو شیریں تھا لیکن اب چونکہ کھچا نہیں ذرا ململا ہو گیا ہے۔ باؤلی کے
چبوترے میں سیڑھیاں دور تک چلی گئی ہیں۔ اس وقت پانی کے اوپر چھیالیس سیڑھیاں
ہیں۔ باؤلی کے گرد کی دو طرفہ دیوار ۲۴ فٹ اونچی تھی۔ مشرق کی طرف باؤلی کے اندر رخ
پر نیچے کے حصہ پر آٹھ آٹھ دیوار دوز طاقچے ہیں، اوپر کے حصہ میں تو نو دیوار سے بیرونی

سمت پر تیر دیوار دو رطاقوں کا سلسلہ ہے جو بجائے خود ساڑھے سات فٹ ۱ فٹ کوٹھریاں ۵ گہری میں ہیں۔ باؤلی کے شمال میں ایک بڑا بھاری گول کنواں ۱۸ فٹ مربع ہے جس کے چاروں طرف درے اور بلداوی گنبد ہے۔ اس کا پانی باؤلی میں بھرتا ہے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کنواں اور باؤلی دونوں بہت گہرے ہیں اور ان میں جیتی سوتیں ہیں۔ جن کا پانی خشک نہیں ہوتا بلکہ عجیب نہیں کہ باؤلی کے شکم میں کنواں ہو کیونکہ بڑی باؤلیوں کے پیندے میں کنویں کھودے جاتے ہیں جیسے کہ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کی باؤلی میں ہے۔

دہلی میں اور بھی کافی باؤلیاں ہیں جیسے کہ بیٹا محل کی باؤلی۔ پرانے قلعہ اور ھندیوں کے درمیان شیخ محمد کی باؤلی، سلطان سکندر بہلول لودھی کے گنبد کے پاس ایک قدیم اور بہت وسیع باؤلی خضر پور کی باؤلی اور موٹھ مسجد درگاہ حضرت روشن چراغ دہلی کے پاس ایک وسیع باؤلی وغیرہ ہیں۔ ان کے متعلق فی الحال کوئی معلومات حاصل نہیں ہو سکی۔ سرسری مطالعہ میں جتنی باؤلیاں نظر پڑیں ان کا اس مضمون میں ذکر کر دیا گیا ہے۔

حضرت خواجہ میر درد کی دیے نیازی

حضرت خواجہ میر درد عربی، فارسی اور اُردو کے شاعر تو تھے ہی مگر اس شاعری سے علاوہ آپ بھاشا میں خیال، ٹھمری، ہوری، دھرپد وغیرہ راگ گانے کی چیزیں فرمایا کرتے تھے اور پیشہ ور لوگ انھیں تبرک گائے جاتے تھے اور اُن کو محفلوں اور شادیوں میں سُنایا کرتے تھے۔ خواجہ صاحب نے یا آپ کے کسی معتقد نے اس کلام کو آپ کے دیوان میں شامل نہیں کیا۔ وہ صرف اہلِ عقیدت اور لوگوں کے حافظہ اور زبان پر ہی رہا۔ چنانچہ آپ کی اس شاعری کے بارے میں آپ کے چھوٹے بھائی خواجہ میر اثر صاحب اپنی مثنوی "خواب وخیال" میں ذکر فرماتے ہیں :-

کوئی صحبت خوشی کی بھاتی نہیں کوئی بزم طرب خوش آتی نہیں
انبساط و خوشی کرے ہے داغ گر ہنسوں بھی تو ہو ہنسی کا داغ
جمع جتنا ہو عیش کا اسباب دل کو اتنا کریں جلا کے کباب
گر بہ تقریب رنگ ہوتا ہے سینہ یک لخت آگ ہوتا ہے
راگ ہر ایک جدا ہیں گو بیشک پر اثر میں ہیں اب سبھی دیپک
حضرت درد کے بنائے خیال کیا کروں کیا کریں ہیں دل کا حال
تان ہر ایک جان لیتی ہے قہر لذت دلوں کو دیتی ہے
بولوں کا لطف جان سے ہے جدا بھول و جان ہر طرح سے فدا

زبان اور اُردو ادب کے لحاظ سے خواجہ صاحب ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ بقول مولانا محمد حسین آزاد چار رکنوں میں ایک رکن یہ بھی ہے۔ باقی رکن میر سودا اور مظہر ہیں حقیقت میں ان چار ہستیوں نے زبان کا قوام درست کیا۔ قدیم ایہام گوئی کو ختم کیا۔ زبان نکھری اور صاف ہوئی۔ متروک الفاظ نکالے گئے اور بالآخر ترقی کی معراج تک پہنچی۔ خواجہ صاحب کی زبان اور طرز ادا وہی ہے جو میر تقی میر کی ہے۔ عبارت سلیس، فصیح اور شستہ ہے۔ بہ آسانی سمجھ میں آجاتی ہے۔ تیر و نشتر کا کام دیتی ہے۔ بقول خواجہ میر درد مخالفین اور موافقین نے ان کی قادر الکلامی کا سکہ مانا ہے ؎

مخالف کہہ گئے سنتے ہی مجلس میں سخن تیرا

زباں کا اب سوا معلوم جوہر تیغ ہے گویا

ہیں شعر فہم جتنے زمانے میں لاعلاج

اے درد مانتے ہیں یہ سب آن کر مجھے

ان کے کلام کی ایک خوبی اپنے معاصرین کے کلام کے مقابلہ میں یہ ہے کہ ان کا کلام ہموار ہے اور دوسروں کے کلام میں ناہمواری پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کی غزلوں کی یہ حالت ہے کہ اس کا ایک شعر نہایت بلند اور دوسرا انتہائی پست ہوتا ہے۔ ایک شعر کی زبان نہایت شستہ، مہذب اور شیریں ہوتی ہے اور دوسرے شعر میں ابتذال کا رنگ جھلکتا ہے لیکن خواجہ کا کلام اوّل سے آخر تک اس قدر ہموار ہے کہ اس میں انتخاب کی بہت کم گنجائش ہے۔ یہی رائے میر حسن نے خواجہ صاحب کے کلام کے بارے میں دی ہے۔

"دیوانش اگرچہ مختصر است لیکن چوں کلام حافظ سراپا انتخاب"۔

دوسرے اساتذہ کے کلام میں اتار چڑھاؤ ہے چنانچہ گلشن بیخار کے مؤلف سودا کے کلام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"قدما را مانند فصحائے متاخرین پیرامون خاطر دیگرین دل نہ این بود
کہ ہر شعر دلپسند برآید و ہر بیت خاطر نشین لہذا در کلام ایشان رطب و یابس
واقع شدہ چہ در قصیدہ و چہ در غزل"۔

میر تقی میر مرحوم کے کلام کے متعلق آزردہ کی رائے ہے "پستش بغایت پست و بلندش
بسیار بلند" اس کی ہلکی سی تردید شیفتہ نے کی ہے "پستش اگر چہ اندک پست است اما
بلندشں بسیار بلند"۔

معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ میر درد علیہ رحمۃ کو مرزا غالب کی طرح مولوی فضل حق
وغیرہ جیسے اہلِ ذوق مل گئے جنھوں نے ان کے کلام میں سے رطب و یابس نکال کر
سارے کلام کی روح کو نکال کر منتخب کر لیا۔ چنانچہ جیسے غالب کے منتخب شدہ
کلام کی حالت ہے کہ ان کے دیوان میں دو دو تین تین شعر کی غزلیں ملتی ہیں، اسی طرح
خواجہ میر درد کے کلام کی حیثیت ہے۔ ان کے دیوان میں دو شعر یا تین شعروں کی غزلوں
کے ساتھ ایک شعر بھی ہے۔

میر تقی میر اور مرزا سودا کو ایسا موقعہ اور ایسے اہلِ علم حضرات نصیب نہیں
ہوئے، اور ان کے کلام کو منتخب کرنے والے مل جاتے تو یہ کمی باقی نہ رہتی۔

خواجہ میر درد کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ محض جوانی اور نشۂ سخن کے
عالم میں شعر و شاعری سے اپنی طبیعت بہلایا کرتے تھے کیونکہ جب دہلی بگڑی اور بڑھاپا
بھی قریب آیا تو انھوں نے شعر گوئی سے ہاتھ اٹھا لیا۔ چنانچہ اس کے متعلق انھوں نے
ایک رباعی لکھی ہے [1]

در موسمِ پیری کہ سفر در وطن است | ہر روز جوابِ طاقتِ جان و تن است
زیں پیش بصد رنگ سخن می گفتم | اکنوں اے درد در خموشی سخن است

[1] اعجاز سخن صد ۲۲۱

خواجہ میر درؔد صاحب کی عاشقانہ رنگ نہایت اعلیٰ اور بلند ہے، اس زمانہ کا عشقِ مجازی جس کو بوالہوسی سے تعبیر کرتے ہیں ان کے کلام میں نہیں ہے جیسے حافظ شیرازی وغیرہ کا محبوب بازاری اور ہرجائی نہیں ہے بلکہ اس سے محبوبِ حقیقی یا مرشد مراد ہے۔ ایسے بزرگوں کی نظر میں شاعری کا پایہ بہت بلند اور اس کا مقصد نہایت اعلیٰ ہوتا ہے۔ چنانچہ خواجہ میر درؔد کی زبان بیہودہ مذاق اور ہجو گوئی سے پاک ومبرا ہے۔ اس وجہ سے ان کا کلام سوز وگداز اور تاثیر سے پُر ہے۔ جس کا ذکر خواجہ میر درد نے اپنے دو شعروں میں اس انداز سے کیا ہے ؎

یہ تیرے شعر جو اے درؔد یا کہ نالے ہیں
جو اس طرح سے دلوں کو خراش کرتے ہیں

شعر ہے اور درؔد ہے یعنے
بات میں اور ہی جان پڑی ہے

تصوف کے بارے میں اُردو شاعروں میں خواجہ صاحب سے بہتر کسی نے نہیں کہا ہے معرفت اور تصوف کے پیچیدہ اور مشکل مضامین اس خوبصورتی سے بیان کئے ہیں کہ وجدی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور شاعرانہ کلام تصوف کی چاشنی سے دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کلام پر خواجہ صاحب کو ناز ہے۔ کہتے ہیں ؎

پھولے گی اس زبان میں گلزار معرفت
یاں میں زمین شعر میں یہ تخم بو گیا

یاروں ہی سے درؔد ہے یہ حیرت جا
پر کوئی نہیں ہے، جو سنے گئے ہم

دونوں عالم سے کچھ پرے ہے نظر
آہ کس کا دل و دماغ ہوں میں

تاہم اور نکتہ چیں حضرات کا بھی گلہ کیا ہے ؎

اے درد کہوں کس سے بتا راز محبت

عالم میں سخن چینی ہے یا طعنہ زنی ہے

کہیں کہیں خواجہ صاحب نے پرانے الفاظ اور محاورے بھی استعمال کئے ہیں۔ مگر اس خوبصورتی سے کہ ان سے شعر کی خوبی بڑھ جاتی ہے اگر ان کی جگہ اور لفظ رکھ دو تو شعر کا لطف اور مزہ ختم ہو جاتا ہے۔

میر تقی میرؔ کی طرح خواجہ صاحب نے جو چھوٹی بحروں میں غزلیں کہی ہیں وہ اپنا جواب نہیں رکھتی ہیں۔ بقول مؤلف آبِ حیات "تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دی ہے یا بقول امیر مینائی "پسی ہوئی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں۔"

خواجہ صاحب کے معاصر اور غیر معاصر شعراء صاحب تذکرہ سب متفقہ طور پر ان کی سحر بیانی کے معترف اور مداح ہیں۔ اور تقریباً ہر ایک ذکر کرتا ہے کہ "ان کے اشعار فارسی و ریختہ پر درد ہوتے ہیں" [۱]

قیام الدین قائم فرماتے ہیں ؎

"ابیات و رباعیات بطور سی بی و خیام بسیار دارد"

صاحب "ریختہ گویاں" کی رائے ہے:-

از شعراء ممتاز زمانہ است و در ریختہ گوئی یگانہ

بے اغراق طبع بلندش رسا است و فکر دل پسندش [۲]

صاحب "گلشن ہند" لکھتے ہیں:-

"اگرچہ دیوان بہت مختصر ہے لیکن سراپا درد اور اثر ہے

---

[۱] سخن شعراء صہ ۱۸۵ [۲] مخزن نکات صہ ۳۹

زبان فارسی میں بھی اکثر غزلیں کہی ہیں پر سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی خالی کیفیت سے نہیں ہے۔"

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ رقمطراز ہیں:۔

....." اگر بلورک سرے ماء مصنفانش کہ دریں فن ہمارا نیختہ تکلم قدرست مطالعہ کن دو دریاب سخنم از خطاو اغراق برکردن است از لطافت طبع و شستگی نظم و رشاقت مضمون پیداست کہ خواجہ را دریں فن نیز مانند اصتروی مکاتی ارجمند و دستگاہی بلند است فکرش صحیح و نظمش فصیح و گفتارش از رکاکت و اغلاط پاک و در جنب گلہائے خیالش گلہائے چمن ہمہ از خس و خاشاک دردیوانش از نظر گذشت از اشعار پرکن خیالی است و اکثر ابیات با علو معانی و سمو مضامین دلکش و عالی۔"

خواہ وہ شاعر ہو یا عالم ہو یا صوفی ہو یا پنڈت وگرنتی ہو ہر ایک کی زندگی گذارنے کا ڈھنگ اور طریقہ جدا جدا ہے کوئی حکومت پسندی کو اچھا سمجھا جاتا ہے حکمران طبقے کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اُن کی خوشامد کرکے اپنے ذاتی اغراض پورے کرانا مقصد زندگی سمجھتا ہے اور اپنی ہستی کو دوسروں کی غلامی سے منسوب کرنا پسند کرتا ہے اور دُنیا کے لہو و لعب سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اسی طرح اپنی پوری زندگی گذار دیتا ہے۔

لیکن ایسے بھی خود دار انسان ہیں خواہ وہ کم ہی کیوں نہ ہوں کہ وہ حکومت اور اس کے حکمران طبقے سے کوئی سروکار نہیں رکھتے اور ان کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں

۵۔ گلشن بیخار ص ۹۹

دیکھتے۔ خوشامد اور چاپلوسی کرنے کو لعنت سمجھتے ہیں۔ دولت ان کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور دُنیا کے شیطانی دھندوں سے ان کا دُور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔

چنانچہ شعراء کے قدیم و جدید طبقے پر نظر ڈالئے۔ اُن میں ایسے اکثر شاعر ایسے ہیں جن کو بادشاہوں، حکمرانوں، افسروں کے قصیدے لکھنے اور چاپلوسی کرنے میں ملکہ حاصل ہے اور ہجو کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور اس بات کے خواہشمند رہتے تھے کہ بادشاہوں کے درباروں میں ان کی کس طرح اور کس ذریعہ سے رسائی حاصل ہو اور اُن سے نذرانیں یا تنخواہیں مقرر ہوں اور ہم اُن کے خادم اور مدح خواں تصور کئے جائیں۔

ان شعراء کے برعکس خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ اُن ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے بے نیاز اور مستغنی زندگی گزاری اور انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا جو اعزاز بخشا گیا ہے اس اعزاز پر بٹہ نہیں لگایا اور کائنات کی ہر چھوٹی بڑی شے اور حقیقت کو اپنے تابع سمجھا اور اپنے اشعار میں اسی افضلیت و عظمتِ انسانی کا بار بار تذکرہ کیا ہے۔ اور انسانوں کو ان کی امتیازی خصوصیت سے آگاہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

جلوہ تو ہر ایک طرح کا ہر شان میں دیکھا

جو کچھ کہ سُنا میں سو انسان میں دیکھا

یوں تو جلوۂ خداوندی کائنات کے ہر ذرّے میں موجود ہے جس سے خالقِ مطلق کے وجود کا ثبوت ملتا ہے لیکن اصل مظہر صفاتِ الٰہیہ صرف انسان ہی ہے۔

گر دیکھئے تو مظہر آثار بقا ہوں

اور سمجھئے جوں عکس مجھے محو فنا ہوں

ہے مظہر انوار صفا میری کدورت

ہر چند کہ آہن ہوں پہ آئینہ بنا ہوں

لوہا پگھلنے کے بعد آئینہ بھی بنتا ہے جس میں کدورت ضرور باقی رہتی ہے لیکن دُنیا

والوں کے لئے رہنمائی کا کام دیتا ہے۔ اسی طرح انسان ہی کا تپلا اسفل السافلین ہے۔ لیکن عالم علوی کا آئینہ دار، اور صفاتِ خداوندی کا عکس بردار ہے۔

میں گو نہیں ازل سے پر تا ابد ہوں باقی

میرا حدوث آخر جا ہی بڑا قدم سے

اگرچہ انسان ازل سے نہیں ہے صرف اللہ رب العزت کی ہی واحد ذات ازلی ہے۔ اور انسان کی تخلیق بعد میں "نفخت فیہ من روحی"[1] کے مطابق ہوئی۔ اس لئے انسان دائمی لافانی ہے اور ابد تک رہے گا۔

ارض و سماں کہاں تیری وسعت کو پا سکیں

میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

ارض و سماں میں انسان جیسی انوار الٰہیہ اور جلوۂ خداوندی سمانے کی طاقت نہیں ہے۔ جب پہاڑوں دریاؤں وغیرہ سے دنیا کا ذمہ دار اور خلیفہ بننے کے لئے اللہ رب العزت نے پوچھا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ یہ ہمت انسان ہی نے کی جو خلیفۃ الارض بننے کے لئے تیار ہوا۔ اور یہی قلبِ انسانی ہے جو انوارِ خداوندی کا حامل ہے۔

انساں کی ذات سے ہیں خدائی کے کھیل

بازی کہاں بساط پہ گر شاہ ہی نہیں

دنیا میں انسان کی ذات سے خدائی کے کمالات و کرشموں کا ظہور ہوتا ہے ان کھیلوں کا دار و مدار انسان پر ہے جس طرح شطرنج کی بساط پر پیدل وغیرہ کے ساتھ بادشاہ نہ ہو تو کھیل کھیلا نہیں جا سکتا کھیل کی جیت کا دار و مدار بادشاہ کے بیٹھے رہنے پر ہے۔

---

[1] میں نے اس (آدم) میں اپنی روح پھونکی۔

باغِ جہاں کے گل ہیں یا خار ہیں تو ہم ہیں

گر یار ہیں تو ہم ہیں، اغیار ہیں تو ہم ہیں

دریائے معرفت کے دیکھا تو ہم ہیں ساحل

گر وار ہیں تو ہم ہیں، اگر پار ہیں تو ہم ہیں

وابستہ ہے ہمیں سے گر جبر ہے وگر قدر

مجبور ہیں تو ہم ہیں، مختار ہیں تو ہم ہیں

تینوں شعروں میں عظمت انسانی کا اظہار ہے :-

گلستانِ دہر کا وجود انسان ہی پر موقوف ہے۔ اسی کے طفیل جہاں کی رونق قائم ہے وہ ہی اس کا نظام اپنے ہاتھوں چلاتا ہے اسے گل سمجھو یا خار، دوست سمجھو یا دشمن۔

دریائے معرفت کے پیرنے اور غوطے لگانے والے ہم ہی ہیں ہم ہی اس کے کنارہ ہیں جو بحر بیکراں اپنے آغوش و قبضہ میں لئے ہوئے ہیں ہم ہی ہیں جو عشق الٰہی کا بیڑہ اٹھانے والے ہیں۔

الفاظ خلق ہم بن سب ہیں ہوائے سے

معنی کی طرح ربط گفتار ہیں تو ہم ہیں

دُنیا کو پیدا کرنے والے لفظ "کن" اس وقت تک بیکار اور مہمل ہے جب تک اس کو عملی جامہ پہنایا نہ جائے۔ عملی جامہ پہنانے والا انسان ہی ہے جو دُنیا کی ہر شے بنا رہا ہے اور دُنیا کو زینت دے رہا ہے ہر شے میں ارتباط پیدا کر رہا ہے۔ کائنات عالم کو ایک سلسلہ میں پرو رہا ہے۔

جھکتا نہیں ہمارا دل تو کسی طرف یاں

جی میں سما رہا ہے از بس غرور تیرا

جب انسان خداوند تعالےٰ کی صفتوں کا حامل ہو۔ اور اس کی ذات کا ایک جزو جانا جاتا ہو اور اس کا مرتبہ اتنا بلند ہوگیا ہو تو اس کو غرور کیوں ہو اور وہ کیوں کسی دوسرے سے لو لگائے اور اس کی اطاعت و بندگی و فرمانبرداری کرے۔

اسی انسانیت کے راز فلسفہ کی یاد اور اس پر عمل کرنے کا عزم خواجہ میر دردؔ کئے ہوئے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

رکھ نَفَخْتُ مِنْ رُّوحِیْ کو یاد

جب تلک اے دردؔ دم میں دم رہے

اشرف المخلوقات اور خلیفۃ الارض کو یہ زیب نہیں دیتا کہ دُنیا کی چیزوں کا غلام بنے اور اس کے حصول کے لئے اپنے آپ کو وقف کردے حتّٰی کہ اس کی پرستش بھی کرنے لگے۔ عظمت انسانی پستی کی طرف مائل ہو یہ اس کی شان کے خلاف ہے۔ خواجہ میر دردؔ دُنیا کی بے ثباتی اور اس کے انتشار کا مطالعہ کرتے ہیں اور انسانوں کو اس سے مطلع کرتے ہیں کہ اس کی طرف اندھے ہو کر نہ گرو۔ اُن کا مشہور اور زبان زدِ خاص و عام یہ شعر ہے شاید اس شعر نے کچھ لوگوں کو عظمتِ انسانی کو دھکا لگانے سے باز رکھا ہو۔ اور ان کو انسان بنا دیا ہو۔ فرماتے ہیں ؎

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

حضرتِ انسان پر عالم نزع طاری ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند ہونے والی ہیں دنیا سے کوچ کرنے کا وقت آلگا ہے تو فکر نے غوطہ لگایا فریب اور غفلت کے پردے آنکھوں کے سامنے سے اُٹھنے لگے۔ کہ تو کسی طرف مائل ہوا۔ یہ دُنیا دھوکہ کی ٹٹی ہے یہ زندگی حباب سے زیادہ نہیں ہے جو کچھ اس زندگی میں دیکھا وہ خواب تھا۔ اور جو سُنا افسانہ تھا ؎

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ

جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

اے ساقی دنیا میں لوگ جانے کے لئے یعنی فنا ہونے کے لئے آتے ہیں۔ دیکھ چل چلاؤ جانے کا سلسلہ لگ رہا ہے یہ دنیا سرائے فانی اور درد زدہ زندگی ہے۔ اس لئے شراب طہور کا دور چلائے جائے جس قدر پلا سکتا ہے پلا دے۔ پھر تو کوچ کرنا ہی ہے ؎

افسوس اہل دید کو گلشن میں جا نہیں

نرگس کی گو آنکھیں ہیں پر سوجھتا نہیں

یہ دنیا اس قدر گندی اس کے دھندے اس قدر ناپاک اور ظلم بدی کے ذریعہ اس قدر بیہودہ ہیں جس کو خوددار اور شریف خصلت انسان برداشت نہیں کر سکتا۔ اور نہ اسے اختیار کر سکتا ہے۔ اسے تو اندھے نرگس جیسے غرض کے بندے اختیار کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے دنیا میں جگہ ہے۔

دنیا میں اہل نظر، اہل بصیرت کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اسی مفہوم کو اپنے خاص انداز میں غالب نے ایک شعر میں سمجھایا ہے ؎

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے

بھرے ہیں جسقدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

میخانہ عالم ہے وہ بے ربط کہ جیسیں

ہو مے جو صراحی کہیں تو جام کہیں

خورشید نہ تنہا ہے گردش میں زمانے کی

یاں اپنے دنوں کے تئیں شبنم بھی تو روتی ہے

کائنات کا ہر ذرہ گردش میں ہے مصیبتوں اور پریشانیوں کا شکار ہر متنفس ہے۔

آہ وزاری اور نالہ و بکا میں مصروف نظر آتا ہے خورشید ہی پر کیا موقوف ہے جو مارا مارا پھر رہا ہے، چکروں میں گرفتار ہے بچاری شبنم بھی روتی نظر آتی ہے، غرض دنیا ہی نام جگر کا ہے سہ

مت جا تر و تازگی پہ اس کے
عالم تو خیال کا چمن ہے
غنچہ ہے دل گرفتہ گل کا ہے چاک سینہ
گلشن میں ہے تو یہ کچھ، آسودگی کہاں ہے

اس برباد دنیا میں کسی کو سکون میسّر نہیں ہے جب گلستان و گلشن جیسے پُر بہار مقام میں غنچہ شگفتہ نہیں بلکہ رنجیدہ اور مغموم ہے اور گل مہکتا ہوا نہیں گریبان چاک، پراگندہ نظر آرہا ہے تو آسودگی کا دنیا میں کیا کام کہیں بھی آسودگی نظر نہیں آتی ۔

ماتم کدۂ جہاں میں جوں ابر
اپنے تئیں آپ رو گئے ہم
جہاں کے باغ سے ہم دل سوا نہ کچھ لائے
فقط یہی ثمر داغدار رکھتے ہیں

زمانے کے ظلموں کا بھلا کرے کہ ہم نے اس دنیا میں سوائے دل داغ داغ کے کچھ نہ پایا۔

میں اپنا دردِ دل چاہا کہوں جس پاس عالم میں
بیاں کرنے لگا قصہ وہ اپنی ہی خرابی کا

بیاں کرنے لگا قصہ وہ اپنی ہی خرابی کا میں اپنا دردِ دل اپنے غموں کی کہانی کس کو سناؤں جس کو سناتا ہوں وہ بھی اپنی پریشانی مصیبتوں اور کلفتوں کے

اے دردؔ جو آکر دیکھا

کچھ تو ہی بتا کہ دل لگا کر دیکھا

مانند مژہ اُلٹ گئی صف کی صف

ہم نے تو جدھر آنکھ اُٹھا دیکھا

ہر شخص اس دُنیا میں پراگندہ اور ڈانواڈول ہے۔ اے دردؔ تو ہی اس فریبی دُنیا کی حقیقت بتا کیا ہے تو ہی اس میں رہا ہے اس سے دل لگایا ہے۔ ہمیں تو یہی پتہ لگا اور جہاں آنکھ اُٹھا کر دیکھا تھا کے بجز کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ جدھر بھی نظر پڑے مژہ پلک کی طرح جیسے سینکڑوں بال لائن وار ہوتے ہیں لوگوں کی صف کی صف موت کا شکار ہوتے دکھائی دی۔

گر جاں ہے تو جاں کے آزار کے ساتھ

یاں زندگی کی مردنی دُشوار کے ساتھ

دُنیا وہ فاحشہ ہے کو سے نہیں بچی

دیکھا جسے تو اس کے یہ مردار ساتھ ہے

مصائب و آلام نے زندگی میں سخت ترین موت کا مزہ چکھا دیا ہے بلکہ زندگی کو بدترین موت کے مانند بنا دیا ہے۔ یہ دنیا فاحشہ عورت کی طرح کسی سے نہیں بچی جس کو اس نے گندہ نہ کیا ہو ناجائز تعلق نہ جوڑا ہو جس فرد بشر کو دیکھا یہ مُردار اس کے ساتھ چمٹی ہوئی ہے۔

اس دُنیا کو خواب، افسانہ، اندھوں کی دُنیا، ماتم کدہ، وحشت سرائے، سرائے فانی، فاحشہ عورت اور مردار کی مثالیں دے کر اس کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچنے کے بعد خواجہ میر دردؔ فرماتے ہیں۔ ؎

یاد رہیں آ بھی تجھے غافل یہ عقریب معلوم ہووے گا کہ یہ عالم فسانہ تھا

یہ تو دُنیا کی حقیقت ہے اور دُنیا والوں کے کیا کردار ہیں جن سے شب و روز اُٹھتے بیٹھتے ہر لمحہ واسطہ پڑتا ہے۔ ان کی کیفیت و حالت کا بھی خواجہ میر درد نے جائزہ لیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

روندے ہے نقشِ پا کی طرح خلق یاں مجھے
اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

دُنیا والے جس طرح کسی کے نقشِ پا کو روندتے ہوئے گذر جاتے ہیں اسی طرح مجھ کو مخلوقِ خدا ہی ہے ذلیل و خوار کر رہی ہے تکلیفیں پہنچا رہی ہے۔ اے رفتہ تو کیسے ناہنجار لوگوں سے مجھ کو متعلق کر کے چلی گئی۔

ہر طرح زمانے کے ہاتھوں ہوں ستم دیدہ
گر دل ہوں تو آزردہ خاطر ہوں تو رنجیدہ

اور بولنے کے باتیں کرو
نام اس کا نہ لو کہاں ہے چاہ

محبت و وضعداری اور انسانیت کی کسی سے توقع نہ کرو۔ وہ تو اُڑ گئی ختم ہو گئی اُس کی تلاش بے سود ہے اس کا وجود نہیں ہے۔ ہنسو، کھیلو مذاق کی باتیں کرو دل بہلاؤ۔

یاں کون آشنا ہے ترا کس کو تجھ سے رابطہ
کہنے کو یہ بھی لوگوں کی اک بات رہ گئی

مخلصانہ تعلق، بے لوث محبت کہنے والی بات بن گئی ہے جو صرف لوگوں کی زبان پر ہے۔ دل اُن سے خالی ہے، دُنیا میں اب نہ کوئی کسی کا سچا دوست اور نہ کہیں کسی سے کسی کا سچا، اچھا ربط و ضبط اور تعلق ہے۔ ع

سب ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

کیا سیر سب ہم نے گلزارِ دنیا

گلِ دوستی میں عجب رنگ و بو ہے

رنگ و بو کیا ہے ؎

یاوری دیکھئے نصیبوں کی

دوست بھی ہو گئے مرے دشمن

اے دردؔ غیر کا نہیں شکوہ میرے تئیں

جو کچھ گلا ہے مجھ کو سو ہے اپنے یار سے

جو انسان خود اعتماد اور خوددار ہوتا ہے اور اس کا یہ یقین نہیں بلکہ ایمان بن جاتا ہے کہ سوائے قادرِ مطلق کے کوئی اُن کی اعانت کرنے کی صلاحیت و قدرت نہیں رکھتا تو پھر وہ کسی کا دست نگر نہیں بن سکتا۔ خواجہ میر دردؔ توحید کے پرستار ہی نہیں بلکہ اس کے پورے عامل ہیں۔ اس لئے ان کا ہر قول و فعل اور شعر اور شاعروں کی طرح شاعرانہ نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔ ؎

شعر میرے میں دیکھنا مجھ کو

ہے میرا آئینہ صفائے سخن

خواجہ میر دردؔ شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مصلح ریفارمر تھے۔ ان کے اشعار پیغام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسا پیغام جو انسان کی زندگی میں کایا پلٹ اور خود اعتمادی کی قوت پیدا کر دے۔ اپنی رہنمائی کا دعویٰ انھوں نے علی الاعلان کیا ہے ؎

ہوں قافلہ سالارِ طریقِ قدما دردؔ

جوں نقشِ قدم خلق کو میں راہ نما ہوں

مزاج کا استغنا دیکھئے فرماتے ہیں: ؎

دولتِ فقر کے حضور گر دے جاہ سلطنت

بجتے ہیں جس کی یاں ہما اپنی نظر میں زاغ ہے

کتنا صاف شعر ہے۔ اور کتنی تمکنت کے ساتھ دولت کی مٹی پلید کی گئی ہے کہ دولت فقر و فاقہ مستی کی بارگاہ میں ایک گرد کی حیثیت رکھتی ہے، اور ان کی نظر میں سلطنت کا جاہ و حشم زاغ سے زیادہ نہیں ہے خواہ دنیا اس کو ہما سمجھے۔

لے نہ جاوے حرص اہلِ فقر کو

بہہ سکے کب موجِ نقشِ بوریا

اہلِ فقر کے پائے ثبات کو حرص و ہوس اور دنیا کی خواہشات کی رَو متزلزل نہیں کرسکتی۔ بوریہ نشین کوہِ عزم و استقلال ہیں۔ جواہرات و دولت کے طوفان میں یہ بہہ نہیں سکتے۔

مثالِ عکس جو کوئی پاک طینت ہیں

جہاں صفا ہے وہیں بود و باش کرتے ہیں

سراپا چشم ہو جوں آئینہ پر

کسو پر دردِ سری کب نظر ہے

میری نظروں میں دنیا کی ہر چیز آتی ہے میں اس کو آئینہ کی طرح دیکھتا ہوں۔ جس طرح آئینہ سوائے دیکھنے کے کسی چیز سے لطف حاصل نہیں کرتا اور نہ لطف حاصل کرنے کی تمنا رکھتا ہے میں بھی کسی چیز سے محدود نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی چیز کا متمنی ہوں۔

روشن ضمیر جتنے ہیں عالم میں جوں نجوم

چرخِ آسیا سے اپنے یہ دانے نہ دَل سکے

جس طرح فلک ستم شعار کے ظلموں سے عقیل و دانا ستارے محفوظ ہو گئے اور اس کی زد میں نہیں آتے اور اسی طرح دنیا کے جس قدر اہلِ بصیرت اہلِ دل

اور خود اعتماد لوگ ہیں گردشِ روزگار کا شکار نہیں بنتے۔

کیا کام مجھے خوف و رجا کا کہ مرے پاس
ہے جانِ صہبائے جان، دل ہے سو غنی ہے

عالم آب میں جوں آئینہ ڈوبا ہے رہا
تو بھی دامن نہ کیا تر دنے تر پانی میں

جس طرح آئینہ پانی میں ڈوبنے کے بعد بھی پانی جذب نہیں کرتا۔ اسی طرح خود اعتماد لوگ عالمِ معصیت میں رہتے ہوئے بھی شیطنت اور گناہوں سے بچے رہتے ہیں۔

ہمت رفیق ہووے تو فقر سلطنت ہے
آتا ہے ہاتھ یعنی یاں تخت دل کے ہاتھوں

اہلِ نظر کو رہنما درد نہیں ضرور کچھ
مثل شرر رہی ہے چشم اور رہی چراغ ہے

روشن ضمیر، صاحب بصیرت کو راستہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنی عقل، شعور، اور ذہانت سے خود راستہ نکالتا چلا جاتا ہے جیسے کہ شرر ہے وہ خود مجسم چشم و چراغ ہے اسے کسی دوسری روشنی کی ضرورت نہیں ہے۔

زنہار دہر مت کھولو چشم حقارت
یہ فقر کی دولت ہے کچھ افلاس نہیں ہے

جو کچھ کہ ہم نے کی ہے ہمت سالے، مگر
یہ آرزو رہی ہے کہ کچھ آرزو نہ ہو

جن خواہشوں کا ہم نے اظہار کیا ہے کہ وہ ہم کو مل جائیں یعنی ان کی تکمیل ہو مگر آرزو یہ ہے کہ کوئی آرزو بھی پوری نہ ہو تاکہ ہم خواہشوں سے بے نیاز ہو جائیں۔

ہم بھی فلک سے کرتے ہیں کس چیز کی طلب
ڈھونڈا پر اپنے دل میں تو کچھ چاہ نہیں

پر یہاں درد کچھ مت رکھو ترقی اور تنزل کا
کر اپنے ذہن میں تو گدا بھی شاہ ہوتے ہیں

ترقی اور تنزل، بزرگی اور کمتری اور امیری و غریبی میں کوئی تمیز کرنا صحیح نہیں ہمارے ذہن و خیال میں تو گدا بھی شاہ ہیں۔

کر زندگی اس طور سے اے درد جہاں میں
خاطر پہ کسو شخص کے تو بار نہ ہووے

یارب درست گو نہ رہوں تیرے عہد پر
بندے سے پر نہ ہو کوئی بندہ شکستہ دل

یارب میں نے تجھ سے وعدہ کیا تھا کہ حق بات کہوں گا اور ہر ایک کی برائی اس کے سامنے رکھوں گا تاکہ وہ اس عیب اور برائی کو چھوڑ دے۔ اے خدا میں اس عہد پر قائم نہیں رہ سکوں گا۔ اس لئے کہ میں نہیں چاہتا کہ کوئی انسان کسی انسان کے عیب اور برائی کو اس کے سامنے رکھ کر اس کا دل توڑے۔

آزادی معرفت نے اے درد کبھی
عقدہ نہ کیا قبول جی پر کوئی

کیوں اتنی اٹک رہی ہے قید حیات
یہ بھی جو گرہ سی ہے وہ کھل جائے کبھی

حریت پسند بے نیاز، اور اہل دل لوگوں نے زر و مال کی پرواہ نہ کی سلطنت تخت و تاج کو لات ماری، کسی کا معمولی سا احسان تک گوارہ نہیں کیا۔ ہمیشہ فقر و فاقہ کی زندگی گذاری یہ زندگی کی بندش و گرہ اور پابندی حیات بھی ختم ہو جائے

یہ پردۂ آب و گل کیوں باقی رہے۔ اس کا احسان کیوں اٹھایا جائے۔

خود دار لوگ موت کو نعمت سمجھتے ہیں اور دائمی زندگی اسی کو قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کا بھی یہی نظریہ ہے ؎

موت کیا آ کے فقیروں سے تجھے لینا ہے
مرنے سے آگے ہی یہ لوگ مر جاتے ہیں

جو مزے ہیں مرگ میں سو ہم سے پوچھا چاہئے
کون جانے آہ کیا لذت ہے مر جانے کے بیچ

اہل دل، اہل درد، رند مشرب حضرات کی زندگی میں روڑے اٹکانے والا، اعتراضوں اور نکتہ چینیوں کی بوچھاڑ کرنے والا مردود و فاسق، فاجر اور ملعون کہنے والا، جنت کی کنجی کا مالک، دوزخ کے دروازے میں دھکیلنے والا طبقہ زاہدوں کا ہے جو دنیا کے ہر فرد و بشر کو دوزخی سمجھتا ہے۔ اس طبقہ کا خواجہ میر درد سے بھی اسطہ پڑا ہے انھوں نے بھی اس کی اچھی خاصی تواضع کی ہے۔ اور عقیدہ کشائی کی ہے۔ واعظ اور شیخ اور ناصح بھی اسی طبقے کے لوگ ہیں جن کو شاعر مخاطب کرتا ہے۔

سب سے زیادہ زاہد کو اپنی عبادت و ریاضت پر غرور ہوتا ہے شب و روز نمازیں پڑھتا ہے، تہجد گذار ہے اس کی اشراق کی نماز بھی قضا نہیں ہوتی نفلیں بے شمار پڑھتا ہے جتنی نمازیں پڑھتا ہے اتنا ہی دماغ عرش معلیٰ پر پہنچتا ہے اس عبادت کی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے خواجہ میر درد زاہد سے مخاطب ہوتے ہیں ؎

مت عبادت پہ پھولیو زاہد
سب طفیل گناہِ آدم ہے

اے عابد و زاہد اپنی عبادت گذاری پر گھمنڈ نہ کر اس کی بنیاد گناہ پر ہے نہ حضرت آدمؑ گناہ کرتے نہ دنیا وجود میں آتی۔ نہ یہ عبادت کا

سلسلہ شروع ہوتا۔

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو

دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

اے شیخ مے نوشی کی وجہ سے میرا دامن تجھ کو تر نظر آتا ہے۔ اس کو چشمِ حقارت سے مت دیکھ، اس تردامنی کو جو دیا اور فریب سے مبرا ہے۔ اتنی فضیلت حاصل ہے کہ اگر میں اس کو نچوڑ دوں تو تم تو فرشتے آسمان سے زمین پر اتر کر اس سے وضو کرنے لگیں۔

ہماری اتنی ہی تقصیر ہے کہ اے زاہد

جو کچھ ہے دل میں ترے ہم وہ فاش کرتے ہیں

شیخ نہیں رشک بے گناہی ہوں

موردِ رحمتِ الٰہی ہوں

رحمت کے مستحق وہ لوگ ہوتے ہیں جو برے اعمال کر کے گناہ کرنے کے مرتکب ہوں۔ تمہارے قسم کے جو لوگ گناہ نہیں کرتے اور گناہ سے بچے رہتے ہیں۔ ان کو رحمت کی کیا ضرورت ہے۔ اس لئے تمہاری بے گناہی کو ہماری گناہ گاری پر رشک تو غلط نہیں ہے بلکہ حق بجانب ہے۔

شیخ صاحب کچھ نہ پوچھو خلق ہے وہ فساد

جس میں یاں اصلاح سے بھی فتنے برپا ہو گئے

یہ زاہد کب خطا سے بے خطر ہے

اگر آدم نہیں تو بھی بشر ہے

حضرت زاہد انسانوں کے زمرے میں ہیں اور حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں، اس لئے خطا اور گناہ سے مبرا نہیں ہو سکتے۔ گناہ ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔

اگر انسانیت سے انکار ہے اور بشریت کے دعویدار ہیں تو بھی صاحب شر ہیں۔ معصوم فرشتے کسی صورت سے نہیں ہو سکتے۔

نہ رہ جاوے کہیں تو زاہد محروم رحمت سے
گنہگاروں میں سمجھا کر تو اپنی بے گناہی کو

زاہد کو ہم نے دیکھ لیا جوں نگیں بر عکس
روشن ہوا ہے نام تو اس روسیاہ کا

زاہد کی حقیقت معلوم ہو گئی پتہ لگ گیا اس کی مکاری عیاری اور فریب کاری کا جس طرح نگیں یعنی مُہر پر سیاہی لگائی جاتی ہے۔ اور اس کے اُلٹنے کے بعد نام کاغذ پر آتا ہے روشن ہو جاتے، اسی طرح زاہد روسیاہ نے غلط طریقوں سے اپنا نام روشن کیا ہے۔ دھوکے اور مکر سے اپنے زہد و تقویٰ کو منوایا ہے۔ گویا زاہد مجسم عیاری ہے۔

واعظ کسے ڈراوے ہے یوم الحساب سے
گریہ مرا تو نامۂ اعمال دھو گیا

زاہد کیا کرے ہے وضو گو کہ روز و شب
چاہے کہ دل سے دھووے کدورت سو ہو چکا

وضو کرنے اور نماز پڑھنے کا صرف ہاتھ پاؤں دھونا مقصد نہیں ہے بلکہ دل میں پاکیزگی پیدا کرنا ہے۔ لیکن زاہد جسمانی صفائی کرتا ہے، اس بات کی کوشش نہیں کرتا کہ دل کی کدورت اور خباثت دور کرے یہ اس سے ممکن نہیں ہے۔

جن کے سبب سے دیر کو تو نے کیا خراب
اے شیخ ان بتوں نے مرے دل میں گھر کیا

مدرسۃ العلوم حسین بخش

یہ مدرسہ محلہ حویلی بختاور خاں بازار مٹیا محل دہلی میں واقع ہے۔ اس کے بانی شیخ حسین بخش پنجابی سوداگروں میں سے ایک دیندار متبع سنت معزز آدمی تھے۔ دلی کے پرانے بزرگوں سے سنا گیا ہے کہ حسین بخش صاحب شاہی فیل خانے میں ملازم تھے۔ شاہی فیل خانہ لال قلعے کے لاہوری دروازے کے باہر محبوب علی خاں وزیر اعظم بہادر شاہ اور شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کے مزار کے درمیان واقع تھا۔ اب محل کی جگہ سڑک الگن روڈ اور لال مندر ہے۔ کنارہ خندق سے فیلخانے کی شرقی دیوار پچاس میٹر کے فاصلہ پر تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے روزنامچے میں حسین بخش صاحب کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے اس مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ اور زمین دی تھی۔

۳۰ اپریل ۱۸۴۷ء۔ ایک دوسرے شقہ میں صاحب کلاں بہادر کے نام تحریر فرمایا کہ صاحب آبادی کے حمام کی پشت پر جو زمین پڑی ہوئی ہے وہ ہم نے مسجد حسین بخش کی تعمیر کے لئے مسجد کے مہتمم کو مرحمت کی ہے (۴۲۴)

۱۷ ستمبر ۱۸۴۷ء حسین بخش سوداگر کے نام کے شقہ جاری ہوا کہ عید گاہ میں ایک خوبصورت چبوترہ بنوا دو۔ پتھر وغیرہ کی ضرورت ہو تو پرانے قلعہ سے منگا لو۔ اس میں کوئی مزاحمت نہیں کرے گا۔ اس امر کے متعلق مجسٹریٹ بہادر

ضلع دہلی کے نام بھی ایک خط انگریزی میں روانہ کیا گیا ہے۔

اس روزنامچہ کی عبارت سے تو اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ حسین بخش صاحب ایک سوداگر تھے شاہی فیل خانہ کی ملازمت کی اس سے تکذیب ہوتی ہے۔

روزنامچہ بہادر شاہ ظفر پر ایک نظر اور ڈالی تو شروع صفحہ ۷ اپریل ۱۸۷۵ء کے روزنامچہ میں حسب ذیل عبارت تحریر ہے۔

حسین بخش بزاز نے پانچ ہزار روپیہ کا دعویٰ منشی شیر علی خاں پر حضور کیفیں صاحب بہادر جج شاہجہاں آباد کی عدالت میں دائر کر رکھا تھا۔ اس کا فیصلہ مدعی کے حق میں سُنایا گیا۔"

اگر یہ حسین بخش وہی سوداگر ہیں جن کا ذکر مذکورہ روزنامچوں میں آیا ہے تو ان کے پیشہ کی بھی صراحت ہوگئی کہ وہ بزازی کا کاروبار کرتے تھے (صابری)۔

آخری مغل بادشاہ سراج الدین ظفر بہادر شاہ (المتوفی ۱۲۷۹ھ) عہد سلطنت تھا اس زمانے میں مولوی نوازش علی شہر شاہجہاں آباد میں ایک جید اور خوش تقریر عالم تھے جو حضرت شاہ محمد اسحٰق رحمتہ اللہ علیہ (نواسۂ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد تھے یہ جامع مسجد میں وعظ کہا کرتے تھے اور مسجد کھجور والی بازار کٹرہ بنگش کے قرب وجوار میں ان کا مکان تھا۔ مقام بونڈلی ضلع کرنال کے رہنے والے تھے۔ مولوی صاحب کا وعظ پُراثر اور مو حدانہ ہوتا تھا نا جائز رسم ورواج اور بدعات کی تردید کرتے تھے ان کی روز افزوں مقبولیت اور صاف گوئی سے مبتدعین اور سرکاری مولویوں میں کھلبل پڑگئی اور اُن کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ دربار شاہی میں اُن کی شکایتیں پہنچنے لگیں حسین بخش صاحب جو مولانا سے عقیدت رکھتے تھے۔ انھوں نے معاملے کی نزاکت کو محسوس کیا۔ اور آپ کے وعظ اور ارشاد کے لئے محلہ حویلی بخاور خاں میں دارالھدیٰ والوعظ

تعمیر کیا اور مولانا سے عرض کیا کہ آپ اس فقرہ میں تہ پڑے ہیں آپ کے لئے مدرسہ بنا رہا ہوں آپ امن وعافیت کے ساتھ وہاں تعلیم وتدریس اور وعظ وارشاد کا سلسلہ جاری رکھ سکیں گے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے جامع مسجد میں وعظ کہنا ترک کر دیا اور دارالھدیٰ والواعظ میں تعلیم وتدریس اور جمعہ کے جمعہ وعظ کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ ہنگامہ ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۴ھ کے بعد تک حیات رہے۔ اور آخر دم تک وعظ وارشاد میں مشغول رہے۔ آپ کا وعظ بہت مقبول تھا۔ شہر میں مختلف مقامات پر لوگ وعظ کراتے تھے۔ وعظ میں بے انتہا اژدحام ہوتا تھا۔ سارا مدرسہ آدمیوں سے بھر جاتا تھا۔ وعظ کا نذرانہ ہرگز قبول نہیں کرتے تھے۔ سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں اور مرزا حیرت دہلوی نے اخبار کرزن گزٹ میں ان کی حقانیت، پاکبازی، استغنا وغیرہ کی بڑی تعریف کی ہے۔

دارالھدیٰ والوعظ مدرسہ حسین بخش کا اصلی نام ہے جو مدرسے کے صدر دروازہ کی پیشانی پر سنگِ مرمر کے کتبے پر کندہ ہے۔ یہی نام مادۂ تاریخ ہے۔ اس سے ۱۲۴۰ھ ہجری سنہ نکلتا ہے۔ اندر مسجد کے پیش طاق اور مغربی دروازہ پر بانی کے نام کا سجع "یارب گناہ بطفیل حسین بخش" خط نسخ میں کندہ ہے۔ لیکن بعد میں اس مدرسہ کا نام مدرسۃ العلوم رکھا گیا۔ کب اور کس نے یہ دوسرا نام رکھا پرانا ریکارڈ مفقود ہے، اس کا پتہ نہیں لگتا ہاں یہ مشہور ہے کہ سرسید احمد خاں مرحوم نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا نام مدرسۃ العلوم اس مدرسہ کے نام پر ہی رکھا تھا۔ فارغ ہونے والے طلبا کو جو اسناد دی جاتی ہیں۔ ان پر

(حاشیہ ص ۲۹۸) لہ آثار الصنادید سرسید احمد خاں ۲ہ مرزا حیرت دہلوی اخبار کرزن گزٹ ۱۹۱۴ء مورخہ ۸ مارچ ۱۹۱۲ء

عنوان سند الفراغ من مدرسۃ العلوم المعروف بمدرسہ حسین بخش لکھا ہوا ہے۔ نیز پیتل کی مہر جو اسناد پر لگائی جاتی ہے۔ اس میں بھی مدرسۃ العلوم کندہ ہے۔ اس مہر میں پوری عبارت "مدرسۃ العلوم دہلی ۱۳۱۱ھ" ہے۔ یہ تحقیق نہیں ہو سکی کہ مدرسۃ العلوم ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء میں ہی اس مدرسہ کا نام رکھا گیا یا اس سے پہلے ہی یہ مدرسہ اس نام سے موسوم تھا۔ مختلف قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ابتداء میں یہ مدرسہ وعظ و ارشاد کا مرکز بنا جیسا کہ اس کے اصلی نام سے پتہ چلتا ہے پھر باقاعدہ علوم عربیہ کی درسگاہ کی شکل اختیار کر گیا اور جیسے ہی درسگاہ کی حیثیت میں آیا اس کا نام مدرسۃ العلوم رکھا گیا ہو۔

محمد شمیم قاسمی

مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جن زمانے میں مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ (صدر مدرس مدرسہ دہلی) کے پاس رہتے اور پڑھتے تھے مولوی نوازش علی کی مسجد میں طلبہ کا اجتماع ہوتا تھا۔ بحث و مناظرہ مطالعہ و تکرار کا شغل رہتا تھا وہاں مولانا نانوتوی بھی جاتے تھے اور طالب علمانہ بحثوں میں حصہ لیتے تھے[۱] مورخین اور تذکرہ نویس ساکت و صامت ہیں کہ مولوی نوازش علی کی وہ مسجد جس میں طلبہ کا مجمع رہتا تھا کونسی مسجد تھی۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ وہ مسجد یہی مدرسہ دارالہدیٰ والوعظ ہوگا۔ چونکہ مولوی نوازش علی کے لئے منزرۃ اس کو چھپا کیا گیا۔ اور مولوی صاحب مشاہیر علماء میں سے تھے اس لئے تذکرہ نویسوں نے اس کو ان کے نام سے منسوب کر دیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی جب ۱۲۶۰ھ میں مولانا مملوک العلی کے ساتھ دہلی آئے تو ان کی عمر ۱۰-۱۱ سال کی تھی۔ دارالہدیٰ والوعظ کا سن تعمیر ۱۲۶۸ھ ہے جبکہ مولانا نانوتوی کا عین نوجوانی کا زمانہ تھا۔ اس سے قبل مولوی نوازش علی کی مسجد اگر کوئی ہوگی تو وہی مسجد کھجور والی ہو سکتی ہے جس کے قریب ان کا مکان تھا۔

[۱] حالات طیب مولانا محمد قاسم نانوتوی مصنفہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی

مولوی نوازش علی سے سرسید احمد خاں نے بھی پڑھا ہے[۱]۔ اور خواجہ حالی نے بھی مدرسہ حسین بخش میں داخل ہو کر مولوی صاحب موصوف سے تعلیم حاصل کی[۲]۔ آپ کے زمانے میں کبھی کبھی مدرسے میں میر محبوب علی بھی وعظ کہتے تھے۔ جو کہ شیخ منگلو میں جو مسجد ہے انھیں کے نام سے مشہور ہے۔ یہ وہی میر صاحب ہیں جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں جہاد کے فتوے پر دستخط نہیں کئے تھے[۳]۔ مولوی نوازش علی کی وفات کے بعد کچھ عرصے تک غالباً میر محبوب علی وعظ کہتے رہے۔ ان کے بعد مولوی محمد حسین صاحب فقیر جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اس مدرسے میں تشریف لائے۔

آپ کا وعظ ہر جمعہ کو ہوتا تھا۔ آپ بھی بڑے متبحر اور معمر رسیدہ عالم تھے۔ وعظ میں خالص قرآن و حدیث کا بیان ہوتا تھا۔ رطب و یابس اور قصہ گوئی سے پرہیز کرتے تھے۔ لوگ ان کو خوش طبعی کے طور پر مولانا گنگوہی کا کوتوال کہا کرتے تھے[۴]۔

حق بات ہمیشہ کڑوی ہوتی ہے۔ غالباً ۱۳۱۵ھ میں متولیوں نے مولانا فقیر کو علیحدہ کر کے مولوی کرامت اللہ خاں کو لانا چاہا۔ اس پر متولیوں کے اور اہل شہر کے درمیان بڑا ہنگامہ ہوا حتیٰ کہ پولیس کو مداخلت کرنی پڑی لیکن مولانا فقیر نے متولیوں کے فیصلے کو مقدم رکھا اور فتنے کو فرو کرنے کے لئے علیحدگی اختیار کر لی[۵]۔ اس کے بعد آپ ترکمان دروازے کی طرف مسجد برنے والی میں وعظ فرماتے رہے۔ آپ کے صاحبزادوں (مولوی محمد ابراہیم وغیرہ) نے شیخ کریم بخش ساکن ترکمان دروازہ اور دیگر اہل شہر کے چندہ سے محلہ حویلی بختاور خاں کے بالمقابل محلہ گڑھیا کے اندر ۱۳۲۲ھ میں مدرسہ حسینیہ

۱۔ حیات جاوید
۲۔ یادگار حالی
۳۔ روشن مستقبل
۴۔ بروایت مولانا احمد سعید رح
۵۔ کرزن گزٹ۔

تعمیر کیا۔ اور مولانا اس میں ہر جمعہ کو وعظ فرماتے رہے۔ غالباً ۱۳۲۳ھ میں مولانا فقیر رح کی وفات ہو گئی اور ان کی جگہ مولوی محمد ابراہیم کا سلسلۂ وعظ شروع ہوا۔ ادھر مدرسہ حسین بخش میں بھی ہر جمعہ کو مولوی کرامت اللہ خاں کا وعظ ہوتا تھا دونوں حضرات اپنے اپنے وعظ میں ایک دوسرے کی تردید کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ مولوی محمد ابراہیم صاحب کا اثر اور مقبولیت بہت بڑھ گئی۔ اہلِ شہر اور متولیانِ مدرسہ حسین بخش بھی اس سے متاثر ہوئے اور مولوی کرامت اللہ خاں کے خلاف ہو گئے۔ آخر پریشان ہو کر انھوں نے مدرسہ حسین بخش کو چھوڑا اور کوچہ قابلِ عطار کی راہ لی۔

مولوی کرامت اللہ خاں کے بعد کچھ عرصے تک غالباً یہاں وعظ کا سلسلہ بند رہا۔ کبھی کبھی مولوی داروغہ یا مولوی شیدا خاں وعظ کہہ دیا کرتے تھے۔

مدرسے کے اساتذہ متولیان کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے مدرسے کا پرانا ریکارڈ ناپید ہو چکا ہے، اور معلوم نہیں کہ مولوی نوازش علی کے بعد کون کون حضرات صدر مدرس رہے ہیں۔ البتہ اتنا معلوم ہوا ہے کہ ۱۳۲۵ھ سے ۱۳۳۶ھ تک مولوی عبدالعزیز صدر مدرس رہے اور ان کے بعد مولانا نورالحسن صاحب دیوبندی صدر مدرس اور واعظ رہے اور اُن کی وفات کے بعد ان کے فرزند مولانا قاری عبدالشکور صاحب ۱۳۵۲ھ سے ۱۳۶۲ھ تک صدر مدرسی اور وعظ و ارشاد کے فرائض انجام دیتے رہے پھر وہ حجاز کی طرف ہجرت کر گئے اور مولوی ممتاز بیگ صاحب اور پھر مولوی عبدالقیوم پشاوری صدر مدرس رہے۔ ذیقعدہ ۱۳۶۵ھ میں مولانا مظاہر امام صاحب بہاری

لہ بروایت مولانا احمد سعید رح

تشریف لائے۔

مولانا مظاہر امام صاحب کے زمانے میں مولانا سید محمد ادریس صاحب سکروڈوی اور مولانا دوست محمد صاحب مدرس رہے۔ مولانا محمد ادریس صاحب کے انتقال کے بعد مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی مدرس ہوئے اور کسی وجہ سے مولانا مظاہر امام صاحب مدرسہ چھوڑ کر گجرات تشریف لے گئے تو کچھ عرصہ صدر مدرس کی جگہ خالی رہی اور تعلیمی معیار بالکل ہی گر گیا تو حضرت مولانا سید محمد میاں رح کی کوشش سے ۱۳۸۲ھ میں مولانا مفتی فضل الرحمٰن صاحب فاروقی مرادآبادی تشریف لائے اور آجکل بھی موصوف ہی صدر مدرس ہیں۔ ۱۳۸۲ھ میں دورۂ حدیث شریف کا سلسلہ نہیں تھا ۱۳۸۳ھ میں پھر دورۂ حدیث شریف کا آغاز ہوا مولانا محمد شمیم صاحب قاسمی اور مولانا دوست محمد صاحب پنجابی مدرس رہے اب الحمد للہ مدرسہ میں درس نظامی کے لئے چھ اساتذہ کام کر رہے ہیں۔ مکتب میں ایک حافظ ہیں۔ نیز جمعہ کی نماز اور وعظ مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی سے متعلق ہے۔ نماز پنج وقتہ کے لئے دوسرے امام ہیں۔ مدرسہ کی مسجد کے لئے موذن الگ ہیں اور ایک محرر بھی ہیں۔ اس طرح دس حضرات باہشاہرہ کام کر رہے ہیں۔ ۱۳۸۳ھ میں صرف ۱۹ طالب علم داخل کیے گئے لیکن الحمد للہ ہر سال طلبا کی تعداد بڑھتی رہی۔ امسال ۱۳۸۹ھ میں ۷۷ طالب علم عربی درجات میں داخل ہیں، جبکہ مکتب میں ایک سو سے زیادہ مقامی بچے قرآن پاک حفظ و ناظرہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

محمد شمیم قاسمی

انتظام و تولیت

مدرسہ کے انتظام و تولیت کے ابتدائی دور کے حالات کا پتہ نہیں چلتا کہ کون لوگ منتظم و متولی رہے صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ حسین بخش صاحب کے خاندان میں ہی اس کی تولیت رہی۔

بیسویں صدی عیسوی کے شروع میں حاجی محمد اسماعیل اور ان کے بعد ان کے دو لڑکے عبدالرشید اور عبدالغنی اس کے متولی رہے۔ عبدالرشید کے انتقال کے بعد متولی دوم عبدالغنی شملہ والے نے ۲۲ اگست ۱۹۳۸ء کو اپنے برادر حقیقی شیخ محمد یوسف کو اور شیخ محمد صدیق ولد شیخ محمد ابراہیم کو متولی مقرر کیا۔[۵]

شیخ محمد یوسف کے انتقال کے بعد شیخ محمد صدیق نے پھر سابق ٹرسٹی شیخ عبدالغنی کو تولیت میں اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ یہ سب ٹرسٹی حسین بخش مرحوم کے خاندان سے ہیں۔ شیخ عبدالغنی چونکہ کبیر السن اور مصروف آدمی تھے تولیت کی ذمہ داریوں سے گھبراتے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں انھوں نے پھر تولیت کو منتقل کیا اور شیخ محمد صدیق کے صاحبزادے شیخ محمد یونس ساکن محلہ بلی ماران اور دوسرے محمد شفیع ولد محمد صدیق ثانی ساکن محلہ حویلی بخشاور خاں کو متولی بنادیا۔ واضح ہو کہ مدرسہ کے متعلق کچھ جائداد اور مکانات وقف ہیں جس کی آمدنی سے مدرسہ کے تمام مصارف پورے ہوتے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں محمد شفیع صاحب سے کچھ ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں ظہور پذیر ہوئیں جن سے مدرسے کو سخت نقصان پہنچنے کا قوی امکان تھا۔ جب علاقے کے مسلمانوں کو اس کا علم ہوا تو ہلچل مچ گئی اور شہر کے ایک ہر دلعزیز لیڈر میر مشتاق احمد (سابق ایم ایل اے) نے مداخلت کر کے اس کا بروقت سد باب کیا اور مورخہ یکم فروری ۱۹۴۷ء (۹ ربیع الاول ۱۳۶۶ھ) کو معززاہل شہر کے ایک اجتماع میں مندرجہ ذیل حضرات پر مشتمل ایک انتظامیہ کمیٹی بنادی گئی۔

حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی کفایت ۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحب ۔ شیخ محمد یونس صاحب سابق ٹرسٹی ۔ مولانا اخلاق حسین قاسمی ۔ مولانا محمد سعید صاحب

---

[۵] از روئے دستاویزات محفوظہ دفتر سنی مجلس اوقاف صوبہ دہلی۔

شیخ[9] حافظ رحمت الٰہی صاحب۔ شیخ محمد[10] احمد صاحب ایم اے۔ سلطان[11] یار خاں صاحب۔ شیخ[12] محمد رفیع صاحب صابون والے۔ حکیم[13] حاجی شریف الدین بقائی۔ شیخ سراج[14] الدین صاحب اسٹور والے۔ مولانا[15] مولوی مظاہر امام صاحب صدر مدرس۔ شیخ محمد[16] غیاث الدین صاحب۔ حاجی بدر[17] الاسلام صاحب تاج جنت۔ شیخ عبد[18] الجبار صاحب ولد شیخ احسان الٰہی صاحب جنرل مرچنٹ۔

ان پندرہ ارکان نے حضرت مفتی اعظم کو سرپرست اور شیخ سراج الدین اسٹور والے کو منتظمہ کمیٹی کا ناظم منتخب کیا۔ مگر حضرت مفتی اعظم نے اس تعلق کو منظور نہیں فرمایا تو آپ کی جگہ مفتی عتیق الرحمان صاحب کو رکن اور حکیم شریف الدین صاحب کو صدر بنایا گیا۔

اس ہنگامے کے موقع پر سابق ٹرسٹی شیخ عبد الغنی نے دستاویزات متعلقہ کو سنی مجلس اوقاف صوبہ دہلی کے سپرد کیا تھا جو اس کی تحویل میں تھیں۔ چنانچہ سنی مجلس اوقاف نے مدرسہ اور اس کے اوقاف متعلقہ کو براہ راست اپنے انتظام میں لینے کے لئے نوٹس دیا۔ مفتی عتیق الرحمان صاحب جو اس وقت سنی مجلس اوقاف کے بھی رکن تھے۔ انھوں نے اس کی مخالفت کی اور شوکت علی عباسی مرحوم ناظر سنی مجلس اوقاف کو سمجھایا کہ مدرسے کی مستقل تشکیل انتظامیہ برقرار رکھیں۔ ناظر صاحب نے اس مشورے کو مان لیا مگر فرمایا کہ اتنی بڑی مجلس انتظامیہ کی ضرورت نہیں لہٰذا اس کو توڑ کر مجلس اوقاف کی طرف سے مورخہ ۵ نومبر ۱۹۴۲ء مطابق ۲ محرم ۱۳۶۲ھ کو سات ارکان پر مشتمل نئی منتظمہ کمیٹی نامزد کی گئی۔ اس کے ارکان مندرجہ ذیل ہیں:۔

مولانا[1] مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی۔ حافظ[2] حاجی رحمت الٰہی صاحب معتکف۔ مولانا[3] قاضی سجاد حسین صاحب۔ صدر مدرس مدرسہ فتحپوری۔ حکیم[4] حاجی

شریف الدین صاحب بقائی، شیخ بدرالاسلام صاحب تاجر جعفت۔ شیخ عبدالغنی صاحب سابق متولی۔ شیخ سراج الدین صاحب اللہ والے۔ اول الذکر اس کمیٹی کے صدر اور آخر الذکر سکریٹری ہیں۔ راقم حفیظ الرحمان واصف ۱۹۵۹ء

اب ۱۹۷۸ء (۱۳۹۸ھ) میں مجلسِ منتظمہ کے ارکان حسب ذیل ہیں:۔

مولانا مفتی عتیق الرحمان صاحب عثمانی۔ مولانا قاضی سجاد حسین صاحب صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری۔ حاجی محمد فاروق صاحب آئل کلاتھ والے حاجی محمد شفیع صاحب پیکارڈ واچ کمپنی۔ حاجی سمیع الدین صاحب اشن والے مولانا مفتی فضل الرحمن صاحب صدر مدرس مدرسہ ہٰذا حکیم شریف الدین صاحب بقائی۔ حاجی چراغ الدین صاحب اللہ والے۔

حکیم صاحب مجلس منتظمہ کے صدر اور حاجی چراغ الدین صاحب سکریٹری ہیں۔

مدرسہ کی جائداد اور مالی حیثیت

مدرسہ کے قریب ہی کچھ مکانات ہیں اور کچھ چاندنی چوک میں ہیں جن کے کرایہ سے مدرسہ کی ضروریات پوری کی جاتی رہی ہیں۔ مدرسہ کے احاطہ میں بھی مشرقی اور مغربی دونوں دروازوں کے اندر طلبا اور اساتذہ کے قیام کے لئے کمرے اور مکانات بنے ہوئے ہیں۔ مگر ضروریات مدرسہ میں تنگی کے پیش نظر مکانات اور کچھ کمرے بھی کرایہ پر دیدیئے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سالہائے ماسبق میں متولیوں نے حالات پر قابو پانے کے لئے یہی سہل راستہ دیکھا تھا اور مستقبل میں اس مدرسہ کی ترقی کے روشن امکانات سے مایوس ہو چکے تھے۔

کچھ عرصہ پہلے حاجی سراج الدین اللہ والے نے مکتب کی عمارت گر جانے پر فوری قدم اٹھایا اور اپنے مخصوص احباب کی اعانت سے صرف مکتب کی تعمیر نہ کرائی بلکہ مکتب پر پانچ کمرے بھی تعمیر کرائے اور کرایہ پر دیدیئے۔ ان کمروں کی

تعمیر سے پہلے مدرسہ کی کرایہ سے آمدنی ساڑھے چھ سو روپے ماہانہ تھی اور اب کرایہ سے ماہانہ آمدنی ایک ہزار روپے ہے مگر ہر شخص پر ظاہر ہے کہ ایک ہزار روپے ماہانہ میں دینی ملازمین کی تنخواہیں اور ۵۰ سے لیکر ۶۰ طالب علموں کے وظائف ماہانہ کس طرح دیئے جاتے چنانچہ صدر المدرسین حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم کے ایماء پر خادم نے سالانہ اور ماہانہ چندے کی اسکیم شروع کر دی اور مسلمانانِ دہلی نے اس اقدام کو بنظرِ تحسین دیکھا اور حوصلہ افزائی کی۔ اس سلسلہ کو مزید ترقی دینے کے لئے مولوی اعجاز اللہ صاحب مدرس مدرسہ ہٰذا کو آمادہ کیا گیا۔ چنانچہ آپ بھی رمضان میں اور عید الاضحیٰ کے موقع پر چرمِ قربانی کے ذریعہ کافی رقم فراہم کرتے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں چندہ کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس سے پہلے قربانی کی کھالیں مدرسہ میں آتی تھیں یا حضرت مولانا محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ رمضان کے وعظ میں چندے کی اپیل کرتے تھے۔ ان سابقہ ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ قراش خانہ، پھاٹک حبش خاں، بلی ماران اور دوسرے علاقوں سے اہل خیر حضرات چندہ دینے خود آتے تھے۔ مولانا نور الحسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے زمانہ میں اس طرح کا چندہ مدرسہ میں آتا تھا۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت مولانا عبد الشکور صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں یہ سلسلہ جاری رہا۔[1]

---

[1] دار العلوم مدرسہ حسین بخش مؤلفہ مولانا حفیظ الرحمٰن واصف بتصرف نقل کیا گیا ہے، اس مضمون میں مولانا محمد شمیم صاحب نائب صدر مدرس مدرسۃ العلوم حسین بخش کے حاشیے شائع ہوئے ہیں۔

دہلی کی پنجابی برادری کے اشخاص کا جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں شرکت

ہندوستان کے جنوب مغرب پر انگریزوں کا تسلط ہو چکا تھا۔ اور سامراج کا اپنا منحوس سایہ اپنی منحوس سازشوں اور سفاکیوں کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ تاریخ ۱۸۵۷ء کی منزل تک پہنچی تھی۔ دہلی کے گلی کوچوں میں یہ خبر عام تھی کہ انگریز اب ہندوستان کے دارالخلافہ دہلی پر بھی قبضہ کرنا چاہتا ہے، ساتھ ہی ہندوستان کے دور و قریب کے علاقوں سے مسلح فوجی اس آخری مورچہ کے لئے دہلی میں جمع ہو رہے تھے، دہلی کے عوام پوری فراخدلی سے مجاہدین کی میزبانی اور اُن کے اسلحہ و گولہ بارود کے لئے روپیہ فراہم کر رہے تھے۔ دہلی پنجابی برادری کے افراد بھی اس معرکے میں پیچھے نہیں تھے، ایک طرف وہ بہادر شاہ ظفر کی مالی مشکلات میں ان کے ممد و معاون تھے، دوسری طرف مجاہدین کے بڑے مورچہ کی سپلائی پر متوجہ تھے۔

صابر بخش

آپ پیچھے کی قطاروں میں فراہمی سامان کا کام کرنے والوں میں سے ایک تھے ویسے یہ ایک تاجر تھے اور بازار تیماران میں اُن دنوں اُن کا کاروبار تھا وہ دکان کے کاموں کو چھوڑ کر مجاہدوں کے پیچھے پیچھے

تھے۔ وہ اپنے ہم مجلسوں کو جمع کرتے اور انگریزوں کے مقابلہ کے عظیم مقصد کی تدابیر کے لئے اجتماعی فیصلے کرتے اور مساجد کے خطیبوں سے جا کر ملتے وہ نمازوں اور خاص طور پر جمعہ کی نمازوں میں جہاد کی تلقین کرتے تھے۔ صابر بخش صاحب کئی کئی دن گھر واپس نہ آتے تھے اور دہلی کے گلی کوچوں میں تنظیم کے کام میں ڈٹے رہتے تھے۔ مئی ۱۸۵۷ء تا ستمبر ۱۸۵۷ء میں بڑے معرکہ کا مورچہ ہوا۔

آگے صفوں میں لڑنے والے ہر مذہب و ملت کے لوگ تھے لیکن مسلمان سب سے زیادہ تھے، انگریزی سامراج کے مقابلہ پر نہ صرف بوڑھے اور جوان بلکہ دھوں میں نہار رہے تھے بلکہ چودہ پندرہ سالہ مسلمان بچوں کی کئی ہزار افواج جو کہ کوچہ چیلان میں آخری معرکہ ستمبر کے لئے منظم ہوئی تھی موری گیٹ کے مورچے پر انگریزی توپوں کے دہانوں پر چڑھتے ہوئے کام آئی اور انگریز دہلی میں داخل ہو گئے، مقابلہ دہلی کے اندر بھی جاری تھا۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ایک مسلمان برقعہ پوش پنجابی برادری کے محلہ سے باہر مسجد فتحپوری کے نقلی بازار کھاری باؤلی میں گھوڑے پر سوار ننگی تلوار ہاتھ میں انگریزی فوجوں کو مارتی کاٹتی ہوئی آئی اور زخمی ہو کر گرفتار ہوئی لیکن تاریخ اس مجاہد عورت کا نام بتانے سے قاصر ہے۔

انگریزوں کے قبضہ کے بعد جو ہزاروں ہندو مسلمان گرفتار ہوئے ان میں صابر بخش بھی تھے کئی مقامات بالخصوص خونی دروازہ پر اور سنہری مسجد پر مجاہدین کو دار پر چڑھا نے کے لئے پھانسیاں لگی ہوئی تھیں۔ صابر بخش بھی زنجیروں اور رسیوں میں گرفتار سنگینوں کے سایہ میں سنہری مسجد کی پھانسی پر لائے گئے۔ یہ تین سو افراد تھے اور چھ پھانسیاں ایک وقت میں چھ کے حلقوں میں پھندے لگا رہی تھیں، چھ لاشیں تخ بستہ ہونے کے بعد اور چھ نوجوان تختہ دار پر چڑھ جاتے

جا رہے تھے کہ ستمبر کے مہینے میں دہلی میں جو کالی آندھیاں آتی ہیں ساہی قسم کی کالی آندھی کا طوفان آیا، گرفتار مجاہدوں نے موقعہ غنیمت جان کر زنجیروں اور رسیوں کو توڑا اور کھولا۔ یہ دو ڈھائی سو کے قریب تھے، انگریزی سنگینوں اور بندوقوں کی تعداد پچیس سے زیادہ نہ تھیں سنگینیں اور بندوقیں چلیں لیکن بڑی اکثریت فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ فرار ہونے والوں میں صابر بخش بھی تھے صابر بخش بزنی کی طرف گئے اور سات برس روپوش رہے، یہ اس وقت بھی جہاں جاتے جہاں بیٹھتے انگریزوں کے خلاف جہاد کی بات کرتے تھے۔

سات برس بعد جب دلی واپس ہوئے تو اسی سنہری مسجد کے نیچے ایک چھوٹی سی دکان کرایہ پر لی۔ چرخی پر سوت چڑھایا اور ریشے دھیلے کی چیپی فروخت کرنے لگے۔ یہ ان کی زندگی کا دوسرا محاذ تھا لیکن اپنے پہلے محاذ پر یعنی انگریزوں کے خلاف دامے، درمے، سخنے وہ زندگی بھر ڈٹے رہے لیکن کاتی پیچھے رہ کر آگے کی زندگی میں ان کا سوت چرخا چلتا رہا۔ اور چیپی فروخت ہوتی رہی۔ اب کے بعد بیٹے فضل الٰہی بھی انہی خطوط پر چلتے رہے لیکن فضل الٰہی صاحب کے صاحبزادے محبوب الٰہی نے انگریز دشمن محاذ پر نمایاں کام انجام دیئے۔ انھوں نے حضرت اسمٰعیل شہید کی سوانح حیات اور ان کی دیگر مطبوعات لا تعداد چھپوائیں۔ اور ۱۹۱۸ء سے مفت تقسیم کی تاکہ پورا ہندوستان کا ذہن متاثر ہو۔ اسماعیل کے بچے کچھے ہوئے ساتھیوں کی اولاد آزاد قبائل کے علاقوں میں بیٹھی انگریز استبداد کے نوّے سالہ دور میں برابر ہی جہاد کرتے رہے۔ محبوب الٰہی صاحب نے حمید اللہ سوت والے، حاجی عبداللہ سوت والوں کے ساتھ مل کر ایک ایسا گروپ بنایا جو آزاد قبائل کے ان مجاہدین کی مالی امداد کرے تاکہ ہتھیار اور گولہ بارود کی خریداری اور جہاد آزادی جاری

رہے یہ واقعہ ۱۹۱۸ء کے لگ بھگ کا ہے کہ ہر دو تین ماہ بعد مجاہدین کا ایک سفیر آتا اور ایک مرتبہ میں دس پندرہ ہزار کی رقم لے جاتا۔ کچھ عرصہ بعد انگریزی حکومت کو اس کا علم ہوا ان لوگوں کے خلاف چار برس تک مقدمہ چلتا رہا اور الٰہ آباد ہائی کورٹ تک گیا لیکن کوئی تحریری ثبوت اور کوئی گواہ پیش نہ ہو سکا۔ لہٰذا بری کر دئے گئے۔ فضل الٰہی اور محبوب الٰہی صاحب کا بھی سوت گولہ کا کاروبار چلتا رہا لیکن زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے لئے کوشش مسلسل جاری رہی، تحریکِ ترکِ موالات کے زمانہ ۱۹۲۱ء میں محبوب الٰہی صاحب نمایاں نظر آتے ہیں۔ جاوید عمر الٰہی سوت والے لکھتے ہیں:-

میرے اپنے بزرگوں کو محبوب الٰہی کے نام سے جاری ہونے والے اکتوبر ۱۹۲۰ء تک کا وہ اشتہار اور جلسہ عام یاد ہے جس میں عظیم سیاسی رہنما دلی کے حکیم اجمل خاں کی مسجد محتسب میں تشریف لائے تھے اور محبوب الٰہی صاحب کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ آج یہ سب بزرگ اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن غیر ملکی سامراج کے خلاف ان کے بتائے ہوئے راستے آج بھی روشن ہیں۔

محبوب بخش

حافظ عبد السلام مفتی شہر قلعہ کے دو صاحبزادے شیخ محمد امیر الامراء کے تین صاحبزادے شیخ شاہ محمد شیر محمد تک انتقال اور شیخ امام بخش ہوئے۔ شیخ شاہ محمد کے چار صاحبزادے رحیم بخش، کرم بخش، محبوب بخش اور الٰہی بخش ہوئے۔ ان میں سے دو بھائیوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ جب انگریزوں کا دہلی پر قبضہ ہو گیا اور مسلمانوں کو پھانسیاں دینے کا سلسلہ شروع ہو گیا تو کسی نے محبوب بخش کی مخبری کر دی۔ کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ اس کی خبر محبوب بخش کو

بھی ہوگئی اس سے پہلے کہ ان کو گرفتار کیا جاتا۔ وہ روپوش ہوگئے جب فوج ان کو گرفتار کرنے آئی تو ان کے بھائی کرم بخش نے خود کو محبوب بخش ظاہر کرکے گرفتاری کے لئے پیش کر دیا اور پھانسی پانے کے لئے تیار ہوگئے۔ چنانچہ اُن کو دار پر چڑھا دیا۔

عام معافی کا اعلان ہوگیا تو محبوب بخش صاحب برآمد ہوئے بعد میں انھوں نے مسلمانانِ دہلی کی بڑی خدمت انجام دی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جو داگذار کمیٹی بن گئی تو محبوب بخش صاحب بھی اس کمیٹی کے ایک سرگرم ممبر تھے۔ محبوب بخش کے فرزند محمد جان اور ان کے لڑکے احمد جان کمیٹی والے دہلی میونسپل کمیٹی کے ممبر اور لکڑی کے بہت بڑے تاجروں میں تھے[۱]

حاجی قطب الدین

آپ نور محمد صاحب کے صاحبزادے تھے۔ بہت بڑے کاروباری آدمی تھے۔ ان کے زمانہ میں سکہ چہرہ شاہی مروجہ کرنسی تھی اتنا پیسہ آتا اور جاتا تھا کہ اسے گننا مشکل تھا۔ لہٰذا تول تول کر رکھتے تھے۔ رئیس، وقت ہونے کے باوجود پیسے کی ٹوہ نہ تھی کہا کرتے تھے جتنا زیادہ ہوگا اسی قدر قیامت کے حساب وکتاب میں دشواری ہوگی۔

جنگ آزادی میں گندھک، شورہ اور تیزاب مجاہدین دہلی کو سپلائی کرتے تھے۔ اس بات کی خبر انگریزوں کو بھی تھی۔ جنگ کی ناکامی کے بعد مجاہدین کے حوصلے پست ہوگئے تھے روزانہ پھانسی پا رہے تھے مخبروں کی تعداد ایسے وقت میں زیادہ ہو جاتی ہے۔ پرانی دشمنیوں کا بھی بدلہ لیا جاتا ہے۔ کسی مخبر نے انگریزوں کو ان کے متعلق کہہ دیا کہ بہادر شاہ ظفر کی فوج کو فلاں چیزیں سپلائی کرتے تھے چنانچہ آپ کو گردن زدنی کا حکم ملا۔ آپ روپوش ہوگئے اور ادھر اُدھر چھپتے پھرے۔ اُن کی عظیم الشان کوٹھی پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ یہاں پر کرنل براؤن نے سرسری فوجی

[۱] یادرفتگان مرتبہ سلطان رفیع ص۲۵

عدالت قائم کر دی جس میں مجاہدین پر مقدمہ پیش ہوتے تھے۔ مرزا غالب بھی اسی کوٹھی میں پیش ہوئے تھے جب ملکہ نے عام معافی کا اعلان کیا۔ دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح قطب الدین روپوشی سے باہر نکل آئے مگر اس حالت میں کہ کاروبار ختم ہو چکا تھا جائیداد جو بحق سرکار ضبط کر لی گئی۔ کافی کوششوں کے بعد جائیداد واگذار ہوئی۔ انھوں نے واگذار کمیٹی قائم کی تھی جس کے مولانا الطاف حسین حالی بھی ایک رکن تھے۔ ایچ، ایس ابراہیم ڈھاکہ والے رقم طراز ہیں:۔

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے دہلی میں داخل ہو کر آخر مغل شہنشاہ کے مددگاروں اور ساتھیوں کو چن چن کر ختم کیا۔ ان کو حاجی قطب الدین کی تلاش جو بہادر ظفر کے حامیوں اور مددگاروں میں سے تھے مگر حاجی قطب الدین بچ کر نکل گئے وہ لنکا جا پہنچے اور وہاں ٹیپو سلطان کے بچے کھچے اہلِ خاندان کو جمع کر کے ان کو دوبارہ انگریزوں کے خلاف لانے کی کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہوئے۔ انگریزی فوجی گورنر کرنل بلاؤن نے دہلی کے چاندنی چوک بازار میں قطب الدین کی کوٹھی پر قبضہ کر کے اسے اپنی قیام گاہ بنالی تھی۔

حاجی قطب الدین اور ان کے والد نور محمد سوداگر کو مغل بادشاہ کی طرف سے ملک التجار کا خطاب دیا گیا تھا۔ دہلی بازار کی بارات کے مقابل چاندنی چوک میں موجودہ چھنا مل والوں کی وسیع کوٹھی حاجی قطب الدین کا تجارتی مرکز تھی۔ جس پر پہلے انگریز گورنر نے قبضہ کر کے خود رہائش اختیار کی اور وہاں فوجی عدالت قائم کی، بعد میں یہ کوٹھی چھنا مل کو دیدی۔ جب دہلی میں امن و امان قائم ہو گیا تو حاجی قطب الدین لنکا سے دہلی واپس آ گئے۔ انھوں نے اپنا مال و متاع جو دہلی سے رخصت ہوتے ہوئے کسی جگہ دفن کر دیا تھا اسے نکال کر

دوبارہ تجارت شروع کردی۔ (یادِ رفتگاں ص۲۱)

شیخ محمد حسین باغیتی

شیخ صاحب ۱۸۳۴ء میں دہلی میں پنجابی کٹڑے گلی مسجد یاں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام حاجی حافظ رحیم بخش سیجدے تھا۔ ان کو بہادر شاہ ظفر نے ملک التجار اور امیر الامراء کے خطاب عطا کئے تھے۔ ان کے دادا حاجی کریم بخش بھی شاہی دربار سے وابستہ تھے۔ اور ان کو خان دوراں اور نواب کے خطابات شاہی دربار سے ملے تھے۔ انھوں نے دہلی میں پنجابی کٹڑے میں ایک سرائے بنوائی تھی جس کا نام سرائے کریم بخش تھا۔ اس سرائے کے ساتھ مسجد بھی تھی۔ اس سرائے کے آخری متولی شیخ محمد حسین باغیتی تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران اس سرائے کا نام و نشان مٹا دیا گیا کیونکہ یہ جنگِ آزادی میں مجاہدوں کے استعمال میں رہی تھی۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں شیخ محمد حسین باغیتی بھی اسلحہ کے ممتاز تاجر ہونے کی حیثیت سے ملک کی حق الملک در خدمت انجام دی اور بہادر شاہ ظفر کی فوج کو پہنچایا جس کی وجہ سے قابلِ قتل قرار دے گئے۔ اُن کی گرفتاری کا انعام مقرر ہوا۔ کیونکہ انگریز اُن کا سر چاہتے تھے۔ یہ خاموشی کے ساتھ روپوش ہوگئے۔ کئی بار ان کے گھر پنجابی کٹڑے کی تلاشی لی گئی لیکن یہ چھپتے چھپاتے باغپت پہنچ گئے۔ اور وہاں گمنامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ملکہ وکٹوریہ نے عام معافی کا اعلان کیا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد یہ دہلی چلے آئے تھے۔ انھوں نے اپنی جائیداد واگذار کرانے کی کوشش کی جس میں کامیاب ہوگئے۔ ان کے شمار دہلی کے رئیسوں میں تھا۔ انھوں نے باغپت میں ایک مسجد اور کنواں تعمیر کیا جس پر ان کا نام وسن وغیرہ کندہ تھا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد یہ لاہور منتقل ہوگئے۔ اور وہاں پر انار کلی میں محمد حسین اینڈ سنز کے نام سے

کاغذ کا کاروبار کرنا شروع کر دیا تھا، اس کے علاوہ ٹھیکیداری کا بھی کام کرتے تھے۔ یہ نہ صرف بڑے کاروبار کے مالک تھے جو دہلی، باغپت، لاہور، کلکتہ اور بمبئی تک پھیلا ہوا تھا۔ بلکہ لاہور کی انارکلی کی آدھی سے زیادہ جائیداد کے بھی مالک تھے۔ اس کے علاوہ دہلی، باغپت میں کافی جائیداد اور کئی باغوں کے مالک تھے لاہور جا کر بھی لوگوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں دلچسپی لیتے رہے

اس کے علاوہ دینی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے ویسے تو لاہور کی کئی مساجد کی تعمیرات میں دل کھول کر عطیات دئے لیکن دو مساجد نیو نیا مسجد لاہور اور اونچی مسجد کی تعمیر و ترقی، تزئین و آرائش میں خصوصی دلچسپی لی۔ ان دونوں مساجد کی انتظامیہ کمیٹی کے صدر بھی تھے۔ لاہور آپ گورنمنٹ کے معاملات میں بھی زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ اس بناء پر آپ کا شمار لاہور کے با اثر لوگوں میں ہوتا تھا۔ لاہور ڈسٹرکٹ کونسل کے چیئرمین رہے، لاہور کے بیشتر تنازعات تصفیہ کے لئے آپ کے پاس آیا کرتے تھے اور آپ ان کو خوش اسلوبی سے طے کر دیا کرتے تھے، اس کے علاوہ لاہور اور دہلی کے کافی سے زیادہ دینی مدارس کی اعانت بھی کرتے رہتے تھے۔ لاہور کی بے شمار بیوائیں اور یتیم بچے آپ سے ماہانہ وظیفے پاتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں دہلی میں اپنے مکان واقع بارہ دری نواب وزیر میں انتقال ہوا۔ اور برادری کے قومی قبرستان میں دفن ہوئے۔ لاہور میں جس وقت ان کے انتقال کی خبر پہنچی تو ایک کہرام بپا ہو گیا۔ کیونکہ آپ لاہور کی مشہور و معروف و مقبول ترین سماجی شخصیت تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ لاہور کے در و دیوار اُن کے غم میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اُن کے لاہور کے مکان بانس منڈی میں تعزیت کے لئے آنے والوں کا ایک ہفتہ تک تانتا بندھا رہا[1]

[1] یادرفتگان صـ ۳۳

رسالدار محمد شفیع

رسالدار صاحب ۱۸۲۴ء میں نائب رسالدار کے عہدہ پر فائز تھے اور برما کی جنگ کے بعد رسالدار کے عہدہ پر ترقی ہوئی۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے وقت وہ بریلی میں اپنے رسالہ کے ساتھ متعین تھے صاحب تاریخ مراد آباد تحریر کرتے ہیں :-

"ان کا تقرر نامہ اور دیگر متعلقہ کاغذات از کمپنی بہادر، و بہادر شاہ کم سنی کے زمانہ میں میں نے دیکھے ہیں اور یقیناً اب بھی خاندان کے کسی فرد کے پاس محفوظ ہونگے نیز ان کے اسلحہ جات، بندوق، تلوار، خنجر، بلم بطور یادگار میری صغیر سنی تک چھپا کر رکھے ہوئے تھے۔ جو بعد میں لاپرواہی سے نذر ہوگئے۔ رسالدار صاحب اس مشہور برادری سے تعلق رکھتے تھے جو برِ صغیر اور خصوصاً دہلی اور یوپی میں پنجابی سوداگران کے نام سے جانی جاتی ہے۔"

رسالدار صاحب کے آباؤ اجداد بھی اعلیٰ عہدہ دار تھے اور اسی وجہ سے یہ خاندان کافی بڑی جاگیر اور شہری جائیداد کا مالک تھا۔ رسالدار صاحب کا خاندان کئی پشتوں سے یوپی کے شہر مراد آباد میں مستقل آباد تھا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے موقعہ پر مولوی محمد شفیع رسالدار اور ان کے بڑے والد ان کے صاحبزادے مولوی قمر الدین صاحب اور کمسن پوتے مولوی نجم الدین کی نسلیں موجود تھیں۔

جس وقت جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور شرکت کرلی تو گھر والوں کو الوداع کہنے بریلی سے مراد آباد کے مشہور محلہ کمبل میں ان کی موجودگی کے دوران ایک دن بے پناہ شور بلند ہوا۔ آپ نے مکان سے نکل کر معلوم کیا کیا بات ہے یہ شور کیسا ہو رہا ہے۔ محلہ والوں نے جو بُری طرح گھبرائے ہوئے تھے کہا۔

قاضی کے دیوان خانہ کو فوج نے گھیر لیا ہے۔ وہ فوراً پختہ اینٹ کے بنے ہوئے دو منزلہ مکان کی تیسری چھت پر گئے جو اس وقت محلہ کی واحد پختہ حویلی کا ایک

حقہ تھا دیکھا قاضی عباس کے دیوان خانہ کی طرف توپچیوں نے اپنی توپوں کا منھ کر رکھا ہے آپ فوراً وہاں پہنچے۔ اور ایک توپچی سے گرجدار آواز میں پوچھا۔
یہ رسالہ کس کا ہے؟ باقی خاں کے توپچی نے جواب دیا۔
بلاؤ باقی خاں کو۔ رسالدار صاحب نے حکم دیا۔
جب باقی خاں سامنے آیا تو رسالدار صاحب نے اس سے رعب دار لہجہ میں کہا۔ باقی خاں نے جب رسالدار صاحب کو دیکھا تو اپنی حرکت پر شرمندہ ہوا معافی کا طالب ہوا اور توپخانہ ہٹا کر چلا گیا۔ [1]

محمد عابد شمس صاحب واقعہ کی حقیقت بیان کرتے ہیں ۔
اس واقعہ کا پس منظر یہ تھا کہ قاضی شوکت حسین کے دادا قاضی عباس صاحب کا دیوان خانہ شہر کی مرکزی سڑک پر اپنی شان و شوکت کا مظہر تھا باقی خاں نے جو اس زمانہ میں لوٹ مار کرتا پھرتا تھا اس نے لوٹنے کے ارادہ سے یہ بہانہ تراشا کہ یہاں فرنگی چھپے ہوئے ہیں اور اپنی توپوں کا رخ دیوان خانہ کی طرف کر دیا لیکن اللہ تعالےٰ کو اس خاندان کی حفاظت منظور تھی لہ اس نے رسالدار صاحب کو فرشتہ بنا کر بھیج دیا تھا۔ اس خاندان کے ایک بزرگ قاضی ایقان حسین صاحب بی اے، ایل ایل بی سٹی کورٹ کے احاطہ میں بحیثیت ادتھ کمشنر کام کر رہے ہیں۔ بہر حال رسالدار ادھر سے مطمئن ہو کر گھر واپس آگئے اور گھر کے تمام افراد کو کسی محفوظ مقام پر جانے کی ہدایت کی اور خاندان کے قافلے کو سوائے ضعیف العمر والد کے جنہوں نے اپنی ضعیفی کی وجہ سے مکان نہ چھوڑا۔ اس کے بعد اس مرد مجاہد کا ان کے خاندان والوں کو کچھ پتہ نہ چل سکا سوائے

---

[1] تاریخ مراد آباد مؤلفہ خدا یار خاں۔

روایات کے۔ جیسے تاریخ اودھ میں یا مولانا سید کفایت علی کافی شہید مراد آبادی نے جنگ سپاہی کے ایک سپاہی اور ہم وطن ہونے کی بنا پر خصوصی ربط رکھتے تھے لیکن جب مخبری کی وجہ سے ان کی گرفتاری عمل میں آئی تو انھوں نے گھر کا دروازہ کھولنے سے پہلے تمام اہم تحریریں جلا کر راکھ کر کے پانی میں گھول دیں اور خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر کے سولی پر چڑھ گئے۔ محمد شفیع رسالدار جنرل بخت خاں کے ساتھ ہی نیپال نکل گئے تھے۔ شہید حریت مولانا وہاج الدین عرف مولوی منو نے جو ہم خلر تھے شہید ہو۔ نے سے پہلے اس روایت کی تصدیق کی تھی۔

جب رسالدار محمد شفیع جنرل بخت کے ساتھ جہاد میں شریک ہو گئے تو ان کی تمام جاگیر اور جائیداد مع اس پختہ حویلی کے جس کی دیواروں کے نشانات ابھی تک اس واقعہ کی نشاندہی کر رہے ہیں ضبط کر کے نیلام کر دی گئی۔ با وفاداروں کو عطا ہوئیں۔ حویلی کے سامان کو تحس نحس کرنے کے بعد رسالدار کے ضعیف العمر والد کو گرفتار کر کے بریلی لے جایا جا رہا تھا۔ راستہ میں قصبہ کمال گنج ضلع فرخ آباد پر جب پڑاؤ ہوا۔ تو ان کا وصال ہو گیا اور وہاں اُن کو عقیدت و احترام کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔

پنڈت اجودھیا پرشاد

پنڈت جی دہلی کے رہنے والے تھے اور وہاں کشمیری برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ اجمیر کالج کے قدیمی طالب علم تھے، جہاں سے انھوں نے انگریزی زبان پر عبور حاصل کیا تھا۔ پنڈت جی اور منشی حسینی کے اہتمام میں ایک پندرہ روزہ اخبار ۱۵ اپریل ۱۸۴۸ء کو جاری ہوا۔ یہ اخبار دہلی کالج کا آرگن تھا۔ اور دہلی کالج کے پریس جامع العلوم دہلی میں چھپتا تھا۔ اس اخبار کا نام مجدبہ تھا۔
اس میں دلچسپ مضامین اور خبریں شائع ہوتی تھیں اور تعلیمی مشورے بھی دیے جاتے تھے۔ اس اخبار کے دو اشتہار۔ قران السعدین دہلی ۲۰ مارچ ۱۸۴۸ء میں اور ۷ اپریل ۱۸۴۸ء میں چھپے۔ اس اخبار نے بہت مختصر عمر ہونے کے برابر عمر پائی تھی۔ تقریباً تین چار شمارے نکلے اور بند ہوگیا۔
پنڈت اجودھیا پرشاد نے دہلی کالج میں مدرس تھے مولوی کریم الدین صاحب اپنے مشہور تذکرہ طبقات الشعراء میں تحریر فرماتے ہیں:۔
"مرد متین ذہین اور محنتی ہیں۔ حال اخلاق کا یہ ہے کہ خلیق بدل روت اور نیک اطوار ہے۔ ایک رسالہ علم مساحت قواعد متعلم میں ہے۔ یہ صحیح تیار کی تالیف ہے۔ اردو میں جو چھپ گیا ہے اور ہرشنی صاحب کا رسالہ ہیئت کا انھوں نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ پنڈت اجودھیا پرشاد کا عہد بلی کالج

ٹرانسلیشن سوسائٹی نے چھاپے چنانچہ آپ نے مذکورہ رسالہ مساحت اور رسالہ ہیئت کا ترجمہ اس سوسائٹی کے لیے کیا تھا اصول قواعد ماہیات انگریزی کا اُردو میں ترجمہ ۱۸۵۰ء میں کیا تھا صفحات ۲۶۰ ہیں اور اصول علم طبعی انگریزی کا ترجمہ پنڈت اجودھیا پرشاد اور شیو پرشاد نے اُردو میں ۱۸۴۲ء میں کیا تھا۔ ۱۶۹ صفحات پر مشتمل ہے۔

اجمیر شریف سے ستمبر ۱۸۵۵ء سے ایک پندرہ روزہ اخبار "خیر خواہ خلائق" جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر پنڈت اجودھیا پرشاد اور سوہن لال ہے۔ نگراں تھے۔ اجمیر شریف اسکول کے ہیڈ ماسٹر قیلن تھے۔ یہ اخبار اجمیر شریف اسکول کا ترجمان تھا۔ اس کے خریدار ۲۸۱ تھے، دو سو گورنمنٹ افسروں اور ۲۸ یورپین افسران کے پاس جاتا تھا۔ مسلمان ۲۵ اور ہندو ۱۲۵ خریدار تھے۔ آٹھ اخبار تبادلہ میں جاتے تھے، اس معمولی اشاعت کے باوجود یہ اخبار نفع میں چل رہا تھا۔ خرچ ۹۸ روپے تھا اور آمدنی ایک سو باسٹھ روپے تھی۔

گارساں دتاسی اس اخبار کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"یہ اس علاقہ کا اُردو کا پہلا اخبار ہے اس کی ادارت دو حضرات سوہن لال اور اجودھیا پرشاد کر رہے ہیں۔ یہ دونوں اجمیر کالج کے طلبا قدیم ہیں جہاں انھوں نے انگریزی زبان پر پورا عبور حاصل کیا تھا۔ انکی اُردو زبان میں سادگی اور لطف بیان کیساتھ ہندوستانیت اور انگریزی دونوں اثر موجود ہیں، اس اخبار کا نام خیر خواہ خلائق ہے یہ ہفتہ وار شایع ہوتا ہے اور چھوٹی تقطیع کے آٹھ صفحات پر مشتمل ہے، روزمرہ کی عام خبروں کے علاوہ اس میں مختلف عنوانات پر بھی مضامین ہوتے ہیں۔ اس میں ایک مضمون ہندوستانیوں کو اسلحہ سے محروم کرنے دوسرے تہذیب و تمدن کے عام توہمانہ خیالات اور جبریہ تبدیل مذہب کے متعلق شایع ہو چکے ہیں، اس اخبار کی مدیروں کی آزاد روش کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا کیونکہ بغاوت کے بعد سے ہندوستان میں آزادی باقی نہیں رہی لہذا حکومت نے اس اخبار کی اشاعت کو ممنوع قرار دیدیا۔"

چودھری احمد بخش صاحب

جناب چودھری احمد بخش ضلع ہوشیار پور پنجاب کے رہنے والے تھے اور پشتوں سے یہیں آباد تھے۔ آپ کا تعلق و سلسلۂ نسب چندربنسی خاندان سے ملتا ہے۔ جو بھارت کا حکمران خاندان تھا۔ مغلوں کے آنے کے بعد اس خاندان کے افراد حکومت میں کافی معزز عہدوں پر معمور رہے۔ بالآخر دین محمدی کی کرن اس خاندان تک بھی راہ دکھانے گئی اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں جناب چودھری احمد بخش صاحب کے جدامجد نے اسلام قبول کیا اس طرح یہ خاندان حلقہ بگوش اسلام ہوا۔ پورا خاندان ہوشیار پور میں آباد تھا اور چودھری صاحب کے بزرگ تقریباً آدھے ضلع ہوشیار پور کے مالک و مختار تھے۔ چودھری احمد بخش صاحب کے دادا انور شاہ کو عطریات کشیدگی کا بڑا شوق تھا۔ سنا ہے کہ جب انور شاہ صاحب شام کو گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکلتے تو ان کے کپڑوں میں لگے عطر کی خوشبو گرد و نواح میں دور دور تک پھیل جاتی۔ اس عطر کی خبر رنجیت سنگھ کو بھی ہوئی اس نے بھی ایک کنستر عطر ان سے منگوا کر اپنی رانی کو دیا تھا۔ جناب چودھری احمد بخش کے والد کا نام چودھری الٰہی بخش تھا جو ہوشیار پور کے رہنے والے تھے۔ جبکہ والدہ کا تعلق جالندھر سے تھا۔ آپ نے عربی و فارسی کی تعلیم اس زمانے کے رواج کے مطابق گھر اور مسجد کے مدرسے میں پائی اس کے بعد مزید تعلیم کے لئے آپ

کو جالندھر بھیج دیا گیا جہاں آپ نے ۱۷ سال کی عمر میں مشن اسکول جالندھر سے اعلیٰ نمبروں کے ساتھ میٹرک پاس کیا۔ یہ اس زمانہ کا اعلیٰ ترین اعزاز تھا۔ نواب لیاقت حیات خاں جو بعد میں ریاست پٹیالہ کے وزیر اعظم ہوئے۔ دیوان عبدالحمید خاں جو بعد میں ریاست کپورتھلہ کے وزیر اعظم ہوئے۔ چودھری نعمت اللہ خاں جو بعد میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج دہلی ہوئے۔ سید عبدالحق سب جج درجۂ اوّل دہلی شیخ عبدالمجید سب جج دہلی نواب زادہ زمرد حیات خاں (سر سکندر کے بڑے بھائی) آپ کے اسکول کے ساتھیوں میں تھے۔ سر سکندر حیات اس ہی باعث چودھری صاحب کا بے انتہا خیال رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ جالندھر کی بڑی بڑی علمی شخصیتیں آپ کو زمانہ طالب علمی میں بھی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھیں خصوصاً جناب مولوی محبوب عالم صاحب آپ کے بڑے مداح تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب چودھری احمد بخش صاحب اپنے والد صاحب کے پاس ہوشیارپور آئے تو یہاں عجیب رنگ تھا جائیداد کی تقسیم کے جھگڑے شروع ہو چکے تھے اور ان کے والد جناب چودھری الٰہی بخش مکمل طور سے اپنی بہنوں اور بھائیوں کی گرفت میں تھے۔ ان جھگڑوں اور خاندانی رنجشوں و مسائل نے چودھری احمد بخش صاحب کو اتنا دل برداشتہ کیا کہ وہ اپنے والد اور اُن کے خاندان سے متنفر ہو کر ہوشیارپور کو چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ اور اپنے چھوٹے بہنوئی کے یہاں آ گئے۔ جہاں سے ملازمت کی درخواستیں روانہ کیں۔ مختلف درخواستوں میں سے سب سے پہلا انٹرویو لیٹر ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ این، ڈبلیو۔ ریلوے سہارنپور کے یہاں دیا۔ اس کے بعد دوسرا خط برائے نائب تحصیلداری ہوشیارپور کا تھا۔ چونکہ چودھری احمد بخش صاحب ہوشیارپور رہنا نہیں چاہتے تھے۔ لہٰذا فوراً سہارنپور کے لئے روانہ ہو گئے اور ڈی ایس کے دفتر میں ملازمت کر لی۔ سہارنپور میں ملازمت کرتے ابھی چند ہی سال گذرے

تھے کہ ایک واقعہ نے انھیں دیارِ دلّی میں لا پٹکا اور پھر یہاں ایسے جمے کہ دہلی ان کی اور یہ دہلی کے ہو کر رہ گئے۔ سنہ ۱۹۱۰ء کی بات ہے۔ حبیب سیٹھ کی پارسی الگزینڈر تھیٹریکل کمپنی سہارنپور آئی ہوئی تھی۔ ایک دن چودھری احمد بخش دفتر کے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ تھیٹر دیکھنے گئے، وہاں پاس مانگے جو کہ انھیں نہیں دیئے گئے۔ زیادہ اصرار پر حبیب سیٹھ نے کہا کہ چودھری صاحب آپ ایک پاس اپنے لئے لے لیجئے۔ مگر یہ نہ مانے اور سب کے ٹکٹ خرید کر تھیٹر دیکھا۔ بات ختم ہو گئی۔ چند یوم بعد کمپنی نے سہارنپور میں اپنا پروگرام ختم کر دیا اور دہلی جانے کا پروگرام بنا کر سامان بذریعہ ریلوے ویگن دہلی روانہ کرنا شروع کر دیا۔

تمام ویگن جو کہ تھیٹر کمپنی کے سامان سے بھری تھیں، دہلی کے لئے بک کر دی گئیں مگر ایک ویگن جس میں تھیٹر کے اسٹیج کے پردے، جھالریں اور تھیٹر کا اہم ترین سامان تھا اس پر مظفر نگر کا لیبل لگا تھا۔ ادھر دہلی میں کھیل کی تاریخوں کا اعلان ہو چکا تھا تمام ویگنیں پہنچ چکی تھیں مگر سامان سب سے اہم ویگن جس کا شدید انتظار تھا غائب تھی۔ دوسرے دن کھیل کا اعلان ہو چکا تھا۔ کھلبلی مچی ہوئی تھی ریلوے کو جگہ جگہ تار دیئے گئے مگر اس ویگن کا کوئی پتہ نہ چلا۔ ادھر مظفر نگر میں جب اس ویگن کو کھڑے کھڑے کئی دن گذر گئے تو اسے وہاں کھولا گیا تو پتہ چلا کہ یہ اس ہی پارسی الگزینڈر کمپنی کا گمشدہ ویگن ہے۔ بہرحال انکوائری ہوئی اور تقریباً ۸ ریلوے افسران و ملازمین کو سہارنپور سے تبدیل کر دیا گیا۔ اس طرح جناب چودھری احمد بخش صاحب کو ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل دہلی کے دفتر میں تبدیل کر دیا گیا۔ چودھری صاحب کو دہلی کچھ ایسی بھائی کہ انھوں نے یہیں مستقل رہنے اور اس ہی دیار کو اپنا وطن بنانے کا ارادہ کر لیا اور ملازمت کے ہی دوران ۱۹۱۱ء میں

کوچہ بلی ماران میں ایک دوکان لے کر جنرل نیوز ایجنسی و اسلامیہ بک ڈپو کی بنیاد رکھی۔

کام کی زیادتی اور ادبی ذوق و شوق نے ملازمت چھوڑنے پر متعدد بار مجبور کیا مگر کوئی نہ کوئی وجہ ایسی درپیش ہوتی رہی کہ ۱۹۱۸ء کے اوائل تک ملازمت اور کاروبار دونوں جاری رکھے مگر آخر کار ملازمت چھوڑنا ہی بہتر سمجھا گیا۔ اور ۱۹۱۸ء کے وسط میں چودہری احمد بخش صاحب نے ڈاکٹری سارٹیفکیٹ پر پنشن لے لی اس کے بعد پوری توجہ کے ساتھ اشاعت۔ طباعت و تقسیم کا کاروبار شروع کر دیا جس میں اللہ نے کافی برکت دی ۱۹۲۱ء میں تمام دنیا مثلاً ہانگ کانگ، جاپان، فرانس، جرمنی۔ اٹلی اور لندن وغیرہ کے اخبارات و رسائل کی آمد و تقسیم کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ایک طرف ادبی لگاؤ دوسری طرف سماجی و مذہبی شغف نے کافی اثر دکھایا۔ چونکہ جنرل نیوز ایجنسی بلی ماران میں تھی جہاں حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کی شریف منزل تھی لہذا قدرتی طور پر حکیم صاحب قبلہ اور چودہری صاحب میں مراسم کی ابتداء ہوئی پھر یہ مراسم دوستی میں تبدیل ہو گئے۔ نتیجتاً صبح و شام کی محفلوں میں چودہری صاحب کی شرکت لازم ہو گئی۔ جنرل نیوز ایجنسی پر کبھی علامہ اقبال کبھی مدینہ بجنور کے مدیر مجید حسن صاحب تو کبھی مولانا راشد الخیری۔ غرض بڑی بڑی ہستیاں چودہری صاحب سے علمی و ادبی مسائل پر گفتگو کرتی دیکھی جاتی تھیں۔ مولانا حسرت موہانی بیگم حسرت تشریف لاتیں۔ مولانا عبدالغفار بھی کلکتہ سے آتے اور جتنے دن رہتے جنرل نیوز میں ان کے لئے ضروری تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن خواجہ حسن نظامی قبلہ۔ خان بہادر میر ناصر علی رسالہ صلاح عام "فراش خانے والے۔ جناب قاری سرفراز حسین جو قاری عباس حسین صاحب کے والد ماجد تھے۔ جنرل

نیوز ایجنسی پر ضرور آتے۔ سردار دیوان سنگھ مفتون صاحب سے چودھری
احمد بخش صاحب کے مراسم نہایت دوستانہ اور بے تکلفانہ تھے۔ اس بے لوث
دوستی کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک مرتبہ انسپکٹر جنرل پولیس ریاست
بھوپال دہلی آئے۔ ان کے ہمراہ جسٹس سر عبدالرحمٰن (جو اس زمانہ میں وکیل
سرکار بھوپال تھے۔) بھی تھے۔ سر عبدالرحمٰن نے دہلی میں چودھری احمد بخش
صاحب کو بلایا اور کہا کہ ہمارا ارادہ ہے کہ سردار دیوان سنگھ مفتون کے
خلاف ہوشنگ آباد میں مقدمہ چلایا جائے ہمیں اس کے لیے فلاں فلاں سال
کے ریاست اخبار کی مکمل فائلیں درکار ہیں۔ اس پر چودھری صاحب
نے کہا کہ میں کوشش کرتا ہوں کہیں سے شاید مل جائیں، اس پر انسپکٹر
جنرل پولیس نے کہا کہ ہمیں معتمد ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ آپ کے پاس ریاست
اخبار کی گذشتہ چھ سال کی مکمل فائلیں موجود ہیں۔ اگر آپ ہماری طلب
کردہ کاپیاں دینے پر تیار ہیں تو ہم آپ کو ایک سو روپیہ فی کاپی تک دے
سکتے ہیں۔ اگر ہمیں آپ نے یہ کاپیاں یا فائل ہمیں نہیں دیتے تو پھر ہم سرکاری
ذرائع بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ معاملہ کافی پیچیدہ معلوم ہوتا تھا۔ اگر فائلیں یہ دیتے
تو دوستی پر حرف آتا تھا۔ نہ دیتے تو بذریعہ نوٹس یا کسی اور سرکاری ذریعہ سے
فائلیں چلے جانے کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا کہا کہ میں جا کر دیکھتا ہوں اور اگر آپ
کے طلب کردہ پرچے یا فائل مل گئے تو صبح پیش کر دوں گا۔ تقریباً پانچ بجے
شام دیکھا گیا کہ چھ سال کی ریاست اخبار کی مکمل فائلیں گھر کے باورچی خانے
میں جل رہی ہیں۔ اور صبح انسپکٹر جنرل پولیس بھوپال سے کہلا دیا کہ میرے
پاس سابقہ کا ایک بھی پرچہ یا فائل اخبار ریاست کی نہیں ہے۔ چاہے
دوکان کی تلاشی لے لو چاہے گھر کی۔

چاہو تو حلفیہ بیان بھی دے سکتا ہوں کہ میرے پاس ماہِ رواں کے چند پرچوں کے علاوہ ایک بھی "ریاست" نہیں ہے۔ دوستی کی یہ ایک ادنیٰ سی مثال ہے اور لطف یہ کہ کبھی دیوان سنگھ مفتوں صاحب سے فائل جلانے کا ذکر بھی نہیں کیا۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے جناب چودھری احمد بخش صاحب نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی مگر اس زمانے میں انگریزی پر اتنا عبور حاصل کر لیا تھا کہ بی، اے کے طلبہ آپ سے انگریزی پر نوٹس لینے دکان پر آیا کرتے تھے۔ حاجی محمد رفیع صاحب جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ انھیں حکومت برطانیہ کی طرف سے خان صاحب کا خطاب ملا تھا یہ خطاب ملنے سے پہلے کمشنر دہلی سے حاجی صاحب سے کہا کہ آپ اپنی بائیوگرافی میں دیجئے۔ حاجی صاحب فوراً چودھری صاحب کے پاس آئے اور کہا چودھری صاحب انگریزی میں میری بائیوگرافی لکھ دیجئے۔ اور ایسی لکھیئے کہ "خان صاحبی" کا خطاب لازماً ملے۔ اگر کہیں کسر رہ گئی تو سمجھئے میری تمام محنت بیکار جائے گی۔ اس زمانے میں خان صاحب یا خان بہادر کا خطاب بہت ہی اعلیٰ اسناد مانی جاتی تھی۔ بہرحال چودھری احمد بخش صاحب نے بائیوگرافی لکھی کہ حاجی محمد رفیع صاحب کا خطاب بھی ملا اور کمشنر نے اسے پڑھ کر ان سے یہ بھی کہا کہ دیل حاجی صاحب تم نے جس سے اپنا بائیوگرافی لکھوایا خوب لکھوایا۔"

۱۹۱۲ء میں حاجی عبدالغنی صاحب رئیس و آنریری مجسٹریٹ دہلی نے اپنے تعلیمی شوق اور مسلمانوں میں تعلیم کا رجحان پیدا کرنے کے لئے پالم۔ چراغ دہلی حضرت نظام الدین اور قطب صاحب وغیرہ میں بالغوں اور بچوں کی تعلیم کے لئے اسکول مدرسے قائم کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ حاجی صاحب بلی ماران میں رہتے تھے۔ اس رہائشی قرب کی باعث چودھری احمد بخش صاحب کو بھی بلا بھیجا گیا۔ صلاح مشورے ہوئے مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے نام سے ایک تعلیمی

سوسائٹی بنائی گئی اور کام شروع کر دیا گیا۔ کام بہت کٹھن تھا۔ دہلی کے مخیر
حضرات موجود تھے۔ مگر سب رئیس ابنِ رئیس۔ اسکول کھولنے کون جائے۔ آخر
سب کی نگاہ انتخاب چودہری صاحب پر ہی پڑی۔ اور جملہ انتظام آپ کے
سپرد کر دیا گیا۔ چودہری صاحب یکہ پر بیٹھ کر ان تمام اسکولوں کا جو کہ
مندرجہ بالا مقامات پر قائم کیے گئے تھے جاتے، معائنہ کرتے اور جملہ دیکھ
بھال کرتے، ایک طرف کتب خانہ رحیمیہ کی دیکھ بھال دوسری طرف سوسائٹی
اور اسکولوں کی نگرانی۔ بے انتہا محنت کرتے مگر کیا مجال جو کسی طرف سے بھی
نگاہ چوک جائے یا کسی طرف بھی جھول آجائے۔ رفتہ رفتہ رفاعی کاموں کی
طرف توجہ زیادہ ہوتی گئی تعلیمی اور دینی مشاغل بڑھے تو اپنے ساتھ خان بہادر
حاجی شیخ عبدالرحمٰن اور جناب عطاء الرحمٰن صاحب جو ادموڑی والے مشہور تھے
اور اس وقت دہلی کے مسلمانوں میں اللہ کے فضل سے سب سے اونچی حیثیت
کے مالک تھے اُن کے صاحبزادگان جناب شیخ عبدالوہاب صاحب پانسنگ
شو والے اور خان بہادر حبیب الرحمٰن صاحب کو بھی بوجہ مراسم و تعلقات
اپنے ساتھ کھینچ لیا اور اس طرح ان دونوں حضرات نے رفاعی اور تعلیمی
معاملات میں دہلی کے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی

سنہ ۱۹۱۱-۱۲ء میں دہلی میں انجمن امن خواہانِ اسلام بنائی گئی جس کی بانی
خان بہادر شیخ الٰہی بخش کے صاحبزادے خان صاحب حاجی محمد رفیع تھے۔
جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس انجمن میں دہلی کے بڑے بڑے رئیس شامل
تھے اُس کا جنرل سکریٹری چودہری احمد بخش صاحب کو چُنا گیا اسی
زمانے میں اس وقت کے پرنس آف ویلز ایڈورڈ ہشتم اور ڈیوک
آف کناٹ دہلی میں آنے والے تھے جن کے دربار کا بڑا چرچا تھا۔ چودہری

صاحب نے طے کیا کہ آئندہ کے بادشاہ کی دعوت کی جائے۔ صلاح و مشورے ہوئے۔ پرنس اور ڈیوک کا دورہ مختصر تھا۔ استقبالیہ کی منظوری مشکل امر تھی۔ بہرحال چودھری صاحب نے ملاقاتیں شروع کیں اور آخر کار انجمن امن تزاہان اسلام دہلی کی طرف پرنس آف ویلز۔ ڈیوک آف کناٹ اور سر جان سائمن کو ایک عظیم الشان استقبالیہ دیا گیا جس کے جملہ انتظامات جناب چودھری صاحب کے سپرد تھے۔ اس طرح مسلمانوں کے اس وقت کے متعلق مسائل کو تاج برطانیہ کے نمائندوں کے روبرو بصورت سپاسنامہ پیش کرنے کا سہرا جناب چودھری احمد بخش صاحب کے سر ہے اس کے بعد جب دربار منعقد ہوا تو چودھری صاحب کو اس میں خصوصی دعوت دی گئی اور آپ کی نشست کا انتظام اعلیٰ ترین خطاب یافتہ اور معزز امراء کے اندر کیا گیا تھا۔

دہلی کی زندہ جاوید اور مشہور ہستی یعنی داستان گو میر باقر علی صاحب سے جناب چودھری صاحب کی بڑی گہری چھنتی تھی۔ دوکان پر پرانے اور کھرے کھرے ایسی داستانیں اور قصے سنا جاتے کہ عقل سی کھنچ جاتی۔ سبحان اللہ میر صاحب فن داستان گوئی کے ایسے استاد تھے کہ جن کا ہمسر پیدا ہونا ناممکن ہے۔ خلیل خان فاختہ۔ بہادر شاہ کا مولا بخش ہاتھی۔ اڑا اڑا دھوں۔ استانی۔ میر صاحب کی مشہور و معروف داستانیں ہیں جن کا آج بھی جواب نہیں۔ یہ چونکہ چھپ چکی ہیں اس لئے مشہور ہوئیں ورنہ درحقیقت ان کی ہر داستان شہ پارہ ہوتی تھی۔ ان کی ہزاروں داستانوں میں سے ایک "داستان عجیب" بھی ہے۔ ۲۲ رجب کی آمد آمد تھی۔ ایک دن میر باقر علی صاحب دوکان پر آئے اور چودھری صاحب کو کونڈوں سے متعلق داستان

سُنائی۔ یہ داستان چودہری صاحب کو بے انتہا پسند آئی فوراً لکھ ڈالی چار صفحوں پر مشتمل اس کتاب کا نام "داستانِ عجیب" رکھا گیا اور لاکھوں کی تعداد میں چھپوا کر صرف ایک پیسہ فی کتاب کے حساب سے فروخت کرنا شروع کر دی۔ اس کتاب نے دہلی میں ایک تہلکہ سا مچا دیا جس نے پڑھا اس نے اپنے گھر میں کونڈے ضرور کئے۔ اس طرح دہلی میں حضرت امام جعفر صادقؑ کی نیاز کے کونڈے رائج ہوئے اور اسے رواج دینے والے چودہری احمد بخش صاحب ہی تھے۔ اس ہی طرح دہلی میں عید کارڈ بھیجنے کا رواج بھی عام کرنے میں چودہری صاحب کی کوششوں کو بڑا دخل حاصل ہے انگریزوں کا زمانہ تھا دہلی میں کرسمس کا تہوار بڑی تیاریوں سے منایا جاتا تھا۔ کئی کئی دن کی چھٹیاں ہوتی تھیں، بڑے بڑے رئیس انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے انھیں ڈالی بھیجتے جس میں بڑے بڑے خوبصورت کرسمس کارڈ بھی رکھے جاتے۔ اس ہی طرح انگریز بھی اپنے ہموطنوں کو کرسمس کارڈ بھیجتے اور ہندوستانی عیسائی بھی تمام کارڈ لندن اور جرمنی سے چھپ کر آتے تھے جو جنرل نیوز کے پتہ پر جناب احمد بخش صاحب بھی منگاتے اور جن کی کافی تعداد میں کارڈ بچ گئے۔ چودہری صاحب کرسمس کارڈوں کے بنڈل بنا بنا کر باندھ رہے تھے کہ اتنے میں ان کے ایک عزیز ترین دوست جناب منشی محمد دین صاحب خوشنویس جو جناب منشی عبدالقدیر صاحب والا خوان اور جناب منشی محمد یوسف خطاط اعظم پاکستان کے والد تھے دوکان پر تشریف لائے۔ انھیں دیکھتے ہی چودہری صاحب بولے منشی صاحب اس سال میں نے کرسمس کارڈ کچھ زیادہ ہی منگالئے تھے۔ کرسمس میں ابھی ایک سال باقی ہے اگر آپ میرا ایک کام کر دیں تو ان کی کھپت

بھی ہو جائے گی اور مسلمانوں میں مبارک باد دینے کا یہ آسان اور سستا نسخہ بھی رائج ہو جائے گا۔ غرض کرسمس کارڈوں کے اندرونی دو صفحات جن پر مبارکباد کے الفاظ انگریزی میں لکھے ہوتے تھے نکال دیئے گئے۔ ان کی جگہ دو سادہ صفحے لگا کر منشی محمدؐ دین صاحب سے نہایت خوشخط عید کی مبارک باد اردو میں لکھائی گئی۔ کچھ پر شعر۔ کچھ پر رُباعی۔ کچھ پر باپ کی طرف سے بیٹے کو۔ کچھ پر بھائی کی طرف سے بھائی کو۔ غرض منشی صاحب کا روز کا یہ معمول ہو گیا کہ جب بھی وقت ملتا چودہری صاحب کے ایماء پر کارڈوں پر خطاطی کے اعلیٰ ترین نمونوں میں عید کی مبارک باد لکھتے رہتے۔ اس طرح تمام کرسمس کارڈوں کو عید کارڈ بنا دیا گیا۔ اس کے بعد عید آئی۔ یہ کارڈوں کے آگے جب سجا کر رکھے گئے تو ایسے فروخت ہوئے کہ اتنا بڑا ذخیرہ دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا۔ دوسرے سال جرمنی سے سنہرے عید کارڈ جو بالکل سونے کا ڈلہ معلوم ہوتے تھے اور جن پر عید مبارک وغیرہ کے الفاظ چھپے تھے منگائے گئے۔ اور پھر اس کے بعد کے سالوں میں لاہور اور بمبئی کے مطبوعہ عید کارڈ بھی آئے اور فروخت ہوئے آج کل جن کارڈوں کی قیمت ڈیڑھ اور ڈھائی روپیہ ہوتی ہے، اس زمانہ میں ایک پیسہ یا دو پیسہ میں فروخت ہوتے تھے۔

چودہری اللہ بخش صاحب نے ۱۹۳۵ء میں تمام اخبارات کی ایجنسیاں ختم کر کے صرف کتب خانہ جاری رکھا جس کا نام اسلامیہ بک ڈپو تھا اور اس میں مذہبی۔ درسی اور متفرق کتابیں فروخت کرتے تھے۔ منشی محمدؐ دین صاحب خطاط اعظم دہلی کی قربت نے آپ کو بھی فن خوشنویسی کی طرف مائل کر دیا تھا اور آپ بعض اوقات اپنے فن کی نمائش کے لئے شیشے کے چاروں مرتبانوں اور گلاسوں وغیرہ پر خوشنویسی کے اصولوں

کے مطابق نہایت عمدہ تغرے لکھتے تھے جو کہ احباب کو بطور ہدیہ دیئے جاتے تھے۔ آپ نے کئی کتابیں خود بھی شائع کی ہیں جن میں سے نغمۂ قوم (قومی نظموں کا مجموعہ) آغا حشر کاشمیری کا "شکریہ یورپ" حضرت نیاز فتحپوری کی "صدا بہ صحرا" خواجہ حسن نظامی صاحب کی چند کتابیں مثلاً "مکی کا اعلانِ جنگ"۔ "طمانچہ بر رخسار یزید" اور "لارڈ کرشن" وغیرہ کافی مشہور ہوئیں۔ خواجہ حسن نظامی نے لارڈ کرشن (سری کرشن مہاراج) پر چند کتابیں اور بھی لکھیں جو جناب چودھری صاحب نے شائع کی تھیں ان پر زبردست بحث و مباحثے ہوئے۔

یہ حالات تحریر ہوئے تھے کہ چودھری احمد بخش کے صاحبزادے شکور باغ احمد صاحب ایڈیٹر "نئی روشنی" کراچی کا کراچی سے ۹ جنوری ۱۹۷۰ء کا لکھا ہوا حسب ذیل خط ملا۔

"نئی روشنی میکلو روڈ۔ کراچی

مولانا سلام مسنون

جناب قبلہ والد صاحب کا ۳ جنوری ۱۹۷۰ء کو ۱۰۳ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۱۸۶۷ء یا اس کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔ مشن سکول جالندھر سے میٹرک پاس کیا۔ ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ سہارنپور میں تقریباً ۲۵ سال کی عمر میں ملازم ہوئے۔ ایک تھیٹریکل کمپنی کا سامان سہارنپور سے دہلی آنے والا تھا، اس پر ملتفر نگر کا لیبل لگا دیا۔ وہاں سے تبدیل ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل دکونٹسٹ دہلی کے ہاں تبادلہ ہوا۔ ۱۹۱۰ء میں ڈاکٹر سارٹیفکٹ پر ریٹائر ہوئے ۱۹۱۱ء میں جنرل نیوز ایجنسی بلی ماران میں کھولی۔ تقریباً ۱۵ اخبارات یومیہ لندن، فرانس، جرمنی اور ہند کے آتے تھے جن کا سلسلہ ۱۹۲۵ء تک رہا۔

۱۹۲۶ء میں جنرل نیوز جاری کیا خود میٹرک تھے مگر بی اے کو تعلیم دیتے میں نے
دیکھا ہے۔ سر جان سائمن کے استقبالیہ کے سکریٹری رہے، پرنس آف ویلز ڈیوک
افسر کناٹ کے استقبالیہ میں سکریٹری رہے۔ میر باقر علی داستان گو۔ میر
ناصر علی صلائے عام فراشس خانہ، نواب احمد سعید گلی مرغ والی گلی قاسم
جان سے تعلقات تھے، حکیم اجمل خاں سے کافی مراسم رہے حکیم محمد احمدؒ مع
حکیم بھورے میاں سے مراسم رہے ہر دکھی کے کام کے لئے پابہ رکاب رہتے
حکیم ناصر الدین ان کے والد رضی الدین ان کے والد حکیم ظہیر خاں ان کے والد
غلام غوث کی تصاویر اور حالات کی ضرورت ہے۔ اور جو یاد آ گیا لکھکر بھیجوں گا۔
اب میری بھی ستر سال عمر ہے۔

جی۔ اے چودہری
ایڈیٹر "نئی روشنی" روزانہ
کراچی

ماسٹر احمد بیگ

ہیڈ ماسٹر اینگلو عربک اسکول دہلی

ماسٹر احمد بیگ کا خاندان دہلی کا قدیمی خاندان تھا۔ یہ خاندان کشمیری گیٹ میں
گلی موجیان میں رہتا تھا۔ ان کے والد ماجد مرزا محمد بیگ صاحب تھے جو اچھا کھاتے
پیتے تھے۔ ایک حیثیت دار زمیندار تھے۔ اکثر جمنا کی ریتی میں ٹھیکہ لیا کرتے تھے۔ پڑھے
لکھے نہیں تھے۔ صرف پہلوانی اور کبوتر بازی کا ان کو شوق تھا۔ فالیز کا ٹھیکہ بھی بہت
دوست و احباب کی تفریح کے لئے لیا کرتے تھے۔ کبھی اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔
ایک گاؤں کے مالک تھے جس کا نام کوواجر تھا، وہ سب فالیز کے ٹھیکوں میں
برابر ہوا۔ ماسٹر احمد بیگ صاحب اسی محلہ میں ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔

ایسے باپ کا بیٹا تعلیم حاصل کرے، تعجب خیز بات ہے، لیکن ماسٹر صاحب
کی پرورش اور تربیت باپ کے ہاتھوں نہیں ہوئی بلکہ ایسے ایک شخص کے سپرد
ہوئی جو فاضل و لائق تھا۔ انھوں نے اپنی خداداد قابلیت کی وجہ سے انگریزی
میں اس قدر استعداد حاصل کر لی تھی کہ اس زمانہ کے اکثر انگریزوں کو جو دہلی میں بطور
افسران کے آتے تھے تعلیم دیا کرتے تھے اور جہاں تک مختلف لوگوں سے ان کی قابلیت
کے بارے میں معلوم کیا گیا وہ یہی تھا کہ انگریزی نہایت اچھی جانتے ہیں اور آجکل

کے بی اے سے زیادہ ان میں لیاقت تھی۔ اگرچہ اس تعداد میں جو موجودہ زمانہ میں کافی یونیورسٹیاں موجود ہیں، وہ اس وقت موجود نہ تھیں مگر تعلیم کا مقصد قابلیت پیدا کرنا تھا نہ کہ صرف ڈگریاں لینا۔

ماسٹر احمد بیگ صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر میں زیر نگرانی ماسٹر حسین ہی کی پائی تھی۔ اور چونکہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی میں مشن اسکول جاری ہو چکا تھا اس لئے ماسٹر صاحب نے انٹرنس اسی مشن اسکول سے پاس کیا۔ ماسٹر احمد بیگ صاحب دہلی کے ان مسلمان لڑکوں میں صف اول میں تھے جنہوں نے سب سے پہلے انٹرنس پاس کر کے مشن کالج کی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ ورنہ اس زمانہ میں تو انگریزی کا پڑھنا کفر کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ ایف اے کی تعلیم ماسٹر صاحب نے مشن کالج دہلی میں پائی اور نہایت اچھے نمبروں سے پاس ہوئے۔ بی اے کی تعلیم بھی شروع کی مگر امتحان صحت خراب ہونے کی وجہ سے نہ دے سکے جس کا ان کو مرتے دم تک قلق رہا۔ تعلیم کا شوق جبلی تھا۔ اگرچہ ماسٹر حسین اپنی ملازمت کی وجہ سے اکثر پیلی بھیت میں رہتے تھے۔ ان کی تعلیم کی کوئی نگرانی کرنے والا نہیں تھا۔ مگر پھر بھی ابتدائی تربیت کا ایسا اچھا اثر ہوا تھا کہ تعلیم سے دل نہ ہٹا۔ ابتدائی عمر میں صرف تیراکی اور لکڑی کا شوق ہوا۔ جس کو انھوں نے اچھی طرح سیکھا اور لوگوں کو سکھایا بھی۔

ماسٹر احمد بیگ صاحب نے مشن اسکول سے بطور استاد کے ملازمت شروع کی۔ اور ایک آدھ سال اس اسکول میں تعلیم دیتے کے بعد مشن اسکول جگادھری ضلع انبالہ کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو کر کام کیا۔ اس مدرسہ کی مدت ملازمت ۲۴۔ ۲۵ برس کی تھی۔ ۱۹۰۸ء میں جب پنجاب یونیورسٹی میں نئے دور کا آغاز ہوا اور مسٹر رائٹ انسپکٹر مدارس نے نئے طریقہ تعلیم کے مروج کرنے کے لئے یہ طے کیا کہ

تمام استاد ٹرینڈ اور سند یافتہ اُستاد ہوں۔ اس وقت ماسٹر احمد بیگ صاحب دیگر استادوں کے ساتھ مشن اسکول جگادھری سے سبکدوش ہو گئے۔ اگرچہ ماسٹر صاحب پُرانے زمانے کے اُستاد تھے۔ وہ مکتب کے طالب تھے۔ انگریزی زبان پر ان کو جتنا عبور تھا۔ آج کل کے اُستادوں میں نہیں پایا جاتا۔ وہ پختہ کار لوگوں میں سے تھے۔ جن کو حفظ مراتب کا بہت خیال تھا۔ اور جو اُستاد کے معنی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اور بڑی تن دہی سے اس پر عمل کرتے تھے۔ اور جن کو رائٹ صاحب کا طریقۂ گفتگو برداشت نہیں ہو سکتا تھا۔

ماسٹر صاحب کی صرف ٹرینڈ نہ ہونے کی وجہ تھی بلکہ وہ اپنے طرز معاشرت اور زندگی میں ایک مولوی معلوم ہوتے تھے۔ اور کسی شخص کو یہ احساس نہیں ہو سکتا تھا کہ سفید داڑھی رکھنے والا جبہ اور دستار پہننے والا اور سیدھی سادی ہندوستانی اجمیری دروازہ کی بنی جوتی کا پہننے والا اور ہر وقت ایک تسبیح رکھنے والا ایک انگریزی کا لاثانی استاد ہے۔

مسٹر رائٹ کو بھلا ایسی حیثیت و رنگ ڈھنگ کا استاد کب جچنے والا تھا۔ اور ماسٹر صاحب کب ایسے انسپکٹروں کو گانٹھتے تھے اس لئے ماسٹر صاحب ۱۹۰۸ء میں اسکول سے خود علیحدہ ہو گئے۔

انگریزوں میں جہاں ہزارہا عیب تھے وہاں ایک خوبی یہ تھی کہ قابل لوگوں کی قدر و منزلت کرتے تھے۔ اینگلو عربک اسکول کے لئے مڈل ڈیپارٹمنٹ کے لئے ایک ہیڈ ماسٹر کی ضرورت تھی جس کے لئے ماسٹر احمد بیگ صاحب موزوں تھے اس لئے مسٹر رائٹ ان کو خود مجبور کر کے اس عہدہ کے لئے لایا۔ اور ان کا تقرر کیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۰ء کے آخر میں انھوں نے ایک معمولی سی بیماری میں چار یا پانچ روز علیل رہ کر انتقال فرمایا۔ چھ لڑکے اور چار لڑکیاں چھوڑیں۔ مگر اولاد

معنوی کی تعداد کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد تھی جو اچھے عہدوں پر ممتاز ہوئے۔

ماسٹر احمد بیگ صاحب کی اولاد ان کی خواہش اور مرضی کے مطابق تعلیم کی طرف توجہ نہ دے سکی۔ اکثر ماسٹر صاحب خود بھی اسکول میں اس بات کا افسوس کرتے تھے۔ ان کے لڑکوں نے انٹرنس تک تعلیم پائی اور نوکری کی طرف بھاگے۔ ان کے بڑے صاحبزادے محمد مرزا ریلوے کی ملازمت سے آپ کی زندگی میں ریٹائرڈ ہو کر پنشن پانے لگے تھے۔

ماسٹر احمد بیگ صاحب سے جن لوگوں نے تعلیم پائی ہے وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ وہ ماسٹر خواجہ شہاب الدین حسن کے دستِ راست تھے۔ اسکول کے انتظامی معاملات اور دیگر مشوروں میں جب تک ماسٹر احمد بیگ صاحب شامل نہیں ہوتے تھے خواجہ صاحب کو چین نہیں پڑتا تھا۔ یہ دونوں سیرت، طرز معاشرت اور خیالات میں اس قدر مشابہ تھے کہ شناخت کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ خواجہ شہاب الدین حسن طبیعت کے ذرا نرم تھے اور ان کا طریقۂ کار چشم پوشی تھا وہ اگر اپنے سامنے بھی کسی کی خطا اور قصور دیکھتے تو اکثر نظر چرا لیتے تھے۔ مگر ماسٹر صاحب قاعدے اور اصول کے پابند تھے۔ ان کے بارے میں درست طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان جیسا منتظم کوئی نہیں ہوا۔

ماسٹر احمد بیگ صاحب ایسے موقع پر چشم پوشی کرنے کے خلاف تھے۔ اس لئے جب کسی قاعدے کی خلاف ورزی کی بابت کسی طالب علم کو سزا دی جاتی جو خواجہ صاحب کی نظر میں ناگزیر ہوتا تھا تو وہ اپنے فرائض ماسٹر احمد بیگ صاحب کو تفویض فرما دیا کرتے تھے۔ اگرچہ اس قسم کے واقعات کافی ہیں مگر صرف ایک ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

جناب مولانا محمد ہارون صاحب زنگی پوری جب اسکول میں پہلی مرتبہ اول
مدرس علوم مشرقی کے ہو کر آئے تو لڑکوں نے ان کے ساتھ بھی وہی طریقہ کرنا
چاہا جو کہ روزِ اول سے طالب علم اپنے استاد کے ساتھ کرتے ہیں۔ مولانا صاحب
عجیب طبیعت کے آدمی تھے۔ عالم باعمل تھے۔ سوائے اسکول میں تعلیم دینے
اور دن رات خدا سے لو لگانے کے ان کو کوئی دھیان نہ تھا۔ ایک دن بدقسمتی سے
جبکہ مولانا صاحب چھٹی جماعت میں فارسی پڑھا رہے تھے ایک لڑکے نے
مری ہوئی چوہیا مولوی صاحب کی نظر بچا کر ان کی میز پر پھینک دی۔ مولانا
صاحب بے خیالی پڑھا رہے تھے کہ یکایک ان کی نظر پڑ گئی۔ تو مولانا صاحب
نے سبق پڑھانا تو بند کر دیا اور استاد و شاگرد کے تعلقات پر ایک بسیط و
بلیغ خطبہ عطا فرمایا۔ اس واقعہ کی خبر خواجہ صاحب اور ماسٹر احمد بیگ صاحب
دونوں کو ہو گئی۔ ہر دو حضرات جماعت کے کمرہ میں تشریف لے آئے۔
طالب علموں کا دم فنا ہو گیا کہ دیکھئے۔ اب کیا گل کھلتا ہے۔ کئی مرتبہ شریر لڑکے
کے نام معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن کسی نے بھی نام بتا کر نہیں دیا۔ آخر مجبوراً خواجہ
صاحب نے حکم دیا کہ ہر لڑکے کو سزا دی جائے۔ مگر خود تشریف لے گئے۔ اور لڑکوں
کو یہ سزا ماسٹر احمد بیگ صاحب کے ہاتھوں سے دی گئی۔

لڑکے بلا کے بنے ہوئے تھے۔ اس وقت تو نام نہ بتانا تھا نہ بتایا مگر
بعد میں خود شریر نے جس نے یہ حرکت کی تھی اپنی خطا اور قصور کی معافی خود مولانا
صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب سے مانگ لی۔

(یارانِ قدیم۔ دہلی
اگست ۱۹۲۶ء)

حاجی محمد اسحاق صاحب

حاجی صاحب پنجابی سوداگران دہلی کے ایک متوسط خاندان کے چشم و چراغ تھے جو اپنے حسن اخلاق، دینداری، اور خدمت دین کی وجہ سے دہلی کے معزز ترین لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ غالباً ۱۸۶۳ء میں قصاب پورہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد اللہ بخش صاحب بڑے متواضع خلیق و دیندار اور متقی شخص تھے۔

حاجی محمد اسحاق نے قرآن مجید کی ابتدائی تعلیم قصاب پورہ کی مسجد میں حاصل کی اس زمانہ میں دہلی میں پیسوں کے بجائے کوڑیاں چلتی تھیں ایک پیسہ کے سولہ گنڈے ہوتے تھے اور عام طور پر ایک پیسہ میں آٹھ کوڑیاں آتی تھیں۔ حاجی صاحب کو جو جیب خرچ ملتا تھا اس میں چند کوڑیاں بچایا کرتے تھے۔ جب بہت سارے پیسے بچ جاتے تو ان کے مٹی کے لوٹے اور جھاڑو خرید کر مساجد میں پہنچا دیتے تھے ہوش سنبھالتے ہی آپ نے کھاتہ کا کام سیکھا اور اسی دوران میں ان کے بڑے بھائی نے کلکتہ میں کچھ کاروبار شروع کیا تو آپ بھی اپنے بھائی حاجی محمد عمر صاحب کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو گئے بعد میں ان کے بھائی کلکتہ کا کام ختم کر کے دہلی میں آ گئے۔ دونوں بھائیوں نے دہلی میں صدر بازار میں حافظ محمد عمر اور محمد اسحاق کے نام سے کاروبار شروع کیا جس

میں اللہ تعالیٰ نے ان کو دن دونی رات چوگنی ترقی دی۔ حاجی محمد اسحاق صاحب بڑے مخیر تھے رفاہی کاموں سے بڑا شغف رکھتے تھے۔

حاجی محمد اسحاق صاحب جب تک فتحپوری کرتے رہے دارالعلوم فتحپوری میں جا کر حدیث کے دور میں شریک ہوتے تھے۔ اسی زمانہ میں اُن کی ملاقات شمس العلماء مولانا عبدالحق مفسر تفسیر حقانی سے ہوئی اور مراسم اس قدر بڑھ گئے کہ جب مولانا حقانی دارالعلوم فتحپوری سے مستعفی ہو کر اپنے مکان حقانی منزل میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو حاجی صاحب حقانی منزل میں آ کر درس میں شریک ہوتے اور اسی لئے اچھے خاصے عالم ہو گئے۔

جب دہلی آ کر اپنے بڑے بھائی حاجی محمد عمر کے ساتھ کاروبار شروع کیا تو حاجی صاحب نے پھر درس حدیث میں شرکت اختیار کی اس طرح صبح کا وقت آپ کا حقانی منزل میں گذرتا تھا۔ مولانا عبدالحق حقانی کا اُن پر ایسا رنگ چڑھا کہ اب اپنا زیادہ وقت قومی اور مذہبی کاموں میں خرچ کرتے، آپ کو دینی و رفاہی کاموں میں حصہ لینے کا بہت شوق تھا اور ان کاموں میں مالی طور پر بھی کافی امداد کرتے رہتے تھے، اس کے علاوہ جب آپ گدی پر بیٹھتے تو کوئی بھی سائل اُن کی دکان سے خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا جس زمانہ میں آپ کو چند اختلافات کی وجہ سے کاروبار سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی تو اپنے بھائی سے کاروبار علیحدگی کے بعد آپ نے حاجی محمد اسحاق محمد احمد کے نام سے اپنا علیحدہ کاروبار شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں آپ نے تحریک شروع کر کے شیدی پورہ میں قبرستان کے لئے زمین حاصل کی جس میں پنجابی سوداگران نے برابر کا حصہ لیا اور بعد میں پنجابی سوداگران کا علیحدہ قبرستان بن گیا۔

حاجی صاحب کو مساجد کی تعمیر کا بڑا شوق تھا چنانچہ کوئی مسجد خستہ

حالت میں دیکھی اس کی از سرِ نو تعمیر کرا دیتے تھے چنانچہ کافی مسجدیں آپ نے تعمیر کرائیں۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں جب آریہ سماجیوں نے مسلمانوں کو شدھی کرنے کا فتنہ اُٹھایا تو مولانا حقانی نے انجمن ہدایت الاسلام کے نام سے ایک انجمن قائم کی جس میں مبلغین کو ملازم رکھ کر دیہاتوں میں بھیجا جاتا تھا تاکہ مسلمانوں کو ارتداد سے بچایا جائے اس انجمن کا تقریباً دو ہزار روپے ماہوار خرچ تھا۔ اس انجمن کا شعبہ مالیات حاجی صاحب کے سپرد کر دیا گیا۔ چنانچہ حاجی صاحب نے اپنے رفقاء کے ساتھ اس شعبہ کو ایسا سنبھالا کہ انجمن کو کبھی مالی مشکلات کی شکایت نہیں ہوئی اور یہ سلسلہ مولانا حقانی کے انتقال کے بعد بھی جاری رہا۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں اس انجمن کو تبلیغ الاسلام انبالہ میں مدغم کر دیا گیا جس کو غلام بھیک نیرنگ نے فتنۂ ارتداد کے مقابلہ کے لئے قائم کیا تھا۔ حاجی محمد اسحاق صاحب مخیر ہستی تھیں، دہلی کا کوئی مذہبی ادارہ ایسا نہ تھا جس میں انھوں نے دل کھول کر حصہ نہ لیا ہو۔ جب نئی دہلی بننی شروع ہوئی تو حکومت نے پرانی دہلی کو صاف کرنا شروع کیا، اور پرانی مساجد اور مقابر کو منہدم کرانے شروع کر دئے جس سے مسلمانوں میں بہت زیادہ پریشانی پھیلنے لگی۔ حاجی صاحب نے انجمن محافظ مساجد و مزارات کے نام سے ایک جماعت مولانا حقانی کے مشورے سے قائم کی اور پھر اس انجمن کا ایک وفد چیف کمشنر سے ملا اور طے کرایا کہ جن مساجد اور مقامات پر کتبے ہوں ان کو محفوظ رکھا جائے۔ چنانچہ اس فیصلے کی منظوری کے بعد حاجی صاحب نے اس انجمن میں ملازم رکھ کر پرانی دہلی کے تمام کہنہ مساجد و مقابر پر کتبے لگوائے۔ اور غیر آباد مسجدیں امام مقرر کر کے اُن کو آباد کرایا۔ دہلی کے بہت سے مسلمانوں نے دیکھا ہو گا کہ دسے ہائے سمل لاج کے سامنے جو دو رتنگ حوض بنائے گئے ہیں اُن کے کنارے ایک پرانی شاہی مسجد موجود تھی، یہ قدیم مسجد بھی مسمار ہوتے ہوتے محض حاجی صاحب کی بدولت

رہ گئی۔ حاجی صاحب نے سنہ ۱۳۲۰ھ میں ایک رباط مکۂ معظمہ حارۃ الباب میں بنائی تھی جس پر یہ الفاظ کندہ ہیں۔ حاجی محمد اسحاق محمد عمر سنہ ۱۳۲۰ھ۔"

حاجی صاحب بہت سے عربی مدارس کے رکن اور بعض کے سرپرست تھے ایک زمانہ میں ایسا بھی تھا کہ مدرسہ امینیہ کے ناظم و سرپرست کی حیثیت سے کام کرتے رہے حقیقت یہ ہے کہ اپنی برادری پر حاجی محمد اسحاق کا بڑا احسان ہے حاجی صاحب دہلی کی عیدگاہ کے بھی متولی تھے۔

۲۹ ربیع الاول سنہ ۱۳۶۱ھ کو طویل علالت کے بعد دہلی میں انتقال ہوا۔ اور قبرستان شیدی پورہ میں سپرد خاک ہوئے لہ

لہ یادرفتگان مؤلفہ سلطان رفیع صہ ۱۲۷

ایس۔ اے۔ خالق اشرفی والے

آپ کے والد ماجد کا نام عطاء اللہ وکیل اور دادا کا نام شیخ ثناء اللہ تھا جبکہ پردادا کا نام مصطفیٰ کمال تھا۔ مصطفیٰ کمال کے بیٹے ثناء اللہ صاحب شملہ والے کہلاتے تھے۔ شیخ عطاء اللہ دہلی کے نامور وکیل تھے معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ پھر انھوں نے خود بھی بہت کچھ کمایا وکالت سے بڑی معقول آمدنی تھی۔ خاندان کی وجہ تسمیہ اشرفی والے یہ تھی کہ عطاء اللہ صاحب بہت دریا دل تھے کسی سے خوش ہوتے تو اسے انعام میں روپے کی بجائے اشرفی دیا کرتے تھے نیز اپنی اہلیہ کو کئی دوپٹے بنوا کر دیے جن میں اشرفی ٹنکی ہوئی تھیں۔

ایس۔ اے۔ خالق صاحب تولد ہوئے تو ان کے والد بزرگوار نے جو خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ اپنے صاحبزادے کو اچھی تعلیم و تربیت سے مرصع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابتدا میں خالق صاحب نے کسی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ بعد میں ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد انھوں نے عربک کالج میں داخلہ کیا۔ پھر ان کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھیج دیا گیا۔ وہاں ہاسٹل میں مقیم ہو گئے۔ آپ بڑے ذہین اور باصلاحیت انسان تھے انھوں نے علم نفسیات کا مطالعہ کیا والدین نے علم و آگہی کی طرف ان کے طبعی رجحان کو دیکھتے ہوئے خالق صاحب کو زیادہ سے زیادہ تعلیم کے حصول اور مطالعہ کا موقع فراہم کیا۔ ان کے والد کو

ان سے غیر معمولی محبت تھی وہ اُن کے لئے عمدہ عمدہ لباس اور اشیاء خورد و نوش وغیرہ پارسل کے ذریعے علی گڈھ بھجواتی تھیں، ان کی والدہ اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے شامی کباب بھی بھیجتی تھیں جو ان کو پسند تھے۔ غرضیکہ عبدالخالق ہاتھوں چھاؤں پلے اور اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کی۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد خالق صاحب کی شادی ہوئی جو محمد یعقوب پانی والوں کی صاحبزادی تھیں پھر یہ کلکتہ چلے گئے جہاں انھوں نے انگریزی دوائیوں کا وسیع کاروبار شروع کر دیا۔ اُن کا لباس و رہائش مغربی طرز کی تھی۔ جو اُس زمانہ میں بہت کم نظر آتی تھی۔ اُنھوں نے نہ صرف لباس و طرز معاشرت مغرب کی اختیار کی تھی بلکہ مغرب کی اچھی باتوں کو اپنایا تھا۔ مثلاً وقت کی پابندی حفظان صحت کے اصولوں پر عملدرآمد، کام اور وقت کے لئے وقت کی تقسیم، دیانتداری اور پابندیٔ عہد وغیرہ وغیرہ۔ مغربی تہذیب سے متاثر ہونے کے باوجود وہ پکے مسلمان تھے، ان کو اپنے گھر میں دینی تعلیم ملی تھی اور قرآن و حدیث کا علم رکھتے تھے اور اپنی اولاد کو انھوں نے قرآنِ مجید حفظ کرایا۔ ان کی اہلیہ باپردہ اور گھریلو عورت تھیں۔

ہندوستان میں کساد بازاری کا دور شروع ہوا تو ایس۔ اے خالق کا کاروبار بھی متاثر ہوا جس کے بعد ان کو کاروبار بند کرنا پڑا اور وہ کلکتہ سے دہلی چلے آئے اس کے بعد آپ نے رسائل و اخبارات میں مضامین لکھنا شروع کئے اور کئی کتابیں بھی تحریر کیں۔ آپ نے ایک تجارتی میگزین نکالا جس کا نام روپیہ رکھا جو بہت مقبول ہوا۔ اس سے قبل آپ نے ایک روزانہ اخبار بھی نکالا تھا اس کا نام بھی روپیہ تھا۔ کسی زمانہ میں ملاپ نے پیسہ اخبار نکالا تھا جو بعد میں بند ہو گیا۔ روپیہ اخبار نے کسی حد تک اس کمی کو پورا کر دی۔

روپیہ نہ صرف تجارتی میگزین تھا بلکہ اس میں کامیاب زندگی گزارنے

کے اصول اور ایسے چٹکلے شامل ہوتے تھے جن کو اختیار کر کے لوگ بہت زیادہ فائدے اٹھاتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کے مسلمان پستی اور نکبت کا شکار تھے۔ اور اقتصادی لحاظ سے برادران وطن سے پیچھے تھے۔ ایس، اے، خالق نے اپنے پرجوش مضامین کے ذریعے ان کو تجارت و صنعت کی نئی تکنیک، نوع بہ نوع ایجادات اور علوم نو سے روشناس کرایا۔ انھوں نے محنت کی عظمت کو واضح کیا اور ذہن و استعداد کے زیادہ سے زیادہ استعمال پر زور دیا۔ انھوں نے کام ... اور کام کرنے کی بیش از بیش تلقین کی۔ وہ قارئین کو وقت کی اہمیت واضح کر کے ان کو اپنی صلاحیتوں کے بہترین استعمال کا موقع دیتے رہے۔ وہ دوسروں کو ہی مشورہ نہ دیتے تھے بلکہ خود بھی شب و روز کام کرتے تھے۔ آپ پچیس سال تک تحریری کام میں لگے رہے، اس عرصہ میں انھوں نے کئی کتابیں لکھیں جن میں سے ایک کا نام "ذرائع نہ ہوں تو ذرائع پیدا کرو" اور دوسری کا "توجہ اور حرکت کی کفایت شعاری" تھا۔ ان کتابوں میں زندگی اور کاروبار کو بامقصد اور کامیاب بنانے کے اصولوں اور طریقوں سے بحث کی گئی ہے۔ مشہور امریکی مصنف "ڈیل کارنیگی" نے انگریزی میں جو کام کیا ہے کم و بیش اسی طرز پر اردو میں پہلی کوشش ایس اے خالق صاحب نے کی ہے جو ان کتابوں کی شکل میں موجود ہے۔ آپ نے ۱۹۵۹ء میں انتقال کیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ آپ کی "توجہ اور حرکت کی کفایت شعاری" کا دیباچہ حسب ذیل نقل کیا جاتا ہے۔

شیخ عبد الخالق دہلوی سائیکالوجسٹ و ایڈیٹر ریویو میگزین نے سالہا سال تک ریسرچ کی اور اس ریسرچ کے دوران امریکی اور فرنگی کتب کا بہت غور سے مطالعہ کیا۔ اور اسی ریسرچ کی بدولت کلکتہ میں ایکسپورٹ اور امپورٹ کا بڑے پیمانہ پر کاروبار کیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ بڑی کامیابی کا راز اور بڑی ناکامی کا سبب اکثر اوقات

ذرا ذرا سی باتوں پر منحصر ہوتا ہے جو اصحاب اس بات کو سمجھ لیتے ہیں وہ اپنی ترقی کے راستے کو صاف رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ ان بظاہر معمولی باتوں کی پرواہ نہیں کرتے وہ خود اپنی ترقی کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم ایک ٹب پانی سے بھرنا چاہیں اور اس میں سوراخ ہیں مگر بند نہ کریں اور اس صورت میں یا تو ٹب پانی سے بھرے گا ہی نہیں اور یا ہمارا بہت سا پانی ضائع ہو جائے گا۔ ایک جنرل لڑائی کے میدان میں جس وقت فوج کی کمان کر رہا ہوتا ہے اس وقت وہ اپنی فوج کی بھاری جمعیت پر بھروسہ کر کے اطمینان سے نہیں بیٹھ رہتا بلکہ اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ کس طرح دشمن کی ناکہ بندی کی جائے اور کیا ترکیب کی جائے کہ اپنے ذرائع وسیع ہوں

تقریباً ہر شخص نے یہ نصیحتیں سنی ہوتی ہیں کہ "وقت بچاؤ" وقت قیمتی ہے مگر وقت کس طرح بچایا جائے۔ "روپیہ بچاؤ فضول خرچی نہ کرو" مگر روپیہ کیسے بچایا جائے فضول خرچی کسے کہتے ہیں ظاہر ہے اگر آپ وقت بچائیں گے اور وقت کا صحیح مصرف بھی کریں گے اور روپیہ بھی بچائیں گے اور روپیہ کو صحیح جگہ خرچ بھی کریں گے تو لازمی طور پر آپ اپنے پیشے اور تجارت میں ترقی کرنے لگیں گے ان طریقوں کو شیخ صاحب نے اپنی تصانیف میں بہت جامع الفاظ میں بیان کیا ہے۔

شیخ صاحب نے بڑی محنت سے اپنی تصانیف لکھی ہیں۔ اور تمام تر توجہ اس بات پر لگائی ہے کہ مضامین دلچسپ ہوں، مختصر ہوں اور ہر مضمون میں زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد باتیں بھی ہوں۔ [1]

---

[1] یادِ رفتگاں مولانا سلطان رفیع صہ ۲۹ء

خان بہادر ایس، ایم عبداللہ

دہلی کے نامور بزرگ خان بہادر ایس، ایم عبداللہ کی زندگی "مینارِ نور" کی حیثیت
رکھتی ہے۔ انھوں نے تقریباً پچاس سال تک مسلسل ہندوستان کے عوام کی زبردست
اور انتھک خدمت انجام دی۔ میونسپل کمیٹی دہلی کی تینتیس سالہ رکنیت کے دوران
اہالیانِ دہلی کی فلاح و بہبود کے لئے عمدہ کام کیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب تقسیمِ ہند عمل میں
آئی اور دہلی میں زبردست فسادات پھوٹ پڑے تو ایس ایم عبداللہ پاکستان منتقل
ہونے کے بجائے دہلی میں قیام کر کے مسلمانوں کی سلامتی اور حفاظت کی تدابیر میں
لگے رہے، انھوں نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر فساد زدہ علاقوں کے بار بار دورے
کئے اور ہر ممکنہ خدمت انجام دی جس میں تعلیمی، مذہبی، سماجی اور رفاہی ہر نوعیت کی
خدمات شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ان کے سانحہ ارتحال کو کافی عرصہ گزر چکا ہے
مگر آج بھی اہالیانِ دہلی کے ذہن میں ان کا تصور تازہ ہے اور ان کا نام آج بھی بڑے
احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

ایس ایم عبداللہ صاحب کے والد ماجد ایس ایم فضل الٰہی تھے۔ ان کی
پیدائش دہلی کے محلہ پھاٹک حبش خاں میں ہوئی۔ اینگلو عربک اسکول سے انھوں نے
تعلیم حاصل کی۔ دہلی میں ایس، ایم عبداللہ اینڈ سنز کے نام سے فتحپوری مسجد کی بلڈنگ
میں ان کا آفس تھا۔ موصوف اسٹنگ کا بزنس کرنے والے اولین چند افراد میں سے

تھے اس خاندان کی عرفیت انڈر نیشنل ٹائر پڑ گئی جو بعد میں مختلف ہو کر صرف ٹائر رہ گئی
وہ پرانی تصیلالدین اینڈ کو نامی فرم میں شریک تھے اس کے علاوہ میسرزالٰہی بخش آرمز
کمپنی (رجسٹرڈ) کلکتہ میں بھی ان کی شرکت رہی۔

آپ دہلی کے ابتدائی تعلیم یافتہ اور باشعور حضرات میں شامل تھے جنہوں
نے سیاست میں سرگرم حصہ لیا ان کے قائد اعظم محمد علی جناح، شہید ملت لیاقت
علی خاں، خواجہ ناظم الدین، نواب محمد اسماعیل خاں اور دیگر مسلم زعما سے
قریبی روابط تھے انھوں نے تحریک میں حصہ لیا۔ اور مسلم لیگ کے ساتھ کافی مالی
اور عملی تعاون کیا وہ کئی سال تک آل انڈیا مسلم لیگ کے جوائنٹ سکریٹری رہے۔
اور انھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے لاہور کے اجلاس میں بھی شرکت کی جس
میں قرار پاکستان منظور کی گئی تھی وہ انجمن وکیل قوم پنجابیان اور دہلی کے ایک سرگرم
و فعال رکن تھے انھوں نے پنجابی یوتھ لیگ دہلی کی سرپرستی منظور کی۔ دہلی کی بھی
دو نمائندہ تنظیمیں تھیں۔

آپ کئی سال تک پنجاب چیمبر آف کامرس دہلی کے صدر رہے۔ وہ مظہر الاسلام
اسکول دہلی کے آنریری سکریٹری تھے جسے منشی نور الٰہی صاحب والد حافظ محمد نسیم
بٹی والوں نے قائم کیا تھا وہ تادم مرگ اس عہدہ پر فائز رہے۔ وہ جامع مسجد دہلی
کے علاقہ میں مدرسہ ریاض العلوم کے منتظم و مہتمم بھی تھے جہاں طلباء کو قرآن مجید اور
حدیث کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ مدرسہ ان کے والد ماجد جناب ایس ایم فضل الٰہی صاحب
نے قائم کیا تھا وہی اس کی کفالت کرتے تھے۔ یہ مدرسہ اب بھی قائم ہے اور اس
کا فیض جاری ہے وہ اٹھارہ سال تک وکٹوریہ زنانہ ہسپتال کے آنریری
سکریٹری رہے جو دہلی کا سب سے بڑا زنانہ ہسپتال تھا۔ وہ شاہی مسجد فتحپوری
کے انتظامیہ کے ایک رکن اور امیر و سنٹرل ٹرسٹ کے ایک اساسی رکن بھی تھے

وہ جوائنٹ واٹر اینڈ سیوریج بورڈ دہلی کے ایک ممبر، اور ڈاکٹر اشراف کے
آنکھوں کے ہسپتال دریا گنج دہلی کے ٹرسٹی تھے وہ دہلی راشننگ اینڈ فوڈ اتھارٹی دہلی
کی ایڈوائزری کمیٹی کے ایک رُکن تھے وہ دہلی کلاتھ اینڈ جنرل ملز لمیٹڈ دہلی
کے بورڈ آف ڈائرکٹر کے چیئرمین بھی تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے اُس
چانسلر تھے۔ اُنھوں نے بیش بہا عطیات حاصل کئے۔ اور خود بھی ان میں حصّہ
لیا۔ وہ سنہ ۱۹۲۱ء میں دہلی میونسپل کمیٹی کے رُکن منتخب ہوئے اُنھوں نے یہ سیٹ
فراش خانہ دہلی کے علاقہ سے جیتی۔ جبکہ ان کے مقابلہ میں مشہور زمانہ حکیم سراج
الدین صاحب تھے۔ دوسرے سال وہ دوبارہ میونسپل کمیٹی کے رُکن منتخب ہو گئے،
اس بار وہ پہاڑ گنج بستی خاں کے علاقہ سے کھڑے ہوئے تھے۔ اور بلا مقابلہ
منتخب کر لئے گئے۔ اس کے بعد وہ مسلسل جیتتے رہے اس طرح وہ تیس سال تک
میونسپل کمیٹی دہلی کے رُکن رہے جو غالباً ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔

خان بہادر صاحب صرف ایک ممبر ہی نہ تھے بلکہ اپنی ذات سے ایک
ادارہ تھے وہ کمیٹی کے سب سے سینئر رکن تھے ایک وقت تھا کہ خان بہادر
میونسپل کمیٹی پر حکمرانی کرتے تھے، وہ تین سال تک سینئر وائس پریزیڈنٹ منتخب
رہے وہ کمیٹی کے سب سے زیادہ قابلِ احترام رکن تھے کوئی شخص بھی کسی شہری امور میں
ان کی اہلیت اور تجربہ کو چیلنج نہیں کر سکا۔ سالہا سال تک آپ مقامی انتظامیہ کی
قوت سمجھے جاتے رہے وہ دہلی کے صوبہ میں اپنے وقت کی اہم ترین شخصیت شمار ہوتے
تھے انھوں نے کمیٹی کے دیگر تمام ممبران سے زیادہ وقت دیا اور پوری محنت اور
دیانتداری سے اپنے فرائض انجام دئے وہ مشکلات پر بڑی اچھی طرح قابو پا لیتے
تھے۔ وہ غیر معمولی قوت ارادی اور بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے کمیٹی میں
اُن کی پُر جوش تقریریں لوگ سنتے تھے، وہ الفاظ کے محتاج نہ تھے وہ بڑی خوبی

اور جرأت کے ساتھ اظہارِ خیال کرتے تھے۔ لوگ ان کے ساتھ کام کرنا باعث عزت و افتخار سمجھتے تھے جس نے بھی ان کے ساتھ کام کیا ہے اس نے اُن سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اُن میں بے پناہ خوبیاں تھیں، وہ امپورٹ بزنس کے بانیان میں تھے وہ نہ صرف شہر کے سب سے بڑے امپورٹر بلکہ شمالی ہندوستان کے چند بڑے درآمد کنندگان میں سے ایک تھے۔ بطور انسان وہ بہت عظیم تھے ان کی شخصیت کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ وہ دوستوں کے دوست اور یاروں کے یار تھے ان کی دوستی نسل و فرقہ و مذہب سے بلند تھی ان ایام میں بھی جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین کشمکش برپا ہوئی تھی انھوں نے کبھی اپنے کسی ہندو دوست سے اس لئے ایفائے عہد میں کوتاہی نہ کی کہ وہ ہندو ہے وہ غیر معمولی طور پر بہادر اور حوصلہ مند تھے ۱۹۴۷ء کے فسادات میں کبھی انھوں نے دہلی کو نہیں چھوڑا اور وہ بدستور دہلی کی شہریوں کی خدمت میں مصروف رہے جس میں ہندو مسلمان سبھی شامل تھے ذاتی حفاظت کے خیال یا خطرہ کے احساس نے کبھی ان کو صبح سے رات تک اپنے خدمتی مشاغل سے باز نہیں رکھا۔

ایس ایم عبداللہ جیسا دوسرا آدمی پیدا ہونا مشکل ہے وہ آدمیوں کے درمیان ہیرا تھے' ملا واحدی صاحب نے اپنی کتاب میرے زمانہ کی دلی' میں خان بہادر ایس ایم عبداللہ کا جابجا تذکرہ کیا ہے اس کے چند اقتباس یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

خان بہادر ایس ایم عبداللہ کا وائس پریذیڈنسی میونسپل کمیٹی دہلی میں نے دیکھی سُنا بھلا معلوم ہوتا تھا۔۔۔ خان بہادر ایس ایم عبداللہ کی تعلیم زیادہ نہ تھی لیکن اچھے اچھے پڑھے لکھوں کو پڑھاتے تھے مسلمانانِ دہلی کی ذہانت کا نمونہ اور مسلمانانِ دہلی کی اکڑ کا بھی حرف، دوستوں کے دوست، مخالفوں کے

مخالف، مخالفت آغاز کر کرتے تھے اور دوستی پر ان کو بھروسہ کیا جاتا تھا خان بہادر ایس ایم عبداللہ اس پریزیڈنٹ نہ رہنے کے بعد بھی بے اثر نہ ہوئے تھے۔

۱۳ اپریل ۱۹۵۱ء کو ایس ایم عبداللہ صاحب نے ۹۰ سال کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ آپ کے انتقال پر دہلی میونسپل کمیٹی کے سینئر وائس پریذیڈنٹ لالہ شام ناتھ نے کمیٹی کے اجلاس میں خان بہادر ایس ایم عبداللہ کو شاندار الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

سید میر محمد اشرف علی

میر صاحب نے دہلی کالج سے فارسی و عربی کی تحصیل کی۔ فارسی میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ اردو کا ترجمہ کرنے میں ان کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان کے والد ماجد مولوی میر اکبر علی صاحب کی فارسی دانی کی بڑی دھوم تھی۔ مولانا امام بخش صہبائی بھی ان کی فارسی دانی کے قائل تھے۔ ان کے والد نے بھی ان کو فارسی پڑھانے پر بڑی محنت کی تھی اور میر صاحب نے بھی فارسی دانی میں بڑا نام پیدا کیا۔ دہلی کالج میں منشی مقرر ہوئے۔ بہت لائق و قابل شخص تھے۔ تاریخ کشمیر جو فارسی زبان میں تھی انھوں نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ اصول حساب کی تالیف کرنے میں بابو ہر دیو سنگھ کی مدد کی۔ اور بریف سروے آف ہسٹری کے اُردو ترجمے کی اصلاح کی۔ جناب مولوی کریم الدین پانی پتی اپنی مشہور و معروف تالیف طبقات الشعراء میں سید میر محمد اشرف علی صاحب کے بارے میں تحریر کرتے ہیں :۔

"منشی مولوی میر اشرف علی بہت ذہین اور ذکی آدمی ہیں اُردو زبان بہت پاک و صاف ہے اور اچھی مہارت فارسی کی ان کو حاصل ہے۔ ایک تاریخ کشمیر کی جو فارسی میں تصنیف کی ہوئی محمد اعظم کی تھی بموجب صاحب بہادر پرنسپل مدرسہ دہلی کے اُردو میں انھوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے جو بہت اچھا ترجمہ ہے اور اصول حساب میں بابو ہر دیو سنگھ کی مدد کی ہے اور بریف سروے ہسٹری

کے ترجمے میں بھی انھوں نے تصحیح اور اصلاح جاری کی ہے۔ غرضیکہ یہ شخص بہت خلیق متواضع، کشادہ پیشانی، ہنس مکھ صورت، ظریف، ادیب اور عقلمند آدمی ہے دوستی بھی صاف اور بے لگاؤ ہے۔ یار باوفادار بامروت ہے۔ قوم سے سید زیدی واسطی بڑے خاندان کا ہے۔

دہلی سے ایک ہفتہ وار اخبار قرآن السعدین ۱۸۴۵ء میں جاری ہوا اس کے پہلے ایڈیٹر پنڈت دھرم نرائن ہوئے اس کے بعد محمد حسین صاحب جو دہلی کالج میں انگریزی کے مدرس تھے انھوں نے اس اخبار کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ بعد میں سید محمد اشرف صاحب اس کے تیسرے ایڈیٹر مقرر ہوئے جس کا ذکر محمد حسین صاحب نے ۲۷ نومبر ۱۸۴۸ء کے قرآن السعدین کے شمارے میں کیا ہے۔

اظہار از طرف مہتمم: مہتمم اخبار ہذا خدمت میں ان جمیع صاحب ذوالاصفات اور دوستان شفیق کی جن کی عنایت و نوازش پیچ و ترویج اس پرچہ اخبار کی بدل مبذول تھی بصد اظہار نیازمندی عرض کرتا ہے اور اس ذرہ بے مقدار کو جناب ہملٹن صاحب بہادر دام اقبالہٗ۔ ریذیڈنٹ مالوہ نے محض اپنی والاہمتی اور بزرگی کار فرما کر اوپر اہتمام مطبع اور درس ثانی اندور پر مامور فرمایا ہے، اگرچہ ہمہ تن زبان ہو تو بھی اس کی عنایت کا ادائے شکر نہیں کرسکتا ازبسکہ عزم روانگی اس دیار کا درپیش ہے۔ اسی واسطے جمیع صاحبان بزرگ طبیعت سے امید ہے کہ وہ بطور قدیم مہتمم ثانی پر بھی اپنی عنایت و شفقت مبذول رکھیں اور یکم دسمبر ۱۸۴۸ء سے جمیع خطوط متعلقہ قیمت اخبار وغیرہ سید محمد اشرف علی مہتمم مطبع العلوم کے نام مرحمت فرمائیں (۵۶۸)۔

یہ ہفتہ وار اخبار بارہ صفحات پر مشتمل تھا۔ سالانہ چندہ دو روپے تھا مطبع العلوم دہلی کالج میں چھپتا تھا۔ محب ہند دہلی، فوائد الناظرین دہلی، قرآن السعدین دہلی اور

تحفۃ الحدائق دہلی کالج کے اساتذہ کے اہتمام سے شائع ہوتے تھے اور ان کے مضامین کی نگرانی کالج کی ایک کمیٹی کرتی تھی ان اخباروں میں اشاعت سے پہلے چھپنے والے تمام مضامین کالج کے شعبۂ عربی کے اول دوم مولویوں کو دکھلائے جاتے تھے، ان مضامین کے جو حصے ان لوگوں کو قابلِ اعتراض معلوم ہوتے تھے ان کو حذف کرنے کا اُن کو اختیار حاصل تھا۔ طباعت کے بعد قرآن السعدین کی ایک کاپی مقامی کمیٹی کے ممبر مسٹر جے بی گوبنس کو اور فوائد الناظرین اور محب ہند کی ایک ایک کاپی مقامی کمیٹی کے عارضی سیکریٹری مسٹر ٹیلر کو بھیجی جاتی تھی۔ یہ حضرات ان کا بغور مطالعہ کرتے تھے بلکہ قرآن السعدین کے بانی دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر سپرنگر صاحب تھے جنہوں نے اس اخبار کے متعلق فرمایا تھا۔

"۱۸۴۵ء میں میں نے پے نی میگزین کی طرز پر ایک باتصویر رسالے کی بنیاد ڈالی۔ اس کا نام قرآن السعدین تھا گویا مشرق اور مغرب مشتری اور زہرہ تھے جن کا قرآن اس رسالے میں ہوا تو یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ اس کی تقلید میں بارہ سے زیادہ رسالے نکل رہے تھے...... میرے نزدیک میری سعی کا یہ بہترین ثمرہ ہے کہ جن لوگوں کے نفع کے لئے میں نے جدوجہد کی تھی ان کو اس سے ایسی تشویش ہوئی کہ وہ نمونے سے بہترین چیزیں بنانے لگے جو ان کے لئے اور ان کے ملک کے لئے مفید ہوں گی۔"

اخبار قرآن السعدین بلند ترین معیار کا حامل تھا۔ اس کے مضامین بڑے دقیق اور تاریخی و معلوماتی ہوتے تھے۔ اس کا مقصد اپنے ہم وطنوں کو یورپین علم و ادب سے روشناس کرنا اور تعلیم کی طرف توجہ دلانا تھا اس کا طرزِ تحریر دلکش اور پسندیدہ اور عمدگی اور قابلیت کے ساتھ عام ذہنوں کو تربیت دینے میں کامیاب رہا۔

اس اخبار میں جو مضامین شائع ہوتے تھے اس کا اندازہ چند حسب ذیل عنوانات سے لگایا جا سکتا ہے:۔

(۱) کاہلی اور سستی ہندوستانیوں کی تمام اُموریں جن میں رفاہ عام مقصود ہے اور جو مفید ہنر ہو (۲) حال حکیم سقراط یونانی کا (۳) علم جغرافیہ کے فوائد میں ۔ ۲۷ نومبر ۱۸۴۵ء (۴) ثبوت وجود کے بیان میں۔ ۹ نومبر ۱۸۴۵ء (۵) خیالات ایک شخص کے جو بجائے خود یہ فکر کرتا ہے کہ مذہب کے باب میں کون سی باتوں کا معتقد ہو۔ ۱۹ اکتوبر ۱۸۴۵ء (۶) حال ملکہ الزبتھ ۲ اکتوبر ۱۸۴۵ء (۷) حال شہنشاہ قسطنطین اعظم کا۔ ۹ اگست ۱۸۴۵ء (۸) اکبر بادشاہ کا بندوبست۔ ۲۲ اگست ۱۸۴۵ء۔ (۹) ہندوؤں میں علوم و فنون کی ترقی نہیں ہوتی۔ ۲۴ اگست ۱۸۴۵ء (۱۰) خلاصہ تاریخ ہندوستان اور عہد محمود غزنوی ۲۴ اپریل ۱۸۴۵ء (۱۱) تاریخ ملتان۔ ۸ مئی ۱۸۴۵ء۔

یہ اخبار بہت محتاط تھا اور حکومت برطانیہ کے خلاف تو کچھ لکھ ہی نہیں سکتا تھا اس کا ہر ایک مضمون انگریزوں کی نظر سے گزرتا تھا لیکن بعض اوقات اس میں ہندوستان کے صحیح حالات چھپ جاتے تھے چنانچہ جس زمانہ میں پنجاب میں انگریزوں نے ہندوستان کو غلام بنانے کے لئے جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ اس وقت ایک انقلابی و باغیانہ اشتہار کی مختصر سی عبارت ۱۲ اکتوبر ۱۸۴۵ء کے شمارے میں چھپ گئی تھی۔

امرتسر کے ایک مجاہد کے دروازہ پر ایک اشتہار کسی ناعاقبت اندیش نے لگایا تھا۔ خلاصہ اس مضمون کا یہ ہے چونکہ انگریزوں نے بدعہدی اور ظلم کیا ہے اس واسطے سب اشخاص جو گوروں کے معتقد ہیں واجب ہے کہ بدل و جان ساعی ہوں اور انگریزوں کو قتل کریں اور اپنی ریاست مقرر کریں اور جو شخص

اس بات پر کمر ہمت نہ باندھے گا وہ سکو نہیں ہے (۴۹۶)

ہندوستان سے انگریز کس قدر روپیہ انگلینڈ روانہ کرتا تھا اس کی تفصیل زیر عنوان حال روانگی روپیہ کام ہندوستان اور ولایتوں کے تحت ۶؍ مارچ ۱۸۴۵ء کے قرآن السعدین میں دی ہے۔

مطبع العلوم متعلقہ دہلی کالج کے آخری مہتمم سید اشرف علی صاحب تھے۔ اس مطبع میں دہلی کے مدرسوں کی کتابیں چھپتی تھیں۔ فوائد الناظر قرآن السعدین وغیرہ اسی مطبع میں طبع ہوتے تھے اس مطبع کے شیئر ہولڈر تھے اور اس کے حصے کی رقم سے مطبع چلایا جاتا تھا دہلی کے بیشتر اساتذہ اس اسکیم میں شامل تھے مثلاً مولوی مملوک علی صاحب، ماسٹر رام چندر، مولوی سبحان علی، میر سید محمد خوشنویس بھی اس کے حصہ دار تھے۔ بہت دنوں تک اس مطبع نے تنہا اپنا سکہ جمائے رکھا لیکن جب اور مطابع جاری ہو گئے تو چھپائی سستی ہو گئی اور اس کا اثر مطبع پر پڑا چنانچہ ۱۶؍ دسمبر ۱۸۴۶ء کے شمارے میں اس پریشانی کا ذکر کیا ہے۔

غالباً قرآن السعدین ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے قبل تک جاری رہا اس کے بعد بند ہو گیا۔

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کو گذرے ہوئے نو سال گذر چکے ہیں خوف و ہراس کا عالم ختم ہوتا جا رہا ہے۔ علوم و فنون کا آفتاب عالمتاب ہندوستان کے مختلف صوبوں اور خصوصاً اجڑے دیار دہلی کو بھی اپنی شعاعوں سے منور کر رہا ہے۔

مختلف صوبوں میں علمی، تاریخی اور ادبی سوسائٹیاں قائم ہو چکی ہیں۔ اور ہوتی جا رہی ہیں مولانا محمد قاسم مولوی رحمۃ اللہ بانیِ مدرسہ دارالعلوم دیوبند، سرسید مرحوم و مغفور اور برہمو سماج کے بانی راجہ رام موہن رائے سوئی ہوئی قوموں میں روح پھونکنے اور علم پھیلانے میں منہمک نظر آتے ہیں۔

ادھر دہلی میں دہلی کالج شباب پر ہے اور دہلی سوسائٹی کو بھی قائم ہوئے ایک سال گذر چکا ہے۔ ماسٹر پیارے منشی ذکاء اللہ بھیڑے ہوئے اہل علم حضرات کو دہلی کے پلیٹ فارم پر لانے کے لئے کوشاں ہیں۔ یہی ۱۸۶۶ء مبارک سال ہے جب علی گڑھ تاریخی اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ، دہلی سے اکمل الاخبار اور رامپور سے دبدبۂ سکندری جاری ہوئے۔

مرزا غالب بھی دہلی میں تشریف فرما ہیں لیکن چراغِ سحری کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قدرت بھی چاہتی ہے اور مرزا غالب کی بھی آرزو اور تمنا ہے کہ دا بدجانی

دہلی میں دہلی کے علم وفضل کی لاج رکھنے والا کوئی پیدا ہو۔ اُن کی منشا پوری ہوئی کہ ۱۳ار دسمبر ۱۸۶۶ء کو بازار سیتارام دہلی میں حضرت کیفیؔ پیدا ہوئے۔

کیفی صاحب کا خاندان کشمیر کا بہت پُرانا خاندان ہے کیفی صاحب کے بزرگ کشمیر سے فرخ سیئر کے زمانہ میں دہلی آئے۔ مرکزی دفتروں میں بڑے بڑے عہدوں پر مامور رہے۔ اُنیسویں صدی کے آغاز میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت شروع کی، آپ کے پردادا کا نام صاحب رائے تھا۔ ان کے دو صاحبزادے تھے پنڈت درگا پرشاد جو فارسی کے بہت اچھے عالم تھے۔ اور ایک چھوٹے عہدہ "پرفاضل کا" میں ملازم تھے جو اُس وقت ضلع سرسہ کی ایک تحصیل تھی۔ دوسرے صاحبزادے جیون رام فیروز پور جھرکہ میں تحصیلدار تھے۔ مدت تک کیفی صاحب ان کو اپنا دادا سمجھتے رہے کیفی صاحب کے والد پنڈت کنہیا لال تھے۔ کیفی صاحب دو تین مہینے کے تھے کہ اُن کے والد کا انتقال ہو گیا کیفی صاحب کے والد ریاست نابھ کے کوتوال تھے۔

کینہ پروری اُس زمانہ میں ایسی تھی کہ کیفی صاحب نے بتایا کہ پنڈت جیون رام نے آخر عمر تک اپنے پوتوں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں کیا ہمیں اپنی یتیمی کا احساس بہت مدت میں جا کر ہوا۔

جیون رام کے دو لڑکے ایک پنڈت سری کشن تھے جو پنجاب کے مختلف اضلاع میں تحصیلدار رہے۔ دوسرے پنڈت رادھا کشن جو پٹیالہ میں سپرنٹنڈنٹ چنگی تھے۔

کیفی صاحب کے والد صاحب کے انتقال کا واقعہ انتہائی سبق آموز ہے وہ ۱۸۵۷ء کے بعد کا ذکر ہے کہ نارنول کا علاقہ جو پہلے نواب جھجر کی ریاست میں تھا انگریزوں کی طرف سے پٹیالہ کو ملا۔ سرحد بندی اور فوجداری و دیوانی

میں ملزموں کی پکڑ دھکڑ کے متعلق انگریزی علاقہ اور ریاست کے حکام میں کچھ اختلاف تھا۔ اس گڑبڑ کو مٹانے کے لیے پنڈت جیون رام جو اس وقت ضلع حصار میں تحصیلدار تھے، انگریزوں کی طرف سے پٹیالہ بھیجے گئے، آپ کے والد نابھ میں کوتوال تھے، دونوں شہروں میں تھوڑا ہی فاصلہ تھا۔ اس وقت پٹیالہ میں ہیضہ کی وبا پھیل رہی تھی۔ کیفی صاحب کے والد نے اپنے چچا کو لکھا کہ آپ اس بُرے وقت میں پٹیالہ کیوں گئے۔ کچھ دنوں کے لیے یہاں تشریف لے آئیے وبا کا زور کم ہو جائے تو فرائض منصبی انجام دیجیے گا۔ پنڈت جیون رام کے ساتھ اُن کے بڑے لڑکے سری کشن بھی تھے، پنڈت جی کے جواب میں لکھا کہ تو جانتا ہے کہ میں ڈرپوک نہیں ہوں نہ میں اکیلا ہوں، تیرا بڑا بھائی سری کشن میرے ساتھ ہے۔ میں اپنے فرض کو سب چیزوں پر مقدم سمجھتا ہوں مجھے ڈر ہے تو پٹیالہ مت آ، میں کام ختم کر کے خود تجھ سے ملنے آؤں گا گر تو تو پولیس کا آدمی ہے اور پولیس کے لوگ نڈر ہوا کرتے ہیں۔ کیفی صاحب کے والد کو جب یہ خط پہنچا تو بہت متاثر ہوئے اور ڈرپوک اور نڈر کے فقرے اُن پر بہت شاق گذرے۔ راجہ ہیرا سنگھ اس وقت نابھ کی گدی پر تھے۔ فوراً اُن سے دو دن کی اجازت لے کر پٹیالہ چلے گئے۔ معلوم نہیں کھانا کھاتے ہی سوار ہوئے تھے یا کیا کھایا تھا پٹیالہ پہنچنے کے بعد چند گھنٹوں میں ہیضہ ہوا اور جاں بحق ہو گئے جوان ہی تھے۔

کیفی صاحب کے نانا ہری کشن بھی فارسی جانتے تھے، فارسی میں ہی خط و کتابت کرتے تھے اُن کے بھائی رادھا کشن کرنال کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔

بازار سیتارام میں کیفی صاحب کے گھر کے قریب حکیم بدری داس کا مطب

تھا اور ان کے ہاں مکتب بھی تھا اس میں اُن کو داخل کیا گیا گلستاں بوستاں اور دستور الصبیان وغیرہ کتابیں جلد ہی مکتب میں ختم کرلیں، اسکول میں بٹھایا گیا×اس زمانہ میں دوسری جماعت سے ہی انگریزی کی تعلیم شروع کرادیتے تھے۔ یہ نصاب سینٹ اسٹیفنز کالج لوئر پرائمری کا تھا۔ یہاں سے فارغ ہوکر ان کو شاہ جی کے چھتے کے سرکاری اسکول میں داخل کیا گیا مولوی رحیم بخش صاحب جو بعد میں سر رحیم بخش ہوگئے تھے ان کے فارسی کے اُستاد تھے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول کشمیری دروازہ میں آپ نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ مسٹر آر بیکر ہیڈ ماسٹر تھے مولوی محمد سعید صاحب ریاضی مولوی شاہجہاں کے والد فارسی پڑھاتے تھے، پنڈت گوند جیون سنسکرت پڑھانے کے لئے مقرر تھے۔ مولوی سید احمد صاحب مولف فرہنگ آصفیہ اور ماسٹر شیو پرشاد بھی اسی اسکول میں تعلیم دیتے تھے، بی اے آپ نے سینٹ اسٹیفنز کالج سے پاس کیا۔

کیفی صاحب نے سب سے پہلے ملازمت لالہ مُرلی دھر کے ہاں کی اُنھوں نے شروع جنوری ۱۸۸۸ء میں اخبار رفیر انڈشس جاری کیا تھا وہ اس اخبار کے مالک تھے، یہ ہفتہ وار تھا۔ انبالہ سے ہیوم پریس میں چھپکر شائع ہوتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر پنڈت برجمن دتاتریہ کیفی صاحب مقرر ہوئے کانگریس کے اغراض و مقاصد کی تشریح اس اخبار کا خاص مقصد تھا۔ میں نے اس اخبار کے فائل کریسا لائبریری بمبئی میں دیکھے ہیں، یہ اخبار ۱۸۹۰ء تک جاری رہا۔ اس وقت تک کیفی صاحب اس کے ایڈیٹر رہے۔ ان کے علیحدہ ہونے کے بعد اس نے اپنی زندگی کے دن پورے کئے۔

اس کے بعد کیفی صاحب پٹیالہ کے منشی خانہ میں پرانے مراسلات کو ترتیب دینے کے لئے مقرر ہوئے جو انگریزوں اور دوسری ریاستوں کے مابین

ہوتے تھے کپورتھلہ میں مہاراجہ جگت جیت سنگھ والئے کپورتھلہ کے چچا کنور سچیت سنگھ کے کئی برس سکریٹری رہے۔

۱۹۱۶-۱۵ میں راجہ سردل جیت سنگھ کے ہمراہ انگلستان گئے۔ ۱۹۱۹ء سے اسسٹنٹ سکریٹری فورن ڈیپارٹمنٹ ریاست کشمیر کے فرائض انجام دئے اس کے بعد جاگیردار سپنی کے وزیر ہوئے۔ جو ایک چھوٹی جموں کے ماتحت ریاست تھی۔

۱۹۳۷ء میں آپ کے صاحبزادے پنڈت پیارے موہن بی اے کا انتقال ہوگیا تھا، اس لئے آپ اس کی نشانی یعنے اپنے پوتوں کی تربیت کی غرض سے لائلپور تشریف لے گئے۔ ۱۹۳۹ء میں انجمن ترقی اُردو حیدرآباد دکن سے دہلی آگئی اس وقت اس کے جنرل سکریٹری بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب لائلپور سے کیفی صاحب کو دہلی لے آئے۔ ۱۹۴۵ء تک آپ نے انجمن ترقی اُردو کے اہم کام انجام دئے، اسی لئے سال دل اور ضیق النفس کے امراض کا حملہ ہوا، ان کے چھوٹے صاحبزادے جو لائلپور کالج میں پروفیسر تھے ان کو دہلی سے لے گئے۔

پنڈت اجودھیا ناتھ شروری لکھنؤ کے قدیم باشندے فیض آباد میں ملازم تھے ان کی صاحبزادی سے کیفی صاحب کی شادی ہوگئی اور شاعری اور ادب کے حق میں یہ جوڑ میل بہت مبارک ہوا۔ زیادہ تر اس وجہ سے بھی کہ بیگم کیفی اچھی لکھی پڑھی تھیں۔ ان کی حیات میں ان کا انتقال ہوگیا تھا، اولادیں کئی ہوئیں لیکن دو صاحبزادے ان میں سے زندہ رہے۔ بڑے صاحبزادے پنڈت پیارے موہن دتاتریہ بی اے ایل بی لاہور کے نامی انگریزی روزنامہ ٹریبیون کے فرسٹ اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج روپڑ میں پروفیسر مقرر ہوئے۔

۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں کیفی صاحب کے بارے میں اطلاع آئی کہ آپ کو کسی نے قتل کر دیا ہے یہ اطلاع دہلی کے ریاست اخبار میں شائع ہوئی، دوستوں نے تاریخ وفات تک کہدی اور مرثیے لکھنے شروع کر دئے۔ لیکن چند دنوں کے بعد یہ اطلاع غلط ثابت ہوئی اور معلوم ہوا کہ آپ بخیریت بمبئی پہنچ گئے ہیں، جہاں آپ اپریل ۱۹۴۸ء تک رہے۔ مئی ۱۹۴۸ء کے پہلے ہفتہ میں احمد آباد میں اُردو کانفرنس ہو رہی تھی۔ کیفی صاحب اس میں شریک تھے، بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب بھی اس میں شرکت کے لئے آئے اور کیفی صاحب کو اپنے ہمراہ کراچی لے گئے وہاں اُن ہی کے ہاتھوں مولوی عبدالحق صاحب نے اُردو کے اخبار "قومی زبان" کا افتتاح کرایا۔

مولوی عبدالحق صاحب اور دوسرے احباب کا فیصلہ ہوا کہ کیفی صاحب دہلی میں انجمن کا کام چلائیں اور مولوی صاحب کراچی میں۔ مرکز ایک ہی رہے بعض وجوہ کی بناء پر اس تجویز پر عملدر آمد نہ ہو سکا۔ اور مولوی صاحب کو کراچی کے لئے اور کیفی صاحب کو ہندوستان کے لئے محدود ہونا پڑا۔ چنانچہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب صدر، کیفی صاحب نائب صدر اور جنرل سکریٹری قاضی عبدالغفار صاحب بنائے گئے۔

کیفی صاحب کے اخلاق انتہائی وسیع تھے کھلی ہوئی پیشانی چمکتی ہوئی آنکھیں اور مسکراتا چہرہ ان کے ملنے والوں کو اُن کا گرویدہ کر لیتا تھا۔ ان سے مل کر ہمیشہ دل کو خوشی ہوتی تھی اور بار بار ان سے ملنے کو جی چاہتا تھا۔ ان کی گفتگو ہمیشہ پاکیزہ اور شگفتہ ہوتی تھی اور ان کے مزاج سے کبھی کسی کی دل شکنی نہیں ہوتی تھی اُن کے احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا۔

تواضع اور مروت ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ تواضع

میں وہ مشرقی اصولوں کے پابند تھے کیفی صاحب کی دوستی رسمی نہیں تھی۔ ان کے دل میں دوستوں کے لئے خلوص مہر و محبت اور دردمندی تھی، وہ حاضر و غائب ہر صورت میں دوستی کی حفاظت کرتے تھے۔ رنج میں دوست کی غمخواری راحت میں مسرت محسوس کرتے تھے۔ ان کی دوستی کا عجیب پہلو یہ تھا کہ وہ ان لوگوں سے بھی جو آپس میں ایک دوسرے کے مخالف ہوتے تھے نباہ کی کوئی نہ کوئی صورت نکال لیتے تھے۔

حضرت کیفی کا قد چھوٹا یعنی کل پانچ فٹ تھا۔ رنگ پہلے خاصہ گورا تھا بعد میں کھلتا ہوا گندمی ہو گیا تھا سر ذرا بڑا تھا۔ داڑھی مونچھ صاف رکھتے تھے خط خود بناتے تھے باہر کی پوشاک سر سے پاؤں تک انگریزی تھی یعنی ہیٹ کوٹ و پتلون لیکن فرشی نشست کے لئے جس کو وہ مغلئی نشست کہتے تھے بالکل دیسی پوشاک پہنتے تھے

کیفی صاحب کا کتب خانہ ادبی عجائبات کا کمیاب ذخیرہ تھا جس میں ہندوستان کی قدیم زبانوں مثلاً پرانی پراکرت، اب بھرنش، سنسکرت و عربی گرامر سے لے کر انگریزی کی تازہ ترین کتب لسانیات و ادب تک آپ کے ہاں تھیں بعض نایاب اخبار و کتابیں مثلاً سراج الاخبار دہلی کے آخری بادشاہ کا اخبار اور کوہِ نور کی جلدیں جو پنجاب کا سب سے پہلا اخبار تھا۔ غالب و ذوق اور آتش کے دیوانوں کے اوّل ایڈیشن اور دکنیات اور فارسی کے قدیم مخطوطات وغیرہ ان کے کتب خانہ میں تھیں کیفی صاحب اپنے کتب خانہ میں سے پانچ سو سے زیادہ فارسی اور اُردو کی کتابیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو عطیہ کے طور پر عنایت کی تھیں۔ جو وہاں کیفی گلشن کے نام سے الگ لائبریری میں رکھی ہوئی ہیں۔ ان میں سے سو کے قریب مخطوطات ہیں جن میں کئی نایاب و کمیاب ہیں ۔ ۱۹۴۷ء میں آپ کا کتب خانہ لاہور میں رہ گیا نہیں معلوم اس کا کیا حشر ہوا!

اس کتب خانہ کا کیفی صاحب کو بہت ملال تھا۔ نو برس کی عمر ہوگی فیض آباد میں کیفی صاحب کا جانا ہوا وہاں ان کی ننھیال کے ایک رشتہ دار تھے۔ اُن کا بڑا لڑکا پنڈت رتن ناتھ کول کیفی صاحب کے ہم عمر تھے اُنہی کے دوست بن گئے واپسی کی تیاری تھی، سامان بندھ چکا تھا، اس زمانہ میں ٹرنک اور سوٹ کیس نہیں تھے، پٹارے یا لکڑی کے صندوق قیمتی چیزوں کے لئے اور بچاندانیاں ہوتی تھیں یا پھر چھوٹی بڑی گٹھڑیاں اور گٹھڑ، ان کی صورت یہ تھی کہ فرش کی ہلکی چیزیں ان کا بالائی غلاف ہوتا تھا، دوسروں کی درزیں سی جاتی تھیں اور اوپر سے کچھ ایک جال کی طرح لپیٹ دی جاتی تھی۔

کیفی صاحب روانگی کے وقت تاش کھیلنے لگے اس میں ان کے دوست نے ان کو ایک قلم تحفۃً دیا اس پر لاکھ بوٹ کرے کا گنگا جمنا بھرا چکا ہوا تھا دوسرے روز گیڑ ہو گئی تو جل کر تقاضہ ہوا "لاؤ میرا قلم" کیفی صاحب والدہ کے پاس دوڑے ہوئے گئے۔ اور قلم مانگا انھوں نے ایک بنڈل کی طرف اشارہ کیا اس میں بندھا ہوا ہے نکل نہیں سکتا، یہ اپنا سا منھ لیکر واپس چلے آئے اور چپ بیٹھ گئے اُس نے پھر قلم مانگا یہ ایک منٹ بھی اس قلم کو رکھنے کے روادار نہیں تھے لیکن مجبور تھے غیرت اور غصہ کا شکار تھے کہ پھر تقاضہ ہوا۔ اس وقت یہ شعر بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا ؎

اب تو وہ بندھ گیا لِندے میں اور وہ پھنس گیا ہے پھندے میں

کیفی صاحب نے طالب علمی کے زمانہ سے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اسی زمانہ میں مسدس مراۃ خیال آپ نے تصنیف کی جو آپ کی پہلی تصنیف ہے پنڈت بشن نرائن ابر لکھنوی جب ولایت سے بیرسٹر ہو کر لکھنؤ گئے تو وہاں کی کشمیری برادری نے اُن کو اپنے میں شریک کرنے سے انکار کر دیا۔ برادری کے

ایک طبقہ نے پنڈت گنگا پرشاد شاستری پروفیسر کیننگ کالج کے ہاتھوں ان کا پراشچت (کفارہ) کرا کر ان کو شریک کر لیا۔ مخالفین نے اس شرکت کو نہیں مانا اس وقت سے دو جماعتیں قائم ہو گئیں۔ شریک کرنے والے گویا ترقی پسند جماعت کا نام بشن سبھا اور فریق مخالف کی جماعت کا نام دھرم سبھا تھا کیفی صاحب ترقی پسند جماعت کے رُکن تھے۔ یہ مسدس اسی ماحول و حالات سے متاثر ہو کر لکھی جس کا پہلا بند یہ ہے:۔

پھر ایسی زمانے کی بگڑی ہوا ہے جدھر دیکھئے ایک طوفاں بپا ہے
یہ فتنہ تعصب کا کیسا اٹھا ہے کہ ہر ایک آپس میں دشمن ہوا ہے
گھٹائیں کدورت کی چھائی ہوئی ہیں
بلائیں خباثت کی آئی ہوئی ہیں

یہ مسدس ۱۸۸۵ء میں طبع ہوا۔ اس مسدس کے ٹائیٹل پیج پر یہ عبارت لکھی ہے "مسدس مراۃ خیالی" یعنے معاملہ جناب بشن نرائن صاحب اپر یسٹر ایٹ لا بر اکثر ارباب قوم کی رائے مصنفہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی تلمیذ جناب مولانا خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۸۵ء مطبع ہند دہلی واقع دریا گنج کوچہ پرماشند بابو چنجی لال مالک مطبع کے اہتمام سے چھپا۔"

آپ کی تصانیف نظم و نثر میں بیس کے قریب ہیں، جن کے نام یہ ہیں (۲) عورت اور اس کی تعلیم ۱۸۹۶ء (۳) سنگیت یا غزل کی روح ۱۹۰۱ء انگریزی کی ایک چھوٹی سی کتاب ترجمہ ہے منشیات کے خلاف (۴) "رہنمائے سالک" ۱۹۰۸ء یہ بھی انگریزی کا ترجمہ ہے (۵) تو زکِ قیصری ۱۹۱۱ء میں جارج جبکہ ہندوستان میں آئے تھے اسی وقت لکھی گئی تھی یہ منظوم ہے جس میں تواریخ ہند کے اہم اور نتیجہ خیز واقعات شہنشاہ جارج پنجم کی تخت نشینی تک کے درج ہیں۔ تمہیدی اشعار

بیے سے

زبدۂ اقطاعِ عالم کشورِ ہندوستان — کس زباں سے ہو سکے تیرے فضائل کا بیاں
شکل یہ تیری ہے تثلیثِ خفی کی رازدار — ہے یہ وہ ترسول صدقہ جس کے ہے ریزہ زماں
یہ نہیں ہے تو وطن ہے اس لئے محبوب — خار بھی آنکھوں میں تیرا ہے گلِ باغِ خیال
مہبطِ انوارِ سبحانی رہا ہے تو مدام — روشنی تجھ سے سدا پاتے رہے اہلِ جہاں
جنتی ہے تو، تو ہے تو منبع بھی علم کا — علم و حکمت گیان گُن میں تو ہے استادِ جہاں

(۶) تاج دلاری ۱۹۱۳ء (۷) مراری دادا ۱۹۱۸ء یہ دونوں اصلاحی معاشرتی ڈرامے ہیں جن میں کیفی صاحب نے سماج کے بعض اہم اور نازک مسائل کو چھیڑا ہے (۷) پریم ترنگنی ۱۹۲۲ء اس میں تمثیل اور استعارے کے پیرائے میں حُسنِ اخلاق، حُسنِ سلوک، رُوحانی ترقی اور انتہائی مقصد زندگی کے وہ عالمگیر اصول درج ہیں۔ جن کا اطلاق عامۃ خلائق پر ہے (۸) قمر خانہ کیفی ۱۹۲۳ء یہ چند دلآویز نظموں کا مجموعہ ہے (۹) شہنشاہ رانا ۱۹۳۱ء جس میں سلطان محمود غزنوی، ابوالنجم احمد ایاز اور ابوریحان البیرونی اور ایک ہندو راجہ کے ساتھ تعلقات کا ذکر ہے (۱۰) منشورات ۱۹۳۴ء اُردو زبان و ادب کی تاریخ و تنقید پر مشتمل ہے اور تحقیق کا گراں بہا خزانہ ہے۔ نثر میں سلجھا ہوا اسلوب بیان اور زبان کا زور جو کیفی صاحب کی خصوصیات ہیں اس کتاب میں پایا جاتا ہے۔
(۱۱) ترجمہ دریائے لطافت ۱۹۳۵ء (۱۲) جگ بیتی ۱۹۳۶ء (۱۳) تمثیلی شلوک ۱۹۳۹ء (۱۴) واردات ۱۹۲۱ء (۱۵) کیفیہ ۱۹۴۲ء (۱۶) افسانے (۱۷) اُردو زبان (۱۸) بھارت درپن ۱۹۰۵ء (۱۹) خم خانۂ جاوید جلد پنجم (۲۰) ہندوستانی نو بیا انگریزی۔

میں یہ بات ہرگز ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ شاعری انسانی ورثہ ہے

تعلق رکھتی ہے۔ شاعری خداداد چیز ہے۔ شاعری کا شوق قدرتی اور جبلی ہوتا ہے چنانچہ حضرت کیفی بھی خداداد شاعر تھے۔ بچپن سے آپ کو شعر کہنے کا شوق تھا۔

یہ وہ دور ہے جبکہ شاعری اپنا رنگ و روپ بدلنا چاہتی تھی اور گل و بلبل کے ترانے، زلفِ پیچدار کے پھندوں میں پھنسے اور کمر کی نزاکت اور اس کے ناپنے تولنے والے تخیلات کو فرسودہ سمجھا جانے لگا تھا اور اس قسم کے شاعروں کو "اگلے ہوئے نوالے چبانے والے" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا نیز مبالغوں سے طوفان، تشبیہ و استعاروں کے بے تکے انبار کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا بلکہ فطرت نگاری وسعتِ نظری جو سادہ اور سلیس درد بھری اور مؤثر زبان میں ہو پسند کی جاتی تھی۔

حضرت کیفی کی شاعری پر بھی ان ترقی پسند نظریات کا اثر پڑا اور اپنے استاد حالی کا نظریہ کو پسند کیا اسی کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے محبوب و معشوق طرحدار کے ہجر و فراق وصل و ناز و ادا کے جھگڑوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا اور دور از کار استعاروں، بعید از قیاس مبالغوں، اور خلافِ عادت امور سے اپنے کلام کو پاک رکھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

بھلا کیا فائدہ ہے قوم کو ایسے سخندان سے	جو رہتا ہے کشاکش میں ہمیشہ زلفِ پیچاں کے
عوارض کا اسے اندازہ کیا ہو شغل جن کا	مساعتِ روزِ محشر کی ہو طولِ شامِ ہجراں سے

یہی وجوہ ہیں جن کی وجہ سے کیفی صاحب کے کلام میں عاشقانہ غزلیں بہت کم ملتی ہیں ان کے تمام دیوان میں تلاش کیجیے جو واردات کے نام سے شائع ہوا ہے اس کے ۱۲۴ صفحات میں صرف ۴ صفحات عاشقانہ کلام کے نظر آئینگے۔ پورا دیوان تصوف اور قوم پرستی کے حقائق اور معارف سے پُر ہے۔ چنانچہ ایک شعر میں اس کا اظہار بھی کیا ہے ؎

اس قدر فرصت کہاں کیفی کہ لکھ پائیں غزل
اور کاموں سے ہمیں مہلت تو دم بھر کی نہیں

کیفی صاحب کے کلام میں فصاحت و سلاست کے ساتھ لطفِ بیان میں شوخی تازگی اور بانکپن، ادائے مطلب میں شگفتگی، زبان اور محاورہ کا لطف اور خیالات میں جدت اور بلندی پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام کا رنگ سالکانہ ہے جو اخلاقی اور صوفیانہ مضامین ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ وہ ان کے کردار اور عمل کے آئینہ دار اور قلبی واردات و کیفیات کے ترجمان ہیں۔ اس لئے ان کے کلام میں درد اور اثر پایا جاتا ہے۔ ہم کیفی صاحب کے چند اشعار پیش کرتے ہیں جو قلبی کیفیات کے ترجمان ہیں ؎

روزِ سیہ ہے ہم سیہ بختوں کو رات دن
کہتے ہو کس سے تم کہ شب آئی سحر گئی

یہ کس سے مخاطب ہیں کہ شام آئی اور سحر گئی۔ آپ بے خبر ہیں ہم بدنصیبوں اور نامرادوں سے جو رات دن مصیبتوں اور تکلیفوں کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں ہمیں رات دن اور صبح کا کیا ہوش، ہمارے لئے تو رات دن روزِ سیہ ہے ؎

آوارۂ وحشت کا پتہ خاک بتائیں
ہوتا ہے بگولے کا پتہ اور کہیں گھر بھی

آوارۂ وحشت سے بگولے کی تشبیہ بے مثل ہے کتنا سیدھا سادہ شعر ہے اور کس قدر موثر ہے، اندازِ کلام بھی انتہائی دلکش ہے ؎

ایک ایک داغ میں سو سو گل حسرت کا ہے رنگ
حالِ دل ہم تو کبھی تم کو دکھاتے بھی نہیں

کیا حسرت انگیز شکوہ ہے اور کیسے محبت بھرے معصومانہ انداز میں اپنے

وفاداری کا اظہار کیا ہے اور تنی کے ساتھ اپنی حالتِ زار کا نقشہ بھی کھینچا ہے کہ تمہاری بے وفائی کی بدولت میری یہ حالت ہوگئی ہے ؎

اس دل کی جلن جو دیکھ پائے
شمع سوزاں چراغ پا ہو

اللہ اللہ کہاں شانِ تکلم ہے طالب مصدق اپنی جلن کا انوکھے انداز سے مظاہرہ کر رہا ہے کہ اگر شمع کی نظر اس پر پڑ جائے تو آگ بگولہ ہو جائے کہ یہ میرا ثانی بھی پیدا ہو گیا۔ میری طرف سے جلنے کے لئے اور مجھ کو جلانے کے لئے ؎

جن اُمیدوں سے بنا تھا خانۂ دل رشکِ خلد
اب وہی اس گھر کی بربادی کو طوفاں ہو گئیں

اُمید تھی کہ زندگی عیش و عشرت سے گزرے گی، مرادیں بر آئیں گی، تمنائیں پوری ہوں گی۔ سرمایہ وافر ہوگا۔ مہوش محبوب وفاشعار ہوگا اس کے حسن و جمال کے دیدار ہوں گے۔ محفلیں جما کریں گی۔ رقص و موسیقی اور مشاعرے ہوں گے۔ جوانی کے مزے لوٹیں گے۔ ان اُمیدوں پر خانۂ دل رشکِ خلد بنا تھا لیکن ان اُمیدوں میں سے ایک بھی اُمید بر نہ آئی۔ ایک بھی تمنا پوری نہیں ہوئی۔ محبوب نے دغا پر دغا کی، بے وفا نکلا، دل چکنا چور ہو گیا۔ اور پنا گھر انہی نا اُمیدیوں کا نشانہ بن کر برباد و تباہ ہوا۔

مؤثر اور درد انگیز کلام کے ساتھ کیفی صاحب کے ہاں ایسے بھی اشعار ملیں گے جن میں تخیل کی بلندی، جدت اور اچھوتا پن پایا جاتا ہے جس کے سننے کے بعد سننے والا دنگ رہ جاتا ہے کہ شاعر کا تخیل کہاں پہنچا ہے۔ ملاحظہ کیجیے تخیل کی بلند پروازی ؎

عشق کی فریاد سنتا کون ملتی کس سے داد
داورِ حشر آپ اپنی صنع پر حیرت میں تھا

قیامت کا دن ہے حساب وکتاب ہو چکا ہے۔ عاشق بدنصیب بھی کھڑا ہے، اس امید پر کہ اللہ رب العزت کے سامنے محبوب کے ظلم وستم رکھوں گا کہ اس نے دنیا میں مجھ کو کس طرح پریشان کیا۔ روسیاہ رقیب کی محفلیں گرم کیں، اس کے ساتھ زندگی بتائی اور اس کے ارمانوں اور مرادوں کو پورا کیا مجھے زندگی بھر ستاتا رہا۔ میں رویا پیٹا، بھوکوں مرا، حال سے بدحال ہوا۔ اس کی یاد میں در بدر مارا مارا پھرا صحرا نوردی تک نوبت آئی لیکن اس کو مجھ پر رحم نہیں آیا۔ ذرہ برابر بھی التفات سے نہیں دیکھا۔ سوچا جاتا ہے اور ایک ایک زیادتی اور جفاکاری کو ذہن نشین کرتا جا رہا ہے۔ آنکھیں نیچے سے اوپر اٹھاتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ خالق ارض وسموات نے حساب ملتوی کر دیا ہے اور میرے محبوب کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے ہیں کہ کیا میری ہی بنائی ہوئی صورت ہے۔ حیرت زدہ ہیں۔ یہ دلخراش منظر نامراد عاشق دیکھ کر دل مسوس کر رہ گیا۔ یہ شعر اس بے کس کی حسرتناک صدا ہے ؎

غم رہا اُن کا جو دوزخ میں پڑے جلتے ہیں

مرے خوش ہونے کا جنت بھی ساماں نہ ہوا

کیفی صاحب کی دُنیا میں تو انسانی ہمدردی پیاری رہی تھی۔ کسی کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے تھے قوم کی بداخلاقی و بدحالی پر کڑھتے تھے غیر قوم کا تسلط ملک پر گوارا نہیں فرماتے تھے۔ عقبیٰ میں پہنچتے ہیں، جنت میں رونق افروز ہیں، وہاں بھی انسانی ہمدردی جاری ہے، دوزخ میں جلنے والوں کی حالت اور مصیبت کو نہیں دیکھا جاتا۔ اور ذرا عمیق نظر سے دیکھئے اور اندازہ لگائیے کہ کیفی صاحب ابھی زندہ ہیں اُن کی نظر کہاں پہنچی ہے۔ دوزخ کے جلنے والوں پر ابھی سے شکوہ اور گلہ شروع ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اخلاق کی وسعت اور بلند نظری کی یہ

انہوں نے کہا ہے سہ

عشق بازی میں آرزو رکھنا برق، خرمن پہ خود گرانا ہے

کتنے سادے انداز میں طالبِ حقیقی کو کتنی پیاری تلقین کی ہے کہ بے آرزو ہو کر شمع کی مانند معشوق کے پروانے بن جاؤ۔ بغیر لالچ کے جاں نثاری کا ثبوت دو اگر اپنے عشق و محبت کے خرمن کو تمہیں بچانا ہے سہ

کیسے لوں اور کیسے پھونکوں تجا ہوں اور کیسے جا ہوں
مری آنکھوں میں تو ہے خار بھی گل اس گلستاں کا

تنگ نظر انسانو، تعصب اور نفرت کے پجاریو! اور انسانیت کی مٹی پلید کرنے والو، اس انسانی اخوت کے بلند معیار پر غور کرو کیفی صاحب کا نظریہ حیات کیا ہے۔ انسانیت کے کس قدر متوالے ہیں۔ پھول اور کانٹا اچھے اور بُرے سب اُن کے محبوب ہیں۔ سب کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں سہ

اک خواب کا خیال ہے دنیا کہیں جسے ہے اس میں اک طلسم تمنا کہیں جسے
رشتہ سے نقش طبع بستانی کی اس سے زیادہ کچھ نہیں دنیا کہیں جسے
خمیازہ ہے کرشمہ پرستی دہر کا اہلِ زمانہ عالم عقبیٰ کہیں جسے

ان اشعار میں اپنے خاص والہانہ انداز میں انوکھی ترکیبوں اور تمثیلوں سے دنیا کی ہی نہیں بلکہ عقبیٰ کی حقیقت بھی بیان کر دی اور ان کی صحیح تصویر کھینچ دی۔

مزاح اور طنز سے کیفی صاحب کا دیوان بھرا پڑا ہے۔ اُن کا مزاح و طنز سوقیانہ اور مبتذل نہیں ہوتا بلکہ سنجیدگی اور متانت کے ساتھ سماج کے سڑے ہوئے ناسوروں پر نشتر لگاتے ہیں۔ غلط قسم کے ذہنی فلسفوں کی دھجیاں بکھیرتے ہیں اور قوم کے ٹھیکیداروں کی نقاب کشائی کرتے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

زاہدوں پر خدا کی مار ہے کہ وہ دو دلی ملنے دیکھنا نہیں چاہتے۔ یہ طبقہ عاشق ومحبوب کو بدنام اور مطعون کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا کر نہیں رکھتا اور یہ غریب اُن کے زہد و تقویٰ کے تختۂ مشق بنتے ہیں۔ معلوم اُن کو اُن سے کیا خدا واسطے کا بیر ہے اس لئے شاعر بھی اُن پر دل کھول کر وار کرتا ہے، اُن پر برستا ہے، اُن کی ریاکاری کی قلعی کھولتا ہے اور نام نہاد زہد و تقویٰ کا پردہ چاک کرتا ہے، اُن سے پوچھتا ہے [۱]

چمن ہوگا، شبنم ہوگا تو مست جام ہے ہوگا ۔ یہی تعبیر ہے زاہد ترے خواب پریشاں کی

کیفی صاحب آخری زمانہ میں ۱۷۔ علی پور روڈ لالہ سری رام مؤلف خمخانۂ جاوید کی کوٹھی میں مقیم ہوئے تھے، اسی کوٹھی میں جنوری ۱۹۵۳ء میں آپ بیماری کے نازک مرحلہ پر پہنچ گئے تھے۔ اسی اثنا میں آپ کی سالگرہ اسی کوٹھی میں منائی گئی آپ نے اس میں شرکت کی لیکن اسٹریچر پر آپ کو لایا گیا۔ اس سالگرہ میں پرانے ادیب و صحافی اور شعرا شریک ہوئے تھے۔ تقریباً دو سال کے بعد یکم نومبر ۱۹۵۵ء کو سفر کرتے ہوئے غازی آباد میں انتقال ہوا۔

---

[۱] حیاتِ آشوب

بیگم مولانا عبدالرزاق

بیگم صاحبہ تقریباً ۱۸۹۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئیں۔ شیخ نورالحسن ایچ بی کی بیٹی مولانا عبدالرزاق کی زوجہ اور حاجی محمدؒ سعید دوائی والے اور شیخ محمد حنیف ڈھاکہ والے کی والدہ۔ بیگم صاحبہ فکری طور پر شعر و ادب کی دلدادہ تھیں مگر کہ اپنے اس ذوق کی تسکین کا موقع انھیں کافی عرصے کے بعد ملا۔ رواج معاشرہ کے مطابق کم عمری میں شادی ہوگئی اور ایک روایتی مشرقی عورت کی طرح وہ شوہر کی خدمت گذاری اور بچوں کی مناسب تعلیم و تربیت میں وقت گذارنے لگیں۔ تعلیم سے ان کو خاص شغف تھا۔ اچھی تعلیم حاصل کرنے کے لئے انھوں نے اپنے بیٹے کو علامہ مولانا راشد الخیری کی شاگردی میں دیدیا تھا۔ جنگِ عظیم اوّل سے قبل اس برادری کا پہلا فرزند جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے گیا وہ بیگم صاحبہ ہی کا بیٹا تھا۔

بیگم صاحبہ کے شوہر مولانا عبدالرزاق صاحب ایک وسیع کاروبار کے مالک تھے جب مولانا کا انتقال ہوا تو بیگم صاحبہ کی اولاد زیرِ تعلیم تھی۔ وراثت کے جھگڑے کچھ اتنے زیادہ تھے کہ بیگم صاحبہ کو اپنے بچوں کے حقوق کے لئے میدانِ عمل میں آنا پڑا۔ اُن کی کاوشیں بچوں کی عملی محنت اور اللہ کا کرم تھوڑے ہی عرصہ میں یہ مختصر سا خاندان پھر سرشار ہوا۔ بیگم صاحبہ اب ایک

مشرقی گھرانے کی عام عورت نہ تھیں وہ ایک جذبہ بن چکی تھیں جس نے اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کرنا سیکھ لیا تھا اولاد سرفراز ہو گئی تو عزیزوں، رشتہ داروں کے لئے جدوجہد کی اس کے بعد جب زمانہ نے اُن کو آزمایا، قحط میں، سیلاب میں، ہندو مسلم فسادات اور تحریکِ آزادی، غرضکہ ہر مشکل اور آزمائش کو بیگم صاحبہ نے لبیک کہا اور اپنے حسنِ سلوک اور حسنِ تدبیر سے معاملات اس طرح سلجھائے کہ بیگم صاحبہ کا وجود دہلی اور کلکتہ کے لوگوں کے لئے ناگزیر ہو گیا۔

فطری طور پر ہر عورت کپڑا اور زیور کی دلدادہ ہوتی ہے، مگر خاوند سے انتقال کے بعد بیگم صاحبہ نے زیور کا استعمال ترک کر دیا تھا، سوتی سفید ساڑھی مخصوص لباس پہننے لگیں بیگم صاحبہ کا پردہ ترک کرنا اس دور میں ایک دھماکا ہی تھا۔ برادری والوں نے بڑی لے دے کی مگر بیگم صاحبہ کو اپنے اعصاب پر پورا قابو تھا کہتی تھیں کہ میں نے عمر کے اس حصہ پر پہنچ کر برقعہ اُتارا ہے جہاں میں ماں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی، اپنے ملنے والیوں میں مسز جینی نائیڈو، ارونا آصف علی اور نور الصباح بیگم سے بہت قریب تھیں یہ ہم خیال خواتین پردہ باغ دہلی میں جمع ہوتیں اور وہیں پر رفاہی کاموں کے پروگرام طے کئے جاتے ایک دفعہ طے ہوا کہ دہلی کے مضافات میں جا کر تعلیمِ نسواں کے لئے لوگوں کو تیار کیا جائے، تقسیم سے قبل کے لوگ لڑکیوں کو کیا لڑکوں کو بھی پڑھوانے میں لیت و لعل سے کام لیتے تھے مگر بیگم صاحبہ نے ہمت نہیں ہاری اور بار بار جا کر دہلی اور اس کے اطراف میں تعلیمِ نسواں کی ضرورت کا پروپگنڈہ کیا۔

دوسری جنگِ عظیم میں بیگم صاحبہ نے کلکتہ میں بڑھ چڑھ کر ریلیف کے کاموں میں حصہ لیا، برما سے ہزاروں کی تعداد میں پناہ گزین آتے تھے۔

اور ان متاثرین کی خصوصاً خواتین اور بچوں کی نگہداشت کا شعبہ بیگم صاحبہ نے سنبھالا ہوا تھا کئی کئی دن تک بھوک و پیاس کی شدت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بیگم صاحبہ بلا تخصیص رنگ و نسل دکھی انسانیت کی خدمت کرتی تھیں ان نگوڑ ریوں کی تکلیف دیکھ کر یہ اپنا کھانا پینا سب بھول جاتی تھیں، ایک دفعہ بیگم صاحبہ برما سے آنے والے قافلہ کو لینے کے لئے اسٹیشن پہنچیں تو دیکھا ایک سپاہی ایک بڑی لڑکی کا زبردستی ہاتھ کھینچ کر لئے جا رہا ہے، یہ فوراً اس سپاہی کے پاس پہنچیں اور پاؤں سے جوتی نکال اُس کی پٹائی کر ڈالی۔ اتنے میں کچھ اور والینٹرز اس طرف متوجہ ہو گئے سپاہی کو جان بچا کر بھاگنے میں ہی عافیت نظر آئی۔

تحریک آزادی میں جن بیگم صاحبہ نے نمایاں حصہ لیا مسلم لیگ اور پاکستان کے لئے کام کیا۔ دہلی میں جلسے کئے اور عورتوں میں جذبۂ آزادی کو بیدار کیا۔ اُس دور میں جب پکڑ دھکڑ عام تھی بیگم صاحبہ نے بلا خوف و خطر کارکنوں کے جلسے اپنے گھر میں منعقد کرائیں مسلم لیگ نیشنل گارڈ کا دفتر بیگم صاحبہ کے گھر میں تھا تقسیم کے وقت ہندوستان میں جو کشت و خون ہوا تو بیگم صاحبہ میدانِ عمل میں اُتر آئیں۔ متاثرہ لوگوں کو فساد زدہ علاقوں سے نکالنا زخمیوں کو ہسپتال پہنچانا، ضرورتمندوں کو کیمپوں میں کھانا اور کپڑا فراہم کرنا، والینٹروں کو ضمانتوں پر رہا کرانا، اس کے علاوہ اعلیٰ حکام کو شہر کے امن و امان برقرار رکھنے کے لئے مشورے دینا ان کا کام تھا۔

ہندوستان میں سیاسی شخصیتوں میں گاندھی جی بیگم صاحبہ کے بہت معترف تھے تقسیم سے قبل جب کلکتہ آتے تو بیگم صاحبہ کے ہاں ضرور نشست رہتی تقسیم کے بعد بیگم صاحبہ کے مہمان خانہ میں ٹھیرتے تھے۔

بیگم صاحبہ خود چونکہ بہت باعمل تھیں۔ لہٰذا وہ اور لوگوں سے بھی یہ اُمید
رکھتی تھیں کہ وہ سرگرم اور باعمل ہوں سنہ ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے کہ صوبۂ بنگال کے
وزیر اعلیٰ حسین شہید سہروردی تھے ہندو مسلم فسادات جاری تھے ایک دن
ہنگامہ آرائی کچھ زیادہ ہوئی مسلمان اپنے علاقوں میں محصور ہو گئے، بیگم صاحبہ
نے سہروردی صاحب کو فون کیا کہ اس علاقہ میں یہ صورتِ حال ہے آپ کچھ
کریں، وہ ٹیلیفون پر بات کرنے کے بعد لوگوں کی باتوں میں مصروف ہو گئے اُن سے
صبر نہ ہو سکا، یہ ایک گھنٹے کے بعد خود وزیر اعلیٰ کی رہائش گاہ پر پہنچ گئیں اُنہوں
نے وہاں سنگین صورتِ حال سے آگاہ کیا تو سہروردی صاحب نے فوراً
آئی جی پولیس کو ضروری ہدایت کر دی کہ وہ متاثرہ علاقوں میں ضروری
کارروائی کریں۔

ایک اور واقعہ جو اخباروں کے لئے بڑا اہم بن گیا تھا وہ یہ تھا،
یہ اُن دنوں کی بات ہے جب کلکتہ میں ہندو مسلم فسادات زوروں پر تھے،
گاندھی جی ریلیف کمیٹی کی درخواست پر کلکتہ آئے ہوئے تھے۔ ایک دن
بیگم صاحبہ گاندھی جی سے مل کر آ رہی تھیں، کچھ والنٹیرز ان کے ساتھ تھے جو
پیچھے رہ گئے تھے، ایک ہندو نوجوان نے بیگم صاحبہ کو روکا اور چھرا مارنے کے لئے
لپکا۔ بیگم صاحبہ ذرا بھی نہ گھبرائیں اور کہا بیٹا جس طرح تو اپنی ماں کو چھرے
سے مارتا، اسی طرح تو مجھے مار۔ اس نوجوان نے یہ سُنا تو چھرا فوراً پھینک دیا
اور روتا ہوا اُن کے قدموں پر گر پڑا۔ پیچھے آنے والے والنٹیرز نے آکر اس
کو پکڑ لیا۔ وہ اس نوجوان کو مارنا چاہتے تھے۔
لیکن بیگم صاحبہ نے ان کو روک دیا۔
تقسیم سے قبل بیگم صاحبہ کئی سماجی اور رفاہی اداروں کی سرپرست تھیں

وہ طبعاً بہت سخی تھیں، ضرورت مندوں کی امداد ضرورت سے زیادہ کر دیتی تھیں۔ ایک وقت ایسا آیا کہ لوگ اپنی ضرورتوں کے لیے رجواڑوں کے بجائے بیگم صاحبہ کی طرف رخ کرنے لگے تھے۔

۱۹۴۹ء میں بیگم صاحبہ ڈھاکہ چلی گئیں تھیں۔ صحت بھی اب جواب دینے لگی تھی۔ پھر بھی اپنی صحت کے مطابق رفاہی کاموں میں حصہ لیتی رہیں بقیہ زندگی انھوں نے سکون کی خاطر اولاد میں گزاری، ۷ مئی ۱۹۶۵ء کو وہ اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بقول کمال سعید صاحب ایسی عورت شاید اس برادری میں دوبارہ پیدا نہ ہو[۱]

---

[۱] یادِ رفتگاں صـ۲۰۷

حافظ بنّے صاحب

محبوب بخش بن شیخ یدّھن کے دو فرزند شیخ عبداللہ شیخ محمد بخش تھے ۔
عبداللہ صاحب کے صاحبزادے ملّا الٰہی بخش صاحب اور اُن کے خلف حاجی محبوب الٰہی صاحب مرحوم تھے ۔ محمد بخش کے صاحبزادے حافظ خدا بخش عرف بنّے اور اللہ بخش تھے ۔ ایک لڑکی عائشہ بی تھیں جو شیخ قدرت اللہ شہید سے بیاہی گئی تھیں ۔ چنانچہ ملّا الٰہی بخش نے مقدمہ مرزا بنام کریم بخش میں بیان دیا تھا کہ ”حافظ بنّے میرے تایا زاد بھائی تھے “۔
حاجی اللہ بخش کے دو لڑکے شیخ عبدالقادر اور حاجی عبدالرزاق صاحب اور ایک لڑکی مسماۃ الٰہی جان تھی ۔ یہ الٰہی جان حاجی سراج الدین کی بیوی اور سر عبدالرحمٰن کی والدہ تھیں ۔
حافظ بنّے کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ غدر کے ایام میں سرائے کے سامنے کے حصّے میں (جہاں اب چمار والا کٹڑہ ہے) لوگوں کو پھانسی دی گئی تو نعش بھی اس کھتّہ پر پھینک دی گئی ۔ اس بات کا علم جب حافظ بنّے کو ہوا تو اُنھوں نے نعش کو وہاں سے اٹھوا کر چمار والوں کے کٹڑے کے درمیانی حصّے میں دفن کرا دیا ۔
حافظ بنّے کے دو بیویاں تھیں ۔ ایک بیگم جان آف لوہارو تھیں جن کا

تعلق لوہارو کے نواب خاندان سے تھا۔ محمد مرزا اور ۲ دو لڑکیاں انور جہاں منور جہاں ہوئیں۔ اور
برادری سے سماۃ رحیم النساء تھیں جن کے بطن سے صرف حافظ کریم بخش ہوئے
یہ قاری محمد بخش کی لڑکی اور قاری فیض بخش کی ہمشیرہ تھیں۔ قاری فیض بخش کے
لڑکے ڈپٹی فخر الدین تھے یعنی یہ ڈپٹی فخر الدین کی پھوپی اور حافظ بنّے ڈپٹی فخر الدین
کے پھوپا تھے۔ اور ایک لڑکی عزیزن محمد یحییٰ کے دادا حاجی امیر احمد سے بیاہی
گئی تھیں۔

محمد مرزا کے ایک لڑکا محمد احمد ہوا تھا جو پندرہ سولہ برس کی عمر میں فوت
ہو گیا۔ ان کی تین لڑکیاں تھیں۔ سلطان جہاں زوجہ محمد عمر عرف تو تو والدہ حافظ
محمد عثمان صاحب۔ بدر جہاں زوجہ حافظ قمر الدین صاحب والدہ حافظ
نجم الدین صاحب مدراس بوٹ ہاؤس والے اور منور جہاں زوجہ احمد علی
شاہ جو سردھنہ میں بیاہی گئی تھیں۔

حافظ خدا بخش صاحب عرف حافظ بنّے گلی جوتے والی متصل مسجد جٹ نی
والی محلہ چوڑی والان میں شروع کے بائیں ہاتھ والے مکان میں جو حاجی عبدالرب
کا تھا رہتے تھے۔ بعد میں گلی ٹیکہ والی چوڑی والان بر مکان ڈپٹی فخر الدین جس میں
اب مدرسہ تعلیم القرآن ہے چلے گئے تھے اور وہیں پر ۱۸۷۵ء میں آپ کا انتقال
ہوا اور خواجہ باقی باللہ کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

کریم بخش صاحب نے پہلے بادش کا کاروبار کیا تھا پھر صدیقی پریس شروع
کیا۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ ان کی سمجھ بوجھ کے دہلی والے قائل تھے شمس
العلماء سید احمد صاحب جامع مسجد دہلی کا اُن سے کافی میل جول تھا جولائی ۱۹۰۲ء
میں انتقال ہوا۔ خواجہ باقی باللہ کے قبرستان میں مدفون ہیں۔ اُن کی شادی
گینیا دی بیگم سے ہوئی جن سے پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں حسب ذیل ہوئیں۔

(۱) حافظ رحیم بخش عرف عبدالوہاب (۲) شیخ عبدالحق (۳) حاجی حافظ عبدالرب صاحب (۴) حافظ عبدالخالق صاحب (۵) محمد یوسف صاحب۔

لڑکیاں۔ (۱) رقیہ بی (۲) سمیع النساء (۳) صغرا بی (۴) فاطمہ بی۔

(۱) رقیہ بی کی شادی عبدالقادر صاحب سے ہوئی۔ یہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانے میں انگریزی فوج میں موزے بنیان کے کھڑی لگا کر بیٹھ جاتے تھے۔ اور انگریزی فوج کی خبریں بادشاہ کو بھیجا کرتے تھے کہ فوج کہاں سے آئی اور کہاں جائے گی۔ اور فوج میں جو کچھ ہوتا اس سے آگاہ کرتے تھے۔ ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ عبدالقادر صاحب سر عبدالرحمن جسٹس کے سگے ماموں تھے۔

(۲) سمیع النساء زوجہ فیاض الدین صاحب، صغرا بی زوجہ حافظ علیم الدین صاحب (۴) فاطمہ بی زوجہ شیخ محمد یعقوب صاحب۔

حافظ عبدالوہاب صاحب

حافظ صاحب کا شمار دہلی کے اچھے حافظوں میں تھا۔ انھوں نے کچھ عرصہ کلکتہ میں پاپوش کا کاروبار کیا۔ دہلی آنے کے بعد سڑکوں کے ٹھیکے لئے اور منڈی کا ٹھیکہ بھی انہی کو ملا تھا۔ حافظ عبدالوہاب صاحب انتہائی ذہین و طباع انسان تھے۔ ان کے والد کریم بخش صاحب نے ان کو جائیداد وغیرہ کا مختارِ عام بنا دیا تھا۔ اس وقت سے یہ جائیداد کی نگرانی اور دیکھ بھال میں لگ گئے تھے جو آخر عمر تک جاری رہی۔

حافظ صاحب کی یادداشت بہت تیز تھی، طویل مدت کے مقدمات کی پیشیوں کی تاریخ، فیصلوں کی تاریخ، جائیداد کے رجسٹری ہونے کی تاریخ ان کو

ازبر یاد تھیں۔ وقت پڑنے پر فوراً بتا دیا کرتے تھے۔ قیافہ اور اندازہ اس بلا کا تھا کہ لوگوں کو گمان ہونے لگا تھا کہ یہ یا تو ولی ہیں ورنہ ان کے بس میں کوئی جن ہے۔

جائیداد کی تعمیر وغیرہ کے کاموں کے سلسلے میں کافی دنوں تک حافظ بنے کی سرائے میں رہنا پڑتا تھا اور گھر جانا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن گھر کی اُن غیر حاضری کے ایام کی باتیں اس طرح بتا دیا کرتے تھے جیسے ان کی چشم دید ہوں۔ بات کے دھنی بھی تھے جو کہتے تھے اُس پر سختی کے ساتھ قائم رہتے تھے۔ اٹل ارادے کے مالک تھے۔ غالباً انھوں نے دو حج ۲۷-۱۹۲۶ء میں کیے۔ رجنوری ۱۹۳۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔ خواجہ باقی باللہ میں مدفون ہیں۔

حافظ عبدالوہاب صاحب کی پہلی شادی سرفراز بنت رحمان بخش صاحب، عرف سوسے ہوئی۔ اُن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تو دوسری شادی رابعہ سلطان بنت محمد فضل صاحب مصور سے ہوئی جن سے حافظ محمد میاں صاحب، حاجی محمد مسلم صاحب، حاجی محمد ہاشم صاحب، شیخ محمد صادق صاحب ایڈوکیٹ اور شیخ محمد سمیع صاحب اور دو لڑکیاں خاتون زبیدہ، زوجہ حافظ ظہیر الدین صاحب اور خاتون محشر زوجہ حاجی بدر الاسلام صاحب ہوئیں۔

حافظ محمد میاں صاحب نے قرآن مجید کے ابتدائی سیپارے حافظ محمد سلیمان صاحب اور حافظ حسین اشرف صاحب سے پڑھے اور حافظ عبدالقادر صاحب ساکنہ باڑہ ہندو راؤ سے اپنے گھر پر قرآن مجید حفظ کیا۔ نورل اسکول کشمیری گیٹ میں دو سالہ تعلیم پانے کے بعد عربک اسکول اجمیری گیٹ میں داخل ہوئے وہاں مڈل تک تعلیم پائی۔ ۱۶ سال کی عمر سے جائیداد کی نگرانی کی ذمہ داری

سونپ دی تھی۔

اُن کی شادی آمنہ خاتون بنت محمد صدیق صاحب شیشے والے سکہ کٹڑہ شیخ چاند لال کنواں سے ہوئی جن سے محمد مومن صاحب محمد محسن صاحب اور محمد احسن صاحب اور پانچ صاحبزادیاں چمن سلطان زوجہ محمد کامل صاحب اور متین سلطان ہوئیں۔

مومن صاحب نے ابتدائی تعلیم پرائمری اسکول تنی سڑک میں پائی اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول کشمیری گیٹ میں نویں کلاس تک پڑھا۔ ۴۷-۱۹۴۶ء میں اخبار ہمدرد جاری کیا جو ہنگامہ ۱۹۴۷ء میں بند ہو گیا تھا۔ اسی ہنگامی زمانہ میں کراچی چلے گئے۔ جہاں آج کل کراچی یونیورسٹی کے دفتر میں ملازم ہیں۔

اُن کی شادی نجمہ سلطان بنت عابد نورمان صاحب سے ہوئی۔ ان سے ایک صاحبزادے سیف الاسلام صاحب اور دو لڑکیاں شیریں سلطانہ صدیقی الماس صدیقی ہوئیں۔

محسن صاحب نے بھی تنی سڑک کے پرائمری اسکول میں ابتدائی تعلیم پائی بعد میں عربک اسکول اجمیری گیٹ سے مڈل تک پڑھا۔ اُن کی شادی اُم ایمن بنت محمد ایوب صاحب سے ہوئی۔ جن سے دو لڑکے نفیس جمال، احمد جمال اور دو لڑکیاں فرحت پروین ہوئیں۔

محمد احسن صاحب نے تنی سڑک کے پرائمری اسکول میں تعلیم پانے کے بعد عربک اسکول اجمیری گیٹ سے میٹرک اور مشن کالج میں ایف اے کیا۔ بی اے آنرز اور ایل ایل بی کیا۔ کراچی میں وکالت کر رہے ہیں۔

حاجی محمد مسلم صاحب نے تنی سڑک کے پرائمری اسکول میں پانچ کلاس

تک تعلیم پائی۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول کشمیری گیٹ سے ۱۹۲۰ء
میں میٹرک کیا۔ جائیداد کی نگرانی کا کام والد صاحب کی زندگی میں ہی شروع
کر دیا تھا۔ ان کی شادی صغرا بی بنت جناب عزیز احمد صاحب سے ہوئی۔
جن سے محمد عارف صاحب، محمد فاروق صاحب، محمد عادل صاحب
صاحبزادیاں۔ آسمہ سلطان زوجہ چراغ الدین صاحب اور مخدومہ سلطان ہوئیں۔

عارف صاحب نے پرائمری اسکول پہاڑی املی سے چوتھی جماعت تک
تعلیم پائی۔ عربک سکول اجمیری گیٹ سے ہائی سکنڈری کیا، اس کے بعد
ادیب عالم اور ادیب فاضل کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ شمیم کے
دفتر میں چار سال تک ملازمت کی۔ ایک سال میونسپل کمیٹی میں ملازمت کی۔
ساڑھے تین سال صدر میں کام کیا آج کل ربڑ کے چپل کے کاروبار میں مصروف
ہیں۔ اُن کی شادی کنیز فاطمہ بنت سلیم الدین صاحب سے ستمبر ۱۹۶۲ء میں
ہوئی جن سے ایک صاحبزادے عبداللہ منیر ۴ مئی ۱۹۶۲ء کو ہوئے۔

محمد فاروق صاحب نے چوتھی جماعت کا امتحان پرائمری اسکول پہاڑی املی
سے دیا۔ آٹھویں جماعت کی تعلیم عربک اسکول سے حاصل کی۔ ہائی اسکول فتحپوری
مسلم ہائی اسکول سے کیا۔ دہلی کالج سے بی۔ اے اور دہلی یونیورسٹی سے پولیٹیکل
سائنس میں ایم اے کیا۔ پچھلے سال جامعہ ملیہ دہلی سے بی ایڈ کیا۔ آجکل بمبئی
انٹر کالج انجمن اسلامیہ میں پروفیسر ہیں۔

محمد عادل صاحب نے بھی پہاڑی املی کے پرائمری اسکول سے ابتدائی
تعلیم چوتھی جماعت تک پائی۔ عربک اسکول سے ساتویں جماعت کا امتحان دیا۔
دسویں جماعت کا امتحان فتحپوری مسلم ہائی اسکول سے پاس کیا۔ گیارھویں جماعت
کی تعلیم کی تکمیل دہلی کالج سے کی۔ بی کام سری رام کالج سے کیا۔ ایم۔ اے آگرہ

یونیورسٹی سے ۱۹۶۴ء کو اکنا مکس میں کیا۔ منسٹری آف ہیلتھ کے کسی شعبہ میں ملازم ہیں۔

مخدومہ صاحبہ نے بلبل خانہ سے آٹھویں جماعت تک تعلیم پائی۔ نویں جماعت کا امتحان اینگلو عربک گرلز اسکول دریا گنج سے پاس کیا۔ دسویں جماعت کی تعلیم گورنمنٹ ماڈرن گرلز اسکول جامع مسجد سے پائی۔ گیارھویں جماعت اور بی اے کا امتحان اندرپرست گرلز کالج سے پاس کیا۔ اُردو میں ایم۔ اے علی گڑھ یونیورسٹی میں کیا۔ جامعہ ملیہ سے بی ایڈ کی ڈگری ۱۹۶۲ء میں حاصل کی۔

محمد ہاشم صاحب نے نویں یا دسویں جماعت تک عربک سکول سے تعلیم پائی ۱۹۴۶ء میں سرکاری طور پر میر محلہ بنائے گئے تھے۔ جائیداد کی دیکھ بھال میں عمر گذاری۔ انھوں نے حج بھی کیا تھا۔ اُن کی شادی اشاراللہ جان بنت صوفی عبداللہ صاحب سے ہوئی۔ جن سے محمد اعظم صاحب لڑکی اکبر سلطان زوجہ ظاہر الاسلام ہوئیں۔

محمد اعظم نے ہائر سکنڈری کا امتحان ۱۹۴۵ء میں عربک اجمیری گیٹ سے پاس کیا۔ اُن کی شادی شمیمہ سلطان بنت محمد سمیع صاحب سے ہوئی جن سے اقبال اعظم صاحب، محمد اسماعیل صاحب، مزمل اعظم صاحب، مدثر اعظم صاحب اور لڑکیاں سلیمہ سلطان، صبیحہ سلطان، عائشہ سلطان ہوئیں۔ اقبال اعظم صاحب پانچویں کلاس میں ہیں۔ محمد اسماعیل صاحب قرآن مجید پڑھ رہے ہیں۔

محمد صادق صاحب نے میٹرک عربک اسکول سے کیا اور بی اے اور ایل ایل بی سینٹ اسٹیفن کالج کشمیری گیٹ سے کیا۔ دہلی میونسپل کمیٹی کے مشیر قانون بھی رہے۔ ہنگامہ ۱۹۴۷ء کے بعد کراچی چلے گئے وہاں وکالت کر رہے ہیں۔ اور کراچی کے مشہور و معروف وکیلوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ سُنا ہے کراچی میونسپل کارپوریشن کے بھی یہ قانونی مشیر ہیں اور کراچی میونسپل کارپوریشن کے ممبر بلکہ ز

ممبر بھی رہے ہیں۔

محمدؐ صادق صاحب کی شادی زبیدہ خاتون بنت سر عبدالرحمٰن سے ہوئی جن سے ایک صاحبزادے ارشد صاحب دو صاحبزادیاں خالدہ اور ثریا ہوئیں۔

محمدؐ سمیع صاحب نے حافظ عبدالقادر صاحب سے ناظرہ قرآن مجید پڑھا۔ اور صدیقیہ سکول روئی کی منڈی میں تعلیم پائی۔ پنجابی، ہندی ان کو بھی آتی ہے۔ ان کی عمر کا بھی بیشتر حصہ جائیداد کی دیکھ بھال و نگرانی میں گذرا۔ ان کی شادی احمدالنسا بنت محمدؐ عمر صاحب نو نو سے ہوئی۔ جن سے محمدؐ ذاکر صاحب، محمدؐ فاضل صاحب اور لڑکی شمیمہ سلطان زوجہ محمدؐ اعظم صاحب ہوئیں۔

محمدؐ ذاکر یکم اپریل ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ عربک اسکول اجمیری گیٹ سے ہائر سکنڈری پاس کیا۔ سری رام کالج آف کامرس سے بی، اے کا امتحان دیا۔ سینٹ سٹیفن کالج سے ایم، اے اکنامکس اور دہلی کالج سے ایم، اے اردو کیا آجکل جامعہ کالج جامعہ ملیہ اوکھلا میں اردو کے لیکچرار ہیں۔ ان کی شادی ظاہرہ سلطان بنت حاجی بدرالاسلام صاحب سے ہوئی جن سے دو صاحبزادے محمدؐ امین سالم صاحب اور محمدؐ عظیم قلور صاحب ہوئے۔

محمدؐ فاضل صاحب۔ ۱۹۴۰ء میں گلی ٹیکے والی محلہ چوڑیوالان میں پیدا ہوئے عربک اسکول اجمیری گیٹ سے ہائر سکنڈری کا امتحان دیا اور بی، ایس سی، انجیرنگ کی تیاری علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے کر رہے ہیں۔ تھرڈ ایئر میں ہیں۔

شیخ عبدالحق صاحب

شیخ عبدالحق صاحب کو جواہرات کے جمع کرنے کا شوق تھا۔ عام طور سے دوپہر کے وقت نگینے دیکھتے تھے۔ اور اس وقت درود تاج اور درود اور آیاتِ قرآنی ضرور پڑھتے تھے۔

سادہ طبیعت پائی تھی۔ غرباء سے بہت میل جول رکھتے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں ۵۴ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ خواجہ باقی باللہ میں اُن کا مزار ہے۔ ان کی شادی کلثوم النساء بنت حافظ امیر الدین صاحب سے ہوئی۔ جن سے حافظ داؤد صاحب پیدا ہوئے۔ حافظ داؤد صاحب بہت دل کش انداز سے قرآنِ مجید پڑھتے تھے اللہ تعالےٰ نے لحنِ داؤدی دیا تھا۔ جائیداد کی نگرانی میں عمر گزری۔

ان کی شادی خدیجۃ الکبریٰ بنت محمد یعقوب صاحب سے ہوئی جن سے ایک لڑکی ہوئی جو کچھ دن زندہ رہ کر فوت ہوگئی حافظ داؤد کا انتقال ۱۹۵۰ء میں ہوا جو خواجہ باقی باللہ میں آرام فرما ہیں۔

حافظ عبد الرب صاحب

حافظ عبد الرب صاحب نے حافظ رحمت اللہ صاحب سے قرآنِ مجید حفظ کیا۔ دہلی کے مشہور خوش خط جناب منشی ممتاز علی صاحب مالک مطبع مجتبائی دہلی سے خوش خطی سیکھی۔ مولوی عبد الاحد صاحب کی شرکت میں کتابوں کا کاروبار کیا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے نقشے چھپوا کر فروخت کرتے تھے الیپی کے پرزے بھی غیر ممالک سے منگواتے تھے۔ پارچہ کا کام بھی مختلف لوگوں کے ساتھ کیا۔ حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ اور ان کے بھائی حافظ عبد الحق صاحب اور حاجی محبوب الٰہی صاحب بیعت تھے۔ ان کا سالانہ عرس اپنے گھر پر کرتے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں ان کا انتقال ہوا خواجہ باقی باللہ میں آرام فرما ہیں۔

اُن کی شادی تطہیر النساء بنت شیخ عبد الرحمٰن صاحب سے ہوئی جن سے یوں تو دس گیارہ اولادیں ہوئیں لیکن دو صاحبزادے حافظ سلیمان صاحب اور حافظ عبد المنان صاحب زندہ رہے۔

حافظ سلیمان صاحب نے قاری حافظ سلیمان صاحب سے مسجد فتح پوری شیخ

منگو میں قرآن مجید حفظ کیا۔ عربک سکول سے آٹھویں جماعت تک تعلیم پائی۔ شاہ ابو محمد صاحب بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے۔ جائیداد کی نگرانی میں زیادہ وقت صرف کرتے تھے۔ ۱۹۲۷ء

میں پہلی مرتبہ پرونسیل کمشنر منتخب ہوئے۔ اس کے بعد بھی دو مرتبہ چنے گئے۔ پرونسیل کمشنری کے زمانہ میں ۱۹۳۵ء میں فوت ہوئے۔

ان کی پہلی شادی محمد بی بنت شیخ غلام اولیاء صاحب سے ہوئی۔ اُن کے انتقال کے بعد دوسری شادی شیخ غلام اولیاء صاحب کی ہی دوسری صاحبزادی احمد بی صاحبہ سے ہوئی۔ جن سے جناب انور طارق صاحب، احمد مختار صاحب لڑکیاں امۃ السبحان زوجہ جناب جمیل الرحمٰن صاحب ایڈووکیٹ، امۃ الرشید زوجہ اقبال احمد صاحب اقبال جہاں زوجہ ڈپٹی صاحب ہوئیں۔

احمد مختار صاحب نے مدرسہ تعلیم القرآن میں قاری نعیم اللہ صاحب سے قرآن مجید حفظ کیا۔ مدرسہ حسین بخش کی جھت پر محراب سُناتے تھے۔ ہندو کالج کشمیری گیٹ میں بی اے تک تعلیم پائی۔ مولوی محمد یوسف صاحب کے ترجمے میں شریک ہوتے تھے۔ مذہبی معاملات میں کافی دلچسپی لیتے ہیں اور تبلیغی جماعت میں بھی کام کیا۔

ان کی شادی حمیدہ بنت طاہر الاسلام صاحب سے ہوئی جن سے ایک صاحبزادے محمد نعیم صاحب ہوئے ہیں۔

حافظ عبد المنان صاحب نے حافظ حسین اشرف حسین صاحب سے مدرسہ حسین بخش میں قرآن مجید حفظ کیا۔ عربک سکول اجمیری گیٹ سے میٹرک ۱۹۱۶ء میں کیا۔ مشن کالج سے ایف اے کیا۔ بی اے کی تعلیم پا رہے تھے کہ تحریک ترک موالات میں تعلیم چھوڑی۔ ۱۹۳۰ء میں جی ڈی اے کا امتحان دیا۔ تین سال تک

بی آر مہوصاحب اور شریعت الرسول صاحب علی گڈھی سے کام سیکھا۔ ۱۹۳۵ء
میں جو گری ملی۔ آپ بھی شاہ ابواحمد صاحب سے بیعت تھے جو شاہ ابوالخیر صاحب
کے چچا زاد بھائی تھے۔

ان کی امت الصبور صاحبہ بنت حافظ عبدالخالق صاحب سے
شادی ہوئی جن سے دو تین اولادیں ہوئیں۔ اب ان کے اکلوتے بیٹے احمد جمال
صاحب حیات ہیں۔ احمد جمال صاحب نے مسجد حوض والی محلہ چوڑی والان
میں قاری نور محمد صاحب سے قرآن مجید حفظ کیا۔ ابتدائی تعلیم کیمبرج سکول
دریا گنج میں پائی۔ پرائیویٹ طور پر پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کیا۔ ہندو
کالج میں ایف۔ اے کیا اور اپنے والد صاحب کی طرح بی اے میں
تعلیم چھوڑ دی۔

ان کی شادی فرحت جہاں بنت حافظ نورالدین صاحب سے
ہوئی جن سے اختر جمال صاحب، اکرام جمال صاحب، ازہر جمال صاحب
لڑکیاں، ثریا جمال، نرگس جمال، شہلا جمال ہوئیں۔

اختر جمال صاحب نے مسجد حوض والی محلہ چوڑی والان میں قرآن مجید
حفظ کیا۔ آج کل دہلی پبلک سکول نظام الدین اولیاء میں نائن سٹینڈرڈ
میں زیر تعلیم ہیں۔ اکرم جمال صاحب، ازہر جمال صاحب دونوں مسجد حوض
والی چوڑی والان میں قرآن مجید حفظ کر رہے ہیں۔ زہرہ جمال کی شادی
احمد مختار صاحب بن حافظ سلیمان صاحب مرحوم سے ہوئی۔

حافظ عبدالخالق صاحب

حافظ صاحب ۱۹۱۴ء تک قطب روڈ
پر مٹی کے تیل کا کاروبار کرتے رہے اس کے
بعد جائیداد کے انتظام اور دیکھ بھال میں اپنا وقت لگایا۔ حاجی امداد اللہ

صاحبؒ مہاجر مکی سے بیعت تھے۔ ہر سال ان کا شاندار طریقے پر عرس کرتے تھے کافی تعداد میں کھانا پکا کر تقسیم کرتے تھے۔

قرآن مجید سے خاص لگاؤ و محبت تھی۔ اپنے پانچوں صاحبزادوں کو حافظ قرآن کیا سب لڑکوں کو ہر سال تراویح سنانے کی تلقین کرتے رہتے تھے! اس اس پر عمل درآمد بھی ہوا لیکن ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ کے بعد اس طریقے میں جزوی طور پر کمی ہوگئی۔ حافظ محمدؒ سعید صاحب کی تراویح میں انتقال تک شریک ہوتے رہے۔ چھ لڑکیوں کو بھی قرآن مجید ناظرہ کرایا تھا۔

خود بھی حافظ قرآن تھے۔ ۱۹۱۰ء تک محراب جامع مسجد گلی شیخ پوشاں کی مسجد اور مولوی عبداللہ صاحب کی مسجد محلہ چوڑی والان میں سنا کر چڑیوں اور کبوتروں کو دانا کھلانے کا بہت شوق تھا۔ فجر کی نماز کے بعد پانچ چھ سیر دانا گھر کی چھت پر لاکر ڈال دیا کرتے تھے اور اپنے موجودگی میں دانا کھلایا کرتے تھے تاکہ ان پر بلی حملہ نہ کرے۔ انتقال کے وقت وصیت کی کہ میرے سب بچے روزانہ صبح کو چڑیوں اور کبوتروں کو دانا ڈالا کریں جس پر اب تک پورے طور پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔

قوم کے اور محلے کے غربا و مساکین کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔ غریب لڑکیوں کی شادی اور تنگی و ترشی کے وقت بھی اعانت کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

درویشوں اور علماء سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ ان کے علم میں آنے کی دیر ہوتی تھی۔ علم ہوا اور فوراً ان کی خدمت میں پہنچ جاتے تھے۔ حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مولانا بخاری آگرے میں رہتے تھے۔ اُن کے پوتے گھرانے سے اُن کے گہرے مراسم تھے۔ خاندان اُن کو اپنے گھر میں رکھنے کے لئے لائے۔ دہلی

کے علماء اور مفتیوں، مولانا کفایت اللہ صاحب اور مولانا غزالی صاحب جو خیبر پاس والی مسجد میں رہتے تھے، ان سے قریبی تعلقات تھے۔

ہر سال جامع مسجد دہلی میں رمضان کے مہینے میں موسم گرما میں برف کے پانی کا انتظام کرتے تھے۔ مدرسہ حسین بخش مدرسہ عبدالرب اور مدرسہ امینیہ دہلی کی وقتاً فوقتاً امداد کرتے رہتے تھے۔ مسجد حوض والی محلہ چوڑی والان کے متولی تاحیات رہے۔ سردیوں میں نمازیوں کے لئے گرم پانی کا انتظام خود کرتے تھے۔

قرآن مجید کا ترجمہ اس مسجد میں کرایا کرتے تھے چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ۱۹۲۰ء تک ترجمہ کرتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد تین چار سال تک ترجمہ کا سلسلہ موقوف رہا لیکن اس زمانہ میں مولوی یار محمد صاحب جو نماز پڑھاتے تھے وہ فجر کے وقت وعظ فرمایا کرتے تھے۔ ان کے بعد مولوی محمد یوسف صاحب نے ترجمہ کا سلسلہ شروع کیا۔ جو الحمد للہ اب تک جاری ہے۔

۱۹۵۰ء میں صحت گر گئی تھی کمزور بھی زیادہ ہو گئے تھے لیکن اس حالت میں بھی مسجد میں نماز پڑھنے اور تراویح سننے جاتے رہے اور ایک دن بھی مسجد میں نماز باجماعت پڑھنی نہیں چھوڑی۔

اپریل ۱۹۵۲ء میں بہت زیادہ ضعیف و کمزور ہو گئے تھے اس وقت سے گھر میں نماز پڑھنی شروع کی اور حافظ محمد سعید صاحب کو ہدایت کی کہ وہ نماز فجر کے بعد ان کو قرآن مجید سنایا کریں۔ چنانچہ وہ ایسا ہی کرتے رہے۔

بواسیر، بخار و نزلہ میں تین چار مہینے مبتلا رہے، چنانچہ ۲۵ دسمبر ۱۹۵۲ء کو ان کا انتقال ہوا۔ اپنی حیات میں اپنا سرداوا اپنی نگرانی میں جامع مسجد کے شمالی گوشہ میں بنوایا تھا۔ چنانچہ ان کو ان کی وصیت کے مطابق

وہیں دفنایا گیا۔ اُن کی اہلیہ دائم المریض تھیں اُن کا بھی سر دادا اُنھوں نے اپنی حیات میں ہوم آیا تھا پھنا پھان کا انتقال مارچ ۵۴ ۱۹ء میں ہوا۔ اُن کو بھی وہیں دفن کیا گیا۔

حافظ عبدالخالق صاحب کی شادی کلثوم بی بنتِ شیخ سراج الدین صاحب سے ہوئی۔ جن سے پانچ صاحبزادے حافظ عبدالباسط صاحب مرحوم، حافظ محمد سعید صاحب وکیل، حافظ احمد میاں صاحب، حافظ نوابلبشیر احمد صاحب حافظ ڈپٹی نذیر احمد صاحب، اور چھ صاحبزادیاں آمنہ بی زوجہ عبدالجبار صاحب امت الصبور زوجہ حافظ عبدالمنان صاحب، ملکہ بی زوجہ حاجی عبدالمغنی صاحب فاطمہ بی زوجہ وحیدالدین صاحب وکیل ہوئیں۔

حافظ عبدالباسط صاحب نے حافظ حسین اشرف صاحب سے مدرسہ حسین بخش میں قرآن مجید حفظ کیا، ایس عبداللہ کی فرم میں ایکسپورٹ، امپورٹ کا کام سیکھا اور اس کے بعد عبدالعلیم صاحب خلف مولوی عبدالاحد صاحب کی شرکت میں مطبع مجتبائی میں ایکسپورٹ امپورٹ کا کام شروع کیا غالباً ۱۹۴۳ء تک یہ کام جاری رہا۔ بعدہٗ گھر پر کام کیا اور ولایت سے چوڑیوں کا شیشہ منگواکر چوڑی بنانے والوں کو سپلائی کرتے تھے۔

ان کی شادی مہرالنساء بنت حاجی نور الٰہی صاحب سے ہوئی۔ جن سے چار لڑکیاں عمر جہاں عرف بٹو زوجہ منصور الزماں صاحب، قمر جہاں زوجہ قدرت الٰہی صاحب، عصمت جہاں زوجہ نواب حسین صاحب ثمر جہاں زوجہ ہلال احمد صاحب ہوئیں۔

حافظ محمد سعید صاحب دسمبر ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید کے دو تین سیپارے حافظ حسین اشرف صاحب سے مدرسہ حسین بخش میں اور بقایا

قرآن مجید حافظ سلیمان صاحب سے مسجد حبشہ شیخ منگو میں حفظ کیا۔ ابتدائی پانچ
جماعتیں گھر پر ماسٹر محمد احمد صاحب سے پڑھیں۔ چھٹی جماعت سے عربک سکول
اجمیری گیٹ میں داخلہ لیا۔ وہیں سے ۱۹۲۰ء میں میٹرک کیا۔ سینٹ اسٹیفنز کالج سے
۱۹۲۲ء میں ایف۔ اے اور ۱۹۲۴ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ اس زمانے
مسٹر ڈینس کے رودرا پرنسپل اور پروفیسروں میں مسٹر سی۔ بی۔ ینگ (انگریزی) مسٹر
پی۔ این۔ ایف ینگ (تاریخ)، مسٹر ہونگ (انگریزی) مسٹر این۔ کے سین (منطق)
مولوی سید اطہر علی صاحب (فارسی) شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن صاحب (عربی)
پڑھاتے تھے۔

۱۹۲۲ء میں دہلی یونیورسٹی قائم ہوئی۔ اس میں حافظ محمد سعید صاحب داخل
ہوئے۔ دہلی یونیورسٹی کی تعلیم اس وقت سوائے ہنڈل سون ہال میں شروع ہوئی
تھی جس کا کچھ حصہ کرایہ پر لیا گیا تھا۔ اس کے پہلے وائس چانسلر سر ہری سنگھ گور صاحب
تھے اور دہلی کے مشہور وکلاء رائے بہادر ڈاکٹر مرزا کشن صاحب، سر عبدالرحمٰن صاحب
اور مسٹر اے۔ سی۔ بوس وغیرہ کو لا کالج کا آنریری پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔

حافظ صاحب نے ۱۹۲۶ء میں دہلی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری
حاصل کی تھی۔ گویا یہ پہلا گروپ دہلی یونیورسٹی کا تھا۔ اسی سال سے حافظ صاحب
نے پریکٹس شروع کی۔ آپ کا دہلی کے مشہور وکلاء میں شمار ہوتا ہے۔ آپ فوجداری
کے نہیں بلکہ دیوانی کے وکیل ہیں۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۵ء تک آپ نئی سڑک کوچہ رحمان
کے علاقے سے میونسپل کمشنر منتخب ہوئے۔

حافظ محمد سعید صاحب کی شادی جمیلہ عائشہ سلطانہ بنت حافظ محمد
یعقوب صاحب سے ہوئی جن سے ایک صاحبزادی سعیدہ سلطانہ زوجہ حافظ
نور الحق رفیق صاحب اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

جناب حافظ احمد میاں صاحب نے حافظ حبیب اشرف صاحب سے مدرسہ حسین بخش میں قرآن مجید حفظ کیا۔ انھوں نے حافظ عبدالباسط صاحب کے ساتھ ایکسپورٹ وا امپورٹ کا کام کیا۔ اس کے بعد بمبئی حاجی عبدالغنی صاحب کے پاس چلے گئے وہاں بیل فیتے کا کاروبار کیا۔ بمبئی سے آنے کے بعد سرائے حافظ جی صدر بازار دہلی میں بیل فیتے کی تجارت شروع کی۔ اسی دوران میں سرائے ہی میں بالش کا کارخانہ کھولا۔ بعد میں گلی جوتے والی محلہ چوڑی والان میں وہ کارخانہ لے آئے۔ کچھ عرصہ وہاں کام چلایا آجکل جائیداد کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں۔

ان کی شادی نور جہاں بنت محمد احمد صاحب سے ہوئی جن سے ایک صاحبزادے شاہد اقبال صاحب جنھوں نے گھر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ آج کل جامعہ ملیہ اسلامیہ اوکھلا میں تعلیم پا رہے ہیں اور ہائی سکنڈری کا امتحان دیں گے۔

حافظ بشیر احمد صاحب نے قاری نور محمد صاحب پانی پت والوں سے مسجد حوض والی محلہ چوڑی والان میں قرآن مجید حفظ کیا۔ ساتویں کلاس تک گھر پر تعلیم پائی۔ آٹھویں جماعت مسلم ہائی اسکول فتحپوری میں پاس کی۔ اس کے بعد کیمبرج سکول دریا گنج میں داخلہ لیا۔ سینیئر کیمبرج کا امتحان دیا۔ ۱۹۳۷ء میں پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان دیا۔ ۱۹۳۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف ایس سی میڈیکل گروپ کا امتحان دیا۔ فیل ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں ایف۔ ایس، سی کا امتحان ڈی اے، وی کالج لاہور سے دیا سکنڈ ڈویزن میں پاس ہوئے۔ میڈیکل کالج لاہور میں داخلہ نہ ملنے کی وجہ سے ایف ایس سی کالج میں داخل ہوئے۔ ان کے والد صاحب ان کا ڈاکٹر بننا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انھیں مردے پھاڑنے پڑیں گے۔ جس کی وجہ سے حافظ بشیر احمد صاحب امتحان دیے بغیر چلے آئے۔ ان کے بڑے بہنوئی حافظ عبدالحمید کی دوکان پیرس شوکمپنی دہلی میں تھی، اس میں انھوں نے نذیر احمد

کی شرکت میں تجارت کی۔ اور اسی دوران میں ۱۹۴۴ء کو آگرہ میں شمشاد فلور مل کے نام سے ڈپٹی نذیر احمدؒ کے ساتھ کام جاری کیا۔ کلکتہ میں بھی تجارت کی شہد منڈی ہے۔ وہاں بھی ڈبل فٹ ویر کے نام سے ایک ڈپو کھولا گویا بیک وقت تین کاروبار کا انتظام اُن کے ہاتھ میں تھا۔

۱۵ر اگست ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ نے ڈائرکٹ ایکشن ڈے منایا تھا۔ اس میں کلکتہ میں فساد ہوا، دُکانیں جلیں جس سے کافی لوگوں کا کاروبار بند ہوا۔ پاپوش کے تاجروں کو بھی نقصان ہوا۔ انھوں نے ان کی رقمیں نہیں دیں اس بنا پر کلکتہ کا کاروبار بند کرنا پڑا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں جگہ جگہ رقمیں ماری گئی تھیں جس کی وجہ سے آگرہ کا کاروبار بند کیا۔ دہلی کا کاروبار ایک آدمی کے سپرد کر دیا تھا۔ اس نے ایمانداری کا ثبوت نہیں دیا خورد برد کیا تو ۱۹۴۸ء میں دہلی کا کاروبار بھی ختم کرنا پڑا۔ اس کے بعد حافظ بشیر احمد صاحب جائیداد کے انتظام میں لگ گئے۔ ۱۹۵۱ء میں انجمن محافظِ اوقاف قوم تاجرانِ جفت دہلی کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ اور بارہ سال ۱۹۶۳ء تک رہے۔

اُن کی شادی ۱۹۳۸ء میں مسترت جہاں بنت حاجی عبدالعلیم صاحب مرحوم سے ہوئی۔ جن سے تین لڑکے حافظ نصیر احمد صاحب، حافظ تسلیم احمد صاحب، شبیر احمد صاحب اور دو لڑکیاں فریدہ بشیر زوجہ عبدالنعیم صاحب، شبنم بشیر ہوئیں۔

حافظ نصیر احمد صاحب نے مسجد حوض والی محلہ چوڑی والان میں حافظ عبدالحمید صاحب سے قرآن مجید حفظ کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان دیا فیل ہو گئے۔

حافظ تسلیم احمد صاحب نے بھی حافظ عبدالحمید صاحب سے قرآن مجید

حفظ کیا۔ زیر تعلیم ہیں۔ ہائر سکنڈری اسکول کا امتحان دیں گے بشیر احمد صاحب نے ناظرہ قرآن مجید حافظ عبد الحمید صاحب سے پڑھا۔ پرائیویٹ طور پر تعلیم پا رہے ہیں۔

فریدہ صاحبہ نے ناظرہ قرآن مجید پڑھا چیلا گیٹ کے گرلز سکول میں چھٹی جماعت تک تعلیم پائی۔ بلبلی خانہ کے سکول سے ساتویں جماعت کا امتحان دیا اسی اثنا میں ۱۹۵۹ء میں ان کی شادی ہوگئی شمیم بشیر نے ناظرہ قرآن مجید حافظ عبد الحمید صاحب سے مسجد حوض والی میں پڑھا۔ گھر پر اردو انگریزی کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید قاری نور محمد صاحب سے مسجد حوض والی محلہ چوڑی والاں میں حفظ کیا۔ عربک اسکول اجمیری گیٹ سے میٹرک کیا۔ اینگلو عربک کالج سے ایف۔ اے کرنے کے بعد بی۔ اے کا امتحان نہیں دیا۔ اس کے بعد حافظ بشیر احمد صاحب کے ہمراہ مذکورہ کاروبار کے اور سگل انڈسٹری کے نام سے مشین بنانے کا کام جامع مسجد کی شمالی پشت پر کیا جو زیادہ عرصہ نہیں چل سکا۔

ان کی شادی نور جہاں بنت نور الٰہی صاحب سے ہوئی جن سے چار لڑکے شمیم احمد صاحب، نسیم احمد صاحب، حافظ فہیم احمد صاحب نعیم احمد صاحب پانچ لڑکیاں راشدہ، رفعت، شاکرہ، شاہین، ذاکرہ اور زاہدہ ہوئیں۔

نسیم احمد صاحب نے ناظرہ قرآن مجید حافظ عبد الحمید صاحب سے حوض والی مسجد محلہ چوڑی والاں میں پڑھا۔ اینگلو عربک اسکول سے ہائر سکنڈری کا امتحان پاس کیا۔ حافظ فہیم صاحب نے مسجد حوض والی میں حافظ عبد الحمید صاحب سے قرآن مجید حفظ کیا۔ عربک سکول میں نویں کلاس میں پڑھ رہے ہیں۔ نعیم احمد صاحب مسجد حوض والی میں حافظ عبد الحمید صاحب سے قرآن مجید حفظ کر رہے ہیں۔

حافظ محمد یوسف صاحب

حافظ صاحب اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے اور انتہائی خوب صورت تھے۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ آپ میں حسن یوسف سمایا ہوا تھا۔ انتہائی بُردبار سمجھ دار تھے۔ سالن خود پکانے کا بے انتہا شوق تھا بلکہ خاص ملکہ حاصل تھا سالن بڑے مزے والے پکاتے تھے تعلیم کوئی خاص نہیں تھی۔ اس کے باوجود بہت ہوشیار تھے اپنے بڑے بھائی حافظ رحیم بخش صاحب عرف عبدالوہاب سے بے انتہا محبت تھی۔ اور ادب و احترام کے باوجود ان سے بہت ڈرتے تھے۔ دوسری طرف بڑے بھائی بھی ان سے انتہائی شفقت سے پیش آتے تھے۔ ان کو کبوتر پالنے کا بے حد شوق تھا سینکڑوں قسم کے کبوتر پالے ہوئے تھے۔ خود ان کے دانہ پانی کا خیال رکھتے تھے۔ مگر بڑے بھائی کے خوف سے اڑاتے نہ تھے۔ پتنگ خوب اڑواتے تھے۔ اس فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اور اس فن کے سینکڑوں داؤ پیچ سے واقف تھے کئی قسم کا مانجھا نہ صرف سُتواتے تھے بلکہ خود بھی اکثر سوت لیا کرتے تھے۔ یہ دور دور تک میچ کھیلنے کے لیے جاتے تھے۔ میرٹھ، علی گڈھ، لکھنؤ۔ الہ آباد میں انھوں نے کئی میچ جیتے۔ ان کے دہلی و بیرون دہلی میں کئی شاگرد تھے۔

ان کی شادی مسماۃ نزاکت النساء بنت حافظ عبدالرحمن صاحب بنارسی سے ہوئی جو گلی تخت والی محلہ چوڑی والان کے بائیں ہاتھ والے شروع کے مکان میں رہتے تھے۔ ان کی وجہ سے ہی گلی تخت والی مشہور ہوئی جس کا سبب یہ ہے کہ آپ گلی کے نکڑ پر تخت پر بیٹھ کر اکثر شام کو پاپوش کی خرید کاریگروں سے کرتے تھے۔

حافظ عبدالرحمن صاحب کی بیوی کا نام بشارت تھا۔ والدہ حاجی جسے بدرالاسلام صاحب بہت خسیس طبیعت رکھتی تھیں۔ ہر کسی کے بہکانے میں آجاتا

ان کا معمولی کام تھا۔ اکثر غیر عورتیں چاندی کی چیزوں کے بہانے سے گلٹ کی چیزیں رہن رکھ کر ان سے قرض لے جایا کرتی تھیں اور پھر لوٹ کر تمام نہ لیتی تھیں اور یہ کوس بیٹھ کر چپ ہو جایا کرتی تھیں۔ بڑھیوں اور فقیرنیوں کا زیادہ خیال رکھتی تھیں۔ خالہ حشمت سے جو گھر کے سامنے ہی رہتی تھیں گہری چھنتی تھی۔ ان کے ہاں اکثر روزانہ درس ہوتا تھا تو یہ شریک ہوا کرتی تھیں۔ رات کے بارہ ایک بجے تک گلی کی عورتوں کے ساتھ بیٹھ کر خوب باتیں کرتی رہتی تھیں۔ اکثر اوقات قرض دیکر بھول جاتی تھیں۔ سودے والے ان کو خوب لوٹتے تھے۔ گلی سڑی چیزیں ان کے ہاتھ فروخت کر جاتے تھے۔ آخر عمر میں بلغمی مزاج ہو گیا تھا۔ اکثر تنا کا جلاب لیتی تھیں۔ اسی بلغمی بیماری سے ۱۴ جولائی ۱۹۵۳ء کو بہ عمر ۸۰ سال انتقال ہوا اور قبرستان خواجہ باقی باللہ میں مدفون ہوئیں۔ انکے خوب صورت ماں باپ کے صرف ایک فرزند حاجی بدرالاسلام صاحب ہوئے۔ بے انتہا خوشی منائی گئی حد سے زیادہ لاڈ کیا گیا۔ مگر خدا کو یہ لاڈ پیار محبت زیادہ عرصہ گوارہ نہ ہوئی۔ جب اس اکلوتے معصوم بچے کی عمر چار سال کی ہوئی تو والد کا انتقال ہو گیا جو اسی آبائی قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے چار سال کا بچہ اپنے تایا حاجی عبدالرب صاحب کے سایۂ عاطفت میں انتہائی لاڈ پیار سے پروان چڑھا تایا نے اپنے زیر سایہ رکھ کر آپ کی دیکھ بھال لکھائی پڑھائی شروع کی۔ ہر طرح سے ان کا خیال رکھا۔ کبھی دل میلا نہ ہونے دیا۔ کسی وقت بھی کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دی۔ مگر ماں کے لاڈ نے زیادہ پڑھنے نہ دیا۔ کھیل کود ڈنگ وغیرہ کے سامنے پڑھائی، ساتویں کلاس کے بعد ختم کر دینی پڑی۔ حالانکہ اینگلو عربک اسکول اجمیری گیٹ دہلی کے ماسٹروں تک نے انتہائی پیار و محبت سے ان کو پڑھایا۔ اس زمانہ کی ابتدائی تعلیم اس قدر جامع ہوتی تھی کہ

موجودہ زمانہ کا دسویں کلاس والا طالب علم کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

آپ کا قد ٹھگنا، گندمی رنگ، بلند اور چوڑی پیشانی بڑی بڑی آنکھیں بہت بھلی لگتی تھیں۔ شروع جوانی کے عالم میں شیو کراتے تھے، سوٹ پہنتے تھے۔ شادی کے کئی سال بعد جب فریضۂ حج سے فارغ ہونے کے بعد تشریف لائے تو چھوٹی سی داڑھی رکھ لی تھی اور کپڑے بھی بے انتہا سادہ پہننے لگے تھے۔ جو بہت کم قیمت کے ہوتے تھے بات چیت انتہائی نرمی سے سر جھکا کر کرتے تھے۔ جو مخاطب کو گراں نہ گزرے، بردبار، تحمل مزاج تھے، جھوٹ سے انتہائی نفرت کرتے تھے۔ نماز جمعہ کے لئے خاص طور پر صبح ہی سے تیاری شروع کر دیتے تھے۔ اور انتہائی عاجزی، انکساری کے ساتھ جامع مسجد میں باجماعت نماز جمعہ ادا کرتے تھے۔ ماہ رمضان المبارک کا لا انتہا احترام کرتے تھے۔ اپنی پوری زندگی میں ایک بھی روزہ قضا نہیں کیا۔ افطاری کا خود ہی اپنے ہاتھ سے انتظام کرتے تھے۔ کئی قسم کے کھانے افطاری کے وقت دسترخوان پر ہوتے تھے جن میں آپ کو خاص ملکہ تھا۔ یہ باپ سے ورثہ میں ملا تھا۔ دوسروں کو کھلانے میں بہت خوش ہوتے تھے۔ اکثر غریب لوگ آپ کے ساتھ ہوتے تھے طبیعت نرمی کے ساتھ ساتھ غصیلی بھی جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو کچھ سخت بات کہہ دیتے تو بعد میں اس سے معافی مانگ لیا کرتے تھے۔ اللہ کے غضب سے بہت ڈرتے تھے۔ جب تک دوسرا شخص معاف نہ کر دیا کرتا تھا چین نہ آتا تھا۔ اولاد سے بے انتہا محبت کرتے تھے کبھی کسی وقت بھی اولاد کو تکلیف نہ ہونے دی اور ہر طرح ان کا دل روپیہ پیسے سے بھرپور رکھا اور کبھی بھی میلا نہ ہونے دیا۔ ان کی تفریح کا خیال بھی رکھتے تھے اور اکثر آگرہ، قطب وغیرہ وغیرہ کے لئے جایا کرتے تھے۔ چھوٹے بچے کو بہت پیار کرتے تھے خواہ اپنا ہو یا غیر کا ترکاری میں خریدو تے

تربوز، آم وغیرہ کی پہچان کافی تھی۔ اور روزانہ پانچ دس سیر گھر پر لے آتے تھے۔ اس میں غریبوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ بچوں کو برائیوں سے بچانے کے لئے سمجھانے کا انداز بالکل نرالا تھا۔ ایسے سمجھاتے تھے جیسے گہرے دوست سمجھاتے ہوں۔ آخر عمر میں انتہائی نرم دل ہو گئے تھے، سبزی، فروٹ وغیرہ کے اکثر زیادہ دام دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مرنے کا افسوس ہر دکاندار کو ہوا۔ اور کئی دن رہا۔ صبح سویرے ہی اٹھ کر سب سے پہلے گوشت تلاش کرتے تھے اور من پسند گوشت جہاں سے ملتا لیتے تھے چاہے پیسے زیادہ ہی دینے پڑیں۔ گوشت کی شناخت میں بے مثل تھے۔ اکثر لوگ اس انتظار میں رہتے تھے کہ حاجی صاحب کس راس سے گوشت لیتے ہیں۔ اسی سے وہ بھی لیتے تھے۔ سالن خود ہی پکاتے تھے اس فن کے نہ صرف ماہر تھے بلکہ اس کے پکانے کے سینکڑوں گر یاد تھے۔ اتوار کو دریائے جمنا کے کنارے پتنگ بازی کا میچ ہوتا تھا، یہ ناممکن تھا کہ آپ حصہ نہ لیں۔ اس فن میں بڑے بڑے استاد ان کا ادب کرتے تھے اور اپنا استاد تصور کرتے تھے۔ داؤ پیچ سے اتنی واقفیت تھی کہ میٹھ کر پیچ لڑایا کرتے تھے اور پھر کاٹتے تھے۔ گھریلو کھیلوں میں شطرنج کا شوق تھا اپنے مدمقابل کو کہہ کر مات دیا کرتے تھے۔ فٹ بال کا کوئی میچ نہیں چھوڑتے تھے، لازمی دیکھتے تھے۔ آپ کے گہرے دوستوں میں میر صلاح الدین عرف لاٹ صاحب مالک نعمانی پریس اور ان کے بڑے بھائی میر حسام الدین و مولانا محمد یوسف فقیر دہلوی تھے۔ اکثر تمام دن میر صاحب کی دکان واقع زیر جامع مسجد بیٹھے رہا کرتے تھے اور ان کا دکانداری میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ فالتو ٹائم میں قرآن مجید کے لائن وار ایک ایک حرف کو دیکھتے تھے اور غلطی نکلنے پر فوراً درست کراتے تھے۔

آپ کی شادی آپ کے بڑے تایا حافظ رحیم بخش عرف عبدالوہاب کی چھوٹی صاحبزادی خاتونِ محشر سے ہوئی۔ ہر دو طرف سے سامانِ شادی دل کھول کر دیا گیا

خاتونِ محترم انتہائی بُردبار ہیں۔ مذہبی کتابیں پڑھتی ہیں۔ قرآن مجید کا روزانہ ورد کرتی ہیں، چاہے کچھ ہو جائے صوم و صلوٰۃ کی بے حد پابند ہیں۔ ساس کی بے انتہا خدمت کی۔ کافی عرصہ ساس کے پاس رہیں۔ اس کے بعد گلی حکیم جی والا مکان چھوڑ کر اپنے دوسرے ذاتی مکان متصل مسجد الف خان اونچی مسجد آ گئیں۔ اپنے ہی بچوں کی دیکھ بھال میں گھری رہتی تھیں۔ گھر کے کام کاج سے انتہا لگاؤ ہے۔ تن من دھن سے بچوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہتی ہیں، روٹی خود پکانے کی عادی ہیں اور کافی بڑی روٹی پکاتی ہیں۔ گھرداری میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ اپنے خاوند کو خود ہی حج کو جانے کی ترغیب دی اور اُن کے ساتھ بڑے لڑکے طاہر الاسلام مع بیوی بچوں اور اپنی ساس کو بھی فریضۂ حج کے لئے روانہ کیا۔ ان کی غیر حاضری میں نوری نام کے ایک شخص نے گھر کی دیکھ بھال رکھی اور کرایہ لاکر آپ کو سنبھلوا دیا۔ حج سے واپسی پر مٹھائی تشتریوں میں رکھ کر رومال کے ساتھ تقسیم کی گئی۔ بچوں کی دیکھ بھال میں اپنے آرام کی فکر نہ کی اور نہ ہی دوسرے کی مدد گوارا کی، جو کام کیا خود اپنے ہاتھوں سے کیا۔ اب ایک بڑھیا روٹی پکانے کے لئے رکھی ہوئی ہے۔ مگر سالن خود ہی پکاتی ہیں، اس کے لئے بہوؤں کو بھی تکلیف نہیں دیتیں اور اُن سے کسی قسم کا کام کاج نہیں لیتیں چونکہ کام کرنے کی خود ہی عادی ہیں اس عادت کو ترک کرنا نہیں چاہتیں۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ حاجی بدر الاسلام صاحب میچ دیکھنے گئے۔ وہاں چکر آ گیا اور گر پڑے۔ ساجد الاسلام ان کو گھر پر لائے، علاج معالجہ ہوا۔ ۲۰ جولائی ۱۹۹۱ء کو بخار شروع ہوا۔ ۲۳ جولائی کو ڈاکٹر ناصر الدین کو دکھایا انھوں نے بڑھا ہوا یرقان بتایا ۲۵ جولائی کو صورت خطرناک ہو گئی۔ اس دن گیارہ بجے گلوکوز دیا گیا۔ بے ہوشی کا غلبہ زیادہ دیکھ کر ڈاکٹر برجموہن نے ڈاکٹر سین کے ہاں لے جانے

کی رائے دی۔ آخر کار ملائٹ صاحب اور محمد علی صاحب ڈرائیور کی مدد سے نور الاسلام شاکر الاسلام اور ساجد الاسلام نے بذریعہ ٹیکسی نرسنگ ہوم میں داخل کیا۔ فوری علاج شروع ہو گیا۔ ۸ جولائی کو معمولی ہوش آیا۔ اسی دن ظاہر الاسلام و شاہد الاسلام پاکستان سے تشریف لے آئے۔ ۳۰ جولائی کو کچھ سمجھ کر زبان سے نہ بولا گیا اور نہ ہی سنا گیا۔ یکم اگست سے کچھ افاقہ ہوا۔ مگر پیروں پر ورم شروع ہو گیا جھاڑ پھونک کرائی گئی، مسجدوں میں دعا کرائی گئی۔ ہندو کرایہ داروں نے مندروں میں دعائیں مانگیں۔ منشی نانک سنگھ نے گوردوارہ میں دعا منگوائی۔ حالت تو درست ہو گئی مگر پیروں پر ورم کافی ہو گیا تھا۔ ۱۶ اگست کو پھر طبیعت خراب ہونا شروع ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ گردے بالکل کام نہیں کر رہے۔ اسی وجہ سے پیٹ میں پانی اور ہوا بھر گئی۔ ۲۳ اگست کو یہ پانی نلکی کے ذریعہ نکالا گیا۔ تھوڑے سکون ہو گیا۔ امید کی جھلک نظر آنے لگی۔ ۲۵ اگست کو پھر حالت خراب ہو گئی پیشاب بھی بہت مشکل سے آیا۔ اس روز کلمۂ طیبہ و کلمۂ شہادت زیادہ زبان پر رہا اور زور زور سے پڑھتے تھے کبھی اللہ غنی کا ورد کرتے تھے۔ یکم ستمبر کو اپنے بیٹوں کو نماز جمعہ کے لئے جانے اور تیاری کرنے کی ترغیب دی۔ جمعہ کا وقت گذرتے ہی آپ پر پھر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ پھر دعائیں مانگی گئیں۔ ۲ ستمبر ۱۹۶۷ء کو کچھ ہوش آیا۔ کلمۂ شہادت کلمۂ طیب پڑھتے رہے۔ ہر آنے والے سے خواہ غیر ہو یا اپنی اولاد سب سے مصافحہ کئے اور بار بار ہر ایک سے الوداع کہا۔ کبھی کبھی اپنی والدہ اور اپنے والد صاحب کو بھی یاد کیا۔ اسی دن شام کو ۷ بج کر ۵۵ منٹ پر کلمہ شہادت کا ورد کرتے ہوئے اپنے ماں باپ سے ملنے چلے گئے اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

۳ ستمبر صبح ۷ بج کر ۱۵ منٹ پر تقریباً ۳۰۰ آدمیوں کے ساتھ شاہ ولی اللہ کے خاندانی مزارات مہندیوں کے لئے روانہ ہوئے اور چار دیواری کے اندر کنویں کے

پاس مدفون کیے گئے۔ بارش کے زیر سایہ مفتی ضیاء الحق صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ تمام دن ابر چھایا رہا مگر واپسی میں بارش ہوئی۔ ۸ بج کر ۴ منٹ پر گھر پر واپس آ گئے اور ضروری رسوم سے فراغت حاصل کی۔

آپ کے وارثوں میں بیوی کے علاوہ چھ لڑکے اور چھ لڑکیاں ہیں۔

لڑکوں میں:۔

(۱) طاہر الاسلام جن کی شادی حاجی غلام اولیاء صاحب کی صاحبزادی مسماۃ نور جہاں سے ہوئی۔ تعلیم اجمیری گیٹ کے سکول سے میٹرک تک حاصل کی۔ جائیداد میں والد صاحب کے ساتھ ہاتھ بٹاتے رہے۔ اب راولپنڈی میں مقیم ہیں اور کپڑے کی تجارت کرتے ہیں۔ آپ کے پانچ لڑکے منتخب الاسلام محمد خالد، عبد الرحمن، حبیب الرحمن، شفیق الرحمن ہیں۔ بڑے صاحبزادے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ باقی دوسرے بھی زیر تعلیم ہیں۔ آپ کی چار لڑکیاں ہیں۔ عیش جہاں زوجہ محمد سعید، طاہرہ سلطان زوجہ کرم الٰہی حمیدہ سلطان زوجہ احمد طارق بن حافظ سلیمان صاحب درحسن آرا تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔

(۲) ظاہر الاسلام صاحب کی شادی اپنے ماموں محمد ہاشم کی صاحبزادی اکبر سلطان سے ہوئی۔ آپ نے بھی میٹرک تک ہی تعلیم حاصل کی۔ فٹ بال اور تیراکی کے شوقین ہیں۔ شطرنج اور پتنگ بازی کے ماہر ہیں۔ کبوتروں کے پالنے کا بھی شوق رہا ہے۔ اب کراچی میں کپڑے کی دکان ہے۔ آپ کا ایک لڑکا ماجد الاسلام اور دو لڑکیاں ہیں جو ابھی کم سن ہیں۔ ان کے نام فرزانہ سلطان اور رخسانہ سلطان ہیں۔

(۳) شاہد الاسلام کی شادی برادری کی مشہور و معروف شخصیت حاجی

زیبو کی صاحبزادی صفیہ خاتون سے ہوئی۔ آپ کو پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ مگر حالات نے بی اے کی تعلیم مکمل نہونے دی۔ اور پارٹیشن ہوگیا۔ کچھ سال اپنے سسر کا ہاتھ بٹایا اور ان کے کام میں ترقی دی۔ اب ان کی اپنی ذاتی دکان کراچی میں ہے، انتہائی ہوشیار، بردبار، سمجھدار طبیعت کے مالک ہیں۔ ان کی صلاح قابلِ قبول ہوتی ہے۔ والد کو ان سے بہت انسیت تھی پہلے صرف پڑھائی کا شوق تھا یا اب تجارت کا ہے۔ کسی کھیل میں حصہ نہیں لیتے اگر لیتے بھی ہیں تو برائے نام۔ ان کا ایک لڑکا شاہد پرویز اور دو لڑکیاں پروین سلطان و زرینہ سلطان ہیں جو زیر تعلیم ہیں۔

(۴) نورالاسلام صاحب کی شادی حاجی نجم الدین صاحب مالک ریز راس بوٹ ہاؤس کی بڑی صاحبزادی حمیدہ سلطان سے ہوئی گیارہویں کلاس تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ریڈیو کی لائن میں پڑ گئے۔ اور بجلی کی فٹنگ کا امتحان پاس کیا۔ کیمروں کی مرمت خوب غور سے کرتے ہیں اور جب تک خود مطمئن نہیں ہو جاتے گاہک کو نہیں دیتے چاہے ایک ماہ لگ جائے۔ سوشل ایجوکیشن سینٹر مٹیا محل کے سکریٹری ہیں۔ اب برادری کی جماعت کے خزانچی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ادھر گھر کو سنبھال رکھا ہے۔ سب بھائی بہنوں کی طرف سے مختار عام ہیں۔ ٹائم نہ ملنے کے باوجود بھی ہر کام میں حصہ لیتے ہیں۔ آپ کے چار لڑکے ہیں، ناظر الاسلام، عبدالمطلب جو زیر تعلیم ہیں اور عبداللہ عمر خالق و محمد طیب ابھی کمسن ہیں۔

(۵) شاکر الاسلام کی شادی مسرت جہاں بنت مشتاق احمد صاحب سے ہوئی۔ دسویں کلاس تک پڑھا۔ اب ہمدرد دواخانہ میں ایک اچھے عہدہ پر ملازم ہیں۔ عنقریب اپنی دکان کرنے کا ارادہ ہے۔ ان کی دو لڑکیاں یاسمین جبین زیر تعلیم

ہے اور دوسری بدرجہاں کم سِن ہے۔

(۶) ساجد الاسلام ابھی زیر تعلیم ہیں۔ لاٹ صاحب کے ساتھ دکان پر اُن کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اب اپنی ذاتی دکان چتلی قبر پر کھول لی ہے۔ پتنگ بازی کا شوق ہے۔ قرآن حفظ کیا ہوا ہے مگر سُنانے کا موقع نہیں ملتا۔ ابھی غیر شادی شدہ ہیں اُن کی منگنی حاجی عبدالعلیم صاحب کے صاحبزادے حافظ عبدالمنان صاحب کی صاحبزادی سے قرار پا چکی ہے۔

لڑکیوں میں سب سے پہلی صابرہ سلطان ہیں جن کی شادی محمد یونس صاحب ولد محمد سعید سے ہوئی۔

(۲) جواہر سلطان کی شادی محمد نبی الدین صاحب ولد حاجی عبدالعلیم صاحب سے ہوئی۔

(۳) رفعت سلطان کی شادی ضیاء العارفین صاحب سے ہوئی۔

(۴) ظاہرہ سلطان کی شادی پروفیسر محمد ذاکر صاحب ولد حاجی محمد سمیع صاحب سے ہوئی۔

(۵) صاجبہ سلطان ابھی غیر شادی شدہ ہیں والدہ کا ہاتھ بٹاتی ہیں حال ہی میں جو خمی پیروں میں تھی وہ دُور ہو گئی۔

(۶) ماہرہ سلطان کا ۸ر مارچ ۱۹۶۳ء میں انتقال ہوا۔ اپنے والد کے سرہانے مہندیوں میں مدفون ہیں [1]

حاجی عبدالرزاق صاحب

عبدالقادر صاحب اپنے والد حاجی اللہ بخش صاحب کی دکان پر اپنے چھوٹے

---

[1] رسالہ صدیقی گزٹ دہلی جون نمبر ۱۹۶۳ء

بھائی حاجی عبدالرزاق صاحب کے ہمراہ بیٹھتے تھے، یہ دکان چاندنی چوک میں تھی۔ عبدالقادر صاحب کی شادی رقیہ بی بنتِ حافظ کریم بخش صاحب سے ہوئی۔ دوسری شادی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد کسی گوالیار کے خاندان میں ہوئی۔ بے اولاد فوت ہوئے خواجہ باقی باللہ میں ان کا مزار ہے۔

حاجی عبدالرزاق صاحب نے اپنے والد صاحب کی دکان پر کاروبار کرنے کے بعد اپنا ذاتی کام چاوڑی بازار نکڑ جامع مسجد پر پاپڑ کا کیا ہول سیل کا کام تھا۔ حاجی صاحب انتہائی نیک اور خدا ترس بزرگ تھے۔ زکوٰۃ خیرات صدقات خوب دل کھول کر دیتے تھے۔ کافی لوگوں کو اپنے پیسے سے حج کرایا۔ برادری کی لڑکیوں کی شادی اپنی بیٹی سمجھ کر کراتے تھے۔ بعض شادیوں میں لڑکی کی طرف سے جائیداد بھی دی۔ پہلے گلی دیویداس محلہ چوڑی والان میں رہتے تھے۔ بعد میں گلی حافظ بنے میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ اسی مکان میں ۱۹۲۳ء کو انتقال ہوا خواجہ باقی باللہ میں آرام فرما ہیں۔

ان کی پہلی شادی برکت النسا بنت عبدالغنی صاحب سے ہوئی اُن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ دوسری شادی سرور النسا بنت ڈاکٹر محمد ابراہیم صاحب سے ہوئی جن سے ایک صاحبزادے عبدالغفار صاحب لڑکیاں امت المبین زوجہ حاجی امیر خاں، امت القیوم زوجہ سید نواب علی صاحب امت الرسول زوجہ حاجی عبدالحمید صاحب ہوئیں۔

عبدالغفار صاحب یکم جولائی ۱۹۱۲ء کو گلی حافظ بنے محلہ چوڑی والان میں پیدا ہوئے۔ حافظ عبداللہ صاحب اور دوسرے قاری سے بیس بائیس پارے حفظ کیے۔ عربک اسکول میں آٹھویں کلاس تک تعلیم پائی۔ اسی دوران موٹر کے کام کے سیکھنے میں حادثہ ہو گیا جس کی وجہ سے تعلیم چھوڑنی پڑی۔ ۱۹۴۴ء میں

نئی سڑک پر پارچہ کی دکان فینسی کلاتھ سٹور کے نام سے کی۔ جو ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ کی نظر ہوئی۔ اسی زمانہ میں ترکِ وطن کیا۔ اوکاڑہ منڈی بہاؤالدین سرگودھا میں بارہ سال ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۶۱ء میں نیو کلاتھ ہاؤس کے نام سے لاہور انارکلی میں کاروبار شروع کیا جو اب تک جاری ہے۔

ان کی پہلی شادی امت المبین بنت حاجی محمدؐ یامین صاحب سے ہوئی جن سے لڑکے عبدالجبار صاحب عبدالوہاب صاحب اور ایک صاحبزادی قمر جہاں ہوئیں۔

عبدالجبار صاحب دہلی میں ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوئے۔ اوکاڑے میں ابتدائی تعلیم پائی میٹرک سرگودھے میں کیا۔ ایف ایس۔ سی میڈیکل لاہور میں کیا۔ آجکل بی ایس سی کی تیاری کر رہے ہیں۔

عبدالوہاب صاحب عرف گلزار احمد صاحب ۱۹۴۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں میٹرک کیا آجکل ایف۔ ایس۔ سی انجینئرنگ کی تعلیم پا رہے ہیں۔ اور کاروبار میں اپنے والد کا بھی ہاتھ بٹاتے ہیں۔

پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کشور جہاں بنت فیض بخش صاحب سے ۱۹۵۲ء میں ہوئی جن سے تین صاحبزادیاں، فوزیہ پروین، فرزانہ بی، اور بلو ہوئیں۔ فوزیہ پروین ۱۹۵۳ء فرزانہ بی ۱۹۵۶ء میں اور بلو ۱۹۵۸ء میں پیدا ہوئیں[1]

حاجی محمدؐ مسلم صاحب، حافظ محمدؐ میاں صاحب، محمدؐ عارف صاحب محمدؐ عادل صاحب اور پروفیسر محمدؐ ذاکر صاحب، حافظ عبدالمنان صاحب، حافظ بشیر احمد صاحب، حافظ محمدؐ سعید صاحب وکیل اور حافظ ڈپٹی نذیر احمدؐ صاحب، جناب نورالاسلام صاحب اور عبدالغفار صاحب سے اس خاندان کے حالات معلوم ہوئے۔

[1] رسالہ صدیقی گزٹ دہلی جون ۱۹۶۲ء

شیخ محمد تقی ایڈوکیٹ

آپ حاجی محمد شفیع صاحب کے صاحبزادے تھے اور حاجی قطب الدین کے پوتے تھے ۱۸۸۷ء میں حویلی حسام الدین حیدر بلی ماراں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ایل ایل بی کر کے وکالت کا پیشہ اختیار کیا آپ سپریم کورٹ آف انڈیا میں وکالت کرتے تھے۔ آپ نے بڑے بڑے مقدمات لڑے اور ان میں کامیابی حاصل کی۔ ان کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے وکلاء میں ہوتا تھا۔

اپنی علمیت و راست بازی اور اصول پسندی کے باعث انھوں نے وکالت کے پیشہ کا نام روشن کیا اور اسے چار چاند لگائے مظلوم عورتیں جو اپنے شوہروں سے ستائی جاتی تھیں انھیں ان کے گھروں میں آباد کرنے یا آزاد کرانے کے لیے ان کے مقدمات بلا معاوضہ لڑتے تھے اور بیکس عورتوں کا بڑا سہارا تھے۔

شیخ صاحب اپنے موکلوں سے جو معاوضہ لیتے تھے اس کا پورا حق ادا کر دیا کرتے تھے وہ مقدمہ کی تیاری کے لیے شب و روز محنت کرتے تھے، ساری ساری رات جاگ کر وہ اپنے موکلوں سے مقدمہ کے رموز کو سمجھتے تھے اور اس کی تمام جزئیات کا باریک بینی سے جائزہ لیتے اور پھر قانونی کتابوں کا مطالعہ کر کے مقدمہ کی پوری تیاری کر کے عدالت کا رخ کرتے تھے، بسا اوقات مقدمہ

میں ان کی دلچسپی صاحب معاملہ سے زیادہ بڑھ جاتی تھی۔ ایک واقعہ مشہور ہے کہ کسی صاحب کا مقدمہ انھوں نے لیا۔ اور اس کے ساتھ بیٹھ کر مقدمہ کی تیاری میں پوری رات گذار دی۔ صبح دم موکل نیند کے غلبے سے مجبور ہو کر سستانے کے لیے لیٹے تو خراٹے بھرنے لگے۔ اس پر شیخ صاحب نے ایک چپت رسید کر کے ان کو اٹھا کر بٹھا دیا۔ اور بولے یہ تو وہی بات ہوئی کہ مدعی سست اور گواہ چست۔ وکیل جاگ رہا ہے اور موکل خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا ہے یہاں مقدمہ لڑنا ہے تو جتنا بھی ہو سکے چوکس اور ہوشیار ہو کر بیٹھو۔"

شیخ محمد تقی صاحب نے مجھ امداد صابری کے بھی کئی سیاسی مقدموں میں پیروی کی ایک مقدمہ ۱۹۴۲ء میں شمس العلماء امام سید احمد صاحب نے دفعہ پانچ سو کا میرے خلاف دائر کر دیا تھا میرا اُن کا کیا مقابلہ، دلی سرا ان کی بے پناہ عزت کرتا تھا چیف کمشنر جیسے لوگوں کو وہ ڈانٹ دیا کرتے تھے نیچے کی عدالت سے میں مقدمہ ہار گیا تھا مسٹر بھنڈاری سشن جج کی عدالت میں میں نے اپیل کی اپیل تو کر دی، امام صاحب کے رسوخ کے مقابلہ میں مجھ کو جیتنے کی ذرہ برابر اُمید نہ تھی شیخ محمد تقی صاحب نے تین دن بحث کی وکیل سرکار بھی اپنے انداز سے بولے بحث ختم ہو گئی تو فیصلہ کی تاریخ مقرر ہوئی۔ مقررہ تاریخ پر پہنچا اس اُمید پہ کہ میرے خلاف فیصلہ سُنایا جائے گا، جب فیصلہ سُنایا گیا تو خدا کی قدرت دیکھیے میرے حق میں ہوا لیکن نا اُمیدی دماغ پر تیز چھائی ہوئی تھی کہ میں یہ سمجھا میرے خلاف فیصلہ ہوا ہے لیکن میرے پاس امام صاحب کے منشی کھڑے ہوئے تھے، انھوں نے مجھ کو مبارکباد دی تو میں نے ان سے پوچھا کس بات کی مبارکباد دے رہے ہو۔ انھوں نے کہا مقدمہ جیتنے کی ان کی بات کا بھی مجھ کو یقین نہیں آیا عدالت سے باہر نکلا تو چپراسی نے گھیر لیا مبارک ہو۔ ہمارا بھی خیال کیجیے، جب مجھ کو یقین

آیا کہ میں مقدمہ جیت گیا ہوں۔ عدالت نے مقدمہ میں دل کھول کر مقدمہ کے خامیوں کو سامنے رکھ کر مجھ کو باعزت بری کیا۔ یہ اللہ کا فضل اور شیخ محمد تقی صاحب کی قابلیت کا نتیجہ تھا۔ مجھ سے شیخ محمد تقی صاحب نے کوئی فیس وغیرہ نہیں لی۔ میرے والد ماجد حضرت العلامہ مولانا اشرف الحق صاحب کے ان سے اور ان کے والد ماجد سے دیرینہ تعلقات تھے اور مجھ پر بھی شفقت فرماتے تھے۔

شیخ محمد تقی صاحب کی ذہنی استعداد غیر معمولی تھی۔ اس پر ان کے علمی شوق اور مطالعہ نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا۔ دینی اور دنیاوی ہر دو علوم پر عبور رکھتے تھے عربی اُن کے لئے مادری زبان تھی۔ وہ قرآن و حدیث کا مکمل درک رکھتے تھے۔ قرآن مجید کے دس نسخے ان کے میز پر ہمہ وقت موجود رہتے تھے جن سے وہ استفادہ کیا کرتے تھے۔ عبادت گذار، اور پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں لکھی تھیں جن کو قبول عام حاصل ہوا۔ اُن میں سے دو کتابوں پر ہندوستانی حکومت نے شیخ صاحب کو پچیس پچیس ہزار روپے کے انعامات بھی دیئے تھے۔ دہلی یونیورسٹی نے ۱۹۵۵، ۵۶ء میں پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری پیش کی تھی۔ اس تقریب میں ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے بنفس نفیس شرکت کی تھی۔

شیخ محمد تقی صاحب نے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں حصہ لیا تھا۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس دہلی کے جنرل سکریٹری تھے، انھوں نے بڑے بڑے ہندو مسلم زعماء کے شانہ بشانہ کام کیا۔ ۱۹۲۲ء میں جب کانگریس مسلم لیگ اور تحریکِ خلافت نے مشترکہ سودیشی تحریک شروع کی جس میں بدیشی مال کا بائیکاٹ کیا گیا تھا تو شیخ محمد تقی بدیشی سامان کی دکانوں پر پکٹنگ کرنے میں پیش پیش تھے۔ اور تو اور انھوں نے اپنی خاندانی کپڑے کی مارکیٹ جو دہلی کی سب سے بڑی مارکیٹ کٹرہ حاجی قطب الدین چاندنی چوک دہلی پر خود پکٹنگ کر کے مال اور گاہکوں کی آمد و رفت قطعاً بند کرا دی جس کے نتیجہ میں

بڑے بڑے تاجر اور سوداگر مارکیٹ چھوڑ کر چلے گئے اور انھوں نے نہر سعادت خان دہلی پر ایک نئی مارکیٹ میں دکانیں قائم کرلیں جس سے یہ مارکیٹ ہمیشہ کے لیے تباہ ہو کر رہ گئی۔ اس طرح انھوں نے لاکھوں روپے کی آمدنی اپنے ہاتھوں سے اجاڑ دی۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی بہت بڑی اور کامیاب پریکٹس پر ہی لات نہیں ماری بلکہ اپنے اوپر تمام آرام و آرائش بھی حرام کرلی۔

اسی زمانہ میں برٹش عدالتوں کے بائیکاٹ کے بعد عوامی سطح پر ایک پنچایتی بورڈ قائم کیا گیا جس کے ذریعے جملہ ہندو مسلم تنازعات کے فیصلے ہوتے تھے۔ شیخ محمد تقی صاحب دہلی کے اس پنچایتی بورڈ کے سرپنچ تھے۔

۱۹۲۲ء میں بغاوت کے الزام میں تین ممتاز رہنماؤں کو انگریزی حکومت نے گرفتار کر کے ان پر جیل کے اندر مقدمہ چلایا۔ ان میں شیخ محمد تقی ایڈوکیٹ بھی تھے۔ شیخ محمد ابراہیم ڈھلکے والے جو شیخ محمد تقی صاحب کے سگے بھائی تھے۔ اس موقع پر جیل میں موجود تھے انھوں نے اپنے بھائی کی جرأتمندانہ کا چشم دید واقعہ دیکھا۔ وہ انہی کے الفاظوں میں نقل کیا جاتا ہے۔

میں کسی طرح جیل کے اندر جا پہنچا تھا مجھے مقدمہ کی کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جیل کے احاطہ میں برٹش کمشنر کی عدالت لگی ہوئی تھی جس کے روبرو شیخ محمد تقی نے بڑی بیباکی اور جرأت کے ساتھ گرجدار آواز میں اپنا بیان دے رہے تھے۔ انھوں نے بلند آواز میں کمشنر کو مخاطب کر کے کہا۔

انگریزو تمہاری خیر اسی میں ہے کہ جلد از جلد بستر بوریا گول کر کے ہندوستان سے نکل جاؤ۔ تم نے ہمارے وطن میں نفاق اور لوٹ کھسوٹ کا ایک بازار عرصے سے گرم کیا ہوا ہے مگر یہ کھیل اب زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتا تمہیں جلد یا بدیر اس کھیل کو ختم کرنا ہوگا رہ گیا یہ مقدمہ تو میرے نزدیک اس کی حیثیت کسی تماشے سے کم نہیں

ہے تم شوق سے مجھے سزا دو بلکہ پھانسی پر لٹکا دو میں نے جو کلمہ حق کہا ہے اسے میں اس کے بعد بھی بلند کرتا رہوں گا مجھ کو اس سے کوئی روکنے والا نہیں ہے اس لئے میں بد سے بدتر نتائج بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔"

جب شیخ صاحب یہ بیان دے رہے تھے تو بپھرے ہوئے شیر کے مانند لگ رہے تھے جیسے وہ گرج رہا ہو۔ اس مقدمہ میں ان کو ایک سال کی سزائے مشقت سنائی گئی۔ انھوں نے خندہ پیشانی سے اس کو سنا اور قبول کیا جیسا نکاح میں دولہا دلہن کے لئے ایجاب وقبول کرتا ہے۔

شیخ محمدؒ تقی ایک بہادر وجری انسان تھے ان کی بے خوفی اور جرأتمندی کا ایک اور واقعہ شیخ محمدؒ ابراہیم ڈھاکے والوں نے سنایا۔

اقبال اسٹیشن ضلع سہارنپور میں میری ایک شوگر مل تھی۔ جو بہت بڑے علاقہ دس ہزار بیگھا زمین پر تھی۔ ۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے کہ شیخ محمدؒ تقی وہاں میرے پاس قیام کے لئے تشریف لائے ہوئے تھے۔ ایک رات کو تین بجے کے قریب ملحقہ کے زمینوں کے کاشتکاروں میں چیخ وپکار ہوئی تو شیخ محمدؒ تقی اور میں اپنی بندوقیں لیکر اس طرف چل پڑے معلوم ہوا سلطانہ ڈاکو اپنے گروہ کے ہمراہ حملہ آور ہوا ہے اور ایک بڑے ہندو کاشتکار سرجا کی لوٹ مار میں مصروف ہے۔ شیخ محمدؒ تقی صاحب نے ایک ہوائی فیر کیا اور ایک زبردست دھاڑ ماری جس سے وہ علاقہ گونج اٹھا۔ دہشت میں آکر ڈاکوؤں نے اپنے ہاتھ اٹھا دیے۔ ہم ان کو گرفتار کر کے اپنے ڈیرے میں لے آئے۔ سلطانہ ڈاکو نے گرفتاری کے بعد بتایا کہ ہم سمجھے کہ ہمارے پیچھے پیچھے پولیس کی بڑی جمعیت ہے چنانچہ وہ اسی مغالطے میں پکڑے گئے آخر سلطانہ نے اپنی رہائی چاہی اور تابعداری کا یقین دلایا۔ شیخ محمدؒ تقی نے ظلم سے توبہ کرا کے آئندہ اچھی اور نیک زندگی گزارنے کا وعدہ لے کر ان کو رہا کر دیا۔

شیخ محمدؒ تقی صاحب عالی حوصلگی اور دلیری کے بارے میں ان کے بھائی محمدؒ ابراہیم صاحب نے ایک اور واقعہ کا انکشاف کیا۔

دہلی میں بلی ماران سے لال کنوئیں جاتے ہوئے ایک تنگ گلی تھی روزانہ ایک صاحب نوشہ ایک لحیم شحیم اور لمبا تڑنگا شخص گزرا کرتا تھا جس کے ساتھ ایک خونخوار کتا بھی رہتا تھا حکیم اجمل کے گھرانے کا بگڑا ہوا نواب زادہ تھا۔ وہ گلی سے گزرتے ہوئے پردہ دار خواتین سے تاک جھانک اور چھیڑ چھاڑ کرتا تھا ایک دن شیخ صاحب نے اس کی حرکت کو دیکھ لیا۔ جو اُن کے لئے یہ بات قابل برداشت نہیں تھی۔ دیکھنے کے بعد پھر کیا تھا وہیں اس کو ٹھنی دے کر نالی میں گرا دیا اور اس کی خوب دھنائی کی بات حکیم اجمل خاں صاحب تک پہنچی۔ شیخ محمدؒ تقی نے حکیم صاحب کے روبرو تمام معاملہ رکھ دیا۔ اس پر حکیم صاحب نے نوشہ پر لعن طعن کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نوشہ نے دوبارہ اس قسم کی حرکت نہیں کی۔

شیخ محمدؒ تقی صاحب ایک اُونچے اور صاحب حیثیت گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر ان کو روپیہ پیسہ اور مال و متاع کی طمع قطعاً نہیں تھی۔ نہ ہی دولت جمع کرنے کا شوق تھا۔ انھوں نے زندگی بے نیاز انداز سے بسر کی اور ہمیشہ اپنے سر کو بلند رکھا خاندانی جائیداد سے اُنھوں نے اس لئے دست برداری اختیار کر لی۔ عزیز و اقربا میں حق تلفی کا احساس نہ ہو۔ دیانت اور احتیاط اس درجہ تھی جب وہ تحریک آزادی میں گرفتار ہوئے تو ان کی تحویل میں انڈین نیشنل کانگریس کے فنڈ کے چودہ ہزار روپے تھے۔ اس سے قبل کہ پولیس اُن کو گرفتار کرتی وہ حکیم اجمل خاں صاحب کے پاس پہنچے اور یہ رقم ان کے سپرد کر دی۔ کسی کے دریافت کرنے پر کہ اتنی جلدی کیوں تھی جواب دیا۔ اگر میرے پاس یہ امانت رہ گئی یا اِدھر اُدھر ہو گئی، تو پھر بدن سے کٹ کٹ کر

نکلنے گی انجمن وکیل قوم پنجابیان نے برادری کا اسکول قائم کیا۔ ابتداً کچھ عرصے شیخ صاحب اس کے ایڈمنسٹریٹر رہے۔ پاکستان بننے کے بعد کافی مسلمان پاکستان چلے گئے لیکن شیخ صاحب نے یہ کہہ کر دہلی چھوڑنے سے انکار کیا۔ اب بھی لاکھوں اور کروڑوں یہاں موجود ہیں۔ میں ان کو چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں۔ ۱۹۶۲ء میں دہلی میں ہی اُن کا انتقال ہوا۔ اور دہلی میں مدفون ہوئے۔ [۱]

---

[۱] یادِ رفتگاں ص۱۲۲

جناب قاری جلال الدین صاحب دہلوی

قاری جلال الدین صاحب کا سلسلہ نسب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ آپ کا خاندان بندہ بیراگی کے ظلم و ستم سے تنگ آکر دہلی میں گلی چہرے والی نزد کوچہ میر ہاشم میں سکونت پذیر ہوا تھا۔ قاری صاحب نے قاری سبحہ محمد بیگ دہلوی جو قاری عبد الخالق متوفی کے سلسلہ کی ایک کڑی تھے اور دہلی میں بڑی شہرت رکھتے تھے ان سے قاری جلال الدین صاحب نے تجوید و قرأت سیکھی۔ آپ کے عزیز و اقارب محلہ چوڑی والاں دہلی میں بھی رہتے تھے۔ ان سے ملنے کے لئے آپ اس محلہ میں روزانہ آتے تھے۔ اس محلہ میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کا میگزین تھا۔ اس جنگ آزادی کے زمانہ میں قاری جلال الدین اور ان کے عزیز و اقارب بھی اس میگزین کو اسلحہ فراہم کرتے تھے۔ جنگ آزادی ناکام ہو گئی تو انگریزی مخبروں کے سرغنہ تراب علی جو کوچہ میر عاشق چاوڑی بازار دہلی میں رہتے تھے مخبری کر دی کہ قاری جلال الدین جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران بہادر شاہ کو اسلحہ فراہم کرتا تھا۔ جنگ کی ناکامی کے بعد قاری صاحب روپوش ہو گئے۔ جب ملکہ کا اعلان ہوا تو قاری جلال الدین صاحب اپنے گھر کبھی کبھی آتے ہوئے نظر آتے تھے۔

قاری جلال الدین صاحب کی پاپوش کی دکان چتلا گیٹ سے باہر چاوڑی بازار کے جامع مسجد کے جانب نکڑ پر جہاں اب جامعہ ہوٹل ہے جامعہ ہوٹل سے ملحق جہاں کے

پان والے کی دکان ہے وہاں تھی۔

قاری صاحب بڑے قانع اور بے نیاز لوگوں میں تھے۔صبح اٹھتے، نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر وظائف پڑھنے کے بعد دکان جاکر کھولتے ایک دو گاہک آتا جس نمبر کے وہ پاپوش مانگتے ان کو بتا دیتے کہ فلاں جگہ پر رکھی ہوئی اٹھالاؤ پہن کر دیکھ لو، سودا ہو گیا۔ اس سے پیسے لئے دکان بند کی چھتہ شیخ منگو کے قریب مسجد کی ایک دکان میں بابو قصائی کی دکان تھی، اس سے دو آنے کا گوشت لیا۔ موہن بنیئے سے گھی خریدا، گھر پہنچے، خدا کا شکر ادا کیا۔جب وہ پیسے ختم ہو گئے تو جاکر دکان کھول لی۔جب گذر اوقات کے مطابق بکری ہو گئی، دکان بند کر کے گھر جا پہنچے، یہ ان کا ہمیشہ کا معمول تھا۔

ان کے دوستوں میں دہلی کے چوٹی کے نامور حضرات تھے۔جامع مسجد کے امام سید محمدؒ صاحب سے ان کے گہرے تعلقات تھے، وہ بھی قرآن حافظ تھے۔اور یہ دہلی کے مانے ہوئے قاری تھے۔رمضان شریف میں یہ امام سید محمدؒ صاحب کا قرآن مجید سنتے تھے کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا کہ امام سید محمدؒ اُن سے دکان پر یا گھر پر ملنے نہ آتے ہوں۔ ان کی ناغہ ہو جاتی یہ جامع مسجد کے حجرہ میں یا امام صاحب کے گھر تشریف لے جاتے تھے۔

آغا خورشید حسن ایرانی جو بہاڑی املی پر رہتے تھے صحیح النسل ایرانی تھے بڑے اچھے فارسی داں تھے شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔قاری جلال الدین صاحب کے خاص دوستوں میں تھے۔خیالات کے لحاظ سے عجیب و غریب عقائد رکھتے تھے۔قاری صاحب سے اکثر اس سلسلہ میں بحث و تمحیص ہوتی رہتی تھی۔میرے والد ماجد علامہ مولانا شرف الحق صاحب اپنے والد قاری جلال الدین کا ایک خواب بیان کیا کرتے تھے جس کی تصدیق میرے تایا زاد بھائی مظہر نے بھی کی۔انھوں نے بھی وہ خواب بیان کیا۔

دادا مرحوم نے خواب میں دیکھا کہ آقائے نامدار جناب محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جامع مسجد کے حوض پر تشریف فرما ہیں۔آپ ان کے سامنے حاضر ہوئے ہیں تو

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

"جلال الدین خورشید حسن آئے گا تو اس کو نہ آنے دینا"

خواب میں دیکھ رہے ہیں کہ خورشید حسن مکان پر آئے ہیں تو آپ نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا ہے، خواب دیکھنے کے بعد آنکھ کھل گئی، برسوں کے تعلقات تھے منقطع کرنے کا حکم مل گیا تھا۔ سوچ ہی رہے تھے کہ کسی کی کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ دروازہ کھولا تو خورشید حسن کھڑے ہوئے تھے، دادا کو دیکھتے ہی خورشید حسن بولے کیوں بھئی مجھے آنے بھی نہیں دیا منع کر دیا۔ دادا کی آنکھیں نیچی تھیں۔ آپ نے کہا "میں کیا کروں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا۔ یہ نماز فجر سے قبل کا وقت تھا۔ اسی وقت آغا صاحب نے قاری جلال الدین کے دونوں صاحبزادوں، میرے تایا شیخ نظام الدین اور میرے والد ماجد مولانا شرف الحق صاحب کو بلوایا۔ ان کے سامنے اپنے خیالات سے تائب ہوئے اور ان حضرات کو اپنا شاہد بنایا۔

کرامت

پادری ڈیوڈ دہلی میں ۱۸۵۷ء سے قبل کچھ سال چھایا رہا۔ چالاک و طرار پادری تھا۔ اس نے اپنے آبحیات یعنی پانی کی اور خاک شفا مٹی کی بڑی دھوم مچا رکھی تھی جس کو پانی دیتا ہو سکتا ہے کچھ قدرتاً ٹھیک ہو جاتے تھے، اس کا وہ بے حد پروپگنڈہ کرتا اسی طرح خاکِ شفا بھی ۔۔۔ دیتا۔ پچاس میں سے ایک دو قدرتی طور پر تندرست ہو جاتے تو ان کی تندرستی کا پروپگنڈہ اپنے حواریوں سے کراتا تھا چھ سات سال میں تندرستوں کی تعداد پچاس ساٹھ ہو گئی تھی۔ وہ سب تقریباً عیسائی ہو گئے تھے ایک روز پادری ڈیوڈ نے تندرست عیسائیوں کا اپنے ساتھ شہر پر اثر ڈالنے کے لئے گشت کرایا۔ ان تندرستوں میں سب ہندو خاندانوں کے جاہل لوگ تھے جن کے باپ دادا جوتیاں بناتے تھے۔

اس گشت کا شہر کے ہندو مسلمانوں پر کافی اثر ہوا۔ گھر گھر اور دکان دکان چرچا رہا

قاری جلال الدین سے کچھ لوگ واقف تھے جن کو چند سال ہوئے ہیضہ کے وبا کے موقع پر قاری صاحب نے اپنا دم کیا ہوا پانی دیا تھا جس کو خطرناک مریض پی کر فوراً اچھے ہوگئے تھے ایسے لوگوں نے قاری صاحب سے آکر ذکر کیا۔ پادری ڈیوڈ کا اثر بڑھتا جا رہا ہے مسلمان بھی کہیں اثر نہ لے لیں اس کا زور توڑنا چاہیئے۔ اس گفتگو میں مشورہ ہوا کہ قاری جلال الدین پادری ڈیوڈ سے مقابلہ کریں۔ دریبہ کلاں کے سامنے گرجا گھر ہے وہاں مقابلہ کیا جائے۔

چنانچہ قاری صاحب کی طرف سے مقابلہ کرنے اور جگہ کا اعلان ہوا۔ پادری اس تاریخ کو گرجا گھر پہنچ جائے اور اپنی خاکِ شفا اور آبِ حیات پانی کی حقیقت بتائے۔

تاریخ مقررہ پر گرجا گھر کے باہر پادری ڈیوڈ پہنچ گیا تھا۔ اور گرجا گھر کے اردگرد کافی مجمع ہو گیا تھا۔ قاری جلال الدین صاحب نے مقابلہ کی ابتدا کی اور کہا پادری صاحب اس مجمع میں بیماروں کو اپنی آبِ حیات یعنی پانی اور خاکِ شفا دے کر تندرست کر کے دکھائیں۔ پادری اٹھا اور اس نے مجمع میں سے بیماروں کو اپنے پاس بلایا۔ اور یہ دونوں چیزیں ان کو دیں۔ دس بارہ منٹ انتظار کیا گیا کوئی بیمار بھی تندرست نہیں ہوا۔ جب یہ دونوں چیزیں پادری بیماروں کو دے رہا تھا تو قاری صاحب قرآن مجید کی آیات پڑھ کر بیماروں پر دور سے دم کر رہے تھے۔ جب بیماروں کی حالت پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تو پادری صاحب سے قاری جلال الدین نے کہا "تمہارے پاس کوئی اور عمل یا طاقت ہے" پادری نے جواب دیا "میرے پاس کوئی عمل اور طاقت نہیں ہے" تو قاری صاحب نے کہا "اب اسلام کا کرشمہ دیکھو۔" قاری صاحب نے ایک گلاب کا پھول لیا اور اس کو دکھلایا کہ دیکھو اس میں کوئی چیز تو نہیں ہے اس نے پھول کو ٹٹول کر دیکھا تو بتایا اس میں کوئی چیز نہیں ہے، آپ نے اس پھول پر قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھ کر اس کے چہرہ پر پھینکا۔ گلاب کا پھول اس کے چہرہ سے ذرا ہی مَس ہوا تھا کہ پادری کا چہرہ بالکل مسخ ہو گیا۔

ہندو مسلمانوں نے جب اس کا مسخ شدہ چہرہ دیکھا تو اللہ اکبر اور بجرنگ بلی کے نعرے لگائے ان نعروں سے دہلی ہل گئی۔ کچھ لوگوں نے شیشہ لا کر پادری کو دکھایا وہ کھڑا ہوا تھا بیٹھ گیا اور مجمع میں چھپ چھپا کر ایسا غائب ہوا کہ دہلی والوں نے دوبارہ اس کی شکل نہیں دیکھی۔

اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ دہلی میں پادری ڈیوڈ نے جتنے عیسائی بنائے تھے وہ سب قاری جلال الدین کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہو گئے [۱]

آخر عمر میں قاری صاحب تجارت کرنے کے لئے حیدر آباد دکن چلے گئے تھے۔ وہیں مقیم ہو گئے تھے اور ان کا انتقال حیدر آباد میں ہی ۱۸۹۱ء کو ہوا خاموش شاہ کی درگاہ کے قریب ان کا مزار ہے [۲]

قاری صاحب کی شادی کرامت النساء بنت شیخ رحیم الدین صاحب سے ہوئی جن سے پانچ صاحبزادے شیخ نظام الدین صدیقی، مولانا شرف الحق صدیقی شیخ برکت اللہ صدیقی، شیخ حشمت اللہ صدیقی اور شیخ غلام اولیاء صدیقی اور ایک صاحبزادی رحمت النساء زوجہ صوفی و حافظ خلیل احمد صاحب ہوئیں۔

---

[۱] روزنامچہ مولانا شرف الحق صاحب۔
[۲] دہلی صدیقی برادری کی شخصیتیں ص ۸

خان بہادر شیخ حبیب الرحمٰن

شیخ صاحب جناب شیخ عطاء الرحمٰن صاحب سگرٹ والوں کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ دہلی میں ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اس کے بعد عربک ہائی اسکول دہلی میں زیر تعلیم رہے جہاں سے میٹرک پاس کیا میٹرک کے بعد شیخ صاحب نے اعلیٰ تعلیم عربک کالج اور سینٹ اسٹیفنس کالج سے مکمل کی اس کے علاوہ بیرون ملک کی کسی یونیورسٹی سے انجینئرنگ کا ڈپلومہ بھی حاصل کیا۔

اینگلو عربک ہائی اسکول اور اینگلو عربک کالج دہلی ہندوستان کے قدیم اور تاریخ ساز ادارے تھے۔ نذیر احمد، مدیر احمد اور شمس العلماء مولانا آزاد، شمس العلماء ذکاء اللہ جیسی ممتاز و معروف شخصیتوں نے ان اداروں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دئے۔ ہندوستان کے فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس اور مشہور قانون داں سر شاہ محمد سلیمان ان اداروں کی مجلسِ انتظامیہ کے چیئرمین رہے ہیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح عربک کالج کی سالانہ تقاریب کے مواقع پر پابندی کے ساتھ اپنی شرکت کا اعزاز بخشتے تھے چنانچہ کالج کے طلباء تمام سال بے چینی کے ساتھ ان کی شرکت اور خطابت کا انتظار کرتے تھے، ملّا واحدی اپنی تصنیف "میرے زمانہ کی دہلی" میں تحریر کرتے ہیں۔

"آخری نصف صدی میں جتنے مسلمان دہلی کے اپنی ذہانت طباعی کی وجہ سے

اینگلو عربک ہائی اسکول مرہونِ منت ہیں، اُن میں سے ایک خان بہادر حبیب الرحمٰن بھی ہیں۔"

۳۲، ۱۹۳۱ء سے نوجوانی کے عالم میں حبیب الرحمٰن صاحب نے سماجی، تعلیمی اور رفاہی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں ان کی ذہانت، لیاقت اور انتظامی صلاحیت سے متاثر ہو کر حکومت نے آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا اور اس کے بعد ان کو متعدد سرکاری، نیم سرکاری، سماجی، تعلیمی اور انتظامی اداروں اور کمیٹیوں کا رکن نامزد کیا۔ انھوں نے ان کے فرائض ذمہ داری کے ساتھ احسن طریقہ پر انجام دیے۔ انھوں نے تمام کاموں میں مسلمانوں اور عوام کی فلاح و بہبود کو خصوصاً ملحوظ رکھا۔ ان کے احساس ذمہ داری اور تندہی سے متاثر ہو کر حکومت نے ان کے آنریری مجسٹریٹ کے اختیارات میں اضافہ کر دیا۔

۱۹۳۵ء میں حبیب الرحمٰن صاحب میونسپل کمیٹی دہلی ممبر منتخب ہوئے۔

۳۰ جون ۱۹۳۸ء کو وہ دہلی کے جونیئر وائس پریزیڈنٹ ہو گئے اور ۱۹۴۲ء میں ان کو او۔ بی۔ ای کا بھی خطاب ملا۔ ۴۴-۱۹۴۳ء میں حکومتِ برطانیہ نے شیخ صاحب کو ہندوستان کی لیجسلیٹو اسمبلی کا ممبر نامزد کر دیا۔ تقسیم ملک تک آپ اسمبلی کے نامزد رکن کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ملا واحدی صاحب نے اپنی کتاب "میرے زمانہ کی دہلی" میں جگہ جگہ شیخ کا ذکر بڑے جوش و والہانہ انداز میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"ممبرانِ میونسپل کمیٹی پیچ پیچ حساب کے سوال اور جواب کی طرح پبلک کے نمائندہ ہوں یا نہ ہوں لیکن ممبروں میں ایک دو ممبر ایسے ضرور آ جاتے تھے جو کم از کم باقی ممبروں کی نمائندگی یا لیڈری کر سکتے تھے۔ دہلی کی حکومت نے اسی قابلیت کے ممبروں پر ہاتھ دھر دیا۔ انگریزوں کی غالباً سارے ملک میں یہی پالیسی ہوگی کہ جس کا تعاون حاصل کیا جائے اس میں تھوڑی بہت جان ہونی چاہیے ہمیں نہ پھونکنی پڑے۔ چنانچہ حکومتِ دہلی نے

دو آدمی ایسے انتخاب کئے کہ واقعی جاندار تھے، حکومت نے ان کی سرپرستی نہیں کی۔

ایک سر سری رام۔ اور دوسرے خان بہادر حبیب الرحمٰن۔ سر سری رام پہلے میونسپل
کمشنر تھے جن کا حکومت دہلی نے تعاون حاصل کیا۔ اور خان بہادر حبیب الرحمٰن آنریری۔
یہ دونوں غیر معمولی دماغ کے انسان ہیں۔ سر سری رام میونسپل کمیٹی کے جونیئر وائس پریذیڈنٹ
تھے اور سر عبدالرحمٰن سینئر وائس پریذیڈنٹ لیکن میونسپل کمیٹی پر حکومت سری رام کی تھی۔
اسی طرح خان بہادر حبیب الرحمٰن جونیئر وائس پریذیڈنٹ تھے جب سر شنکر لال سینئر وائس
پریذیڈنٹ ہو گئے تو مسٹر لالی بیلی جیسا زبردست انگریز پریذیڈنٹ میونسپل کمیٹی
شیخ صاحب کی نگاہیں دیکھا کرتا تھا۔ میرے سامنے بارہا ایسا ہوا کہ لالی بیلی صاحب
میونسپل کمیٹی کی سب سے اہم کمیٹی فائننس کمیٹی کی صدارت کر رہے ہیں کسی ممبر نے ان کی
رائے سے اختلاف کیا۔ تو وہ تھوڑی دیر ممبر سے الجھا کرتے تھے بالآخر شیخ صاحب سے پوچھتے
کہ آپ کی کیا رائے ہے۔ شیخ صاحب نے جواب دیا کہ ممبر حق بجانب ہے تو لالی بیلی صاحب
جو دلی کے ڈپٹی کمشنر بھی تھے بتاشے کی طرح بیٹھ جاتے تھے۔ پریذیڈنٹ کو شیخ صاحب
کی بے لوثی، ایمانداری اور دانشمندی پر اس قدر اعتماد و بھروسہ تھا کہ پریذیڈنٹ
اپنے وائس پریذیڈنٹ کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا تھا۔ شیخ صاحب نے ایسی مقبولیت
حاصل کی کہ بالآخر ہندو مسلمان ممبران کمیٹی نے ڈپٹی کمشنر کے بجائے شیخ صاحب کو
کمیٹی کا صدر منتخب کر لیا۔ ان سے پہلے دہلی کے کسی ہندو یا مسلمان کو یہ عزت
نہیں ملی تھی۔ انگریز اس انسان کی قدر کرتے تھے جس کے پاس طاقت ہو۔
شیخ صاحب کے پاس بے لوثی، ایمانداری اور دانشمندی کے ساتھ پبلک نمائندگی
کی طاقت تھی خان بہادر ہونا معمولی اعزاز تھا۔ دہلی میونسپل کمیٹی کا ہر جونیئر وائس
پریذیڈنٹ خان بہادر یا رائے بہادر بنا دیا جاتا تھا۔ شیخ حبیب الرحمٰن کو
حکومت نے او۔ بی۔ ای کا خطاب دیا اور سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی کا ممبر نامزد کیا۔ حکام

اس طبقہ کا یہ آخری مسلمان عوامی نمائندہ حکیم اجمل کے سوا ماسبق تمام ہندو مسلمان لکم دیسوں سے بازی لے گیا۔ مسلمانوں کا چراغ دہلی میں گل ہونے والا تھا۔ شیخ حبیب الرحمن نے اس چراغ کی آخری بھڑک دکھادی۔"

مُلّا واحدی صاحب اپنی دوسری تصنیف "تاثرات" میں لکھتے ہیں:۔

"دہلی میونسپل کمیٹی میں ہندوؤں سے مسلمان کم ہونے کے باوجود مسلمانوں کا دہلی میونسپل کمیٹی میں غلبہ تھا ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں کی چلتی تھی۔ علم و دولت کے اعتبار سے بھی مسلمان ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ مسلمان ممتاز ممبروں میں کوئی ایم، اے، بی اے نہیں تھا۔ ایس، ایم عبداللہ، حاجی رشید احمد، حافظ محمد صدیق ملتانی اور شیخ حبیب الرحمن چار ممتاز ممبر تھے۔ صرف حبیب الرحمن نے کالج کی شکل دیکھی تھی چاروں معمولی تعلیم یافتہ مسلمان اتنے مدبر تھے کہ دہلی کلاتھ ملز کے مالک سر شری رام اور ان کے والد لالہ مدن لال اور برلا ملز کے جنرل منیجر مسٹر منزیلیا اور مدن موہن مالوی کا بھتیجا لالہ دیش بندھ گپتا اور پروفیسر رام سنگھ جو آج کل صوبہ دہلی کی ہندو سبھا کے کرتا دھرتا ہیں اور دوسرے ایم اے، بی اے اور ایل، ایل بی ہندو ان کا لحاظ کرتے تھے اور ان کی بات مانتے تھے۔ ان کے برتاؤ ان کی خوش معاملگی اور ان کی سوجھ بوجھ سے ساری کمیٹی میں ان کا ڈنکا بجتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ کاروباری دماغ، سیاسی کام وکیلوں اور بیرسٹروں سے بہتر انجام دے سکتے ہیں۔ کاروبار کرنے والوں کو معاملات سنبھالنے کی عادت پڑجاتی ہے۔"

"ایم ایس عبداللہ، حاجی رشید احمد، حافظ محمد صدیق ملتانی، شیخ حبیب الرحمن چاروں خان بہادر تھے بلکہ حاجی رشید احمد اور حبیب الرحمن او، بی، ای تھے لیکن کیسے او، بی، ای ڈپٹی کمشنر جو دہلی میونسپل کمیٹی کا صدر ہوا کرتا تھا اس کا منہ تکنے والے نہیں بلکہ انگریز ڈپٹی کمشنر ان کا منہ تکتا تھا۔"

"انگریز پریذیڈنٹ نے سکریٹری میونسپل کمیٹی کو حکم دیا کہ نوٹس جاری کر دو کہ کچھ مشورہ کرنا ہے سب ممبران فلاں فلاں وقت میری کوٹھی پر آجائیں۔ خان بہادر حبیب الرحمٰن وائس پریذیڈنٹ تھے، پریذیڈنٹ نے ان کو بتایا کہ میں یہ نوٹس جاری کر رہا ہوں جب نوٹس جاری ہوا۔ تو حبیب الرحمٰن نے بھی سب ممبروں کو اسی دن اسی وقت کا بلاوا بھیج دیا۔ ہندو مسلمان سب ممبر شیخ حبیب الرحمٰن صاحب کے ہاں پہنچ گئے پریذیڈنٹ کے ہاں ایک بھی نہیں گیا آخر ڈپٹی کمشنر نے معافی مانگی کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی"۔

"۱۹۴۱ء میں طے پایا کہ آئندہ ڈپٹی کمشنر دہلی میونسپل کمیٹی کا پریذیڈنٹ نہیں بنایا جائے گا۔ ہندو مسلمان سب ممبروں نے متفقہ طور پر خان بہادر حبیب الرحمٰن صاحب کو پہلا ہندوستانی صدر چنا۔ خان بہادر کے خطاب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انگریز کے خوشامدی ہوں گے لیکن ان کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے"۔ [1]

خان بہادر حبیب الرحمٰن کی گورنر پنجاب مسٹر جیکسن سے بڑی دوستی تھی، وہ ان پر بے انتہا اعتماد کرتا تھا۔ دہلی میں خان بہادر حبیب الرحمٰن کا اتنا اثر اور رسوخ تھا۔ عبدالمتین صاحب لکھتے ہیں کہ میرے والد صاحب نے بتایا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ کشمیری گیٹ پر اپنی جائیداد بنوا رہے تھے سمنٹ پر پابندی تھی لیکن خان بہادر حبیب الرحمٰن کی وجہ سے برابر سمنٹ کی سپلائی جاری تھی اتفاق سے ایک روز جس ٹرک میں بھرے ہوئے وہاں سمنٹ آرہا تھا اس ٹرک کے نیچے عین تھانے کے سامنے ایک آدمی مارا گیا پولیس نے ٹرک والے کو پکڑ لیا اور پوچھا سمنٹ کہاں لے جا رہا ہے

---

[1] تاثرات۔

جب اس نے بتایا کہ خان بہادر حبیب الرحمٰن کی بہن کی جائیداد پر لے جا رہا ہوں
تو پولیس والے نے کہا کہ پہلے سمنٹ کا ٹرک وہاں پر جاکر خالی کراؤ۔ ساتھ میں
اس ڈرائیور کے ایک پولیس والا بھی گیا۔ پھر جب ٹرک آیا تو اس کا چالان کیا
گیا اس دوران ایک اور واقعہ بھی والد صاحب نے بتایا کہ جنگ کی وجہ سے
گورنمنٹ کو جس جائیداد کی ضرورت ہوتی وہ حاصل کر لیتی تھی۔ اس سلسلہ میں
خاص آرڈیننس جاری کیا گیا تھا۔ لیکن خان بہادر کی وجہ سے نہ صرف ہماری
بلکہ برادری کے کئی دیگر افراد کی جائیدادیں بچ گئیں جبکہ ہم اس طبقہ میں خان
بہادر حبیب الرحمٰن جیسا اقتدار کسی اور ہندوستانی کو بھی میسر نہ آیا۔

۱۹۴۷ء میں حبیب الرحمٰن صاحب نے دہلی چھوڑ دی اور پاکستان چلے گئے
اس وقت بھی ان میں اتنی قوت تھی کہ انھوں نے اپنے سامنے اپنے ہندو
اپنے دوست ڈاکٹر یدھ ویر سنگھ کو میونسپل کمیٹی کی صدارت کی کرسی دلوا دی تھی۔

حبیب الرحمٰن صاحب نے دہلی میں پنجابی برادری کی پہلی کنونشن ۱۹۴۴ء
میں کی وہ استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے آپ نے اس میں بڑا معرکۃ الآرا خطبہ
استقبالیہ پڑھا تھا۔

شیخ حبیب الرحمٰن صاحب انتہائی ذہین، معاملہ فہم اور دور اندیش
تھے، وہ بہت اچھے منتظم بھی تھے۔ انھوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں سے
کام لیتے ہوئے دہلی میونسپل کمیٹی کی کایا پلٹ کر دی تھی جس کا ہر کس و ناکس معترف
تھا۔ وہ اپنے والد ماجد شیخ عطاء الرحمٰن کی طرح انتہائی مخیر تھے۔ اور بہت
خاموشی اور بلا نام و نمود کے بیواؤں، طلباء اور ضرورت مندوں کی امداد کرتے
تھے۔ شیخ صاحب بڑے وضعدار انسان تھے وہ رکھ رکھاؤ، آداب و سلیقہ
کے سخت پابند تھے، وہ اپنی خوش پوشی اور اعلیٰ ذوق کے لئے بہت مشہور

تھے ہر بات میں نفاست کا خیال رکھتے تھے بے حد متواضع تھے اور احباب کی خاطر مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے اس میں ان کی وہ بندوق بھی تھی جس سے وہ اپنی نوجوانی کے زمانہ میں شکار کیا کرتے تھے آپ اچھے شکاری اور نشانہ باز تھے ہر عید و بقر عید کو وہ اپنے احباب کو پارٹی پر مدعو کرتے تھے۔ یہ طریقہ انھوں نے جو اختیار کیا تھا وہ تا حیات جاری رہا۔ ایک رجسٹر میں احباب کے نام درج تھے جن کو ہر سال پابندی کے ساتھ دعوت نامہ بھیجا جاتا تھا۔ اگر کوئی شخص ایک دو بار شرکت نہ کرتا تو اس کا نام رجسٹر سے کاٹ دیا جاتا تھا۔ شیخ صاحب ہر ایک دوست پر نگاہ رکھتے تھے جو شرکت نہ کرتا وہ ان کی نگاہ سے رہتا تھا۔

برادری کے سماجی و تعلیمی مسائل سے ان کو خاص دلچسپی تھی۔ اس سلسلہ میں جب کبھی کوئی ذمہ داری ان پر ڈالی گئی۔ اسے انھوں نے پوری دلچسپی اور انہماک سے ادا کیا۔

کراچی آنے کے بعد شیخ حبیب الرحمٰن سیاست سے بالکل کنارہ کش ہو گئے تھے اور تمام توجہ اپنے کاروبار پر لگا دی تھی۔ کراچی میں انھوں نے انگریزی ادویہ تیار کرنے کی ایک بڑی فیکٹری لگائی تھی۔ اس کا انھوں نے "اتیکو لیبارٹریز" نام رکھا تھا لیکن افسوس کہ اس عظیم الشان فیکٹری جس کا افتتاح وزیر اعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین نے کیا تھا بعد میں بھٹو کے دور میں شیخ محمد رشید کی طفلانہ "مجرک منصوبہ" کی بھینٹ چڑھ گئی اس کے علاوہ آپ نے "اتیکو اینڈ سٹریز" کے نام الہ دین سیل بھی تیار کیا جس نے بڑی شہرت اور نام پیدا کیا تھا۔

۱۹۶۷ء میں کراچی میں برادری کا جو کل پاکستان کنونشن منعقد ہوا اس کے اوّلین اجلاس کی صدارت شیخ حبیب الرحمٰن صاحب نے فرمائی تھی۔ ان کی رفاہی و سماجی خدمات بھی وسیع تھیں۔ آپ نے جامعہ ملیہ میں پانی کا ایک کنواں تعمیر کرایا تھا۔

جس پر اُن کا نام کندہ ہے۔ علاوہ ازیں نو ہزار روپے جامعہ ملیہ کو بطور عطیہ دیئے تھے۔ آپ نے دہلی کالونی گزری میں جمعیت کے تحت قائم کیے جانے والے اسکول میں ایک کمرہ کی تعمیر بھی کرائی تھی۔ اس پر ان کے نام کی تختی نصب ہے۔

افسوس صد افسوس یہ آفتاب جہاں تاب ۲۲ جولائی ۱۹۷۲ء کو غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون [1]

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

شیخ حبیب الرحمٰن صاحب بڑے وسیع الاخلاق، وسیع النظر انسان تھے۔ بڑی سے بڑی مخالفت کو بڑی خوش اسلوبی سے برداشت کرتے تھے۔ ایک حرف بھی شکایت کا کسی سے نہیں کہتے تھے۔ دہلی کے نوجوانوں نے دہلی کی سرکاری میونسپل کمیٹی کے خلاف اصلاح میونسپل کمیٹی ۱۹۳۷ء میں قائم کی تھی اس نے میونسپل کمیٹی کی بدعنوانیوں اور غلط اقدامات کے خلاف جلوس نکالے جلسے کیے پوسٹر دہلی کی در و دیوار پر چسپاں کرائے۔ میونسپل کمیٹی کی وزیٹرز گیلری سے گندے ٹماٹر اور سڑے ہوئے انڈے سرکاری ممبران پر پھینکے۔ غرض کہ جو کچھ نہ ہونا چاہیے تھا وہ دس سال ۱۹۴۷ء تک ہوا۔ دہلی میونسپل کمیٹی کے یورپین ڈپٹی کمشنر کی مخالفت میں ایک ایجی ٹیشن شروع کیا گیا۔ ایک میٹنگ سے قبل سرکاری ممبران کو اغوا کیا گیا جس کی وجہ سے سرکاری ممبران کی تعداد کم رہ گئی اور وہ میٹنگ بالآخر ملتوی کرنی پڑی اور یہ ایجی ٹیشن کامیاب ہوا۔ ۱۹۴۶ء میں ایک ہندوستانی ممبر میونسپل کمیٹی دہلی کا صدر منتخب ہوا حقیقت یہ ہے کہ شیخ حبیب الرحمٰن کا ہی دل گردہ تھا جو انھوں نے دس سال تک ہماری مخالفت کو برداشت کیا اس اصلاح میونسپل کمیٹی کا صدر راقم الحروف امداد صابری تھا۔

---

[1] یادِ رفتگاں میں یہ مضمون تلا واحدی اور عبدالمتین صدیقی کا مرتبہ شائع ہوا جس سے اخذ کیا گیا صفحہ ۲۷۸

جس کا تخریبی و شرارتی دماغ اسی میں لگا رہتا تھا اللہ تعالیٰ مجھ کو معاف فرمائیں۔

جب میں اٹھارہ سال کے بعد ۱۹۶۷ء میں کراچی پہنچا، دوستوں اور علمی قدردانوں نے دعوتیں کرنی شروع کیں۔ اپنے اداروں میں تبادلۂ خیال کرنے کے لئے بلوایا تو میری آمد کی اطلاع شیخ حبیب الرحمٰن صاحب کو مل گئی۔ انھوں نے فوراً مجھ کو کہلوایا کہ فلاں تاریخ اور فلاں وقت میرے ہاں آپ کی دعوت ہے اس میں آپ کو آنا ہے۔ اس دعوت میں مُلّا واحدی صاحب، علّامہ رازق الخیری، علّامہ ابوالبیان آزاد، عبداللہ شمیم ایڈیٹر چنگاری، مولانا حامد علی قریشی مہتمم انجمن حمایت الاسلام، حافظ منظر احمد صدیقی جنرل بوٹ ہاؤس والے وغیرہ شریک ہوئے۔ شیخ حبیب الرحمٰن مجھ سے بڑے تپاک سے ملے۔ دہلی کے حالات پوچھتے رہے۔ دوران گفتگو انھوں نے کہا۔ آپ جس طرح دہلی میں بے باکی کے ساتھ دہلی کے عوام کی ترجمانی کر رہے ہیں وہ قابلِ قدر ہے۔ اخبارات میں آپ کے متعلق جو خبریں شائع ہوتی ہیں اُن کو پڑھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔ یہ بات مُلّا واحدی نے بھی سُنی تو انھوں نے فرمایا شیخ صاحب فرماتے تھے۔

"ہم لوگ دہلی چھوڑ کر چلے آئے لیکن ان لوگوں نے دہلی والوں کی لاج رکھ لی"۔

حقیقت یہ ہے کہ شیخ حبیب الرحمٰن دہلی والے تھے۔ دہلی والوں کا بڑی سے بڑی مخالفت کو نظر انداز کرنا معمولی بات ہے۔ چنانچہ شیخ صاحب نے بھی ایسا ہی کیا دورانِ گفتگو پچھلی باتوں کا کوئی بھی ذکر نہیں کیا۔

مُلّا واحدی صاحب نے شیخ حبیب الرحمٰن کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ حرف بہ حرف بالکل درست ہے۔ حاجی رشید احمد اور شیخ حبیب الرحمٰن نے نڈر ہو کر دہلی کے عوام کے لئے بھلائی کے جو کام کئے ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ وہ باتیں اب عنقا بن گئی ہیں۔ حاجی رشید احمد زندہ باد۔ شیخ حبیب الرحمٰن زندہ باد۔ یہ نعرے اُن کے لئے دہلی میں رہتی دنیا تک لگیں گے اور گونجتے رہیں گے۔

سید حیدر رضا دہلوی

سید حیدر رضا دہلی کے رہنے والے تھے۔ اُن کے آباو اجداد بھی دہلی کے باشندے تھے۔ سید حیدر رضا دہلی کالج سے تعلیم پانے کے بعد سینٹ اسٹیفن کالج میں داخل ہوئے۔ ایم اے کی تعلیم پا رہے تھے کہ ۱۹۰۶ء میں دہلی میں کوئی سیاسی و ادبی زندگی نہیں تھی۔ ادیب لوگ اور دوسرا اعلیٰ طبقہ حکومت کی قصیدہ خوانی کرنے کے بجائے کوئی کام جانتا نہیں تھا۔ سید صاحب نے دہلی والوں کے جذبات کی ترجمانی کا کام انجام دینے کے لئے قدم اٹھایا اور ایک جماعت بنائی جس میں شہر کے وکیل ایک دو ڈاکٹر اور دہلی کے شہری معزز ادیب شامل ہو گئے ان میں کے خاص نام یہ تھے لالہ شنکر ناتھ، ایم اے بیرسٹر لالہ کشن دیال وکیل جو لالہ ہردیال کے بھائی تھے، لالہ امیر چند جنہوں نے لارڈ کرزن پر بم دہلی کی چاندنی چوک میں پھینکا تھا اور اس کی پاداش میں پھانسی پائی تھی ڈاکٹر جی کے متراء لالہ شیو نرائن، عبدالرحمٰن وکیل لالہ چند و لال جاتوں والے بابا چندر بھائی کیفی وغیرہ

اس جماعت کے بانی در اصل میں دو حضرات تھے۔ سید حیدر رضا نے بھی ایک ہفتہ وار اخبار ۱۹۰۷ء میں دہلی سے نکالا تھا اس کے مالک و ایڈیٹر سید صاحب ہی تھے۔ کانگریس پریس دہلی میں چھپتا تھا۔ سالانہ چندہ تین روپیہ تھا۔ یہ اخبار ہندوستان کے محب وطن و حق گو اخباروں میں تھا۔ حکومت برطانیہ کی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے جاری ہوا تھا اس کی صلح کل پالیسی تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کو ملک کی آزادی کے لئے ضروری

جھتا تھا۔ اس اخبار کو پڑھنے کے لئے لوگ بے چین رہتے تھے اور بڑے شوق و چاہت سے پڑھتے تھے۔ رسالہ منزل امرتسر نے اپنے دسمبر ۱۹۰۷ء کے شمارے میں آفتاب دہلی پر حسبِ ذیل تبصرہ کیا تھا۔

سید حیدر رضا کا آفتاب ایسے وقت نمودار ہوا جب کہ پولیٹیکل مطلع پر گرد و غبار چھایا تھا یہ ذرا بلند ہوا اور کرنیں کچھ تیز ہوئی تھیں کہ شور و فساد کی تیز و تند آندھیوں سے پنجاب میں خصوصاً کالی رات کا آسمان دکھائی دینے لگا۔ اس وقت کئی ہم عصروں نے ٹھوکریں کھائیں اور کئی آپس میں ٹکرا گئے مگر سید حیدر رضا کے قدم نہ لڑکھڑائے اور نہ آفتاب کی آب و تاب میں کوئی فرق آیا۔ اس نے بہ نظرِ انصاف بلا خوف ہر معاملہ پر خوب روشنی ڈالی۔ لالہ جپت رائے کی جلا وطنی پر جہاں ہندو اخبارات تک خاموش تھے۔ آفتاب نے اپنی دل سوزی کا پورا پورا ثبوت دیا۔ نیلی چھتری کے معاملہ میں سید صاحب نے جس گرمی سے ایجی ٹیشن کیا اور دھواں دھار تقریریں کیں وہ ان کی روشن خیالی کی بیّن دلیل ہے۔ یہ آفتاب ہی کی روشن ضمیری ہے کہ وہ جس قدر سے اسلامی پیشواؤں کو دیکھتا ہے اسی نظر سے اہلِ ہنود کو مشاہیر کو دیکھتا ہے اور انھیں ہمارے رشی منی کہہ کر پکارتا ہے اور باوجود اس انقلابِ عظیم اس کی آزادی اور صلح کل پالیسی میں کوئی فرق نہیں آیا۔"

سید حیدر رضا کی ہر نقل و حرکت پر حکومت کی نگاہ رہتی تھی چنانچہ ان کی عدم موجودگی میں اخبار آفتاب میں پرنٹر سید حیدر رضا کا نام چھپا رہ گیا، اس جرم کی پاداش میں جج نے ان پر دو سو روپے کا جرمانہ اور عدم ادائیگی کی شکل میں تین ماہ کی سزا دی تھی۔ اس انتقامی کارروائی پر رسالہ زبان دہلی نے اپریل ۱۹۰۸ء کے شمارے میں نکتہ چینی کی ہے۔

ہمارے شہر کے معزز محبِ وطن فنا فی القوم سید حیدر رضا صاحب پر بھی گورنمنٹ کے اعلیٰ روشن دماغ جج نے مبلغ دو سو روپے جرمانہ اس جرم میں ٹھونک دیا۔ آپ کا

عدم موجودگی میں جو پرچہ آفتاب ہفتہ وار کانگریس پریس میں چھپا تھا اس پر شائع کنندہ کا نام نہ تھا کیا خوب کتنا بڑا جرم ہے اور کیا معقول سزا ہے، اس سزا کے مقابلے میں جب ہم ان جرائم کبیرہ کا خیال کرتے ہیں جن میں باوجود فحش حرکات کے بھی فقط دس دس پانچ پانچ روپے جرمانہ ہی کافی سمجھا جاتا ہے تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہم یہ سوچتے ہیں کہ یہ محض سہو ہی تھا جرم کی حد تک بھی نہیں پہنچتا۔ اس پر اتنی بڑی سزا اور لطف یہ کہ عدم ادائیگی کی صورت میں تین ماہ کی قید کیا خوب نعم البدل ہے۔ ہم اس موقع پر یاد دلائے بغیر نہیں رہ سکتے کہ قوانین اخلاق کی رو سے اس قسم کی سزا سزا نہیں ہے بلکہ ایک قسم کا عوض ہے جو مہذب قوم کو ہرگز شایانِ شان نہیں ہے۔ اس اخبار کی عمر سال ڈیڑھ سال سے زیادہ نہیں ہوئی لیکن اخبار آفتاب وہ کام کر گیا جس کو تاریخ صحافت فراموش نہیں کر سکتی۔

سید حیدر رضا ایک طرف اپنی قلم سے اور دوسری طرف اپنی زبان سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ آزادی کی تحریک میں حصہ لے رہے تھے۔ ماسٹر امیر چند اور سید حیدر رضا نے دہلی میں جب یہ دیکھا کہ دہلی کی بجلی کمپنی کے چلانے والے انگریز ہیں اور اسی کے انتظام کے تحت دہلی کی ٹریموے بھی چل رہی ہے اور بجلی اور ٹریموے کا معقول انتظام نہیں ہے ٹریموے چھکڑا چلائی جا رہی ہے۔ قدم قدم پر رک جاتی ہے اس کو کمپنی ٹھیک کرنے کا نام نہیں لیتی تو ان دونوں حضرات نے ٹریموے کا ایک دن کا بائیکاٹ کیا جس میں دہلی والوں نے بھرپور ساتھ دیا۔ اور ٹریموے میں سوار نہیں ہوئے۔

مسٹر بال گنگا دھر تلک اور مسٹر گوپال کرشن گوکھلے کا زمانہ تھا جب کانگریس میں آٹھ سات مسلمان تھے جن میں دہلی کے سید حیدر رضا صاحب بھی تھے اس وقت کانگریس میں مسلمانوں کا کوئی اثر و رسوخ نہیں تھا لیکن سید حیدر رضا صاحب کا زور بندھ گیا تھا۔ دہلی کے خصوصی مسلمان ان کے ایسے گرویدہ ہو گئے تھے، بقول ملّا واحدی صاحب

اتنی گرویدگی اور مسلمان لیڈروں کے ساتھ میں نے پہلے کبھی دیکھی اور نہ بعد میں دیکھی۔

چیف کمشنر اور ڈپٹی کمشنر دہلی کی صدارت میں خان بہادروں اور رائے بہادروں کے جلسے ہو رہے ہوتے اور سید حیدر رضا آ جاتے تو حاضرین جلسہ ایک ایک کر کے سرکاری جلسے سے اُٹھ جاتے تھے اور حیدر رضا صاحب کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ سرکاری جلسہ برخاست کرنا پڑتا تھا۔ سرکاری میز کرسیوں پر سید حیدر رضا صاحب کا قبضہ ہو جاتا تھا اور وہ ٹھاٹھ سے اپنا جلسہ کرتے۔

ایسے تماشے حیدر رضا بہت دکھاتے تھے۔ ایک دفعہ اعلان کیا گیا کہ فلاں وقت بیگم کے باغ میں فلاں جگہ جناب سید حیدر رضا صاحب تقریر فرمائیں گے حکومت نے دفعہ ۱۴۴ لگا دی مگر لوگ پھر بھی پہنچ گئے۔ اور جناب سید حیدر رضا صاحب بھی آ گئے، سید حیدر رضا صاحب جلسہ میں رُکے نہیں۔ منہ اُٹھائے بڑھتے چلے گئے۔ لوگ اُن کے پیچھے پیچھے ہو لئے اور راستہ میں جس نے یہ ہجوم اور بھیڑ دیکھی وہ بھی ساتھ چل پڑا۔ جلسہ میں پانچ ہزار کا مجمع تھا اب وہ دس ہزار کا مجمع ہو گیا۔

جناب سید صاحب نے جمنا کے پُل کی طرف رُخ کیا اور مجمع کو لے کر پُل پار کر گئے۔ اُس وقت پُل کے دوسری جانب دہلی کے حدود نہیں تھے یو پی کے حدود تھیں۔ ہاں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ نہیں تھا وہاں پہنچ کر سید حیدر رضا صاحب نے تقریر شروع کی اور دل کی خوب بھڑاس نکالی اور دفعہ ۱۴۴ کا خوب مذاق اُڑایا اور پبلک کی ہمت کی داد دی کہ تم لوگ میرے ساتھ اتنے دُور پیدل چلے آئے۔

جب سید حیدر رضا صاحب کی جوشیلی اور جذبات سے بھری ہوئی تیز تقریریں دہلی شہر کے مقامات پر ہونے لگیں اور سی آئی ڈی زیادہ آنے لگی اور اُن کی تقریروں نے جب سیاسی رنگ لینا شروع کر دیا تو ان کی جماعت میں لالہ شنکر ناتھ، بابا چندر بھان کیفی اور لالہ چندو لال کے علاوہ سب علیحدہ ہو گئے۔

۱۹۰۸ء میں جب ان پر مقدمہ چلایا گیا تو ماسٹر امیر چند کے علاوہ ان کے ساتھ کوئی نہ تھا یہ تنہا ہی رہ گئے اور ہر ایک ساتھی نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری وہی جوشیلی اور جذبات سے بھرپور تقریریں جاری رکھیں، ذرا سی جنبش نہیں کھائی۔

۱۹۰۸ء تک جناب سید حیدر رضا صاحب نے اتنی مقبولیت و شہرت حاصل کر لی تھی کہ سورت کے سالانہ کانگریس کے اجلاس میں ان کا شاندار استقبال ہوا تھا ۱۹۰۷ء میں لالہ لاجپت رائے اور سردار اجیت سنگھ کے جلا وطن ہونے پر پنجاب میں کافی سیاسی بیداری پھیل گئی تھی اور لوگوں میں بے حد جوش پیدا ہو گیا تھا اس جلا وطنی کا دہلی پر بھی اثر پڑا لوگوں میں بدیسی حکومت کے خلاف ایک آگ سی لگ گئی تھی۔ اب دہلی میں جلسے ہوتے تو بڑی تعداد میں لوگ اس میں شامل ہوتے اور اپنے رہنماؤں کی توجہ کے ساتھ تقریریں سنتے لیکن دہلی میں مقررین میں ماسٹر امیر چند اور جناب سید حیدر رضا صاحب کے علاوہ کوئی نہیں رہا۔

۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۸ء تک دہلی میں جلسوں کا بازار گرم رہا۔ ماسٹر امیر چند کی تقریروں کی چہل پہل اور اس میں کیفی صاحب کی نظموں کی تاثیر نے دہلی میں لوگوں میں ایک کیف پیدا ہو گیا تھا۔ سید حیدر رضا صاحب کی تقریریں طلسم ہوشربا اور بوستانِ خیال کے رنگ میں رنگی ہوئی تھیں اور یہی حال ان کی تحریر کا تھا۔ سید حیدر رضا صاحب کے نام اور مقامات سے بہت سے دعوت نامے آتے تھے وہ پونہ اور ناگپور بھی تشریف لے گئے جہاں ان کی ساحرانہ تقریریں ہوئیں۔

جناب سید حیدر رضا صاحب کے چچا تحصیل دار تھے۔ انھوں نے اپنی لڑکی سے نسبت کر دی تھی، اور اپنے خرچ پر بیرسٹری پڑھنے کے لئے انگلستان بھیج دیا تھا۔ ان کے ساتھ مسٹر آصف علی اور مسٹر رؤف علی بیرسٹری کے لئے گئے

تھے۔ رؤف صاحب نے واپس آکر بیرسٹری شروع کردی تھی۔ مسٹر آصف علی صاحب واپس ہوئے تو سیاست میں دلچسپی لینی شروع کردی۔ سید حیدر رضا صاحب نے لندن میں ایک دولت مند عورت سے شادی رچائی اور اٹھارہ برس دہلی کو بھلائے رکھا۔ جب وہ عورت مرگئی تو دہلی تشریف لائے تو اُس وقت رئیس الاحرار حضرت مولانا محمد علی جوہر کا دور دورہ تھا۔ ان کے سامنے ان کا چراغ نہ جلا اور حیدرآباد دکن چلے گئے۔ وہاں کے کسی ضلع میں پریکٹس شروع کی اور وہیں فوت ہوئے۔

پنڈت دھرم نرائن

پنڈت دھرم نرائن ابن پنڈت بشن نرائن دہلی کالج کے شعبۂ انگریزی کے سینیئر سکالر تھے اور ان کا کالج کے نہایت قابل اور ذہین طلبا میں شمار ہوتا تھا۔ پولیٹیکل اکونومی (معاشیات) کا ترجمہ انھوں نے اردو میں کیا تھا نیز حصۂ تاریخ انگلستان کا بھی ترجمہ کیا۔ دونوں کتابیں، اس زمانے میں سوسائٹی نے چھاپی تھیں۔ اخبار قرآن السعدین دہلی سے ۱۸۴۵ء کو ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا جس کے پہلے ایڈیٹر پنڈت دھرم نرائن مقرر ہوئے۔ محب ہند، فوائد الناظرین، قرآن السعدین اور تحفۃ الحدائق دہلی کے اساتذہ کے اہتمام میں شائع ہوتے تھے۔ اور ان کے مضامین کی نگرانی کالج کی ایک کمیٹی کرتی تھی۔ ان اخباروں کی اشاعت سے پہلے تمام چھپنے والے مضامین کے جو حصے ان لوگوں کو قابل اعتراض معلوم ہوتے تھے۔ ان کو حذف کرنے کا ان کو اختیار حاصل تھا۔ طباعت کے بعد قرآن السعدین کی ایک ایک کاپی مقامی کمیٹی کے جائنٹ سکریٹری مسٹر ٹیلر کو بھی بھیجی جاتی تھی یہ حضرات ان کا بغور مطالعہ کرتے تھے قرآن السعدین کے بانی تو دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر سپرنگر صاحب تھے جنھوں نے اس اخبار کے متعلق یہ فرمایا تھا۔

"۱۸۴۵ء میں میں نے دہلی میں پینی میگزین کی طرز پر ایک باتصویر رسالہ کی بنیاد ڈالی اس کا نام قرآن السعدین تھا گویا مشرق و مغرب، مشتری اور زہرہ

تھے جن کا قرآن اس رسالے میں ہوا تو یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ اس کی تقلید میں بارہ سے زیادہ رسالے نکل رہے تھے میرے نزدیک میری کاکی کا یہ بہترین ثمرہ ہے کہ جن لوگوں کے نفع کے لئے میں نے جدوجہد کی تھی اس کو اس سے ایسی تشویش ہوئی کہ وہ نمونے سے بہتر چیزیں بنانے لگے جو ان کے لئے اور ان کے ملک کے لئے مفید ہوں گی۔"

اخبار قرآن السعدین بلند ترین معیار کا حامل تھا اس کے مضامین بڑے دقیع و تاریخی و معلوماتی ہوتے تھے اس کا مقصد اپنے ہم وطنوں کو یورپین علم و ادب سے روشناس کرانا اور تعلیم کی طرف توجہ دلانا تھا اس کا طرزِ تحریر دلکش اور دلپسند تھا۔ اور عمدگی و قابلیت کے ساتھ عام ذہنوں کو ترتیب دیتا تھا۔

اس اخبار میں جو مضامین شائع ہوتے تھے اس اخبار کی حیثیت کا اندازہ چند حسبِ ذیل مضامین کے عنوانات سے ہو سکتا ہے:۔

(۱) کاہلی اور سستی ہندوستانیوں کی تمام امور میں جن سے رفاہِ عام مقصود ہے اور جو مفید ہند ہو۔

(۲) حال حکیم سقراط یونانی (۳) علم جغرافیہ کے فوائد میں، ۲۷ نومبر ۱۸۴۸ء

(۴) ثبوت وجود دیکھ کے بارے میں ۱۳ نومبر ۱۸۴۸ء (۵) خیالات ایک شخص جو بجائے خود یہ فکر کرتا ہے کہ مذہب میں کونسی باتوں کا معتقد ہو۔ ۱۶ اکتوبر ۱۸۴۸ء۔

(۶) حال ملکہ الزبتھ۔ ۲ اکتوبر ۱۸۴۸ء (۷) حال شہنشاہ قسطنطین اعظم کا ۲۶ اگست ۱۸۴۸ء۔ (۸) اکبر بادشاہ کا بندوبست۔ ۲۷ اگست ۱۸۴۸ء۔

(۹) ہندوؤں میں علوم و فنون کی ترقی نہیں ہوتی۔ ۲۴ اگست ۱۸۴۸ء۔

(۱۰) خلاصہ تاریخ ہندوستان اور محمود غزنوی۔ ۲۴ اپریل ۱۸۴۸ء (۱۱) تاریخ ملتان۔ ۸ مئی ۱۸۴۸ء

قرآن السعدین کی ادارت کے بعد مالوہ اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور اندور اسکول کے ہیڈ ماسٹری کرکے بھی فرائض انجام دیے۔ ۱۸۵۲ء میں مالوہ اخبار کی ایڈیٹری کی ذمہ داری سے سبکدوش ہوئے اندور کے میر منشی بنے رائے بہادری کے خطاب سے سرفراز ہوئے سرسید احمد خاں کی سائنٹفک سوسائٹی کے لئے ملکی پولیٹکل اکانومی کا انتخاب سیاست مدنی کے نام سے کیا جس کو سائنٹفک سوسائٹی نے ہی طبع کرایا [1]

اخبار قرآن السعدین کی مہتممی کے زمانہ میں پنڈت جی کو ایک نقصان ہوا تھا۔ ان کے خانگی زیورات چوری ہو گئے تھے جسے حاصل کرنے کے لئے مالی برآمد کچھ دینا بھی طے کیا تھا۔ چنانچہ اس مضمون کا اشتہار انھوں نے ۱۲ دسمبر ۱۸۴۸ء کے قرآن السعدین میں شائع کرایا تھا۔

دوسری تاریخ ماہ حال کو شام کے وقت کہ اس دن یوم شنبہ تھا۔ میرا ہر قسم زیورات تعدادی تخمیناً ایک ہزار چھ سو پچانوے روپیہ کا چوری گیا ہے۔ اس واسطے اشتہار دیا جاتا ہے کہ جو شخص کل مال کو برآمد کرائے گا اس کو میں علاوہ کمیشن کے جو سرکار کی طرف سے مقرر ہے دو سو روپے زیادہ بطور حق الخدمت کے دوں گا۔ اور اگر مال برآمد ہوگا تو حساب بالا کے بموجب جو کچھ حساب سے نکلے گا دیا جائے گا۔

مولوی کریم الدین صاحب مؤلف طبقات الشعراء بھی دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ اس وجہ سے پنڈت دھرم نرائن صاحب سے بخوبی واقف تھے۔ اس لئے انھوں نے طبقات الشعراء میں ان کا ذکر کیا ہے۔

---

[1] مرحوم دہلی کالج ص ۱

پنڈت دھرم نرائن ابن کشن نرائن بہت خلیق اور باادب، عقلمند، ہوشیار، چالاک، تیز اور ذہین آدمی ہے۔ اس نے کئی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔ ایک پولیٹیکل اکانومی کا اُردو میں اور کچھ تاریخ ہندوستان کا کیا ہے وہ دونوں چھپ گئی ہیں درمیان ۱۸۴۷ء کے اُنکی عمر ۲۲، ۲۳ برس کی ہے۔

نگارسان دتاسی نے بھی اُن کا ذکر اپنے خطبہ میں مالوے اخبار کے ساتھ کیا ہے: اندور کا اخبار جو مالوہ کا دارالحکومت ہے مالوہ اخبار ہے۔ یہ آٹھ صفحوں کا ہفتہ واری ہے۔ اس کے ایک کالم میں اُردو اور دوسرے میں ہندی ہوتی ہے اس کے ایڈیٹر دھرم نرائن ہیں جن کی چھبیس ستائیس برس کی ہوگی۔ یہ بہت اچھے شاعر ہیں اور انھوں نے مل کی پولیٹیکل اکانومی معاشیات اور انگلستان کی ایک تاریخ کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ (خطبہ ۲۹ نومبر ۱۹۵۲ء) [1]

---

[1] اُردو کے اخبار نویس صہ ۱۲۸۔

جناب حافظ رحمت اللہ صاحب

حافظ رحمت اللہ صاحب کے والد ماجد کا نام عبد اللہ تھا۔ آپ ڈھائی سال کے تھے کہ آپ کے والد فوت ہو گئے تھے ہوش سنبھالا تو اپنی والدہ ہی کو دیکھا ان کے خالو نے ان کی پرورش کی اور ہر قسم کی دیکھ بھال کی انھوں نے ہی جن کا نام فخر الدین تھا۔ فخر الدین صاحب ہی اپنے بھائی کی صاحبزادی سے حافظ صاحب کی شادی کرائی ناظرہ قرآن مجید خالو صاحب نے پڑھایا پھر اپنے ذوق و شوق سے لکھنا پڑھنا سیکھا اور خود ہی قرآن مجید حفظ کیا۔

پہلے قصے کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کا شوق ہوا اور کافی قصے کہانیوں کی کتابیں جمع کر لیں۔ جب احساس ہوا کہ ان کتابوں کے پڑھنے سے وقت ضائع ہوتا ہے اور گناہ بھی ہوتا ہے تو پوری کتابوں کو جلانے کا ارادہ کیا۔ والدہ نے کہا جب! بیٹے بجائے ان کتابوں کو فروخت کر دو تو آپ نے والدہ کو جواب دیا کہ چند پیسوں کے خاطر لوگ کیوں گناہ میں شامل ہوں اور اس کی وجہ سے میں بھی گنہگار رہوں تو اس کو جلانا ہی بہتر ہوگا۔ یہ جواب سنکر ان کی والدہ صاحبہ بہت خوش ہوئیں اور ان کتابوں کی جلانے کی اجازت دیدی چنانچہ انھوں نے ان سب کتابوں کو نذر آتش کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے دینی کتابیں دیکھنی شروع کر دیں۔ کافی کتابیں دیکھنے کے بعد متفرق قرآن مجید کے تراجم دیکھے۔ پھر تفسیریں پڑھنی شروع کر دیں تو ذوق شوق

پڑھاتا چلا گیا تو احادیث کے تراجم کا مطالعہ کیا۔ تو کافی معلومات حاصل ہوگئی۔ اُردو اور عربی کا خط بہت عمدہ تھا یہ بھی بلا استاد کے سیکھا تھا، پہلے حنفی مسلک کے تھے بعد میں اہلِ حدیث کا مسلک اختیار کر لیا۔ نئی سڑک حوض والی مسجد میں نماز پڑھتے مولانا احمد اللہ صاحب محدث دارالحدیث رحمانیہ کے مشورہ پر عمل کیا اور آپ نے پھاٹک حبش خاں میں مدرسہ سبیل السلام میں جن کو حاجی محمد عمر یانا والے چلا رہے تھے پڑھانے لگے اس کے بعد مدرسہ دارالہدیٰ اہلِ حدیث کشن گنج میں پڑھانا شروع کر دیا۔ اس مدرسہ میں دونوں طرف قرآن پاک کی تعلیم ہوتی تھی۔ ایک طرف قرآن پاک کی تعلیم جس کی دیکھ بھال حافظ حمید اللہ صاحب کرتے تھے۔ دوسری طرف قرآن مجید کی دیکھ بھال حافظ محمد اسحاق صاحب کرتے تھے

حافظ رحمت اللہ نے قرآن مجید کی خدمت پچاس برس کی آپ کے بہت سے شاگرد ہیں جس میں حنفی بھی ہیں اور اہلِ حدیث بھی۔ آپ نرم مزاج تھے کسی شاگرد سے عقیدہ کے بارے میں سختی تو کیا بلکہ کبھی تذکرہ بھی نہ کرتے تھے کہ تم حنفی ہو یا اہلِ حدیث۔ آپ کے شاگرد لاتعداد پاکستان و ہندوستان میں موجود ہیں۔ ایک صاحب اپنی حمائل پر نشان لگوا کر جرمنی لے گئے تھے۔ حافظ صاحب نے ایسی ایسی غلطیاں بتائیں وہ کہتے تھے کہ میں اس حمائل کو تیس برس سے پڑھتا ہوں اب پتہ چلا کہ تیس برس سے غلط پڑھتا رہا۔ اس طویل عرصہ کے بعد حافظ رحمت اللہ صاحب کے بتانے پر پتہ چلا کہ صحیح الفاظ یہ ہیں :۔

حافظ رحمت اللہ صاحب کو پہلوانی کا بہت شوق تھا۔ اندر لنگر باندھ کر، نیچا جانگیہ پہن کر گھنٹوں ڈنڈ اور بیٹھکیاں لگاتے تھے اور کشتی بھی لڑتے تھے۔ مدرسہ دارالہدیٰ میں ایک نوجوان پٹھان طالب آیا۔ وہ سب طلباء کا کھانا موقع دیکھ کر کھا جاتا تھا۔ بڑا قیم وشحیم، سرخ وسفید اور طاقت ور تھا بیچارے طالب علم اس سے پریشان

ایک روز آکر حافظ صاحب سے چھیڑ خانی کی اور ہاتھ ملایا۔ حافظ صاحب نے وہی پسکی لگائی۔ دھڑام سے خان صاحب فرش پر آگرے اب کیا تھا غصہ بھڑک گیا چاقو کھول کر سامنے آگیا۔ حافظ صاحب نے اس کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ اس کے بعد خان صاحب نے حافظ صاحب کے پیر پکڑ لئے اور معافی مانگی۔ اور درخواست کی ہم کو بھی داؤں پیچ سکھائیں۔ حافظ صاحب نے خان صاحب کو بلی اور شیر کا واقعہ سنایا۔ ایک بلی نے شیر کو داؤں پیچ سکھائے۔ ایک روز شیر نے بلی کو پکڑنا چاہا تو بلی درخت پر چڑھ گئی شیر نے بلی سے کہا خالہ آپ نے یہ داؤں مجھے نہیں سکھایا۔ بلی نے شیر کو جواب دیا کہ جانجے اگر میں تم کو یہ بھی داؤں سکھا دیتی تو تم کب مجھ کو چھوڑتے۔ حافظ صاحب نے کہا۔ آپ کو سب کچھ سکھا دیا جائے گا لیکن گرگا داؤں نہیں سکھایا جائے گا۔ بخیر سکھائے تم نے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔

ایک دفعہ جامع مسجد میں مولانا عبدالحمید نعمانی صاحب کچھ بیان کرنے کے لئے آئے۔ اُن کے ساتھ حافظ رحیم الدین صاحب بھی تھے لوگ نعمانی صاحب کی تقریر سننا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی کسی سیاسی بات پر ناراض تھے، لوگ ان کی تقریر کرنے پر معترض ہوئے۔ حافظ رحیم الدین صاحب نے لوگوں سے کہا آپ اُن کی باتیں تو سن لیں، اگر ان کی بات غلط ہو تو اس کا جواب دے دیجئے گا۔ حافظ صاحب نے حافظ رحیم الدین صاحب سے مخاطب ہو کر جواب دیا کہ امام نماز میں غلطی کرتا ہے تو فوراً ٹوک دیا جاتا ہے اگر انھوں نے کوئی بات غلط کی تو فوراً ٹوک دیا جائے گا۔ حافظ رحیم الدین نے کہا وہاں نہ ٹوکنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ حافظ صاحب نے فرمایا کہ یہاں نہ بتلانے سے خیال فاسد ہو جائے گا۔

حافظ رحمت اللہ صاحب کو حاضر جوابی کا خداداد ملکہ حاصل تھا چنا نچہ گیسٹ میں ایک روز پنڈت جی مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ اگر تمہارا خدا قدرت والا ہے

تو اپنے جیسا ایک اور خدا بنا سکتا ہے یا نہیں۔ بے چارے بھولے بھالے لڑکوں کو جواب بن نہیں پڑتا تھا۔ اس وقت حافظ جی بھی آ گئے۔ پنڈت جی کا اعتراض سنا فرمایا کہ ہاں پنڈت جی خدا اپنا جیسا بھی خدا بنا سکتا ہے لیکن یہ تو فرمائیے وہ خدا ہی کہاں ہوا وہ تو مخلوق ہی رہا۔ خدا وہ ہے جو خود ہو بنا ہوا اور گھڑا ہوا خدا نہیں ہوتا۔ پنڈت جی یہ جواب سنکر اوس پڑ گئی اور ان کا بنا ہوا محل گر پڑا۔ حافظ صاحب کی پہلی اہلیہ محترمہ کا انتقال ۱۹۲۴ء میں ہو گیا تھا، ان سے اٹھارہ بچے پیدا ہوئے جن میں حافظ نعمت اللہ صاحب بچے۔ دوسرا نکاح ۱۹۲۴ء میں ہوا جس سے تین لڑکیاں اور ایک لڑکا پیدا ہوا۔ حافظ نعمت اللہ صاحب نے شادی نہیں کی چاوڑی بازار میں بنیان فروخت کر کے گذر اوقات کرتے ہیں۔ حافظ رحمت اللہ کے نواسے نے اعلیٰ تعلیم پا کر ماشاء اللہ ترقی کی انکم ٹیکس کے آفس میں ایک آفیسر کی حیثیت سے شیر از ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔

راقم الحروف امداد صابری بھی حافظ رحمت اللہ صاحب کا شاگرد ہے۔ میں نے اُن سے قرآن مجید حفظ کیا۔ بچپن میں میں کھنہ چوڑی والان سے کشن گنج مدرسہ دار الہدیٰ میں قرآن مجید پڑھنے جاتا تھا۔ وہ ڈیڑھ سال میں پورا کیا، حافظ صاحب اپنے شاگردوں کو بڑے پیار و محبت سے پڑھاتے تھے۔ بچوں کو مارتے کم تھے۔ کوئی بچہ سبق یاد نہیں کرتا بار بار کہنے پر بھی نہیں پڑھتا تو گوشمالی کر دیا کرتے تھے۔ اور اُستادوں کی طرح نہیں کہ ذرا ذرا سی بات پر دُھن دیتے تھے۔ حافظ صاحب کا رعب ہم بچوں پر کافی تھا۔ حافظ صاحب نے مجھ کو تو دو ڈھائی سال کے عرصہ میں کبھی نہیں مارا۔ ہاں شرارت کرنے پر ڈانٹ ڈپٹ ضرور کر دیا کرتے تھے۔

حافظ رحمت اللہ صاحب چتلا گیٹ میں رہتے تھے جو میرے گھر کے قریب ہے۔ حافظ صاحب شام کو چھٹی کے بعد جب اپنے گھر آتے تو اکثر مجھ کو ساتھ لاتے تھے حافظ صاحب کے صاحبزادے حافظ نعمت اللہ نے میرے ساتھ قرآن مجید حفظ کیا تھا۔

حافظ رحمت اللہ صاحب کی ایک ادا مجھ کو بہت پسند آئی ۔ وہ غربت میں مست رہتے تھے ۔ مدرسہ دارالحدیث کے منتظمین ان کو جو کچھ دیتے تھے اس پر صبر و شکر کر کے گزر اوقات کرتے تھے اور استادوں کی طرح کبھی بچوں کو تنگ نہیں کیا کہ وہ ان کو اپنے والدین سے لا کر دیں بلکہ صبح کے وقت جو غریب بچے بغیر ناشتہ کے گھر پر چلے آتے تھے اُن کو ناشتہ کراتے تھے ، اور اُن کا ہر طریقے سے خیال کرتے تھے ۔ عید پر ان کے کپڑے بھی بنا دیا کرتے تھے ۔

حافظ رحمت اللہ صاحب کا انتقال کافی عرصہ ہو گیا ۔ لیکن ان کی باتیں اس طرح یاد آتی ہیں جیسے آج ہوئی ہوں ۔ وہ اہل حدیث مسلک کے ضرور تھے لیکن اس کا اظہار انھوں نے کبھی کسی سے نہیں کیا ۔ نہ مسلک کی حمایت میں کسی سے انھوں نے بحث کی ۔ میں امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہ کے مسلک کو پسند کرتا ہوں اور بہت سے میرے ہم جماعت حنفی تھے ۔ حافظ صاحب نے اپنے شاگردوں میں کوئی امتیاز نہیں برتا ۔ اُن کے شاگرد ایسے بھی تھے کہ ان کے والدین کا دہلی کے رؤسا میں شمار ہوتا تھا ۔ حافظ صاحب کی توجہ رؤسا کے بچوں پر نہیں ہوتی تھی بلکہ غریب بچوں پر زیادہ توجہ دیتے تھے ۔ حافظ صاحب ہر امام کا احترام کرتے تھے ، احترام کے ساتھ اُن کا نام لیتے تھے ۔

اُستاد رسا دہلوی

اُستاد رسا دہلوی کے حالاتِ زندگی پر دو مضمون ہم نے اخبار پرتاب دہلی مورخہ ۲۱ر اکتوبر ۱۹۷۶ء خان غازی کابلی کا اور دوسرا مضمون ارضِ وطن دہلی مورخہ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۷۶ء اے آر کاردار کے کٹنگ کاٹ کر رکھ لئے تھے یہ دونوں مضمون اس کتاب میں نقل کئے جاتے ہیں۔ خان غازی کابلی والا مضمون یہ ہے:۔

جہاں آباد (دہلی) کے آخری شاعر —— اور —— "میخانۂ درد" کے مے نوش۔

—— حکیم سید رفیق احمد رسا دہلوی ۸ر اکتوبر ۱۹۷۶ء کو "عدم آباد" کے سفر پر روانہ ہوکر وہاں پہنچ گئے۔ جہاں آخر کار اس "سرائے فانی" کے ہر مہمان کو پہنچنا ہے ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو سب تیار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

اُستاد رفیق رسا دہلوی بلاشبہ "جہاں آباد" کے آخری بادہ نوش اور درویش صفت شخصیت تھے۔ اُن کے اٹھ جانے سے نہ صرف "میخانۂ درد" کے درد دیار اور ساغر و شمیم جیسے بولتے ہوئے بے شمار خم و ساغر اُداس ہیں بلکہ اُردو بازار کے "دستوران" اور "اُردو معلی" کی رنگین اور پُربہار محفلیں بھی ویران سے ویران ہوگئی ہیں ؎

ویران ہے میکدہ خم و ساغر اُداس ہیں
وہ کیا گئے کہ رُوٹھ گئے دن بہار کے

"اُستاد رسا قد و قامت عمر اور اُردو کی خدمت کے سلسلے میں بالکل "غنی عبد الغفور"
تھے۔ برق و رعد کی طرح کڑک دار، گرجدار اور خیر بار و گلبار زبان منہ میں رکھتے تھے
جب کسی محفل میں "شرر بار و شرر افشاں" ہوتے تھے تو ایسا گماں ہوتا تھا کہ "وسیلی
کھنڈ" کے "روہیلے افغان" پانی پت کے میدان میں "شمشیر و سناں" کے کرتب دکھا رہے
اور اس بات کا ثبوت پیش کر رہے ہیں ع

"جرأت و سرکشی و جہل بہ افغاں دادند"

یا علامہ اقبالؔ کے "غلام قادر خاں روہیلے" "لال قلعہ میں" "نشاۃ عالم" سے باز پرس
کر رہے ہیں کہ تم نے ہندوستانیوں سے پوچھے بغیر "کمینی بہادر" کو دیوانی کے حقوق کیوں
سونپے؟ ـــــ دوسری طرف اُستاد رسا کی یہی زبان جب گل بار و گل افشاں ہوتی
تھی تو کابل و یغمان اور روست کے چمنستانوں کے ایسے پھول کھلاتی تھی کہ جن کی
"خوشبو شعراء" کے دل اور دماغ مہک جاتے تھے نئی شوق سے سرشار ہو کر مجازی حسن کے
پیکر سر بزم اُستاد کے گلے کا ہار بن کر نظر آنے لگتے تھے ـــــ "امیر مینائی" کا قول
ہے :۔

"سینے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوئے" "لیکن کسی شخص کے سینے میں
درد دل ہوں یا نہ ہوں "اُستاد رسا دہلوی" کے منہ میں تو یقیناً "شرر افشاں" اور
"گل افشاں" نام کی دو زبانیں تھیں اور بالکل اسی طرح جس طرح مولانا عبد المجید
سالک جو "اُستاد رسا" کے ہم تخلص اُستاد رسا رامپوری کے شاگرد رشید تھے۔ دو زبانوں
کے مالک تھے۔ مولانا سالک زبان قلم سے "سیف" کا کام بھی لیا کرتے تھے اور "افکار
و حوادث" کے مقتل میں "احراری غازیوں" کے سر بھی قلم کرتے تھے۔ "زبان گوشت
سے دم گفتار ایسے شیریں سخن تھے کہ اُن کی زبان سے ہنگالی رس گھلنے رسا کرتے تھے
کسی محفل میں غزل سرا ہوتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ہندوستانی اُستاد

داغ ۱۸۵۷ء کے غدار شاعروں سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں کہ ؎

فلک کو پڑا ابھی دل جلوں سے کام نہیں
جلا کر خاک نہ کر دوں تو داغ نام نہیں

اُستاد رسا دہلوی اور مولانا عبدالمجید سالک میں یہ خصوصیت بھی مشترک تھی کہ دونوں "طاقِ دیر و حرم" میں یکساں طور پر جگمگاتے تھے۔ یعنی اُستاد رسا کٹر قسم کے نیشنلسٹ ہونے کے باوجود "بتانِ مسلم لیگ" سے عشق بازی کی پینگیں بڑھانے کو عار نہیں سمجھتے تھے۔ اور مولانا سالک کٹر "مسلم لیگی" اور "قادیانی" ہونے کے باوجود "غازی" جیسے "احراریوں" اور "مہاشہ کرشن" جیسے "آریہ سماجیوں" سے بھی ربط و تعلق رکھتے تھے۔ گویا دونوں غازی کے اس شعر کے مصداق تھے ؎

دیر و حرم کو ناز نہیں اس چراغ پر
یکساں جو طاقِ دیر و حرم میں نہ جل سکے

اُستاد رسا دہلوی چونکہ ہر سال "یوم بیخود" کے مشاعرے کے انعقاد کے "گناہ" کے مرتکب ہوتے تھے۔ اس لئے یار لوگوں اور بعض "بیخودیوں" نے انہیں بیخود دہلوی کا شاگرد مشہور کیا تھا۔ حالانکہ اُستاد رسا ہر رنگ میں "بیخود" سے بالکل مختلف اور متضاد تھے۔ اس سلسلے میں ایک دن "غازی" نے ان سے دریافت کیا تو ماتھے پر بَل ڈال کر اپنے خاص انداز میں یوں شرر فشاں و گل افشاں ہوئے۔

"قدرت نے مجھے پیدائشی اُستاد پیدا کیا ہے۔ میرا شمار "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" میں ہے۔ رہی "بیخود" کی بات تو دہلی میں میرے دم سے ہی "بیخود" کے اُستادی کے پرچم لہرا رہے ہیں۔ میرے بعد "بیخود" کا نام کوئی لینے کی جرأت و ہمت نہ کرے گا"

مختصر یہ کہ اُستاد رسا دہلوی خود ہی اُستاد بھی تھے اور شاگرد بھی اور اپنی ذات میں خود ہی ایک چلتی پھرتی انجمن بھی ؎

بے آدمی جلائے تو دا ایک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

جہاں دوسرے شعراء اُردو نماز اور روزے کے معاملے میں شرابی اور لا ابالی قسم کے ہوا کرتے ہیں وہاں اُستاد رسا نماز اور روزے کے نہایت ہی پابند تھے۔ اور مرنے سے کچھ عرصہ پہلے تو دربار کلیم اللہ میں بھی صبح و شام حاضری دینے لگے تھے۔ اور تسبیح و مالا پھیرنے کا شغل بھی کر لیا تھا۔ تمام عمر مجرد رہے۔ اور اپنی بیوہ بہن کے بچوں کی پرورش کرتے رہے۔ اکبر الہ آبادی کا قول ہے۔ ع

کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

لیکن اُستاد رسا کی عمر بھٹیار خانوں میں گذری اور عدم آباد کے سفر پر .... حاجی ہوٹل سے روانہ ہوئے۔ انہیں کھانے کو جو روکھا سوکھا مل جاتا تھا کھا لیتے تھے۔ اور خدا کا شکر کرتے تھے۔ مگر کھانے کے بعد چنگ اور برفی کا ٹکڑا ضرور کھاتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ یہ خاندانی ہند اُستاذ وقی کی سنت ہے۔

مشاعرے میں اُستاد کے پڑھنے کا انداز بھی بے حد دلچسپ تھا تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ اور پڑھتے وقت بالکل "میر سوز" کی طرح سراپا مجسم غزل بن جاتے تھے۔ اور داد کے تحفے کچھ اس انداز سے وصول کرتے تھے کہ بعض اوقات داد دینے والے کے گلے میں جھولا جھولنے لگ جاتے تھے۔ سر بزم ان کے ہونہار قسم کے قدرداں جب بلند آواز میں مطالبہ کرتے کہ اُستاد غزل کے ساتھ کچھ گالیاں بھی عنایت کیجئے کیونکہ آپ کی لطیف غزل کثافت کے بغیر جلوہ پیدا کرنے سے قاصر ہے اس پر اُستاد ایسی ٹکسالی گالیاں دیتے کہ نا آشنائے راز و نیاز کانوں میں انگلیوں کے ساتھ روئی بھی ٹھونس لیتے تھے۔ لیکن امیر و شمیم آدرد اسلم و سلیم اور محبت کے گستاخ نوجوان اُستاد زندہ باد کے جیکاروں سے مشاعرے کو گونجا

دیتے تھے مشاعرے کے خاتمے پر یہ گستاخ محبت بے زاد قسم کے نوجوان اُستاد سے یُوں شکوہ طراز ہوتے کہ۔ "استاد آج آپ نے ہمیں ایسی گندی بے نقط گالیاں دی ہیں اور ہماری توہین کی ہے کہ ہمارا جی چاہتا ہے کہ آپ کو کاٹ کر دو ٹکڑے کر دیں۔ اس پر اُستاد گردن جھکا کر کہتے ع

"یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے"

اور اُن کے سروں پر شفقت کا ہاتھ پھیر کر اور اُن کی پیشانی کو بوسہ دے کر فرماتے ۔۔۔ عزیزو! ؎

ہم نے تو تم کو چاہ کے یوسف بنا دیا
اب کیا رقیب تم کو پیمبر بنائیں گے

اس پر یہ نوجوان پھولوں کی طرح کھلکھلا کر ہنسنے لگتے۔ اور اُستاد کو "ظہیر ریستوران" کھینچ کر لے جاتے اور دیر تک "بادہ چائے" کے دور چلتے رہتے۔

۱۹۶۳ء کے آغاز میں اُستاد رسار اچانک دہلی سے غائب ہو گئے تو "دلی کی اوراق مصور گلیاں" بالکل سُونی ہو گئیں اور آغا امیر اور شمیم جیسے اُستاد کے بے شمار قدردان اُن کے فراق میں چاک گریباں نظر آنے لگے۔ آخر امیر الحق عرف آچاریہ کربلائی نے جو اُستاد کے پُرانے عشاق میں سے ہیں یہ انکشاف کیا کہ اُستاد کراچی میں گلگشت کر رہے ہیں۔ اسی تعازی نے ذیل کی غزل نما نظم "جنگ" کراچی کو بھیجی:۔

امتحاں گاہِ دل اہلِ وفا تک پہنچے
کافر ہند بھی دربارِ خدا تک پہنچے
جادۂ خیر کی ہے قافلے والوں کی تلاش
راہ زن سلسلۂ راہ نما تک پہنچے
طائرانِ چمنِ درِ خدا کی قدرت

اُڑ کے دلی سے کراچی کی فضا تک پہنچے

یاد آتے نہیں شاید اُنھیں اب اپنے رفیق
ورنہ کیوں بیداد و جفا تک پہنچے

پھر تے ہیں صورتِ مسکیں آسیر اور تبسم
ترے مکتوب جو اک شوخ ادا تک پہنچے

اُن سے ملنے کی تمنا بھی ہے جُز و ایمان
جن کی گالی کا بھی انداز دُعا تک پہنچے

مل گیا بت کا سہارا تو فقیہانِ حرم
ناخدا ڈھونڈھنے نکلے تو خدا تک پہنچے

اپنی زلفوں میں چھپائے انھیں اے جانِ ضیا
وہ اندھیرے جو ترے رُخ کی ضیا تک پہنچے

منتظر دیر سے دلی میں ہیں یارانِ وطن
کاش غازی کا یہ پیغام رسا تک پہنچے

جنگ کراچی میں اس نظم کی اشاعت کے بعد اُستاد رسا کا ایک مکتوب غازی کے نام اس مضمون کا آیا کہ میں حیران ہوں کہ یہ نظم لکھ کر آپ نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے یا آپ نے پاکستانیوں پر یہ ظاہر کیا ہے کہ اُستاد رسا بھی غازی کے دوستوں میں سے ہیں۔ اور پاکستان کے مخالف پختونستان کے پُرجوش حامی ہیں۔ یاد رہے کہ پاکستانی توپ و تفنگ سے نہیں ڈرتے مگر غازی کے نام سے گھبراتے ہیں —
غازی ابھی خط کا جواب لکھنے ہی والے تھے کہ اُستاد شوق کے پَر لگا کر کراچی سے اُڑے اور دہلی پہنچ گئے۔

اُستاد رفیق رسا دہلوی سے بہت سی یادیں دل و دماغ کے جھروکوں میں

پھڑپھڑا رہی ہیں اور مطالبہ کر رہی ہیں کہ ہمیں سپردِ قلم کر کے رُسوائی کا شرف بخشو لیکن صفحات کی تنگ دامانی اجازت نہیں دیتی۔ اس لئے ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے

۱۹۶۴ء میں ایک دن جب غازی اپنے دوست جنرل محمد عمر خاں کو الوداع کرنے گئے تھے تو اُستاد رسا بھی ساتھ تھے۔ دورانِ گفتگو جنرل محمد عمر نے دریافت فرمایا کہ آپ کے رفیق کی کیا تعریف ہے۔ اس پر غازی نے عرض کیا کہ میرے رفیق کا نام حکیم سید رفیق احمد ہے۔ مگر ہندوستان میں "اُستاد رسا دہلوی کے نام سے مشہور ہیں۔ اس پر جنرل موصوف نے فرمایا کہ یہ کس فن کے اُستاد ہیں؟ اس پر اُستاد فوراً بول اُٹھے "جناب عالی! ہر فن کا میں اُستاد ہوں" اور اس کے بعد قاآنیٔ ہند کا یہ مقطع سُنایا۔

تقدیر سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ
ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

اس پر جنرل عمر مرحوم نے فرمایا کہ افسوس اس پُربہار اور برجستہ شخصیت سے ایسے وقت ملا ہوں جبکہ دہلی سے کابل کے لئے پابہ رکاب ہوں۔

اس بات کا نہایت ہی افسوس اور قلق ہے کہ اُستاد رسا جیسے باکمال شاعر کا ایک چھوٹا سا شعری مجموعہ بھی یادگار نہیں ہے اُردو بازار میں اُستاد کے ایک نسبتی بھتیجے اور قدردان مسٹر رشید مالک انڈیا آرٹ سٹوڈیو" کے بیاض سے چند اشعار غازی کو دستیاب ہوئے ہیں۔ انھیں ذیل میں پیش کرتے ہیں ملاحظہ ہوں:

کیوں ہوئے پردہ نشیں یہ کیا کیا تم نے غضب
گھر سے نکلا کر بھی بازار آدمی رہ گئے

طور پر موسیٰ نے دیکھی اک جھلک تو کیا ہوا
آدمی نکلی حضرت دیدار آدمی رہ گئے

وار کیا مجھ پہ کیا دو ہو گئے تلوار سے

دستِ قاتل میں رہا تلوار آدھی رہ گئی

نہ ہار دیکھی نہ جیت سمایا سودا کچھ ایسا سر میں

بچا رہے دل کی بازی حساب سود و زیاں سے پہلے

حیات اپنی رفیق نکلی جگایا مجھ کو رہا ٹھکانے

وہیں پہ مجھ کو لیجا کے چھوڑا چلی تھی لیکر جہاں سے پہلے

وہ کوئی گستاخ پاگل منچلا تھا میں نہ تھا

آپ کو چھیڑا تھا جس نے دوسرا تھا میں نہ تھا

عدوے دشمنی ٹھیری عدو سے بن گئی ہی تھی

تمہاری بات بگڑا ہے جو ہم سے بل کی لیتے ہو

تیرے آنے سے ذرا پہلے کی باتیں اور تھیں

درس حکمت دے ۔ ہاں تھا تیرا دیوانہ بھی

گناہوں پہ نہ ہوا تنا منفعل بندہ خدا کہدے

کہ جاں بخشانے کی شرمندگی دیکھی نہیں تی

اے ' اے کا ردوار صاحب ایم اے کا مضمون یہ ہے :۔

ساٹھا گر پاٹھا قسم کا انسان رفتار میں تیزی گفتار میں تندی مقابلے پر

آئے تو فوجی کی طرح اپنی قدر لی سبنھالتا ہے ۔ جنگ گفتار کا غازی حاضر جواب کا

مرد میدان ۔ ہزاروں الفاظ اس کے سامنے حاضر جوابی میں پانی بھریں جو بذات

خود ایک انجمن جس کی ذات بہ برکات ایک دبستان جس کی حیات ایک تاریخی داستان

—— مرنجان مرنج شخصیت جو دور سے ہیولہ نظر آئے ، سر پر منڈھی ہوئی ٹوپی

جس سے چاروں طرف کو نکلے ہوئے خود رو بال دکھائی دیں ۔ دہن مبارک پان کی

آراستہ و پیراستہ جس سے داڑھی کے چند بال بھی لالہ زار ہو اُٹھیں۔ انگرکھا نما شیروانی اُٹنگا پاجامہ، ایک ہاتھ میں روایتی چھڑی اور بغل میں بیاض اور چند بوسیدہ فائلیں جن میں شاعروں اور مشاعروں کی اصلاح طلب غزلیں، مشاعروں کی تفصیلات، پُرانے پوسٹروں کے نمونے، نئے پوسٹروں کے خاکے، چندے کی رسید بُک یعنی تمام دفتر بغل میں موجود ایک فوجی انسان کی طرح ہمہ وقت کمربستہ اور ہر دم تیار، پریشان حال، لپک جھپک، رکشہ تانگے کا کیا سوال۔ غرض پہلی ہی نظر میں دیکھنے والے کو یہ گمان ہو کہ حضرت نوادراتِ شاہی میں سے ہی یا کسی مسجد کی امامت فرماتے ہیں یا کسی قبرستان کے نگراں ہیں، یا پھر کسی پُرانی خانقاہ کے متولی یا کسی غیر معروف مزار کے سجادہ نشین ہیں نہیں تو چند تحریکِ عجائب کی کوئی چیز ضرور ہیں۔

جو کچھ بھی ہو موصوف کی شخصیت گوناگوں خصوصیات کی حامل ہے۔ ویسے تو ان کی نیم عمرانی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں لیکن پھر بھی عرف عام میں انھیں اُستاد رسا جانشین بے خود کہا جاتا ہے اور جہاں تک ان کی رسائی کا تعلق ہے ادبی واسطی۔ امیر و غریب، عالم و جاہل ہر طبقے میں یکساں ہے بخصوصاً نوجوان طبقہ "یار سے چھیڑ چلی جائے اسد" کے مصداق۔ اُستاد کو ذرا سا چھیڑ کر خاص ٹکسالی دہلوی اور ہی ورائتی گالیاں سُننے کا خواہشمند رہتا ہے۔

شاید غالب کا محبوب بھی اتنے حسین و دلکش پیرائے میں گالیاں نہ دیتا ہوگا کہ جتنی بے ساختہ گالیاں استاد کے دہن مبارک سے نکلتی ہیں ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

اور حقیقت یہ ہے کہ اُستاد کی گالیاں دشنام، حاضر جوابی فقرے

مشاعرہ "یوم بے خود" کی کامیابی کا ضامن ہیں۔

استاد رسا اور مشاعرہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ تمام سال اُستاد کو ایک کام ہوتا ہے مشاعرے کی تیاری اور اس تیاری کے سلسلے میں اُستاد دہلی کی سڑکوں کا طواف اس طرح کرتے ہیں جیسے بقول شاعر ؎

جاناں کی گلی کا ہر پھیرا
سو حج کے برابر ہوتا ہے

یا جیسے حضرت مجنوں فراقِ لیلیٰ میں صحرا نوردی فرما رہے ہوں یا کوہکن اعظم اپنی محبوبہ دلنواز کی خاطر جوئے شیر نکالنے میں کوشاں ہوں یا کوئی سیاسی لیڈر اپنی گرتی ہوئی ساکھ برقرار رکھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے غرض کچھ بھی سمجھئے مگر استاد کو تمام سال ایک ہی دھن سوار رہتی ہے — مشاعرہ — مشاعرہ اُستاد کی زندگی مشاعرہ اُستاد کی محبوبہ، مشاعرہ استاد کے لئے عبادت، مشاعرہ اُستاد کے لئے ریاضت، مشاعرہ استاد کا روزگار، مشاعرہ استاد کا کاروبار، غرض مشاعرے نے اُستاد کی شخصیت پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہے کہ اگر مشاعرہ کو اُستاد کی زندگی سے علیحدہ کریں تو اُستاد کی تمام صفات یکسر معدوم ہو جائیں گی یعنی اُستاد کے لئے ہیں۔

بیخود دہلوی کے شاگرد یقیناً اور بھی رہے ہوں گے لیکن حق شاگردی یا گورو دکشنا جس طرح ان کے شاگرد رشید رسا نے ادا کی ہے شاید ہی کسی نے ادا کی ہو خاندان مغلیہ نے ہمیں تاج اور غالب دیا۔ تو بے خود نے رسا دے کر ہمارے اوپر احسانِ عظیم کیا ہے یقیناً اُستاد رسا کی باغ و بہار شخصیت سے دہلی کی تہذیبی زندگی میں ایک حرکت نظر آتی ہے اس طرح اگر ہم استاد رسا کو دہلوی تہذیب کی بساط کی آخری شمع سے تعبیر کریں تو شاید بے جا نہ ہوگا۔

اب آیئے مشاعرے کی طرف، اگر آپ کا قیام شاہجہاں آباد (پُرانی دہلی) میں ہے تو ایک صبح نور کے تڑکے وہاں کے در و دیوار پر آپ کو ایک عدد دھماکہ خیز پوسٹر بہ عنوان "مشاعرہ یوم بے خود" نظر آئے گا جس میں شاعر، متشاعر، مقامی و بیرونی شعراء کے ناموں کی ایک طول طویل مع خطابات ہوگی۔ ساتھ ہی حاشیئے میں جلی حرفوں میں لکھا ہوگا کہ یہ مشاعرہ آل انڈیا ریڈیو سے براڈکاسٹ اور ٹیلی کاسٹ کیا جائے گا۔ اب آپ کا طائرِ تجسس پھڑپھڑائے گا۔ اور آپ مشاعرے کی تاریخ کے سلسلے میں تمام پوسٹر پر نظر ثانی کریں گے لیکن تو یہ کیجئے اس پوسٹر میں تاریخ کا کیا سوال؟ کافی غور و خوض اور پوسٹر کے بغور مطالعے کے بعد آپ پر یہ منکشف ہوگا کہ یہ پوسٹر تو فوج کا ہراول ہے اور مشاعرے کی تاریخ کا اعلان باقی آئندہ پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ خیر صاحب جیسے تیسے مشاعرے کی تاریخ مقرر ہوئی اور حسب وعدہ دوسرے پوسٹر کے ذریعے اس کا اعلان آپ کی نظر سے گزرے گا، تاریخ کا اعلان کیا ہوا کہ لوگوں کے اشہب ذوق پر ایک تازیانہ پڑا۔ لوگ کئی مہینے سے اس تاریخ کا انتظار کرنے لگے۔

جامع مسجد کی اطراف میں جہاں جگہ نظر آئے گی استاد مشاعرہ کا پنڈال وہاں ایستادہ کرا دیں گے مشاعرے کے دن استاد کی سج دھج ان کا بانکپن فرحت اللہ بیگ کے مشاعرے کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ صدر مشاعرہ کوئی بھی ہو استاد میر مشاعرہ یا شمع انجمن بنے مسندِ مشاعرہ پر رونق افروز نظر آئیں گے۔ ہر شاعر کی عزت افزائی کے لئے ہار اور ٹرافی لئے موجود رہیں گے۔ گویا استاد کا یہ ارشاد ہر شاعر کی عزت افزائی کے لئے اور ٹرافی تو ہیں پر آنکھ کے ہم پلہ ہو۔ جہاں کسی شاعر نے ڈھنگ کا شعر پڑھا اور استاد نے لپک کر گلے میں ہار ڈالا۔ ساتھ ہی واپسی میں شاعر کو کرایہ دینے کے بجائے ٹرافی سے نواز ڈالا۔

یوں تو اُستاد کو مشاعرے میں شعراء کو سننے کا زیادہ شوق ہے لیکن موقع غنیمت
دیکھ کر خود بھی شروع ہو جاتے تھے۔ مشاعرے میں شعراء کے کلام سے زیادہ سامعین کو
اُستاد کی نوک جھونک، دشنام طرازی میں زیادہ دلچسپی ہوتی ہے طلبہ دہلی کالج کے
فقرے بازی اور اُستاد کا شاعر کے کلام کو درمیان میں روک کر، ٹیک پر فوری
جواب فقرے بازی — پھبتی — چھیڑ خوباں — حملے جوابی حملے — خود اپنی
خاصی آزاد شاعری کی شان بن جاتے ہیں۔

یہاں اُستاد کی شاعری پر تبصرہ کرنا یا اُن کے شاعرانہ مرتبہ کا تعین کرنا مقصود
نہیں ہے۔ اتنا کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ زبان و بیان کا جو انداز جو داغ کا طرّہ
تھی اُستاد کے یہاں بھی نظر آتا ہے بطور تبرک اُستاد کا یہ شعر پیشِ خدمت ہے ؎

بال تم نے حضور کیسے کھوئے
سر منڈاتے ہی پڑ گئے اولے

اُستاد کی شخصیت نامکمل رہ جائے گی اگر ان لطائف کا ذکر نہ کیا گیا جو
ان کی شخصیت سے وابستہ ہیں یوں تو اُستاد کے بے شمار لطائف ہیں جنھیں ضابطہ
تحریر میں لانا محال ہے کیونکہ وہ لطائف صرف صاحبِ ذوق ہی پسند فرما سکتے ہیں۔
پھر بھی چند ایک بیان کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

مشاعرے کے انتظام میں اُستاد جی کا مشورہ ہرگز قبول نہیں کرتے ہیں۔
[illegible] اسٹیج پر پھول وغیرہ لگوا رہے تھے کہ ان کے ایک نیاز مند نے اُستاد کو مشورہ دیا
کہ یہ پھول اس مقام کے بجائے اس جگہ ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔

اُستاد نے دو منٹ اُن کی طرف دیکھا — پھر کچھ سوچا — اور جیب سے
ڈائری نکالی اس میں کچھ دیکھا اور جھٹ ان حضرت کی طرف پانچ کا نوٹ بڑھاتے
ہوئے فرمایا ... چلے کرنے میں مشورہ دینے۔

مشاعرے کی تیاری کے سلسلے میں اُستاد کو قالین کی ضرورت پڑی۔ اُستاد نے اسی علاقے کے ایک غیر معروف شاعر سے قالین مستعار لی۔ اور مشاعرے کی تیاری مکمل کی۔ ہوا یہ کہ مشاعرے کے شروع ہوتے ہی وہ قالین والے شاعر مع چند احباب کے تشریف لائے اور اُستاد سے کہلوایا کہ انھیں پڑھوایا جائے۔ اُستاد نے ہاتھ کے اشارے سے توقف کرنے کو کہا۔ ادھر سے اصرار بڑھتا گیا ـــــ اُدھر اُستاد کا ہاتھ توقف کا اشارہ کرنے کے لئے جلدی اُٹھنے لگا۔ جب اُستاد کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تو اُنھوں نے فوراً مشاعرے کی کارروائی کو روکا۔ قالین پر سے شعراء کو ہٹایا اور اس قالین کو اسٹیج سے نیچے پھینک کر بولے .... چلے آتے ہیں مشاعرے میں پڑھنے کے لئے۔

غرض اُستاد کی تمام زندگی لطائف و ظرائف سے پُر ہے۔ سچ یہ ہے کہ اُستاد رسا ذوق اور داغ کی روایت کے آخری امین ہیں یہ ہے کہ اُستاد رسا کی باغ و بہار شخصیت کی وجہ سے دہلی میں قدیم مشاعروں کی روایت کسی حد تک زندہ ہے ع

ڈھونڈوگے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

عقیل نامدی اُستاد رسا کے بڑے معتقد تھے اُنھوں نے اپنی زندگی میں ایک دو مرتبہ میری ڈپٹی میری کے زمانہ میں ان کی یاد میں مشاعرے بھی کرائے تھے، اس زمانہ میں میں ان سے کہا کرتا تھا کہ اُستاد رسا کا کلام جمع کر دو تو میں اُستاد رسا کی سوانح عمری شائع کرا دوں گا جس میں یہ کلام بھی ہوں گا۔ نامدی صاحب نے توجہ نہیں دی۔ یہ مضمون ختم ہوا۔ تو اُستاد رسا کا کلام یاد آیا جسب ذیل نظم میری نظر سے گذر چکی تھی میرا خیال یہی تھا میں اپنے کسی رسالے یا اخبار میں شائع کی ہے۔ کل ۲۴ر نومبر ۱۹۸۶ء کو رسالہ آزاد ہندوستان دہلی کا فائل دیکھ رہا تھا اس کے مارچ ۱۹۵۰ء کے شمارے ایک نظم جس کا عنوان "دامِ فرنگ" ہے دکھائی دی جو رفیق رسا دہلوی کے نام سے شائع ہوئی ہے ملاحظہ ہو ــــ

کیا جانے کوئی خاک مگر ہم ہیں جانتے　　باغِ جہاں کے برگ و شجر ہم ہیں جانتے
صیاد و باغبان کی نظر ہم ہیں جانتے　　برقِ تپاں کے خوف و خطر ہم ہیں جانتے

ہم جانتے ہیں کس کو نشیمن سے لاگ ہے
جلتا ہے جس سے وہ رگِ خس کی آگ ہے

کیا جانے کوئی فصلِ ربیع و خریف کو　　کیا جانے کوئی شکلِ حنیفِ خریف کو
کیا سمجھے کوئی قوم کے حالِ نحیف کو　　ہم جانتے ہیں نبضِ قوی و ضعیف کو

اسبابِ ضعف　　پوچھیے
ہم سے دوائے صحتِ بیمار پوچھیے

تفریقِ خاص و عام و نفاقِ انام دیکھ　　اے ہمنشیں نتیجہ تفکیر خام دیکھ
اربابِ عقل و اہلِ خرد کا نظام دیکھ　　ارضِ وطن نہ ہے ہوئی نہ نظام دیکھ

پہنچی نظر کسی کی نہ انجام کار پر
لاکھوں کے خون بہہ گئے پانی کی دھار پر

آزادیٔ وطن کے مسائل نہ حل ہوئے　　جو حل ہوئے وہ باعثِ طولِ عمل ہوئے
کیا کچھ نہ انقلاب سے جنگ و جدل ہوئے　　آزاد ہم نہ آج ہوئے نہ کل ہوئے

کیسے اسیرِ دامِ بلائے فرنگ ہوئے
کنجِ قفس میں اہلِ خرد بھی تو دنگ ہیں

ہے رہبرانِ قوم پہ الزام قوم کا　　رکھا نہ غور و فکر پہ احترام قوم کا
جو کام بھی کیا وہ گیا خام قوم کا　　آیا ہے آفتاب لبِ بام قوم کا

تیغِ نفاق سر پہ ہے سلاسل ہے پیر میں
مقصد وطن کا گم ہوا آپس کے بیر میں

بٹوارہ کیا، ملک کی تقسیم کیوں ہوئی　　ارضِ وطن نفاق سے دو نیم کیوں ہوئی

تجویز غیر شرق سے تسلیم کیوں ہوئی　　آخر اصول خاص میں ترمیم کیوں ہوئی

آزادئ تمام کا دعویٰ کہاں گیا

خوش حالئ عوام کا دعویٰ کہاں گیا

انساں کو چاہیے کہ نہ آئے فریب میں　　پانی ہوا خراب جو ٹھیرا نشیب میں

ہٹ دھرمیاں فضول ہیں اہلِ عجیب میں　　لازم تھا امتیاز گریبان و جیب میں

مذہب کا علم تھا نہ سیاسی شعور تھا

کھایا فریب ہم نے ہمارا قصور تھا

دھوکے میں ایسے آ گئے کہ اللہ کی پناہ　　ایسے فریب کھائے کہ اللہ کی پناہ

وہ کام کر دکھائے کہ اللہ کی پناہ　　ہم نے وہ گل کھلائے کہ اللہ کی پناہ

ارضِ وطن کو خون سے گلزار کر دیا

نسلوں کو نذرِ خنجرِ خونخوار کر دیا

خان بہادر حاجی رشید احمدؒ

حاجی رشید احمد کون تھے ، کیا تھے اور دہلی کے مسلمانوں کی کیا خدمت انجام دیں ، اس سوال کا جواب اب بہت ہی کم پرانے دلی والے دے سکیں گے ۔ نئی نسل تو ان سے بالکل ہی ناواقف ہوگی ۔ اس لئے ؎

گاہ گاہ باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن آں داغ ہائے سینہ را!

حاجی رشید احمد صاحب ۱۸۸۳ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد حاجی عبدالکریم صاحب نمبردار میرٹھ کے ممتاز تاجروں میں تھے اور بہت نیک طینت اور پرہیزگار بزرگ تھے ۔ دہلی کے حضرت شاہ ابو الخیر رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے ۔ حاجی صاحب نے اس زمانے کے رواج کے خلاف اپنے شوق سے انگریزی کی تعلیم حاصل کی اور ۲۱ سال کی عمر میں بی اے پاس کرلیا ۔ وہ اپنی برادری میں پہلے گریجویٹ تھے ۔ شروع سے ہی تجارت سے دلچسپی رہی اور تعلیم سے فارغ ہوتے ہی انھوں نے بندوق و کارتوس کی مشہور اور قدیم فرم الٰہی بخش کمپنی میں شرکت کرلی ۔ اگرچہ انگریزی تعلیم یافتہ تھے لیکن تربیت خالص اسلامی طرز پر ہوئی تھی ان پر مذہبی رنگ غالب تھا اور شروع ہی سے علماء کی خدمت کرنے کا شوق تھا ۔ اوائل عمر میں گنگوہ حاضر ہوئے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ سے بیعت ہوگئے تھے حضرت کی وفات کے بعد حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری

سے تجدید بیعت کی۔ تھانہ بھون میں بھی حاضر ہوتے اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب سے بھی خاص تعلق تھا۔ یہ حضرات بھی حاجی صاحب پر شفقت فرماتے تھے میرٹھ میں یہ حضرات حاجی صاحب ہی کے ہاں اکثر مہمان رہتے تھے حضرت تھانوی کی مجلس وعظ بھی میرٹھ میں حاجی صاحب کے مکان میں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ ۱۹۱۰ء میں میرٹھ میں جمعیۃ الانصار کا سالانہ جلسہ ہوا جس میں سینکڑوں علماء نے شرکت کی۔ اس جمعیۃ کے بانی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اور مولانا عبیداللہ سندھی تھے۔ اس کے مقاصد میں دارالعلوم دیوبند کے لئے فراہمی سرمایہ بھی ایک مقصد تھا۔ حاجی رشید احمد صاحب نے اس جلسہ کا نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انتظام کیا۔ جلسہ بہت کامیاب رہا۔ ۱۳-۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان کے زمانے میں بھی ترکوں کے لئے چندہ کی فراہمی میں حاجی صاحب میرٹھ میں پیش پیش رہے۔ تعلیم سے حاجی صاحب کو خصوصیت کے ساتھ دلچسپی تھی۔ میرٹھ صدر بازار کے مدرسہ امداد الاسلام جہاں پر قرآن اور دورہ حدیث کی تعلیم دی جاتی تھی۔ حاجی صاحب اس کے بانیوں میں تھے۔ اور آخر تک اس کی سرپرستی کرتے رہے جہاں دور دور سے طلباء آ کر دینی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ۱۹۲۲ء تک حاجی صاحب میرٹھ میں تجارتی کاموں میں اپنا وقت صرف کرتے تھے۔

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۹ء کے اختتام پر حاجی صاحب نے مع اہل وعیال کے حج کیا۔ جنگ کے اختتام کے بعد پہلا جہاز تھا جو ہندوستانی حاجیوں کو لے کر روانہ ہوا۔ حجاز اس وقت ترکوں کی شکست کے بعد انگریزوں کے زیر اثر تھا اور شریف حسین کو انگریزوں نے حاکم بنا رکھا تھا۔ اس زمانہ میں اونٹوں کی سواری تھی۔ اور بدو لوگ حاجیوں کو طرح طرح سے ستایا کرتے تھے۔ حاجی صاحب کی شخصیت سے متاثر ہو کر شریف حسین نے ان کی دعوت کی۔ حاجی صاحب نے حاجیوں کی شکایات شریف حسین تک پہنچائیں اور ان کا مداوا کرایا۔

۱۹۲۲ء میں حاجی صاحب نے دہلی میں کشمیری دروازہ میں اپنی فرم کی شاخ کھولی اور مستقل طور پر دہلی میں منتقل ہو گئے۔ مسلمانوں اور عوام کی خدمت کرنے کا جذبہ حاجی صاحب میں بے حد تھا اور دہلی والوں نے حاجی صاحب کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور بہت عزت کی۔ جہاں کسی کو حکومت یا برادرانِ وطن سے کوئی شکایت ہوتی تو حاجی صاحب اس کے رفع کرنے کی کوشش کرتے۔ آپ دہلی کے سرکاری دفاتر میں مسلمانوں کے حقوق بحال کرانے میں بے حد کوشاں رہے۔ مسلم ایسوسی ایشن کے نام سے ایک جماعت قائم کی جس کا پہلا صدر سر رحیم بخش وزیر اعظم ریاست بہاولپور کو بنایا۔ بعد میں آپ بھی اس کے صدر منتخب ہوئے اور سکریٹری دہلی کے مشہور وکیل محمد عظمت اللہ کئی سال تک رہے۔

حاجی رشید احمد صاحب ۱۹۳۵ء میں دہلی میونسپل کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے اور مسلسل دس بارہ سال تک ممبر رہے چھ سات سال بطور سینئر وائس پریسیڈنٹ بھی میونسپلٹی کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس زمانے میں خوش قسمتی سے حاجی صاحب کو ان ہی کی طرح جذبۂ قومی و ملی سے سرشار رفقائے کار کا تعاون حاصل رہا۔ مثلاً خان بہادر حبیب الرحمٰن جیسے مخلص حضرات کے ساتھ مل کر میونسپلٹی اور عوام کی ایسی بے مثال خدمات انجام دیں جو دہلی کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھی جائے گی۔ جب وہ پہلی مرتبہ میونسپلٹی کے ممبر چنے گئے تو دہلی والوں کی طرف سے ان کو شاندار استقبالیہ دیا گیا۔ انھوں نے اپنی جوابی تقریر کے دوران عوام کے شکریہ کے بعد مرزا غالب سے معذرت کے ساتھ یہ شعر پڑھا ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سوداگری
کچھ ممبری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

اور حقیقت بھی یہی تھی کہ ماشاء اللہ حاجی صاحب اور ان کے رفقائے کار کی اچھی تجارتیں تھیں اور فکرِ معاش سے اللہ تعالیٰ نے آزاد کر رکھا تھا۔ اس لئے بے لوث ہو کر قومی و ملی

خدمات میں مصروف رہتے تھے، اور مسلمانوں کے حقوق کے لئے لڑتے رہتے تھے۔ چنانچہ میونسپلٹی کی ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب آبادی کے لحاظ سے بھی بڑھ گیا تھا۔ دہلی میونسپلٹی کی تاریخ میں پہلی دفعہ ایک مسلمان افسر کا تقرر سکریٹری کا عہدہ بھی ملک انیس الدین کو دلانے میں حاجی صاحب کامیاب ہو گئے۔

دہلی میں منتقل ہوتے ہی حاجی صاحب نے اپنی برادری پنجابی سوداگران کے معاملات میں گہری دلچسپی لینی شروع کر دی تھی اور برادری کی تعلیمی تجارتی اور صنعتی ترقی کے لئے برابر کوشاں رہے۔ شادی بیاہ کی تقریبات میں سادگی اور اصلاح رسوم کے لئے بڑی جدوجہد کے بعد کامیاب ہوئے۔ اس میں بھی مذکورہ رفقائے کار اور برادری کے افراد کا حاجی صاحب سے مکمل تعاون رہا۔ سالہا سال انجمن وکیل قوم پنجابیان دہلی کے صدر رہے اور انجمن کے ہر ہفتہ واری جلسہ میں پابندی سے شرکت کرتے تھے اور اپنا کافی وقت اس کے معاملات و مسائل میں صرف کرتے تھے۔ انجمن کے اسکول کے لئے قطب روڈ سے آگے حاجی صاحب اور ان کے ساتھیوں کی بڑی کوششوں سے ایک قطعہ زمین حکومت سے حاصل کیا جس پر اسکول کی عمارت تعمیر ہوئی۔ فتحپوری مسلم ہائی اسکول کے بھی حاجی صاحب بانیوں میں تھے۔ اینگلو عربک ہائی اسکول کی کمیٹی کے ممبر اور دہلی کالج کی گورننگ باڈی کے بھی ممتاز رکن تھے۔ غرض دہلی کا کونسا سوشل تعلیمی ادارہ تھا جس میں حاجی صاحب کی دلچسپی نہ تھی۔ دہلی کی تاریخی شاہی مسجد فتحپوری کمیٹی اور جامع مسجد کمیٹی کے یہ سرگرم رکن تھے۔ حاجی صاحب مدرسہ مظاہر العلوم کے سرپرست تھے اور دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے بھی ممبر تھے اور مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کورٹ کے بھی عرصہ تک ممبر رہے۔

۱۹۳۲ء میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن کا سفر کیا، وہاں رئیس الاحرار حضرت مولانا محمد علی جوہر جیسے زعماء کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے حقوق

سکے لئے لڑے۔ علماء دہلی سے حاجی صاحب کے تعلقات مدت العمر قائم رہے حضرت
مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب سے خصوصی تعلقات تھے۔ مولانا محمد الیاس
صاحب بانی تبلیغی جماعت ہر اہم معاملہ میں حاجی صاحب سے مشورہ کرنے کے لئے
تشریف لایا کرتے تھے۔ بلکہ آپ کا شمار تبلیغی جماعت کے بانیوں میں تھا۔ اور حاجی
صاحب تبلیغی اجتماعات میں جو اس وقت دہلی اور میوات تک محدود تھے شرکت
فرماتے تھے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب سے تو عزیزوں جیسا تعلق
تھا۔ اور حاجی صاحب سے حضرت شیخ کو بہت عقیدت تھی۔ ان کا ذکر جب بھی
حضرت شیخ کے سامنے آتا ہے تو ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

تقسیم ہند کا جب اعلان ہوا تو حاجی صاحب پاکستان جانے کے لئے تیار
نہیں تھے۔ دہلی میں ہی رہنا چاہتے تھے مگر جب ان کے ہندو احباب مثلاً گوری شنکر لال
اور سردار سندر سنگھ دھوپیا وغیرہ نے حاجی صاحب کو مشورہ دیا کہ اب آپ پاکستان چلے
جائیے، دہلی میں آپ کی زندگی محفوظ نہیں ہے۔ اس وقت ان کو دہلی کو خیرباد کہنا پڑا۔
اور آپ مشرقی پاکستان میں ہجرت کر گئے اور ڈھاکہ و چاٹگام میں تجارت شروع
کر دی۔ آپ نے بہت جلد چاٹگام میں بھی اپنا مقام بنا لیا۔ وہاں کی شہری تعلیمی تجارتی
اور صنعتی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ چاٹگام میونسپلٹی کے بھی ممبر منتخب ہوئے اور پورٹ
ٹرسٹ کے ٹرسٹی اور نائب صدر بھی عرصہ تک رہے۔ چاٹگام میں تعلیم صرف بنگلہ
زبان میں دی جاتی تھی تقسیم ملک کے بعد جو کثیر تعداد میں مہاجرین آکر آباد ہوئے۔
ان کے بچوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا چنانچہ ۱۹۴۹ء میں حاجی صاحب کی کوشش
سے چاٹگام میں اردو میڈیم کے اسکول ایک لڑکوں کے لئے اسلامیہ ہائی اسکول دوسرا
لڑکیوں کے لئے فاطمہ جناح گرلز ہائی اسکول قائم ہوئے چاٹگام کے پاکستان چیمبر
آف کامرس کے لئے بھی آپ کئی سال تک صدر رہے۔ اسلامی دینی مدارس اور

وہاں کے علماء سے بھی آپ کا تعلق قائم رہا۔ چاٹگام میں کوئی دینی مدرسہ نہ تھا حاجی صاحب کی کوششوں سے مدرسہ مظاہر العلوم چاٹگام میں قائم ہوا جو اب تک قائم ہے۔

۱۹۴۹ء میں حاجی صاحب دوسری مرتبہ چاٹگام سے حج کیلئے گئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ سے آپ کو عشق تھا۔ اور برابر مدینہ منورہ کے قیام کی آرزو رہی۔ مسجد نبوی میں ۱۹۴۹ء میں حاجی صاحب نے فلورٹ لائٹ نصب کرائے، اس سے قبل وہاں بجلی کے بلبوں سے روشنی ہوتی تھی۔ مدرسہ علوم شرعیہ میں جب حضرت مولانا سید احمد صاحب برادر حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے ۱۹۲۱ء میں قائم کیا تو حاجی صاحب نے ہندوستان میں اس مدرسہ کے لئے کافی چندہ جمع کیا اور ہر سال حجاج کے ساتھ چندہ کی رقمیں بھجواتے رہتے تھے۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۵۲ء کو آپ کا چاٹگام میں انتقال ہوا۔

حاجی صاحب کے چار صاحب زادے اور پانچ صاحبزادیاں تھیں۔ اپنے چاروں بیٹوں کو حافظ قرآن بنایا۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے حاجی متین احمد حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری سے بیعت ہوگئے۔ چاٹگام میں ہجرت کرنیکے بعد لاہور چلے گئے تھے۔ آج کل اپنی صاحبزادیوں کے پاس امریکہ میں مقیم ہیں۔ دوسرے صاحبزادے انیس احمد نے میرٹھ کالج سے بی، اے اور سینٹ اسٹیفنز کالج سے ایم اے کیا۔ چاٹگام میں اپنے والد صاحب کے ساتھ رہے ۱۹۷۲ء سے انیس صاحب مع اپنی اہلیہ ایک بچے اور ایک بچی کے مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہیں۔ تیسرے بیٹے حافظ محمد بشیر احمد اور چوتھے صاحبزادے روح الامین احمد صاحب ہیں یہ دونوں کراچی میں تجارتی زندگی گذار رہے ہیں۔

قاری سرفراز حسین عزمی دہلوی

۱۹۰۰ء کی صدی کی ابتدا میں تیس پینتیس سال قاری صاحب نے ایک دھوم مچا رکھی تھی۔ مگر زمانہ بڑا ناقدر اور ذود فراموش ہے۔ اب علمی طبقہ بھی ان کے نام سے نا آشنا ہو گیا ہے۔

قاری صاحب میں وہ خصوصیات تھیں جو عام آدمیوں میں مفقود ہیں وہ مشہور زمانہ ادیب ہونے کے ساتھ مبلغ اسلام اور جادو بیان مقرر تھے۔ اور بڑی خصوصیت ان کی یہ تھی کہ انتہائی ظریف اور حاضر جواب تھے۔ لوگ ان کی باتیں سننے کے لئے ترستے تھے۔

قاری صاحب دہلی کے قاریوں کے ایک مشہور و معروف ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جو شاہان مغلیہ کے درباروں میں ممتاز عہدہ دار تھے اور ان کو نمایاں رسوخ حاصل تھا۔

قاری صاحب کے والد ماجد قاری برکت اللہ صاحب تھے جو شہر کے با اثر و مقتدر عالم تھے۔ جامع مسجد دہلی میں رمضان شریف میں تراویح سنایا کرتے تھے۔ اور رمضان کی دسویں شب کو ختم کر دیتے تھے۔ بہترین واعظ گو تھے۔ سیرت مقدسہ پر بڑی مؤثر تقریر کرتے تھے۔

قاری سرفراز حسین صاحب دہلی میں ۱۸۶۷ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے سر سے

آپ کے والدِ ماجد کا سایہ بہت جلد اُٹھ گیا تھا۔ دادا، دادی اور نانا بھی گذر چکے تھے۔ آپ کی ابتدائی تربیت آپ کی والدہ اور نانی نے کی محلّہ کے ایک گھر میں ایک عمر رسیدہ استانی اور ان کی لڑکی سے جہاں لڑکے اور لڑکیاں پڑھتے تھے وہاں خود انہوں نے قرآنِ مجید پڑھا۔ اس کے بعد عربک اسکول اجمیری گیٹ دہلی میں داخلہ لیا۔ ہر سال دو جماعتیں پاس کرتے تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اور بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوئے۔ اس اسکول میں ان کے اُستادوں میں مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی بھی تھے۔ زمانہ طالب علمی میں شعر و شاعری کا ذوق و شوق پیدا ہوا۔ عزمی تخلص رکھتے تھے۔ مولانا سیف الحق ادیب دہلوی حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ ان سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا۔ مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد ملازمت کی۔ تعلیم کا شوق تھا۔ اعلیٰ تعلیم پانے کی تمنا تھی۔ چھ برس کی نوکری چھوڑ کر علی گڑھ مسلم کالج میں سر تھیوڈ کارلنس مسٹر بک ڈاکٹر ارنلڈ اور مولانا شبلی آپ کے اُستاد تھے۔ طالب علمی کے زمانہ میں قاری صاحب سے سٹر مارلیسن نے اُردو پڑھنی شروع کی۔ یونین کلب کے مباحثوں میں بھی حصہ لیا۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ اعلیٰ تعلیم مکمل کرلیں مگر یہ پوری نہیں ہو سکی۔ ان کی اقتصادی حالت اچھی نہیں تھی جس کی وجہ سے تعلیم ترک کرنی پڑی۔ اور محکمہ کمسریٹ میں ملازم ہو گئے اور ساری عمر اسی میں گذاری۔

ملازمت کے دوران مطالعہ کتب بھی جاری تھا۔ اسی زمانہ میں علماء اور صوفیائے کرام کی صحبتوں میں رہے۔ جس کی وجہ سے تصوف کا رنگ چڑھا۔ ۱۸۸۷ء میں مولانا احمد حسین چشتی نظامی کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ تصنیف و تالیف کی طرف بھی رغبت تھی۔ تین ناول سعید، سعادت اور شاہد رعنا لکھے۔ مختلف مذاہب کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب اور مولانا عبدالحق صاحب مؤلف تفسیر حقانی کے ساتھ قاری صاحب کے خاندانی تعلقات تھے۔ یہ ان ہستیوں میں تھیں جن کی وجہ سے قاری صاحب کے دل میں دین اور تبلیغ اسلام کا جذبہ پیدا ہوا۔ آپ نے ان دونوں حضرات کے مشورے سے تبلیغ کے لئے جاپان جانا طے کر لیا۔ اس وقت ان کی بیوی اور بھائی سخت علیل تھے اس وجہ سے حکیم صاحب نے اس بات پر ان کی توجہ دلائی کہ آپ کے بھائی اور بیوی کی حالت تسلی بخش نہیں ہے بہت مخدوش ہے کیسے جا سکتے ہیں۔ ان کا جواب قاری صاحب نے برجستہ دیا۔ میں خدا کے کام کے لئے جا رہا ہوں۔ خدا ان مریضوں کا حافظ و ناصر ہے چنانچہ پروگرام کے مطابق قاری صاحب نے اس بات پر ان کی توجہ دلائی کہ آپ کے بھائی اور بیوی کی حالت تسلی بخش نہیں ہے، بہت مخدوش ہے، کیسے جا سکتے ہیں ان کا جواب قاری صاحب نے برجستہ دیا۔ میں خدا کے کام کے لئے جا رہا ہوں۔ خدا ان مریضوں کا حافظ و ناصر ہے چنانچہ پروگرام کے مطابق قاری صاحب جاپان روانہ ہو گئے۔ ابھی کلکتہ ہی پہنچے تھے۔ چھوٹے بھائی کی موت اور بیوی کی علالت کی خطرناک صورت اختیار کرنے کی اطلاع ملی لیکن آپ کے ارادہ میں کسی قسم کا تزلزل پیدا نہیں ہوا اور آپ جاپان چلے گئے۔ یہ واقعہ ۱۹۰۵ء کا ہے۔

قاری صاحب کا جاپان میں تپاک خیر مقدم کیا گیا آپ کی تبلیغی تقریر پر اخبار ناگاساکی نے لکھا کہ "آپ نے نہایت ہی دلچسپ پیرایہ میں ثابت کیا کہ توحید جو ہر مذہب و فلسفہ کے اندر کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے وہ اسلام میں درجہ تکمیل تک ہے۔"

قاری صاحب نے انگلستان پہنچ کر پہلا لیکچر لکسٹن ہال میں دیا جلسہ جہاں قاری صاحب کا تعارف آنریبل سید امیر علی صاحب نے کرایا تھا۔ اس لیکچر کے اختتام پر ایک نوجوان جرمن خاتون نے اسلام قبول کیا اور انگلستان کے اخباروں میں قاری صاحب

کے موثر لیکچر کی دھوم مچ گئی۔ چنانچہ وہاں کے ممتاز مشہور اخباروں مثلاً ڈیلی مرر، مانچسٹر گارڈین اور لنڈن ٹائمز وغیرہ نے آپ کی قابلیت فصاحت اور شستہ بیانی کی بڑی تعریف کی۔

طوائفوں کی زندگی پر قاری صاحب نے دس ناول لکھے ہیں۔ شاہد رعنا نے سب سے زیادہ شہرت پائی۔ یہ وہ کتاب ہے جسے دیکھ کر مرزا رسوا نے امراؤ جان ادا تصنیف کی۔ ناولوں کے علاوہ قاری صاحب نے علم الکلام پر بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ مولانا شوکت علی صاحب ان کے ہم سبق تھے وہ ان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :-

اگر پس پردہ آپ سے پوچھوں کہ کیسے حضرت کہاں آئے ہے۔ آپ ضرور فرمائیں گے آدمی مزیدار ہے مگر دلی کا چھٹا ہوا شہدا ہے۔ بالکل سچ ہے۔ سر تا پا حسین واقعی ایسا ہے۔ صوفی، منش آدمی ہیں۔ دل میں عشق مجازی اور عشق حقیقی کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ علی گڑھ کی اصطلاح میں فیشن ایبل شرارا اور دل پھینک سے مگر رائے جلد قائم نہ کیجیے ذرا ٹھہریئے۔ یا تو بر غل غپاڑہ ہنسی دل لگی تھی یا یکایک ہمارے دوست کا چہرہ بدلا۔ آنکھوں میں شعلیں روشن ہو گئیں، یہ مقناطیسی قوت کا اثر ہم کھلنڈروں پر بھی پڑا اور سب غل غپاڑہ غائب یا تو وہ رنگ رلیاں تھیں یا یکا یک ہم پر دوسری حالت طاری ہو گئی۔ ہمارا دوست ہم سے اخلاق پر گفتگو کرنے لگا۔ خدا نے زبان میں وہ تاثیر دی کہ سبحان اللہ، غیر مذہب کے اعتراضات کے ان معقول جوابات چھوٹے چھوٹے دلچسپ نکتے، جس سے اسلام کی محبت اور وقعت دل میں پیدا ہو۔"

قاری صاحب بڑے خوش کلام، زندہ دل اور پر مذاق شخصیت تھی۔ محفلوں میں جان و لطف پیدا کرنے والوں میں سے تھے۔ ایک دفعہ مسوری میں ایک رئیس نے چاہا کہ قاری صاحب آن کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی باتوں سے ان کا جی بہلایا

کریں۔ قاری صاحب نے ٹالنے کے لئے کہلوا دیا کہ میں سو روپے فی گھنٹہ لوں گا۔ اگر منظور ہو تو طلب فرمائیں وہ بھی بگڑے دل رئیس تھے۔ دو سو روپے روزانہ دیتے رہے اور قاری صاحب وہ روپیہ انجمنِ اسلام کو بھیجتے رہے۔

قاری صاحب بذلہ سنجی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ نواب صاحب رامپور کے دربار میں ایک دفعہ انھیں شرکت کا موقع مل گیا تو ان کی خداداد ذہانت وظرافت سے نواب صاحب اس قدر محظوظ ہوئے کہ باوجود درخواست کے انھوں نے مدتوں قاری صاحب کو رامپور سے نکلنے نہیں دیا۔ اسی طرح نواب صاحب جاؤرہ بھی ان کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ مگر قاری صاحب ذوق کے ہم خیال تھے۔ ان سے بھی دلی کی گلیاں نہیں چھوٹتی تھیں۔

قاری صاحب کے زمانہ میں شاہجہان آباد کے مشاہیر ادب میں علامہ راشد الخیری، مرزا اشرف گورگانی اور مولوی اشرف حسین بی اے تھے ان میں آپس میں پھبتیاں کسی جاتی تھیں۔

شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب کے فرزند مولوی بشیر الدین صاحب بھی بیسیوں کتابوں کے مصنف تھے اور عمر میں مولانا سے بڑے تھے ان کو کسی نے جتا دیا کہ بیٹے کے بھتیجے کو جانشین بنایا جا رہا ہے۔ مولوی بشیر الدین نے اس کی پرواہ نہیں کی مگر قاری سرفراز حسین صاحب نے اس کا خاصا لطیفہ بنا دیا۔ کوئی شادی تھی جس میں لوگ جمع تھے۔ مولانا راشد الخیری صاحب نے ایک بہت ڈھیلی ڈھالی ٹخنوں سے ذرا اونچی پرانی سی اودی شیروانی پہن رکھی تھی۔ قاری صاحب مولوی بشیر الدین صاحب سے مخاطب ہو کر بولے 'واحدی نے راشد کو جانشین مولوی نذیر احمد غلط نہیں لکھا قسم ہے پیدا کرنے والے کی میں نے اپنے دونوں آنکھوں سے مولوی نذیر احمد کے پاس یہ شیروانی دیکھی ہے جو آج راشد

کے جسم پر ہے۔

ایک دفعہ ایڈورڈ پارک میں مجمع تھا۔ کوئی بڈھا سفید ڈاڑھی، خمیدہ کمر، بھیک مانگتا اس چوکڑی کے اندر آکھڑا ہوا۔ علامہ راشد الخیری صاحب نے بے ساختہ کہا۔ "آؤ میاں قاری برکت اللہ بڑی مدت میں دکھائی دیئے۔ تمہارے دیدار کو تو آنکھیں ترس گئیں۔ قاری برکت اللہ، قاری سرفراز حسین صاحب کے والد کا نام تھا جن کو گذرے ہوئے اس وقت پچاس برس ہوگئے تھے۔ مولانا راشد الخیری صاحب نے کبھی خضاب نہیں لگایا تھا۔ آخر وقت میں سر داڑھی اور بھنویں بالکل بگلا تھیں اور سر کے بال خوب بڑھے ہوئے اور اُلجھے سے تھے۔ ایک دن مولانا ننگے سر کھڑے تھے کہ قاری صاحب آپہنچے اور فرمایا "حضرت مولانا روئی کے بیج میں کام شروع کردیا ہے۔"

قاری صاحب خضاب استعمال کرتے تھے، ایک روز ڈھاٹا باندھے ہوئے تھے اور ڈھاٹے میں سے روئی زیادہ باہر نکل آئی تھی۔ مولانا نے کہا واہ قاری صاحب صرف دُم کی کسر ہے یعنی دُم لگالو تو لنگور معلوم دوگے ---!

قاری سرفراز حسین صاحب عرصہ تک فالج کے مرض میں مبتلا رہے آخر ۲ جون ۱۹۳۴ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

مرزا محمد سعید

حضرت ملّا واحدی ایڈیٹر نظام المشائخ دہلی کراچی نے مرزا محمد سعید صاحب کے حالات زندگی ۱۰ دسمبر ۱۹۶۸ء کے جنگ کراچی میں شائع کرائے تھے، وہ نقل کیے جا رہے ہیں:-

پروفیسر مرزا محمد سعید کو شہرت حاصل کرنے کا قطعی شوق نہیں تھا لیکن ان کی پڑھانے کی مہارت اور برابر پڑھنے کی عادت نے انھیں اپنے ہمعصروں میں بہت ممتاز و فائق کر دیا تھا۔ مرزا صاحب مجھ سے دو تین برس بڑے تھے۔ غالباً ۱۸۸۵ء کی پیدائش لیکن لڑکپن ہی سے میرے لئے ان میں بڑا پن تھا۔ شیخ عبدالقادر، ایڈیٹر رسالہ مخزن بیرسٹری کرنے دلّی آئے ہیں اور دفتر مخزن ساتھ لائے ہیں تو میں پڑوس کی وجہ سے شیخ صاحب کی مجلس شام کا حاضر باش تھا۔ مرزا محمد سعید اس وقت ایم اے کر چکے تھے اور علی گڑھ کالج میں پروفیسر تھے۔ مرزا صاحب سے ابتدائی ملاقاتیں شیخ عبدالقادر کے ہاں ہوئیں۔ اس حیثیت میں کہ مرزا صاحب شیخ صاحب کے دوست تھے اور میں شیخ صاحب کی صحبت سے فیض پانے کا طالب۔ میں دسویں جماعت کا معمولی طالب علم تھا اور مرزا صاحب ایسے کامیاب ناول کے مصنف جس کا نام آج بھی نمونے کے ناول کے طور پر لیا جاتا ہے۔

مرزا محمد سعید میرے ہم محلہ تھے۔ اور ان کے نانا میر ببر علی اور میرے خسر میر [illegible]

بھائی بھائی تھے۔ میر ببر علی سید محمد خاں برادر کلاں سر سید احمد خاں کے داماد تھے۔ میر ببر علی کے بیٹے سید محمد علی جوڈیشنل کمشنر کو گورنمنٹ انگریزی نے نواب کا خطاب دیا تھا۔ نواب سید محمد علی علی گڑھ کالج کے آخری سکریٹری تھے۔ مرزا محمد سعید کے نواب سید محمد علی صاحب ماموں بھی تھے اور خسر بھی۔

مرزا محمد سعید نے انیس سال کی عمر میں ایم، اے کیا تھا۔ ایم اے کرتے ہی وہ علی گڑھ کالج سے لاہور چلے گئے۔ علی گڑھ میں اکثر شاگرد ان سے زیادہ عمر کے تھے اور لاہور میں تقریباً سب لگ بھگ عمر کے۔ مرزا صاحب دونوں جگہ انگریزی کے پروفیسر رہے۔ وہ انگریزی کے ایم اے تھے۔ اور انھیں انگریزی زبان اور انگریزی ادب پر بڑا عبور تھا۔ سر محمد شفیع کی وزارت کے زمانے میں وزارت تعلیم کے انڈر سکریٹری بھی رہے۔ پھر رہتک کالج کی پرنسپلی پر بھیجا جا رہا تھا، اسے انھوں نے منظور نہیں کیا اور استعفےٰ دیکر قبل از وقت پنشن لے لی۔

پنشن لے کر دلی آ بیٹھے تو میرے اور اُن کے تعلقات خاصے بڑھ گئے۔ روز شام کی ہوا خوری کرنے وہ اور رضا اللہ انجینیر فرزند شمس العلماء منشی ذکاء اللہ میرے ساتھ جاتے تھے۔ راستے میں بڈھے بڈھے ہندو مرزا صاحب کو جھک جھک کر سلام کرتے تو میں پوچھتا یہ کون صاحب تھے۔ مرزا صاحب فرماتے۔ ریٹائرڈ سول سرجن ہیں یا ریٹائرڈ سشن جج ہیں وغیرہ وغیرہ، لاہور میں میرے شاگرد رہے ہیں۔

علی گڑھ کالج میں حسین شہید سہروردی وزیر اعظم پاکستان کے بھائی حسن شہید سہروردی مرزا محمد سعید کے شاگرد تھے۔ گورنمنٹ کالج، لاہور میں چودھری محمد ظفر اللہ (جج انٹرنیشنل کورٹ) نے مرزا صاحب سے پڑھا تھا۔ مشہور شاعر اسد ملتانی مرزا صاحب کا لطیفہ سُنایا تھا کہ میں کمرے میں گھسا تو دروازہ زور سے

بند کرتا ہوا گھسا۔ مرزا صاحب بولے صاحبزادے دروازہ آہستگی سے بند کیا کرو۔ شریف آدمیوں کے اعصاب اتنے مضبوط نہیں ہوتے کہ دروازوں کا زور سے بند ہونا برداشت کرلیں۔

مرزا محمد سعید ملنے جلنے میں نہایت سادہ منکسر مزاج تھے۔ خودداری تھی۔ لیکن اکڑ مطلق نہیں تھی۔ البتہ اپنی رائے اور اپنی تحقیق پر انھیں پورا وثوق اور بھروسہ تھا اس سے ہلانا محال تھا۔ مرزا محمد سعید کا سارا خاندان سُنی ہے۔ مگر مرزا صاحب نے مطالعہ کتب سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ شیعہ مذہب صحیح ہے۔ مرزا صاحب اس عقیدے پر جم گئے۔ مرزا صاحب کے خیالات شیعوں جیسے تھے لیکن عمل سنیوں جیسے۔ جمعہ اور عیدین کی نماز وہ جامع مسجد میں پڑھتے تھے اور سُنیوں کی طرح پڑھتے تھے۔ ایک بیٹی مرزا صاحب کی مرزا مسعود بیگ کی بیوی ہیں جو انگریزوں کے زمانے میں وزیر ریاست رامپور تھے اور آزادی کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کے پرائیویٹ سکریٹری رہے۔ اب معلوم نہیں کیا ہیں۔ مرزا مسعود بیگ سنی ہیں دو بیٹیاں مرزا صاحب نے شیعوں سے بیاہیں۔ مسٹر سبط حیدر، جو اسسٹنٹ سکریٹری ——— اسٹیبلشمنٹ ڈویژن، پاکستان اور مسٹر طیب حسین سفیر پاکستان در ایران مرزا صاحب کے شیعہ داماد ہیں۔ تاہم شیعہ حضرات نے مرزا صاحب کو شیعہ کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اینگلو عربک کالج، دہلی کی منتظمہ کمیٹی میں شیعہ سیٹ نکلتی تھی تو انھیں سنی کہہ کر نہیں لیا جاتا تھا۔ اور سنی سیٹ خالی ہوتی تھی تو شیعہ کہہ کر رد کر دیا جاتا تھا۔ اینگلو عربک کالج مرزا محمد سعید جیسے علمی اور تعلیمی شخص سے محروم ہی رہا۔ مرزا صاحب انڈین ایجوکیشن سروس کے آدمی تھے۔ (I.E.S)۔

میرے بہنوئی خان صاحب سید احمدؒ نے میرے بڑے بھانجے کا پیغام مرزا محمد سعید کے ہاں بھیجا۔ میرے بہنوئی کی مرزا صاحب سے رشتہ داری ہے لیکن

وہ مرزا صاحب کی شیعیت سے بے خبر تھے کسی سے سُنا تو مجھ سے پوچھا کہ کیا مرزا صاحب شیعہ ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا۔ مرزا صاحب کے پاس چلے جائیے اور خود آپ ہی دریافت کر لیجیے۔ مرزا صاحب چھپائیں گے نہیں جو بات ہو گی صاف صاف بتا دیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ مرزا صاحب نے جواب دیا۔ جی ہاں میں شیعہ ہوں۔ میرے بہنوئی نے سوال کیا۔ آپ کی لڑکیاں کیا ہیں۔ فرمایا۔ یہ وہی بتا سکتی ہیں۔ میں نے کسی کو شیعیت کی تبلیغ نہیں کی ہے۔ البتہ میری شیعیت کا انھیں علم ہے۔

مرزا صاحب کتابوں کے کیڑے تھے۔ انگریزی دانوں میں اُن سا علم دوست کم ہوگا۔ مطالعہ کرتے کرتے ہی وہ دین سے بھی خوب واقف ہو گئے تھے۔

میرا اُن کا ساتھ شام کی ہوا خوری میں پابندی سے رہتا تھا۔ شام کے بعد ان کی نشست مسٹر آصف علی کے ساتھ ہوتی تھی۔ ان کے شاگرد سید احمد شاہ بخاری ڈائرکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو اس صحبت کے شریک تھے۔

مرزا محمد سعید کا کردار بہت بلند تھا۔ مرزا صاحب کے ایک بڑے گہرے دوست کے لڑکے نے بی اے کا امتحان دیا۔ مرزا صاحب بی' اے کے ممتحنوں میں تھے ان کے گہرے دوست نے کہا کہ مرزا صاحب! اپنے بھتیجے کا خیال رکھیے گا۔ مرزا صاحب بولے مجھ سے کیا آپ بے ایمانی کرانی چاہتے ہیں۔ اسی طرح سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی کا انتخاب ہونے لگا تو مسٹر آصف علی کانگریسی اُمیدوار تھے اور شیخ عثمان آزاد مسلم لیگی اُمیدوار۔ مرزا صاحب نے آصف صاحب کی قابلیت اور ذاتی دوستی کی پروا نہیں کی اور عثمان آزاد کو علی الاعلان ووٹ دیا۔

مفتی شوکت علی فہمی

مصورِ فطرت شمس العلما، حضرت خواجہ حسن نظامی کے حلقۂ ادب سے تربیت حاصل کرنے کے بعد اہلِ قلم حضرات کو میدانِ ادب و صحافت میں ہر دلعزیزی اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ انہی میں مفتی شوکت علی فہمی کو ایک امتیازی درجہ حاصل ہے۔ چنانچہ خواجہ حسن نظامی کے حلقۂ ادب سے تعلق رکھنے والوں میں اُن کا شمار اس برِ صغیر میں حضرت ملا واحدی دہلوی کے بعد کیا جاتا ہے۔

مفتی شوکت علی فہمی اس ملک کے ممتاز صحافی و مصنف شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی ادارت میں ۱۹۲۳ء سے لے کر اس وقت تک ایک درجن کے قریب اخبارات و رسائل شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ تیس ۳۰ چالیس ۴۰ کتابوں کے مصنف بھی ہیں جن میں زیادہ تر دینی اور تاریخی کتب شامل ہیں۔ اُنھوں نے تاریخی کتب کی تصنیف کے سلسلے میں جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ نہایت آسان، عام فہم اور سادہ ہے اور اُن کی تاریخی کتب کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ چنانچہ اُن کی تاریخی کتب ہزاروں کی تعداد میں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو چکی ہیں۔ مفتی شوکت علی فہمی ایک طرف تو ممتاز سیاسی مفکر اور صحافی ہیں اور دوسری طرف ایک نہایت ہی مقبول مورخ بھی ہیں۔ اور اُنھیں تحریر کے مختلف اصناف پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ سنجیدہ، تاریخی اور اصلاحی مضامین کے علاوہ کبھی کبھی افسانے بھی لکھ لیتے

ہیں۔ افسانہ نگاری میں ٹیگور اور منشی پریم چند کے مقلد ہیں۔ اُن کے افسانے زیادہ تر تاریخی ہوتے ہیں۔

قلم کاری اور مضمون نگاری مفتی شوکت علی فہمی کی زندگی کا محبوب ترین مشغلہ ہے وہ روزانہ اوسطاً کتابی صفحات کے پندرہ بیس صفحات بڑی پابندی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ گذشتہ چالیس سال سے وہ کبھی رات کے ایک بجے سے پہلے نہیں سوئے۔ شب کو روزانہ نو دس بجے سے اُن کی تحریر کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو رات کے ایک دو بجے تک جاری رہتا ہے۔ اُنھوں نے تقریباً تمام کتابیں رات ہی کو لکھی ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ بسیار نویسی میں مشکل ہی سے ہندوستان کا کوئی اہلِ قلم اُن کا مقابلہ کر سکتا ہے، وہ ہر موضوع پر بے تکان لکھتے چلے جاتے ہیں اور جس صنف پر بھی قلم اُٹھاتے ہیں اُسے بڑی خوبی سے نبھاتے ہیں۔ لکھتے وقت اُن کے انہماک کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اُنھیں گرد و پیش کی کوئی خبر نہیں رہتی ایک نشہ سا اُن پر طاری ہو جاتا ہے۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ قلم کاری میرا ایک ایسا محبوب مشغلہ ہے جس کے بغیر میں زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ اگر کبھی بیمار ہو جاتے ہیں تو بیماری کی حالت میں بھی اُن کی تحریر کا سلسلہ کسی نہ کسی حد تک بدستور جاری رہتا ہے۔

مفتی شوکت علی فہمی کا آبائی وطن یو۔پی کا مشہور تاریخی شہر میرٹھ ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم میرٹھ ہی میں ہوئی ہے، اُن کے پاس کوئی بڑی علمی ڈگری نہیں ہے لیکن اُن کا مطالعہ غیر معمولی ہے۔ قرآن، فقہ، حدیث اور تاریخ اُن کے محبوب موضوعات ہیں جن کا مطالعہ آج بھی وہ ایک طالبِ علم کی طرح کرتے ہیں۔ وہ بہت بڑے اہلِ قلم ہیں اور اُن کا شمار ممتاز مصنفین میں کیا جاتا ہے لیکن وہ ابھی تک اپنے آپ کو ایک مبتدی سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ مفتی شوکت علی فہمی اُن خوش نصیب حضرات میں سے ہیں جنھوں نے کہ جب آنکھ کھولی تو اُن کے گرد مایۂ ناز علماء کا

ہجوم تھا اور جب بڑے ہوئے تو انھوں نے علماء ہی سے تربیت حاصل کی۔ اُن کا پورا خاندان ہی چونکہ علوم و فنون کا دلدادہ رہا ہے اس لئے علمی ذوق اُن کی فطرت میں شامل ہو گیا ہے۔ اور یہی علمی ذوق آج سے پچاس سال قبل انھیں دہلی کھینچ لایا اور حضرت خواجہ حسن نظامی کی معیت نے انھیں کندن بنا دیا۔ یہ یاد رہے کہ فہمیؔ اُن کا تخلص نہیں ہے بلکہ حضرت خواجہ حسن نظامی کا عطا کیا ہوا خطاب ہے۔ مفتی شوکت علی فہمی کی سوجھ بوجھ اور ہوشمندی سے متاثر ہو کر حضرت خواجہ حسن نظامی نے انھیں یہ خطاب عطا فرمایا تھا۔

خاندانی اعتبار سے بھی مفتی شوکت علی فہمیؔ کو ایک امتیازی درجہ حاصل ہے یہ ددھیالی کی طرف سے اُس خاندانِ مفتیان سے تعلق رکھتے ہیں جو حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب کی اولاد میں سے ہے۔ مفتی عبدالرحیم صاحب کو مغلیہ دور میں بہت بڑا عروج حاصل تھا۔ مفتی شوکت علی فہمیؔ مفتی برکت علی مرحوم کے فرزند اور مفتی عنایت علی مرحوم کے پوتے ہیں۔ اور ننھیال کی جانب سے ان کا شجرۂ نسب حضرت بہاؤالدین ذکریا ملتانیؒ سے جا کر ملتا ہے۔ مفتی شوکت علی فہمیؔ کے نانا حضرت مولوی محمدؐ ہاشم علی حضرت بہاؤالدین ذکریا ملتانی کی آٹھویں پشت میں سے تھے۔

مولوی محمدؐ ہاشم علی کا شمار نہ صرف میرٹھ بلکہ صوبہ یو۔پی کے مقتدر علما میں کیا جاتا تھا۔ مولوی ہاشم علی، مولانا محمدؐ قاسم صاحب۔ نانوتوی بانیٔ مدرسہ دیوبند کے نہ صرف ہم عصروں میں سے تھے۔ بلکہ مولانا نانوتوی سے ان کے خصوصی تعلقات بھی تھے۔ مولوی محمدؐ قاسم صاحب کا مولوی محمدؐ ہاشم سے کس قدر گہرا تعلق تھا، اُس کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ مولانا محمدؐ قاسم صاحب زمانۂ دراز تک مہینہ میں پندرہ روز دیوبند سے میرٹھ جا کر مولوی محمدؐ ہاشم علی کے ہاشمی پریس میں قیام فرماتے رہے ہیں تاکہ آپ عربی درسی کتب کی طباعت کی

نگرانی اور تصحیح فرمائیں جو مطبع ہاشمی میں طبع ہوا کرتی تھیں۔ اور اس کے لئے بہت ہی حقیر معاوضہ ہاشمی پریس کی جانب سے حضرت مولانا نانوتوی قبول فرماتے تھے

یہ یاد رہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد مولوی ہاشم علی مرحوم نے عربی کی دینی اور درسی کتب کی طباعت کے لئے میرٹھ میں ہاشمی پریس قائم کیا تھا۔ اور یہ اس وقت اپنی نوعیت کا سارے ہندوستان میں واحد پریس تھا۔ جو عربی زبان کی دینی اور درسی کتب شائع کرتا تھا اور ان کتب کی تصحیح اور نگرانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے سپرد تھی۔ مفتی شوکت علی فہمی کو اس بات پر فخر ہے کہ اُن کی والدہ محترمہ اُم کلثوم حضرت مولانا محمد قاسمؒ کی گود میں پلی ہیں جن سے کہ مولانا مرحوم اولاد کی طرح محبت کرتے تھے۔

مفتی شوکت علی فہمی کی پیدائش ۲۴ دسمبر ۱۹۰۴ء کو اپنے نانا مولوی محمد ہاشم علی کے اُس تاریخی مکان میں ہوئی تھی جو محلہ نو محلہ اندر کوٹ شہر میرٹھ میں واقع ہے۔ اور جو تقریباً نصف صدی تک علمائے ہند کی توجہات کا مرکز بنا رہا ہے مفتی شوکت علی فہمی اس علمی فضا میں پلے بڑھے۔ اور چونکہ اُن کے گھرانے کا ماحول ہی علمی تھا۔ اس لئے اُن پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا۔ جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ یہ تیرہ چودہ سال کی عمر میں ہی مضامین لکھنے لگے تھے چنانچہ ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء میں ان کے مضامین بڑی پابندی سے رسالہ پھول لاہور اور رسالہ عصمت دہلی میں شائع ہوا کرتے تھے اور اسی زمانہ میں انھیں شعر و شاعری سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی۔ مفتی شوکت علی فہمی کے ماموں زاد بھائی اور برادر نسبتی محمد انوار ہاشمی ۱۹۲۱ء سے ماہنامہ دین و دنیا دہلی سے شائع کر رہے تھے یہ رسالہ حضرت خواجہ حسن نظامی کی سرپرستی اور مولانا سید ظہور احمد چشتی شاہجہانپوری کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ مولانا سید ظہور احمد چشتی جن کی ادارت میں یہ رسالہ شائع ہوتا تھا۔ اپنے دور کے ممتاز عالم ہی نہیں تھے بلکہ بہت بڑے اہلِ قلم اور بلند پایہ شاعر

شمار کئے جاتے تھے۔ مولانا سید ظہور احمد چونکہ عام طور پر بیمار رہتے تھے اس لئے اس جریدہ کے لئے ایک معاون مدیر کی شدید ضرورت تھی۔ ماہنامہ دین دنیا کے روحِ رواں محمد انوار ہاشمی کو چونکہ مفتی شوکت علی فہمی کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کا شروع ہی سے اندازہ تھا۔ اس لئے وہ ۱۹۲۳ء میں مفتی شوکت علی فہمی کو دین دنیا کی ادارت کی معاونت کی غرض سے میرٹھ سے دہلی لے آئے اور اب مولانا سید ظہور احمد شاہجہان پوری اور مفتی شوکت علی فہمی کی مشترکہ ادارت میں دین دنیا شائع ہونے لگا اور اس کی مقبولیت میں بھی غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔

مفتی شوکت علی فہمی ہندوستان کے دوسرے صاحب ذوق ادیبوں کی طرح شروع ہی سے حضرت خواجہ حسن نظامی کے اندازِ تحریر کو بے حد پسند کرتے تھے۔ دہلی آنے کے بعد چونکہ انھیں حضرت خواجہ حسن نظامی کا قرب حاصل ہو گیا تو اُن کی ادبی صلاحیتیں اور بھی چمک گئیں اور انھوں نے حضرت خواجہ حسن نظامی کے قرب سے خاطر خواہ فوائد حاصل کئے۔ سچ تو یہ ہے کہ مفتی شوکت علی فہمی حضرت خواجہ حسن نظامی ہی کے اسکول آف لٹریچر کے ایک اسکالر ہیں۔ ایک علمی گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے یوں تو اُن میں علمی اور ادبی ذوق ابتدا ہی سے موجود تھا۔ لیکن ان کی صحیح علمی اور ادبی تربیت حضرت خواجہ حسن نظامی ہی کے زیرِ سایہ ہوئی ہے۔ خود خواجہ حسن نظامی اُن کی تحریروں کے بے حد مداح تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے روزانہ اخبار عادل میں شوکت علی فہمی کا جو "قلمی چہرہ" لکھا تھا۔ اُس میں انھوں نے تحریر فرمایا تھا کہ اگر میری کسی تحریر پر شوکت فہمی کا نام ڈال دیا جائے یا شوکت علی فہمی کی تحریر پر میرا نام درج کر دیا جائے تو پڑھنے والا دونوں کی تحریروں میں کوئی فرق محسوس نہیں کر سکتا۔ یہ اتنا بڑا کریڈٹ ہے جو شائد خواجہ حسن نظامی

جیسے بلند پایہ اہلِ قلم نے کسی کو بھی نہیں دیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء سے لیکر ۱۹۴۶ء تک شوکت علی فہمی کے جو مضامین دین دنیا اور دوسرے جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اُن میں حضرت خواجہ حسن نظامی کے اندازِ تحریر کی پوری جھلک پائی جاتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد مفتی شوکت علی فہمی کی تحریر کا رنگ بڑی حد تک بدل گیا۔ اور اُس میں تاریخی اور سیاسی رنگ زیادہ نمایاں دکھائی دینے لگا۔

مفتی شوکت علی فہمی کی ادبی اور صحافی زندگی کی ابتدا اگرچہ ۱۹۲۳ء میں سالہ دین دنیا کی ادارت سے شروع ہوئی ہے۔ لیکن انھوں نے دین دنیا کے علاوہ بھی متعدد اخبارات اور رسائل کی ادارت کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دیے ہیں۔ روزانہ سہ روزہ ہفتہ وار۔ ماہوار جرائد اور اخبارات کی کوئی ایسی صنف نہیں جس کا انھیں تجربہ نہ ہو۔ ۱۹۳۵ء میں حضرت خواجہ حسن نظامی نے جب روزنامہ عادل بڑی آب و تاب سے جاری کیا تو اس اخبار کے چیف ایڈیٹر کے فرائض مفتی شوکت علی فہمی ہی انجام دیتے رہے۔ روزنامہ عادل اپنے ایک مخصوص رنگ کا اخبار تھا جس کا انتظام اہتمام اور ادارت سب کچھ مفتی شوکت علی فہمی ہی کے سپرد تھی۔

عادل کے چیف ایڈیٹر کے فرائض انجام دینے سے قبل ۱۹۲۵ء میں مفتی شوکت علی فہمی نے خود اخبار الہلال کے انداز پر طاقت کے نام سے ایک باتصویر ہفتہ وار اخبار جاری کیا تھا۔ جو اپنی بےلاگ تنقیدوں کے لئے بےحد مشہور تھا خصوصیت کے ساتھ یہ اخبار اُس زمانہ کے امپیریلزم اور والیانِ ریاست کا شدید مخالف تھا چنانچہ اس اخبار پر گورنمنٹ کی جانب سے متعدد مقدمات چلائے گئے۔ اور ان تمام مقدمات میں مسٹر آصف علی بیرسٹر نے جو بعد میں مرکزی وزارت میں شامل ہوئے بڑی قابلیت سے مفتی شوکت علی فہمی اور اخبار "طاقت" کی جانب سے پیروی کی۔

ان مقدمات کے سلسلہ میں مفتی شوکت علی فہمی کو اس قدر مالی نقصانات اٹھانے پڑے کہ آخر اخبار "طاقت" بند کر دینا پڑا۔

اخبار "طاقت" کے بند ہونے کے بعد ۱۹۳۷ء میں مفتی شوکت علی فہمی نے ماہنامہ دین دنیا کو ایک نہایت شاندار باتصویر ہفتہ وار اخبار کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ جو ایک نہایت ہی کامیاب ہفتہ وار اخبار ثابت ہوا ماہنامہ سے ہفتہ وار ہونے کے بعد یہ جریدہ بڑی حد تک ایک ادبی اور سیاسی جریدہ بن گیا جو ۱۹۴۷ء میں اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ تقسیم ہند کے بعد دہلی میں ہنگامے نہیں شروع ہو گئے لیکن ۱۹۴۷ء میں اخبار اور پریس کے پورے عملہ کے پاکستان چلے جانے کے بعد ہفتہ وار دین دنیا کو بند کر دینا پڑا۔

اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ ۱۹۳۵ء میں حضرت خواجہ حسن نظامی نے مفتی علی فہمی کی ادارت میں روزانہ "عادل" جاری کیا تھا جو صرف دو سال تک جاری رہا لیکن اس روزنامہ کے بند ہونے کے بعد ۱۹۳۷ء میں مفتی شوکت علی فہمی نے خود اپنی ملکیت میں اخبار "عادل" کو سہ روزہ کی شکل میں دوبارہ جاری کیا جسے ملک میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ سہ روزہ عادل بڑی آب و تاب کے ساتھ ۱۹۴۷ء تک جاری رہا لیکن ۱۹۴۷ء میں دہلی کے ہنگاموں کی بنا پر جب اس اخبار کا بھی تمام عملہ اخبار دین دنیا کے عملہ کی طرح پاکستان چلا گیا تو اس اخبار کو بھی بند کر دینا پڑا ــــ اسی زمانہ میں سہ روزہ عادل، ہفتہ وار دین دنیا کے ساتھ مفتی شوکت علی فہمی کا ایک اور ماہنامہ "اسلامی دنیا" کے نام سے بھی شائع ہو رہا تھا۔ یہ ماہنامہ ۱۹۳۳ء میں جاری کیا گیا تھا اور اس کی تعداد اشاعت تو دس ہزار تک پہنچ گئی تھی جو اس زمانہ میں شاید کسی جریدہ کی بھی نہ تھی لیکن ۱۹۴۷ء میں دہلی کے ہنگامی حالات سے مجبور ہو کر ماہنامہ اسلامی دنیا کو بھی بند کرنا پڑا یہاں تک کہ مفتی شوکت علی فہمی کا پریس جو تیج پریس کے نام سے چل رہا تھا وہ بھی بند ہو گیا۔ اور اس طرح مفتی شوکت علی فہمی نے

کو بہت بڑا مالی نقصان اُٹھانا پڑا۔

۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں دہلی میں جو تباہی برپا ہوئی تھی، اُس نے مفتی شوکت علی فہمی کے دل و دماغ پر غیر معمولی اثر کیا تھا۔ اُن کے سب ہی معاون اور مددگار پاکستان چلے گئے تھے اور وہ دہلی میں تن تنہا رہ گئے۔ اب نہ کوئی اخبار تھا نہ رسالہ اور نہ اُن کے لئے کوئی کام۔ ایک ایسا شخص جو مسلسل بارہ گھنٹے کام کرنے کا عادی ہو اُس کے لئے اس طرح کی جمود کی زندگی گزارنا بڑا ہی دشوار ہے چنانچہ اب ان کا واحد مشغلہ یہ تھا کہ مطالعہ میں مصروف رہیں اور نئی نئی کتابوں کی تصنیف کے مشغلہ میں لگ جائیں۔

ایک مسلمان کے مطالعہ کے لئے سب سے مقدس کتاب قرآن پاک ہی ہو سکتی ہے لہٰذا وہ مہینوں قرآنِ مجید کا مطالعہ کرتے رہے اور قرآنِ پاک کے جواہر پاروں سے اپنا دامن بھرتے رہے لیکن قرآن کے مطالعہ کے بعد فہمی صاحب کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اگر میں نے خود قرآن کا مطالعہ کر لیا تو اس سے دوسرے مسلمانوں کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا لہٰذا انھوں نے فوراً ہی "ڈکشنری مضامین القرآن" کے نام سے ایک کتاب لکھ دی جس میں کہ پورے قرآنِ پاک کے مضامین کے جواہر پارے ابجد وار ڈکشنری کے طرز پر جمع کر دیئے۔ تاکہ دوسرے بھی ان کے مطالعہ سے فائدہ حاصل کر سکیں۔ اسی طرح بخاری شریف، مسلم شریف، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ جیسی مستند احادیث کی کتب کا مہینوں مطالعہ کرنے کے بعد "اُردو حدیث" کے نام سے ایک ایسی حدیث کی آسان کتاب مرتب کر دی جس سے کہ معمولی استعداد کے مسلمان بھی احادیث سے پورا پورا استفادہ کر سکتے ہیں۔

مفتی شوکت علی فہمی کو شروع ہی سے تاریخ سے غیر معمولی دلچسپی رہی ہے۔

اُن کے پاس تاریخی کتب کا کافی ذخیرہ موجود تھا اور اب جبکہ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں
کے بعد سے اُن کے تمام جرائد بھی بند ہو چکے تھے تو ان کو کافی فرصت تھی۔ لہٰذا
اُنھوں نے مسلم عوام کے فائدہ کے لئے تاریخی کتب کی تصنیف کا ایک
طویل سلسلہ شروع کر دیا۔ سب سے پہلے اُنھوں نے "ہندوستان پر اسلامی
حکومت" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جس میں ہندوستان پر مسلمانوں
کے ہزار سالہ دورِ حکومت کی مکمل سرگزشت ہے اس کے بعد "ہندوستان پر
مغلیہ حکومت" کے نام سے مغلوں کے دور کی مکمل تاریخ لکھ دی۔ اور مغلوں کے
بعد کی تاریخ جو انگریزوں کے دورِ حکومت سے متعلق ہے "انگریز کا شرمناک
دورِ حکومت" کے نام سے سپردِ قلم کر دی۔

تقسیمِ ملک کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں میں احساسِ کمتری پیدا ہو گیا
تھا اور خود مسلمان اپنی زبان سے ایسی باتیں دُہرانے لگے تھے جن سے
ذریعہ پتہ چلتا تھا جیسے مسلمانوں نے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں کوئی
حصہ ہی نہیں لیا ہے۔ اِس احساسِ کمتری کو محسوس کرتے ہوئے اور اسے دُور
کرنے کی غرض سے مفتی شوکت علی فہمی نے "انقلاب کی خونیں تاریخ" کے نام
سے ایک نہایت ہی اہم تاریخی کتاب تحریر کی جس کے ذریعہ تاریخی حقائق سے
یہ بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کے امامِ اوّل مسلمان ہی ہیں اور
آج اس ملک کے باشندے جس آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں اُسے
حاصل کرنے میں مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ غرضکہ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کا
دور جو مسلمانانِ ہند کے لئے بڑی ہی پریشانی اور جمود کا دور تھا اور جس زمانہ میں
کہ عام طور پر مسلمان باتیں بنانے میں اپنا وقت ضائع کیا کرتے تھے اُس
نازک دور سے مفتی شوکت علی فہمی نے سب سے زیادہ فائدہ اُٹھایا۔ اور

کئی ہزار صفحات کی ایسی کتابیں لکھ دیں جو صدیوں تک مسلمانانِ ہند کی رہنمائی کرتی رہیں گی اور پھر دو تین سال کے بعد ہی مفتی شوکت علی فہمیؔ نے "مکمل تاریخ اسلام" کے نام سے ایک نہایت ہی اہم کتاب ملک کے سامنے پیش کر دی جو پوری تاریخ اسلام" کا نچوڑ ہے اور نو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۲ء تک کی پانچ سال کی طویل مدت میں مفتی شوکت علی فہمیؔ کے خورد و نوش کا بھی کوئی معقول انتظام نہ تھا صرف دو دو روٹیاں دوپہر کو اور دو دو روٹیاں شام کو بازار سے منگا لیتے تھے مگر اپنے کام میں پوری طرح منہمک رہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد اگرچہ بظاہر دینؔ دنیا بند ہو چکا تھا لیکن مفتی شوکت علی فہمیؔ اس کے نام کو برقرار رکھنے کے لئے ۱۹۵۲ء تک کئی کئی ماہ کے وقفہ کے بعد دین دنیا برابر نکالتے رہے اگرچہ یہ صرف سولہ صفحات کا معمولی پرچہ ہوتا تھا لیکن جوں ہی مفتی شوکت علی فہمیؔ نے یہ محسوس کیا کہ اب حالات بہتر ہو گئے ہیں تو دسمبر ۱۹۵۲ء میں پوری آب و تاب کے ساتھ دوبارہ دینؔ دنیا جاری کر دیا۔ لیکن ۱۹۴۷ء سے قبل کے دینؔ دنیا میں ۱۹۵۲ء کے دینؔ دنیا میں بہت بڑا فرق تھا۔ ۱۹۴۷ء یا اس سے قبل جو دین دنیا نکلتا تھا وہ بڑے سائز کا ہفتہ وار با تصویر ادبی اخبار تھا لیکن ۱۹۵۲ء میں جو دینؔ دنیا شائع ہوا تو وہ ایک خوبصورت ماہنامہ جریدہ تھا اور مضامین کی نوعیت بھی بدلی ہوئی تھی۔ اب اس میں قرآنِ پاک کی آسان تفسیر تھی۔ احادیث نبویؐ تھیں اور مسلمانوں میں حوصلہ پیدا کرنے والے ولولہ انگیز تاریخی مضامین تھے۔ ایک ایسے دَور میں جبکہ اس ملک کے مسلمانوں کے حوصلے پست ہو رہے تھے ایک ایسے حوصلہ مندانہ مضامین شائع کرنے والے جریدہ کی شدید ضرورت تھی۔ لہٰذا اس جریدہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور چند ماہ کے اندر ہی یہ جریدہ اس ملک میں شمال سے جنوب تک اور

مشرق سے مغرب تک پھیل گیا۔ اور پورے ملک میں اس جریدہ کی ایک ہزار سے زیادہ ایجنسیاں قائم ہوگئیں اور مسلمانوں کے تقریباً ہر طبقہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

دین دنیا کی حیاتِ ثانیہ کا مقصد یہی تھا کہ اس جریدہ کے ذریعہ مسلمانانِ ہند کے گرتے ہوئے حوصلوں کو آگے ابھارا جائے اور مفتی صاحب اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوگئے کیونکہ واقعی اس جریدہ نے مسلمانانِ ہند میں ایک نئی بیداری اور حوصلہ پیدا کر دیا۔ اس جریدہ کے ذریعہ مسلمانوں کو یہ بتا دیا گیا کہ "تم ایک زندہ قوم ہو۔ زندہ رہے ہو زندہ رہو گے۔ تاریخ تمہاری حوصلہ مندی کے واقعات سے بھری ہوئی ہے"۔ یہ امر واقعہ ہے کہ دین دنیا نے مسلمانانِ ہند میں ایک نیا حوصلہ پیدا کرنے میں نہ صرف نمایاں حصہ لیا ہے بلکہ اس جریدہ نے مسلمانانِ ہند میں غیر معمولی سیاسی بیداری بھی پیدا کر دی ہے۔

مفتی شوکت علی فہمی کے اپنے مخصوص نظریات ہیں اور دین دنیا کے ذریعہ وہ ان ہی نظریات کی تبلیغ واشاعت کر رہے ہیں۔ اُن کا نظریہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے صرف روزہ۔ نماز اور حج زکوٰۃ ہی کافی نہیں بلکہ کچھ اور باتوں کی بھی شدید ضرورت ہے اور ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سچا مسلمان وہ ہے جو بلند کردار میں صحابۂ کرام کا مقلد ہو اور جس میں طوفانوں سے ٹکرانے کا حوصلہ موجود ہو۔ اُس کی جان و مال اور سب کچھ ہر وقت اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے لئے وقف رہے۔ . . . موجودہ دور میں مفتی صاحب مسلمانوں میں سیاسی سوجھ بوجھ اور بیداری کو بھی نہایت ضروری سمجھتے ہیں تاکہ وہ مخالفوں کے داؤ پیچ سے ہوشیار رہ سکیں۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے ۱۹۶۳ء میں ایک ماہنامہ جریدہ "سیاسی دنیا" کے نام سے شائع کرنا شروع کیا تھا۔ جو دین دنیا ہی کی طرح ایک خوبصورت اور باتصویر جریدہ تھا۔ اس جریدہ کے نکالنے کا مقصد

یہی تھا کہ مسلمانانِ ہند میں زیادہ سے زیادہ سیاسی شعور پیدا کیا جائے۔ یہ جریدہ تقریباً دو سال تک جاری رہا لیکن مسلم عوام کی بے توجہی کی بنا پر ہزارہا روپیہ کا نقصان اُٹھا کر اسے بند کر دینا پڑا۔

مفتی شوکت علی فہمی بلند کردار مسلمانوں کا ایک زندہ نمونہ ہیں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے دینی مسلک کے پیرو ہیں۔ خلفائے راشدین کے بہت بڑے معتقد ہیں۔ رسول اللہ صلعم اور اہلِ بیتؑ کی جانب اُن کے قلب کا جھکاؤ بہت زیادہ ہے۔ سیاسی اعتبار سے وہ ہندوستان کی کسی بھی سیاسی پارٹی سے منسلک نہیں۔ وہ صرف ملک و وطن کی سرزمین کے سچے وفادار ہیں۔ کانگریس کا چار آنے کا ممبر نہ ہونے کے باوجود اگرچہ شروع ہی سے اُن کا جھکاؤ آل انڈیا کانگریس کی جانب ہے لیکن پھر بھی کانگریس پر بڑی سختی کے ساتھ تنقید کرتے ہیں۔ دین دنیا میں جو ان کے سیاسی شذرات شائع ہوتے ہیں وہ حق گوئی اور حق گوئی کا شاہکار ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان شذرات میں حکومت پر شدید تنقید ہوتی ہے اس لئے حکومت بھی دین دنیا سے خوش نہیں ہے۔ ان شذرات کو ملک کے سب ہی مسلم طبقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ فہمی صاحب کے سیاسی شذرات اور مضامین کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا ہندی گجراتی تامل۔ تیلگو۔ مراٹھی اور ہندوستان کی تقریباً سب ہی زبانوں میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔

دہلی میں ۱۹۲۲ء میں ان کی صحافتی زندگی کا آغاز بھیا احسان الحق کے مکان سے ہوا جو اس زمانہ میں بجلی والان میں اُردو منزل کے نام سے مشہور تھا۔ اور ۱۹۳۱ء سے جامع مسجد سے متصل چھتہ شیخ منگلو میں اپنے ذاتی مکان میں مقیم ہیں۔ یہی رہائشی مکان بھی ہے اور اسی میں دفتر اور پریس بھی ہے عمر ستر کے قریب پہنچ چکی ہے لیکن جوانوں کی طرح مستعد ہیں۔ اب بھی روزانہ بارہ گھنٹے

مسلسل کام کرتے ہیں۔ رات کو جاگنے میں کمال رکھتے ہیں۔ اگر پوری رات جاگتے رہیں یا لکھتے پڑھتے رہیں تو مطلق تھکان یا نیند محسوس نہیں کرتے۔ نیند پر کامل قدرت حاصل ہے۔ جب چاہیں دس پندرہ منٹ کے لیے سو سکتے ہیں۔ اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتے ہیں۔ شیروانی پہنتے ہیں کلین شیو ہیں۔ درمیانہ قد ہے۔ آنکھوں میں ایک خاص چمک ہے۔ راستہ چلتے ہیں تو نوجوانوں کی طرح قدم اُٹھاتے ہیں۔ ابھی تک جوانوں جیسا پھرتیلا پن موجود ہے۔ شادی ۱۹۴۹ء میں کافی عمر میں کی ہے۔ آپ کی اہلیہ مفتی رعایت علی کی صاحبزادی ہیں جن سے آٹھ اولادیں ہیں۔ بڑی لڑکی زرینہ بھی ایم۔ اے کر چکی ہیں۔ بڑے صاحبزادے تعریف فہمی اور منجھلے لڑکے راشد فہمی دونوں بی اے میں ہیں اور باقی سب بچے بھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ آپ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس زمانہ میں لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرکے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے۔

مفتی شوکت علی فہمی اپنے خاندان میں کوئی پہلے اہل قلم نہیں ہیں بلکہ ان کے خاندان میں علمی شغف صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ ان کا خاندان میرٹھ کے تین پرانے معزز خاندانوں پر مشتمل ہے۔ یعنی خاندانِ مفتیان۔ خاندانِ ہاشمیان اور خاندانِ قاضیان جسے مغلوں کے دور سے قضاۃ کا منصب حاصل رہا ہے۔ اب یہ تینوں خاندان آپس میں سینکڑوں برس کے رشتوں کی وجہ سے اس طرح منسلک ہو گئے ہیں کہ بالکل ایک ہی بن گئے ہیں۔ ان کی اولادوں کی رگوں میں مشترک خون دوڑ رہا ہے۔ اس خاندان نے اپنی حریت نوازی کی بنا پر غدر ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کے ہاتھوں بے حد مصائب برداشت کیے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انگریزوں نے اس خاندان کو اپنی دانست میں بالکل کچل کر رکھ دیا تھا۔

مفتی شوکت علی فہمی کے خاندان کو یہ فخر حاصل رہا ہے کہ وہ زمانہ اور ہر

شیخ محمد عثمان آزاد

شیخ عبدالصمد صاحب بستی والوں کی دو بیویاں تھیں۔ محمد عثمان آزاد ان کی دوسری بیوی سے تھے۔ وہ [illegible] میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد شیخ حاجی عبدالصمد صاحب۔ محلہ احاطہ کالے صاحب میں رہتے تھے بہت مخیر اور صاحب حیثیت بزرگ تھے۔ انھوں نے بے شمار روپیہ خرچ کر کے سینکڑوں غریب و بے آسرا مسلمانوں کو دکانیں کرائیں اور اُن کو افلاس و غربت کی پریشانی و بدحالی سے نکال کر خوشحالی کی منزل تک پہنچایا۔ اپنا سارا کاروبار ملازموں اور کارندوں پر چھوڑ رکھا تھا اور اُن پر اندھا دھند اعتماد کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حاجی صاحب کی علالت کے دوران اور وفات کے بعد ملازموں نے سب کچھ کھا پی کر برابر کر دیا۔ اس طرح ان کے تین کمسن بچے محمد عثمان محمد عمر اور محمد الیاس رشیدی خالی ہاتھ رہ گئے۔

عثمان آزاد صاحب نے بجا نگر حبش خاں کے صدیقیہ اسکول میں سات یا آٹھ جماعتیں پڑھیں۔ جوشیلے نوجوان تھے۔ قوم اور ملک کی خدمت کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ لیکن اس وقت مسلمانوں کی کوئی فعال قومی تنظیم یا سیاسی جماعت کا وجود نہ تھا۔ اس لئے دیگر نیشلسٹ مسلمانوں کی طرح یہ بھی کانگریسی بن گئے۔ اور انھوں نے ایک اخبار نکالا جس کا نام "ترنگ" [illegible] تھا۔ اس اخبار

کے اجراء کا معاملہ بھی دلچسپ ہے۔ مشہور صحافی جناب سید سردار علی صاحب اس طرح بیان کرتے ہیں۔

یہ ۱۹۲۸ء کی بات ہے جب سولہ سترہ سال کا ایک گورا چٹا لڑکا اپنے ننھے سے بھائی الیاس رشیدی کی انگلی پکڑ کر روز ٹہلانے لے جاتا تھا، وہ پنجابی سوداگروں کی مشہور بستی احاطہ کالے صاحب میں رہتا تھا۔ اور احاطہ کالے صاحب کے مقابلہ میں لہاروں والوں کی حویلی سے ملحق حاوی منزل کے عقبی حصے میں سکونت رکھتے تھے۔ ریاست اخبار کے دفتر جاتے ہوئے روزانہ اس لڑکے سے علیک سلیک ہوتی تھی۔ ہاں اس لڑکے نے اس نو عمری میں مسلمانوں کی خدمت کے لئے ایک انجمن شبان المسلمین دہلی قائم کر رکھی تھی۔ شاید ڈاکٹر نور احمد اس کے صدر تھے۔ خود آزاد صاحب سکریٹری۔ مولانا مظہر الدین اپنے اخبار الاماں میں شبان المسلمین کی خبر چھاپنے سے انکار کرتے ہیں۔ سولہ سترہ سال کا یہ نو عمر پُر جوش کارکن اپنی خبر لے کر میرے پاس اخبار ریاست کے دفتر پہنچتا ہے۔ میں عذر پیش کرتا ہوں کہ ریاست کی حیثیت ایک ہفت روزہ میگزین کی ہے اُس میں خبریں نہیں چھاپی جاتیں تو عثمان آزاد کی رگ جاں بھڑک اُٹھی۔ سُرخ و سفید چہرہ بھی تمتما اٹھا اکڑ کر دہلی کی مخصوص بولی میں فرمایا۔

”نہ مظہر الدین میری خبر چھاپتا ہے اور تم چھاپتے ہو، وخت وخت (وقت وقت) کی بات ہے میں بھی اپنا اخبار نکال کر الاماں اور ریاست کی ایسی تیسی پھیر دوں گا۔“

مجھے آزاد صاحب کی باتوں پر بے ساختہ ہنسی آ گئی کہ عمر اتنی کم، مالی حالت غیر مستحکم، اور دعویٰ یہ کہ الاماں و ریاست کی ایسی تیسی کر دوں گا۔ میرا ہنسنا غضب ہو گیا۔ دلی کی مخصوص بولی جسے صرف دلی والے جانتے ہیں کہ ٹرین پوری اسپیڈ سے

چل پڑی۔ بولے ایک سکھ کی کرسی؟ بیٹھو کے ہنستے ہو اگر ایک دن تم کو نوکر نہ رکھوں تو عثمان نام نہیں۔

تھوڑے ہی دن گذرے کہ سولہ سترہ سال کے عمر کے اسی عثمان آزاد نے اپنا ایک روزنامہ "قومی گزٹ" بالکل بے سروسامانی کی حالت میں جاری کر دیا۔ نہ کوئی دفتر، نہ کوئی ساز و سامان، اخبار کا پہلا دفتر میرا مکان تھا۔ وہی کمرہ جہاں ایک روایت کے مطابق حضرت غالب کسی الزام میں گرفتار کئے گئے تھے۔ چند ہی روز بعد قومی گزٹ کا دفتر ایک خوبصورت سے مکان میں قائم ہو گیا۔ دو تین میزیں بھی آ گئیں۔ اور چند کرسیاں بھی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مناسب سٹاف بھی ہو گیا جس قومی گزٹ کا پہلا شمارہ، نہایت بے سروسامانی کی حالت میں میرے ہاں مرتب ہوا تھا اس کی چھپائی کے بعد جس کے بنڈل بغل میں دبا کر شیخ محمد عثمان آزاد فروخت کرنے جامع مسجد کے چوک اور مسجد فتحپوری لے گئے تھے اسی قومی گزٹ نے اس کے بعد ایک دو ماہ کے عرصہ میں اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے تھے، اس کی کثرت اشاعت سے سب زیادہ الاآباں متاثر ہوا تھا۔ قرب و جوار کے دیہاتی دہلی آتے تو "قومی گجٹ" کا پرچہ ہاکروں سے طلب کرتے خود نہ پڑھ سکتے، دوستوں کی خوشامدیں کرتے اور پڑھوا کر سنتے۔ حکیم احسان الہٰی صاحب بیان کرتے ہیں۔

عثمان آزاد کے پاس اس وقت دولت کی فراوانی تو تھی نہیں جو باقاعدہ جگہ لے کر آفس بنایا جاتا۔ اور اس میں اسٹاف کام کرتا۔ چھوٹے سائز کا یہ چار صفحوں کا پرچہ احاطہ کالے صاحب کے دروازہ کی بالائی چھت پر نیم منہدم بھیون میں جہاں آج کل فضل حق ہال بنا ہوا ہے شائع ہوتا

تھا۔ ایڈیٹوریل کے فرائض اعزازی طور پر والد بزرگوار صوفی نور الٰہی صاحب
انجام دیتے تھے۔ اور کبھی کبھار اخبار کی چھپائی کا بل بھی اپنے جیب سے ادا
کر دیتے تھے۔ میں نے والینٹری طور پر اخبار کو خاص طور پر برادری میں مقبول بنانے
کا بیڑا اٹھایا تھا۔ صدر بازار میں دکان دکان پھر کر ایک ایک پیسہ کا پرچہ بیچ کر روزانہ
خریدنے کی ترغیب دیتا تھا۔ قومی گزٹ کی پالیسی انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا
تھی اگر آزاد صاحب چاہتے تو کانگریس سے کافی رقم مدد کے طور پر مل سکتی تھی لیکن
آزاد صاحب نے روپے کے عیوض اپنے آپ کو غلام بنانے کا تصور بھی نہیں کیا۔

۱۹۳۰ء میں جب کانگریس کی تحریک نے زور پکڑا اور نمک قانون توڑا گیا
تو آزاد صاحب بھی برطانوی حکومت کے خلاف میدان میں اتر آئے اور کھل کر
انگریزوں کی مخالفت کرنے لگے اور ہندوستان کی آزادی کے مطالبہ پر جُھٹ گئے
کانگریس جو ہندوستان کی اس زمانہ میں ایک سیاسی جماعت تھی۔ اس نے کہا
کہ ہم برطانوی حکومت کو تسلیم نہیں کرتے اس لئے اس کے بنائے ہوئے قوانین
کو بھی تسلیم نہیں کرتے کانگریس کی طرف سے نمک قانون اس طرح توڑا پہلے سادہ
پانی میں نمک گھول کر اسے نمکین کیا پھر ایک چولھے پر رکھ کر پانی کو بھاپ بنا کر
اُڑایا۔ پانی اُڑنے کے بعد برتن میں نمک باقی رہ گیا۔ نمک بنانے کا عمل چونکہ غیر
قانونی تھا اس لئے اس نمک بنانے والے کو قانون کی خلاف ورزی کرنے کے
جرم میں گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ آزاد صاحب نے بھی چاندنی چوک میں نمک قانون توڑا
لیکن پولیس کے آنے میں دیر ہوئی آزاد صاحب گرفتاری سے بچ گئے۔

شراب کی دکانوں پر بھی پکٹنگ جاری تھا۔ آزاد صاحب نے نئی سڑک
کی شراب کی دکان پر پکٹنگ کیا۔ تماشائی جمع ہو گئے۔ یہاں بھی پولیس کے آنے
سے پہلے پکٹنگ ختم ہو گیا۔ دوبارہ بھی آزاد صاحب گرفتار نہ ہو سکے۔

آزاد صاحب نے حکومت کے خلاف سخت لکھنا شروع کیا۔ بالآخر آزاد صاحب گرفتار کر لئے گئے ان کو مجسٹریٹ نے ساڑھے چار مہینے کی سزا، پچاس روپے جرمانہ عدم ادائے گی پر ڈیڑھ ماہ کی مزید سزا کا حکم دیا۔ اور بی کلاس دی گئی۔ کم عمر ہونے کی وجہ سے ان کو لاہور بورسٹل جیل بھیج دیا گیا کچھ عرصہ بعد ملتان سنٹرل جیل روانہ کر دیا گیا۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد آزاد صاحب نے اپنے اخبار کو ترقی دینے پر ساری توجہ مرکوز کی کچھ عرصے بعد آزاد صاحب کی شادی ہو گئی۔ عالمی برادری سے جب برطانیہ پر دباؤ پڑا تو مجبوراً ہندوستان کو بھی آزادی دینے کی باتیں ہونے لگیں۔ قائد اعظم نے دیکھا کہ ملک آزاد ہونے کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں تو انھوں نے مسلم لیگ کی صفوں کو درست کیا، قوم کو اتحاد اور تنظیم کا سبق دیا۔ آپس میں اتحاد پیدا کیا۔ اس طرح انھوں نے مسلم لیگ کو ایک فعال جماعت بنا کر مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بنا کر مسلمانوں کے لئے ایک الگ وطن پاکستان کا مطالبہ حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کر کے اس پر جم گئے سارے ملک میں پاکستان کا پروپگنڈہ کیا ایک ناممکن چیز ممکن بن گئی۔ پاکستان کی حمایت کرنے کے لیے عثمان آزاد صاحب نے اخبار کا نام بدل کر "انجام" رکھ دیا اور اپنی پالیسی تبدیل کر کے مسلم لیگ کا پروپگنڈہ کرنا شروع کر دیا۔ اخبار انجام بہت مقبول ہو گیا اس کی آواز میں وزن تھا اس لئے مقبول ہوتا چلا گیا۔

سردار علی صابری صاحب اخبار انجام کی اجرا اور اختتام کی کہانی اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

شیخ محمد عثمان آزاد نے "قومی گزٹ" کے سلسلہ میں جن دوستوں پر بھروسہ کیا تھا انھوں نے آزاد کے اس عظیم اور حیرت انگیز کارنامے پر دھوکہ اور فریب سے

قبضہ کرلیا۔"قومی گزٹ" شمالی ہند کا مقبول ترین پرچہ تھا جس زمانہ میں اخبار بینی کا ذوق عوام میں کم تھا۔"قومی گزٹ" کی اشاعت پچیس تیس ہزار کے درمیان تھی یعنی "الامان" سے زیادہ اور ریاست سے دُگنی تھی۔"قومی گزٹ" سے اچانک محروم ہو جانا کچھ کم سانحہ نہ تھا۔ میں اُن سے ملا۔ ہشاش بشاش پایا جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں چند دن گزرے کہ نماز فجر کے ذرا دیر بعد ہی میرے پاس پہنچے اور جامع مسجد کی سیڑھیوں کے سامنے مولوی ہوٹل میں "مسکہ بند" کھاتے اور کھلاتے ہوئے بولے میں "قومی گزٹ" کے بجائے ایک نیا اخبار نکالنا چاہتا ہوں نام بتادو۔ میں نے کہا انتقام بولے نہیں نہیں میں نے نام تجویز کرلیا ہے۔ انجام میں کسی سے انتقام نہیں لوں گا سارا معاملہ خدا پر چھوڑتا ہوں۔ اب مجھے دیکھنا ہے کہ میرا اور میرے دشمنوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔

آزاد صاحب ٹھیرے کٹر کانگریسی اور پاداش میں سزائے قید اور نظربندی بھی بھگت چکے تھے۔ دہلی میں چیف کمشنر کا راج تھا، روزنامہ انجام کا ڈیکلریشن ملے تو کیسے۔ اِن دنوں یوپی میں کانگریس منسٹری قائم ہو چکی تھی۔ آزاد صاحب بلا کے ذہین تھے۔ اُنھوں نے میرے ساتھ فوراً میرٹھ یوپی جا کر روزنامہ انجام کا ڈیکلریشن لے لیا۔ درخواست میں یہ لکھا کہ غازی آباد میں کوئی پریس نہیں ہے اس لئے اخبار شائع ہوگا غازی آباد سے لیکن چھپے گا دہلی میں۔ چنانچہ غازی آباد کے ایک مکان پر انجام کا بورڈ لگادیا اور دہلی میں برانچ آفس قائم ہوا لیکن سارا کام ہوتا تھا برانچ آفس میں اور ہیڈ آفس نام کے لئے تھا۔

روزنامہ انجام شائع ہونے سے دشمنوں کا انجام سامنے آگیا۔ وہی "قومی گزٹ" جو آزاد صاحب کی ملکیت میں نہ صرف دہلی بلکہ شمالی ہند میں ایک عظیم ترین پرچہ تھا قبضہ اغیار میں جا کر اس تیزی سے زوال پذیر ہوا کہ دو چار مہینے میں وجود عدم برابر ہو گیا۔ اس کی جگہ روزنامہ انجام نے لے لی۔ عروج و ترقی کے منازل بجلی کی

مقدار سے طے گئے۔ کثرتِ اشاعت میں اُردو کا کوئی پرچہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اور وہ برِ صغیر میں مسلم لیگ کا سب سے بڑا ترجمان ثابت ہوا۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح کو روز نامہ انجام کا انتظار رہتا تھا اور کبھی پرچہ اسی کے ذریعہ جبکہ پرچہ ملنے میں دیر ہو جاتی تو فون کر کے تاخیر کی وجہ دریافت فرماتے تھے۔

روز نامہ انجام پہلا پرچہ تھا جس نے خبروں کے لئے ٹیلی پرنٹر لگایا۔ اور یہی اخبار تھا جس کے کارکنوں نے مسلم لیگ کی تحریک میں حصہ لیا اور مجھ سمیت سب نے قید خانہ کی ہوا کھائی۔ یہی تو مردِ مجاہد تھا جس نے انجام نے مسلم لیگ کے پیغام کو ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پہنچایا۔ مسلم لیگ کی حمایت میں ایک نظم شائع کرنے کی پاداش میں دو سال قید سخت کی سزا ہوگئی۔ مولانا ظفر اللہ شہید کے بعد یہ پہلا مسلمان لیگی تھا جس پر قاتلانہ حملہ ہوا۔

کانگریس نے مسٹر آصف علی بیرسٹر کو اپنا امیدوار نامزد کیا تھا۔ دہلی میں ہندو ووٹروں کی اکثریت تھی۔ اس لئے مسلم لیگی امیدوار کے کامیاب ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا مگر عثمان آزاد مسلم لیگ ہائی کمانڈ کے اشارہ پر امیدوار کھڑے ہوئے وہ الیکشن میں کامیاب نہ ہو سکے مگر مسلمانوں کے ووٹ کثرت کے ساتھ عثمان آزاد صاحب کو ملے۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کو برطانوی حکومت کی جانب سے تقسیم کے فیصلہ کا اعلان ہوتے ہی عثمان آزاد صاحب نے کراچی سے انجام کا ایڈیشن نکالنے کا فیصلہ کر لیا اور جولائی کے آغاز تک دہلی سے اسٹاف کی ایک معقول تعداد اپنے بھائی محمد عمر فاروق صاحب کی سربراہی میں کراچی بھیج دی۔

پاکستان دُنیا کے نقشے پر نمودار ہوا تو روز نامہ انجام کراچی پہلا ہاجر پرچہ تھا جس نے ایک نئے وطن کا خیر مقدم کیا۔ مشرقی پنجاب کے بعد دہلی میں قتل عام شروع

ہوگیا جس میں مسلمان ہی تھے۔ روزنامہ انجام کا یہ کام تھا کہ مہاجرین کے جو لٹے پٹے قافلے کراچی آتے تھے اُن کی خیریت اور نام اور پتے درج کرنے کے لئے اخبار کے ڈیڑھ دو کالم روزانہ وقف تھے قیام پاکستان کے کچھ عرصہ کے بعد تک دہلی سے بھی روزنامہ انجام مسٹر نہیم الدین کی ادارت میں نکلتا رہا۔ دہلی کے انجام میں کراچی کے انجام سے مہاجرین کی تفصیلات نقل کی جاتی تھیں اور دہلی کے پریشان حال مسلمان اپنے بچھڑے ہوئے بھائیوں کی خیریت دریافت کرنے کے لئے جو کچھ دہلی کے انجام میں شائع کراتے تھے وہ حرف بحرف کراچی کے انجام میں شائع ہوجاتا تھا۔ اس طرح نازک اور پُرآشوب دور میں برِصغیر کے مسلمانوں کے درمیان ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ قائم ہوگیا تھا۔ بعد میں دہلی کے روزنامہ انجام کو حکماً بند کردیا تھا۔

عثمان آزاد صاحب بہت دلیر تھے کسی کے سامنے جھکنا نہیں جانتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ بڑی ہمت سے کام لیا۔ اور عوام کے حقوق کی ترجمانی کی۔ مارشل ایوب خاں کے سخت دورِ حکومت تک انھوں نے بنیادی جمہوریت کے نظام اور عائلی قانون کی سخت مخالفت کی اور مسلسل کئی آرٹیکل راقم الحروف (سردار علی صابری) سے لکھوائے کراچی میں جب فیلڈ مارشل ایوب خاں نے ۲۹ رمضان کی رات نو دو بجے رویت ہلال کا اعلان کیا۔ تو انجام پاکستان میں واحد پرچہ تھا جس نے تیسویں روزے کی حمایت اور سرکاری عید کی پُرزور مخالفت کی تھی۔ ۱۲ ستمبر کو جب کچہری روڈ والے مکان کی نچلی منزل میں آزاد صاحب کی لاش کفن میں لپٹی ہوئی رکھی تھی اور لوگ مرنے والے کا آخری دیدار کر رہے تھے میں پُرنم آنکھوں میں ماضی کی یادوں میں گم تھا۔ اُس مردِ باخدا کی میّت ہے جس کے دل میں اسلام اور انسانیت کا درد تھا جس نے دمہ کے خوفناک مرض کے دوران بھی ایک روزہ قضا نہیں کیا۔

جو دہلی میں اس نازک وقت پر بھی جبکہ قتل عام کی تیاری ہو رہی تھی رمضان المبارک میں مولانا عبدالحلیم صدیقی کی اقتدا میں تراویح پڑھنے کے لئے لال تنکوں کی مسجد میں جایا کرتا تھا۔ اور بیماری کی حالت میں بھی دس پارے سنتا تھا۔ اور رمضان المبارک کا احترام سچے دل سے کرتا تھا۔ اور جس کا حکم تھا کہ دن کے وقت دفتر میں کچھ کھانا پینا تو درکنار کوئی شخص سگریٹ وبیڑی بھی نہیں پی سکتا تھا وہ اسٹاف کے افطاری کا انتظام بڑے ذوق وشوق اور بڑے پیمانہ پر کرتے تھے آخری کاپی بھیجنے وقت اگر سحری کا وقت ہوتا تو سب کو لذیذ ترین نہاری کھلائی جاتی تھی۔

یہ مسلمانوں اور عوام کے اس غیرت مند عاشق کی حیثیت ہے کہ جس نے دہلی کے ڈیفنس کے زمانہ میں حوض قاضی کے ایس۔ ایچ۔ او کو جو مسلمانوں اور غریبوں کے ساتھ زیادتی اور بے انصافی کر رہا تھا۔ اس کو عثمان صاحب نے بر سر عام گالیاں دی تھیں اور انسپکٹر سے کہا تھا کہ ان غریب لوگوں کو کیا ستاتا ہے تو مجھے گولی مار کر دیکھ تیری گولی بعد میں چلے گی اور تیری گردن توڑنے کے لئے میرا ہاتھ پہلے اٹھے گا۔ یہ اسلام کے اس عاشق جانباز کی حیثیت ہے جو دہلی کے زمانۂ قتل عام میں جبکہ جامع مسجد میں سبزی منڈی قرول باغ کے چودہ پندرہ ہزار پناہ گزین تھے۔ مسجد کی نمازیں بند ہو چکی تھیں۔ مسجد کے عظیم الشان صحن میں تباہ شدہ لوگوں کو دھوپ سے بچنے کے لئے پردے تان رکھے تھے۔ دروازے میں بچے پیدا ہو رہے تھے، عثمان آزاد برہنہ میلے کپڑے پہنے ہوئے قمیص کی جیب میں نوٹوں کی گڈیاں رکھ کر آتے اور بے سہارا لوگوں کو خاموشی سے تقسیم کر دیتے تھے پھر لال کنوئیں سے جامع مسجد تک راستہ ان کے آنے جانے کا تھا یہ راستہ مقتل بنا ہوا تھا لیکن وہ آتے جاتے اور اپنا کام کر لیتے تھے۔ آزاد صاحب کا عقیدہ اور ایمان تھا کہ موت کبھی وقت سے پہلے نہیں آسکتی۔ اس سے ڈرنا بیکار ہے۔

سہارنپور کے الیکشن میں نواب زادہ لیاقت علی خاں کے مقابلہ میں
کانگریس کے اُمیدوار مسٹر کاظمی کو ہزاروں ووٹوں سے شکست ہوئی۔ کچھ عرصہ
کے بعد کاظمی صاحب کے کسی رشتہ دار کا انتقال ہوا۔ ان کے جنازہ میں مسلمانوں
نے شرکت نہیں کی روزنامہ انجام نے یہ خبر پہلے صفحہ پر نمایاں سرخیوں کے
ساتھ شائع کی تو کاظمی صاحب نے عثمان آزاد، محمد عمر فاروقی اور علی احمد کاتب
کے خلاف مظفر نگر میں ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا۔ پیشی اس زمانہ میں
لگی جب میرٹھ و مظفر نگر کے قرب وجوار میں قتل عام شروع ہو گیا تھا اور
ٹرینیں لٹنے لگی تھیں۔ آزاد صاحب اور اُن کے ساتھی تاریخ مقررہ پر
مظفر نگر پہنچ گئے۔ واپسی پر ریل مودی نگر پہنچی، اس کا ڈرائیور انجن لیکر فرار ہو گیا۔
درندوں نے ٹرین پر حملہ کر دیا۔ بے شمار لوگ شہید ہو گئے اور آزاد صاحب فاروقی
صاحب اور علی احمد کاتب کو ایذائیں دیکر قتل کرنے کے لئے کسی دوسرے مقام پر اُتار
لیا گیا۔ اسٹیشن پر زخمی عورتوں، مردوں اور بچوں کی چیخ وپکار سے ایک قیامت
برپا تھی مگر عثمان آزاد صاحب اطمینان سے پلیٹ فارم بیٹھے ہوئے تھے۔ واقعی
موت وقت سے پہلے نہیں آتی۔ اچانک مسلح افواج کے کچھ نوجوان
موقع پر پہنچ گئے۔ اُن میں سے بعض کے دلوں میں انسانیت ختم نہیں
ہوئی تھی۔ انھوں نے آزاد صاحب اور تھوڑے سے بچے کچھے مسلمانوں
کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ اور دوسرے انجن کا انتظام کرنے کے بعد
دہلی پہنچا دیا۔

حکیم احسان الٰہی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ

"ایوب خاں کے زمانہ میں جب اُنھوں نے تمام قومی
اخباروں کو قومیانے کے لئے پریس ٹرسٹ بنایا۔ تو جتنے

کو آزاد صاحب کے پیچھے لگا دیا تو آزاد صاحب جی سے ایسے
متاثر ہوئے کہ بغیر پیسہ پائی لئے سادے کاغذ پر دستخط کر کے
اخبار انجام ان کے حوالے کر دیا۔ بالآخر ناا ہل کار ندوں
کے ہاتھوں جانے کے کچھ عرصے کے بعد اپنی موت آپ مر گیا۔
اس کا آزاد صاحب کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ عرصہ سے
دمے کے مریض تھے۔ ایک دن دمے کا دورہ پڑا جو جان لیوا
ثابت ہوا اس طرح آزاد صاحب ۱۱ ستمبر سنہ ء کو فوت
ہو گئے۔ اناللہ و انا الیہ راجعون [۱]

---

[۱] یادرفتگان مضمون سردار علی صاحب، حکیم احسان الہٰی۔

خان بہادر حافظ محمد صدیق ملتانی

دہلی کے معززین کا ذکر آئے گا تو لازمی طور پر خان بہادر حافظ محمد صدیق ملتانی کا بھی ذکر آنا چاہیے۔

حافظ صاحب ۱۸۶۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد کا نام شیخ رحیم اللہ تھا۔ حافظ صاحب نے فقہ و حدیث کی تعلیم مولوی نذیر احمد صاحب سے حاصل کی۔ دین سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ آپ کی پوری زندگی، طہارت، نیکی، تقویٰ اور پرہیزگاری کی ایک بے داغ تصویر نظر آتی ہے۔ خدمتِ خلق اور رفاہِ عام کے کاموں میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ آپ کا شمار دہلی کے ان لوگوں میں ہوتا تھا، جن کی رائے اور مشورہ حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا تھا۔ دور و نزدیک کے لوگ مشورہ، تعاون اور رہنمائی حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ ہمہ وقت انہی مسائل میں گھرے رہتے تھے۔ پوری زندگی دوسروں کے لیے سوچنے اور ان کے کام آنے میں گذاری۔

وہ اپنے دور کے نامور شخصیت تھیں دہلی کی معزز و باوقار ہستیوں میں ان کا شمار ہوتا تھا سیاسی مجالس ہوں یا سماجی، ادبی محفلوں ہوں یا ثقافتی، مذہبی جلسے ہوں یا دیگر تقاریب ہر جگہ اور ہر مقام پر وہی نظر آتے تھے گویا اپنے وقت میں سوسائٹی کی ناک سمجھے جاتے تھے۔ اس کے باوجود ذرہ برابر بھی غرور تکبر نام کو نہ تھا کسر نفسی اُن کا شیوہ تھا۔ سر تا پا اخلاق و مروّت کی تصویر تھے۔

کیا بڑے اور کیا چھوٹے ہر ایک سے جھک کر ملتے تھے۔ خوش گو، خوش پوش، خوش اطوار، خوش مزاج غرضکہ باعتبار شگفتگی اور شائستگی کا پیکر تھے۔ جیسا کہ بزرگوں کا شیوہ و طریقہ رہا ہے۔

۲۲ سال مسلسل اور بلا مقابلہ دہلی میونسپل کمیٹی رکن منتخب ہوئے۔ جو آپ کی ہر دلعزیزی کا بین ثبوت ہے۔ آپ جس علاقہ کے نمائندے تھے۔ وہ نمبر ۱۳، ۱۴ کہلاتا تھا یعنی قطب روڈ سے لے کر سبزی منڈی تک جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو برادری والوں ہی نے نمائندہ نہ چنا تھا۔ بلکہ دہلی کے عام مسلمانوں اور ان علاقوں کے باشندوں نے بھی آپ کو اپنے حقوق کی نیابت سونپی تھی۔ جہاں برادری والوں کی کوئی آبادی سرے سے موجود نہ تھی۔ حکومت بھی آپ کو صاحب الرائے اور عوام کا نمائندہ سمجھتی تھی۔ اس لئے شہری انتظام اور شہری دفاع وغیرہ کے لئے وقتاً فوقتاً جو کمیٹیاں بنائی جاتی تھیں ان میں آپ کا نام بالعموم شامل ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں آپ کو خان صاحب اور اس کے بعد غالباً ۵ سال بعد خان بہادر کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ آپ انجمن وکیل قوم پنجابیان کے بانیان میں سے ہیں۔ پنجابی اسکول، فتحپوری مسلم ہائی اسکول اور نذیریہ لائبریری کے قیام میں آپ کا بنیادی اور کلیدی حصہ رہا ہے۔ دہلی میں ابتداء میں دہلی پنجابی برادری کا کوئی ایسا مرکزی ادارہ موجود نہ تھا جو ناداروں کی خبر گیری کا فریضہ انجام دے۔ یہ ضرور ہوتا تھا کہ رمضان المبارک میں کوئی دن مقرر کر کے محلوں کے اندر نادار خواتین اور بچے جمع کر لئے جاتے تھے اور ان کو زکوٰۃ کے پیسے تقسیم کر دئے جاتے تھے۔ اسے اس وقت کی اصطلاح میں "بارہ بڑتا" کہتے تھے اس طریقہ کو حافظ صاحب پسند نہیں کرتے تھے۔ اس پوری صورت حال پر غور کرنے کے لئے برادری کے چند بزرگ سر جوڑ کر بیٹھے جن میں حافظ صاحب

کے علاوہ حافظ محمدؐ صدیق چاندنہ، حافظ عبدالسلام لالٹین والے، شیخ انعام اللہ چپل والے، شیخ محمدؐ صدیق پنّی والے، شیخ رکن الدین صاحب تواڑے والے اور شیخ کرم الٰہی گلگٹ والے وغیرہ ان تمام بزرگوں نے مشورہ کرنے کے بعد انجمن کی داغ بیل ڈالی۔ حافظ عبدالسلام صاحب اس کے پہلے صدر، اور حافظ محمدؐ صدیق اتانی اس کے سکریٹری، اور حاجی محمدؐ صدیق صاحب چاندنہ خازن مقرر کئے گئے۔ کارکنوں کے اخلاص اور انتھک محنت کے سبب یہ پودا دیکھتے ہی دیکھتے ایک شاداب باغ میں تبدیل ہو گیا۔ انجمن کا قیام غالباً ۱۹۰۵ء کو عمل میں آیا تھا۔ انجمن نے لاکھوں بندگانِ خدا کی امداد کی۔ اس کے تحت اسکول ٹرسٹ، قبرستان، مساجد، مکاتیب اور فیض رسانی کے دیگر اداروں نے کام کیا اور اب تک کسی نہ کسی طرح سے فیض عام جاری وساری ہے۔

انجمن کے قیام کے مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ برادری کے افراد سے زکوٰۃ کا روپیہ لے کر برادری کے غرباء میں ماہانہ وظائف یکمشت امداد کی صورت میں تقسیم کیا جائے تاکہ وہ گھر گھر جانے اور ہر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ذلت سے بچ جائیں۔ تحصیل زکوٰۃ کی اپیل کا جو اشتہار انجمن کی طرف سے شائع ہوتا تھا اس پر یہ شعر درج ہوتا تھا ؎

من زر از قوم خواہم دہم قوم راہم

حافظ صاحب سالہا سال تک انجمن قوم پنجابیان کے صدر اعلیٰ رہے۔ ۱۹۰۷ء میں انجمن نے برادری کے بچوں کے لئے ایک اسکول جاری کیا جس کا نام پنجابی اسکول تھا۔ یہ اسکول ابتداء میں تیسری جماعت تک تھا بعد میں چوتھی جماعت کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ تاجر پیشہ برادری ہونے کی وجہ سے اس وقت کی یہ اہم ضرورت تھی۔ اس سے پہلے برادری کے بچے دکانوں پر شاگردی کر کے بچپن سے

اسکول اور دوسرا مشن ہائی اسکول اس وقت ایک اور ہائر سکنڈری اسکول کی ضرورت محسوس کی گئی۔ حافظ محمدؐ صدیق ملتانی صاحب نے یہ خواہش ظاہر کی اگر مسجد فتحپوری کی چھت اس کام کے لئے مل جائے تو اس پر اسکول کے قیام کے لئے ایک منزل تعمیر کی جا سکتی ہے چنانچہ پیرزادہ صاحب اور خان بہادر حاجی رشید احمدؐ صاحب کوششوں کے نتیجے میں اس کی اجازت مل گئی۔ حافظ صاحب کے علم میں یہ بات تھی کہ شیخ حاجی محمدؐ ابراہیم جاپان والے نے کچھ رقم انہی مقاصد کے لئے وقف کی تھی جو حاجی محمدؐ اسماعیل صاحب کی تحویل میں ہے، وقت کی بات ہے' ان سے تعاون کے لئے کہا گیا اور وہ فوراً تیار ہو گئے۔ اس طرح اس رقم سے مسجد کی چھت پر اسکول کے لئے کمرے اور ایک وسیع ہال تعمیر کیا گیا۔ اس ہال میں طلبا ء ، ادبی مجالس اور مذاکرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ اس اسکول کے پہلے سکریٹری حاجی محمدؐ صدیق ملتانی منتخب ہوئے، بعد میں وہ اپنی علالت اور دیگر مصروفیات کے باعث اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے۔ اور پھر یہ بار حاجی رشید احمدؐ صاحب نے اٹھایا۔ تقسیم ہند کے بعد یہ اسکول قائم نہ رہ سکا۔

پھاٹک حبش خاں دہلی میں علمی اور دینی کتب کے ذخیرے سے سالہا سال ایک قابلِ قدر پبلک لائبریری قائم کی گئی جس کا نام نذیریہ لائبریری تھا۔ اس میں بڑی قیمتی، قدیم، نادر کتب موجود تھیں تقسیم کے بعد اس جائیداد پر ایک غیر مسلم کا قبضہ ہو گیا جس میں یہ لائبریری قائم تھی۔ اس شخص نے یہ کوشش کی کہ لائبریری والا کمرہ بھی کسٹوڈین سے اپنے نام الاٹ کرا لے۔

اس جائیداد پر جس نے قبضہ کیا تھا۔ اس نے کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب کو جو اس وقت دہلی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ اس مقصد کے لئے درخواست دی۔ مہندر سنگھ بیدی خود چل کر حافظ محمدؐ صدیق ملتانی کے پاس آئے اور ان کو

ہمراہ لے کر لائبریری کا معائنہ کیا۔ اور حافظ صاحب سے تبادلۂ خیال کر کے بیدی صاحب نے اس کی درخواست نامنظور کرتے ہوئے فیصلہ دیا کہ لائبریری ختم نہیں کی جا سکتی۔ اگر وقتی طور پر اس سے استفادہ نہیں کیا جا رہا ہے تو کچھ دن کے بعد ضرور کیا جا سکتا ہے۔ لائبریری سے واپس ہوتے ہوئے حافظ صاحب کا پیر سیڑھیوں پر سے پھسل گیا۔ گر پڑے جس سے ان کے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اور چوٹیں بھی آئیں۔

ن کے علالت کے دوران انجمن کے اجلاس آپ کے مکان پر ہوا کرتے تھے حالانکہ وہ اُس وقت صدر بھی نہ تھے لیکن انجمن کے اراکین اُن کے شورے اور رفاقت کو ضروری خیال کرتے تھے۔

۲۰ مارچ ۱۹۵۱ء کو بروز جمعہ حافظ محمد صدیق صاحب نے کراچی میں انتقال فرمایا۔ اپنے بچوں اور اہلِ خاندان سے ملنے کے لئے گئے تھے۔ اس طرح یہ روشن شمع یک لخت گل ہو گئی لہ إنا للہ وانا الیہ راجعون۔

لہ یادِ رفتگاں مؤلفہ سلطان رفیع مضمون مشتاق احمد لقمانی صفحہ ۲۴۹

علامہ عبدالحق حقانی دہلوی

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے صاحب زادوں نے سب سے پہلے
ہندوستان میں اردو تفسیر اور ترجمہ کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ
صاحب نے تفسیر فتح الرحمٰن شاہ عبدالعزیز صاحب نے تفسیر فتح العزیز شاہ رفیع
الدین صاحب نے ترجمہ قرآن اور شاہ عبدالقادر صاحب نے تفسیر موضح القرآن
تحریر فرمائی۔ اُن کے بعد اور حضرات نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ اور قرآن مجید کے
ترجمے اور تفسیر لکھی۔ اُن حضرات میں مولانا عبدالحق حقانی بھی ہیں جنہوں نے
تفسیر حقانی تالیف فرمائی۔ مولانا عبدالحق صاحب ابن خواجہ محمد امیر شیخ علوی کابلی
الاصل تھے۔ عالمگیر کے عہد میں یہ بزرگ ہندوستان آئے اور دہلی میں سکونت اختیار
کی اُن کے مورث اعلیٰ حضرت خواجہ شمس الدین تبریزی تھے آپ کے دادا کو رئیس
کو تحصیل مل گئے اُن کے والد ماجد نے بعد میں گنگھڑ میں قیام کیا۔ پھر دہلی میں مستقل
رہنا شروع کر دیا۔ مولانا عبدالحق صاحب ۲۷ رجب ۱۲۶۵ھ کو گنگھڑ میں پیدا
ہوئے۔ استاد اُن کے حضرت مولانا مفتی محمد لطیف اللہ علی گڑھی، مفتی محمد یوسف
صاحب لکھنوی۔ مولانا عبدالحق مہاجر مکی سے ۱۲۸۸ھ میں علوم دینی تحصیل کی اور دہلی
میں مولانا نذیر حسین صاحب محدث دہلوی سے استفادہ کیا۔ آپ کو صوفیائے کرام سے
عقیدت تھی۔ آپ قادریہ سلسلے میں مولوی سید عالم سے اور نقشبندیہ میں حضرت مولانا

شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی سے بیعت ہوئے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ابتدائی کاموں میں مولانا حقانی نے حصہ لینا شروع کیا۔ ندوۃ العلماء کا بنیادی جلسہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کانپور میں دستار بندی کے موقع پر ہوا۔ اس میں ندوۃ العلماء کی بنیاد رکھی گئی۔ ایک سال تک ملک کے کونے کونے میں اس کا پروپگنڈہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ سال سے زیادہ ہو گیا۔ تو ۱۵، ۱۶، ۱۷ شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲، ۲۳، ۲۴ اپریل ۱۸۹۴ء کو مدرسہ فیض عام کانپور میں پہلا اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت حضرت مولانا لطف اللہ علی گڑھی نے فرمائی۔ اس وقت مولانا عبدالحق صاحب حقانی کو ندوۃ العلماء کی پہلی نشست میں دستور العمل پیش کرنا تھا۔ یہ کام آپ کو حضرت مولانا محمد علی مونگیری نے سونپا تھا لیکن آپ وقت مقررہ پر تشریف نہ لاسکے تو علامہ شبلی نے صدر جلسہ کی اجازت سے دستور العمل پیش کیا جس میں طے پایا کہ پہلے ایک مخصوص جلسہ کیا جائے اس میں اس کو پیش کیا جائے

دوسری نشست ۱۶ شوال کو صبح چھ بجے ہوئی۔ سید محمد شاہ محدث رامپوری نے جلسہ کی صدارت فرمائی۔ سب سے پہلے مولانا عبدالحق حقانی صاحب نے ندوۃ العلماء کے فوائد اور اغراض و مقاصد پر بڑی گرمجوشی کے ساتھ تقریر کی اس کے بعد مولانا محمد ابراہیم صاحب آروی مہتمم مدرسہ احمدیہ آرہ مولوی خلیل صاحب نے تقریریں کیں۔ اس جلسہ میں دستور العمل منظور ہوا۔ اور چار تجویزیں پاس ہوئیں پہلی تجویز تھی کہ موجودہ طریقہ تعلیم قابل اصلاح ہے۔ یہ تجویز سوائے ایک صاحب کے اختلاف کے کثرت رائے سے منظور ہوئی اور تمام علماء نے اس بات کو تسلیم کیا کہ موجودہ طریقہ تعلیم میں اصلاحات ہوں۔

اسی وقت بارہ اشخاص پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل کی گئی جس کا کام نصاب تعلیم پر غور کر کے جلد از جلد اپنی سفارشات پیش کرنا تھا اس کمیٹی میں مولانا عبدالحق حقانی کے علاوہ مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی مولانا محمد علی مونگیری مولانا محمد حسین الہ آبادی

مولانا شاہ سلیمان پھلواری، مولانا شبلی نعمانی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولانا محمد حسین بٹالوی اور مولانا ظہور الاسلام فتح پوری شامل تھے۔ ان حضرات سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ دوسرے علماء خصوصاً حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے اس مسئلہ میں رابطہ قائم کریں۔ اور مشورہ کر کے نصاب تعلیم تجویز کریں۔

مولانا عبد الحق حقانی دہلوی اور حضرت مولانا محمد علی مونگیری نے حضرت مولانا لطیف اللہ علی گڑھی سے تعلیم پائی تھی۔ اس طرح آپ دونوں حضرات حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی سے بھی بیعت تھے۔ اس لئے دونوں میں محبت و یگانگت تھی۔ ایک دوسرے کو صحیح اور دیانت دار سمجھتے تھے اور معاملہ فہمی کے بھی قائل تھے اس لئے مولانا عبد الحق حقانی دہلوی ہر معاملہ میں مولانا محمد علی مونگیری کی ہمنوائی و تائید فرماتے تھے اور مولانا محمد علی مونگیری کے مخالفین کو حق پر نہیں سمجھتے تھے۔ پہلے اجلاس کے بعد ندوۃ العلماء کے خاص ارکان اور دوسرے حضرات نے حضرت مولانا محمد علی مونگیری ناظم ندوۃ العلماء کی پوری توجہ کے ساتھ ندوۃ العلماء کو ترقی دینے کی کوشش کی اور خصوصاً مولانا عبد الحق حقانی دہلوی نے بڑی دلسوزی اور ولولہ کے ساتھ یہ فریضہ انجام دیا۔ دہلی، بمبئی اور حیدر آباد دکن میں جا کر سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے ندوۃ العلماء کی حمایت میں اور مخالفوں کے جواب میں پُر زور اور مؤثر تقریریں کیں اور لوگوں کو آمادہ کیا۔ ان حضرات کی وجہ سے اور ان کی انتھک کوششوں کی بناء پر ندوۃ العلماء کو مالی فوائد بھی حاصل ہوئے۔ مولانا شاہ سلیمان پھلواری اور مولانا عبد الحق حقانی دہلوی، مولانا حکیم ظہور الاسلام فتح پوری، مولانا فتح محمد تائب لکھنوی اور مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی بھی اس مہم میں پیش پیش رہے جس کی وجہ سے مختصر سے عرصہ میں ڈھاکہ سے پشاور اور حیدر آباد دکن تک نہ جانے کتنے سرد و خفتہ لوگوں کو ان حضرات نے گرمایا اور بیدار کیا اور کتنی ہستیوں میں اُمید و یقین کی شمع روشن کر دی۔

چنانچہ مولانا محمد علی مونگیری ناظم ندوۃ العلماء اس مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا مسرت کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں "اس مبارک انجمن کی ایک سال کی عمر ہوئی۔ اور اس ایک سال کی عمر میں اس نونہال نے کس قدر عالمگیر شہرت اور قابل قدر وقعت حاصل کی جس کو فضل ربانی اور تائید ایزدی کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے ہندوستان کا کوئی شہر کوئی قصبہ کوئی قریہ ایسا نہیں جہاں اس کا ذکر خیر نہ پہنچا ہو کوئی دانشمند ایسا نہ ہوگا جو امید کی نظروں سے اسے نہ دیکھتا ہو کوئی سچا اور بہی خواہ اسلام ایسا نہ ہوگا جو اس کی رفتار و گفتار پر ہمہ تن گوش نہ ہو وہ علماء اور مشائخ اس جلسہ میں منزلیں طے کر کے آئے جو اپنے شہر میں عام جلسوں میں شریک نہ ہوتے تھے بعض علماء کی زبان سے یہ بھی سنا گیا کہ الٰہی یہ کیسی مقناطیسی کشش ہے کہ بے اختیار اس قدر دور دراز سے ہم چلے آئیں اگر کوئی بادشاہ بھی بلاتا تو اس مسرت کے ساتھ اپنا روپیہ صرف کر کے نہ آتے۔ الغرض یہ شہرت یہ دلفریبی تائید غیبی کی خبر دیتی ہے۔ اس عرصہ میں ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس ۱۰ شوال ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۲ اپریل ۱۸۹۵ء کو قیصر باغ میں صبح ۹ بجے شروع ہوا۔ مولانا محمد علی مونگیری صاحب کی تحریک سے مولانا سید محمد شاہ محدث رام پوری صدر جلسہ منتخب ہوئے۔ اس اجلاس میں بھی مولانا عبد الحق حقانی وغیرہ تقریر کرنے اور ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد کو پھیلانے اور سمجھانے میں پیش پیش رہے تیسری نشست میں مولانا محمد علی مونگیری صاحب نے شعبہ افتاء کے قیام کی تجویز پیش کی تو مولانا عبد الحق حقانی اور مولانا شاہ سلیمان پھلواری نے اس کی تائید میں اپنی تقریر فرمائی۔

ندوۃ العلماء کے اصلاحی اور ترقی پسندانہ اقدامات کے خلاف جن لوگوں نے مخالفانہ پروپگنڈہ کرنا شروع کر دیا تھا کہ تمام کتب ندوۃ مفصلاً بالاستیعاب ملاحظہ ہوں تو آپ پر خود عیاں ہو جائے گا کہ ترک مذہب و اختیار دہریت کی کھلی کھلی دعوتیں دی گئیں عجب

اہل سنت کی صریح توہین کی گئی ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا جو انگریزی پڑھانے پر بے حد اصرار کرنے لگا کہ انگریزی کی باقاعدہ تعلیم کا پورا انتظام کیا جائے لیکن مولانا محمد علی مونگیری جلت کو مفید نہیں سمجھتے تھے نہ تھی وہ تدریجی طور پر نرم روی کے ساتھ تبدیلیوں کے حامی تھے۔ مولانا عبدالحق حقانی، حضرت مولانا محمد علی مونگیری کی پالیسی اور طریقۂ کار کے حامی تھے۔ اور مخالفین کے طریقوں سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ مولانا محمد علی مونگیری صاحب نے اختلافات اور اپنی خرابیٔ صحت کی بنا پر نظامت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ ندوۃ العلماء کا دسواں اجلاس ۳،۴،۵ ،۱۲ ،۱۶ شوال ۱۳۲۲ھ مطابق ۲،۳،۴ جون ۱۹۰۴ء کو مدارس میں ہوا۔ مولانا عبدالحق حقانی کا نام اس اجلاس کی صدارت کے لئے پیش ہوا۔ چنانچہ آپ نے صدارت کی ایک گھنٹہ تک ندوہ کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کی اسی اجلاس میں مولانا عبدالحق حقانی نے تجویز کے طور پر مولانا محمد علی مونگیری کا استعفیٰ پیش کیا۔ آپ نے فرمایا مولانا مستعفی ہو گئے ہیں۔ یہ جلسہ ان کا استعفیٰ منظور کرتا ہے۔ اس استعفے کے بعد مولانا محمد حسین الہ آبادی صاحب ندوۃ العلماء سے کنارہ کش ہو گئے۔ مولانا عبدالحق حقانی تو ساتھ رہے لیکن وہ دلچسپی نہیں رہی جو پہلے تھی۔

مولانا صاحب بڑے ذی علم اور ادیب بھی تھے، درس و تدریس اور تصنیف کا مشغلہ مدت العمر رہا۔ حکیم اجمل خان صاحب نے آپ سے بھی تعلیم پائی۔ ریاست حیدر آباد دکن سے آپ کو معقول وظیفہ ملتا تھا۔ کچھ عرصہ کلکتے کے مدرسہ عالیہ میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ آپ کی خداداد ذہانت قابلیت و لیاقت کو دیکھ کر حکومت برطانیہ نے شمس العلماء کا خطاب دیا تھا۔ مولانا عبدالحق حقانی بہت سادہ مزاج دوست نواز، بڑے خلیق، ملنسار، مدبر، مرجع عوام و خواص اور مرنجاں مرنج بزرگ تھے۔ جہاں سے جس طرح بھی ممکن ہو سکا۔ انھوں نے دل کھول کر اسلام کی خدمت کی۔ آپ اسلام میں فرقہ بندی کو ناپسند کرتے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں دہلی کے معززین اور سربر آوردہ لوگوں نے

ایک انجمن حمایت الاسلام، یتیم خانہ اور لڑکے لڑکیوں کا اسکول قائم کیا تھا۔

اس کے اصل بانی منشی کرم اللہ خاں دہلوی تھے۔ حکیم اجمل خان مولوی عبدالاحد صاحب، حکیم ظہیرالدین، حکیم رضی الدین، نواب غلام محمد حسن، مولانا عبدالرحمٰن راسخ دہلوی، مولوی محمد دین صاحب، خان بہادر محمد اکرم اللہ خان، مولانا عبدالحق حقانی، محمد الٰہی بخش، وغیرہ حضرات اس کے سرگرم کارکن اور سرپرست تھے۔ یتیم خانہ اور اسکول کی غرض یہ تھی کہ مسلمان لڑکے اور لڑکیوں کے سکول نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان لڑکے اور لڑکیاں عیسائی سکولوں میں داخل ہو کر عیسائی مذہب اختیار کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس طرح یتیم خانہ نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان لاوارث بچے مشنریوں کے ہاتھوں میں چلے جاتے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کے یتیم خانے اور اسکول قائم ہونے چاہئیں۔ (مولانا محمد علی مونگیری)

مولانا عبدالحق حقانی نے ۱۹۱۱ء میں انجمن ہدایت الاسلام دہلی میں قائم کی تھی جس کا مقصد اسلام کی حقانیت اور خوبیوں کا اظہار کرنا اس کی تعلیم و اشاعت کی طرف توجہ دلانا۔ مخالفین اسلام کا جواب دینا اور عیسائیوں کی شرارتوں کو رد کرنا تھا۔ ان مقاصد کو پھیلانے کے لئے انجمن نے ایک رسالہ "الہدایت" دہلی سے جاری کیا تھا جس کے سرپرست مولانا عبدالحق حقانی تھے۔ مولانا عبدالحق حقانی ویسے جامع الکلام تھے مگر مفسر قرآن بڑے پایہ کے تھے۔ قرآن مجید سے ان کو خاص لگاؤ تھا۔ چنانچہ آپ نے تفسیر حقانی آٹھ جلدوں میں تالیف کی ــــــ

یہ تفسیر اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ آپ نے ایک "البیان" بھی لکھی ہے۔ جو مذہبی اسلامی لٹریچر میں ایک عمدہ اضافہ ہے جس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوا تاکہ یوروپین اقوام بھی اسلام کی حقانیت سے واقف

دا گاہوں اس کتاب میں وجود ملائکہ حشر و نشر پر روشنی ڈالی گئی ہے عقائد اسلام بھی آپ کی تصنیف ہے۔ آپ کا دہلی میں ۱۹۱۶ء کو انتقال ہوا آپ کے صاحب زادے ابوالحسن حقانی سے جواب فوت ہو چکے ہیں۔

مولانا عبدالرحیم دہلوی قادری

حضرت مولانا کا خاندان سلطان محمد غوری رحمۃ اللہ علیہ اور سکندر لودھی کے عہد در زمانہ میں آیا ان کے اُمراء میں شامل ہوا اور سرکاری خدمات انجام دینے کے سلسلہ میں مختلف مقامات پر منتقل ہوتے رہے۔ مثلاً دہلی، بجنور، گور بنگالہ، بریلی محلہ، نور محلہ اور حیدر آباد دکن وغیرہ۔

آپ کے آباؤ اجداد مستقل طور پر ۱۱۹۱ھ میں ہندوستان میں آباد ہوئے۔ اور آپ کے جد امجد میر سیف اللہ خان نظام الملک کی فوج میں اپنے والد سید حیدر خان کی جگہ حیدر آباد دکن میں ایک عمدی کے لشکر کے سردار مقرر ہوئے تھے۔ ۱۸۲۲ء میں انھوں نے اپنا فوجی منصب چھوڑ دیا تھا اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ دہلی روانہ ہوگئے مگر دوران سفر برہان پور ضلع کھنڈوہ فوت ہوگئے تاہم ان کے صاحبزادے میر عبداللہ خاں نے جو شاہ مولانا عبدالرحیم صاحب کے والد تھے بمعہ اپنے خاندان کے خیر وعافیت کے ساتھ دہلی پہنچ گئے۔

شاہ مولانا عبدالرحیم ۱۸۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ آپ دو سال کے تھے کہ دہلی میں ابتدائی تعلیم میر عبداللہ خاں صاحب سے شروع کی اور دہلی میں حضرت حافظ محمد فضل عظیم قادری پشاوری رحمۃ اللہ علیہ سے قرآن مجید کی تعلیم کا آغاز کیا مگر وہ کسی وجہ سے پشاور چلے گئے تو اپنے استاد محترم سے مزید تعلیم کے لئے آٹھ سال کی عمر میں

پشاور پہنچے اور تمام مشقتیں اور تکلیفیں اس چھوٹی عمر میں برداشت کیں اور پشاور میں کلام اللہ ناظرہ پڑھا اس کے بعد! استاد محترم کے مشورہ، ایماء اور ہدایت کے مطابق حضرت اخون شاہ محمد عبد الغفور صاحب قادری کی خدمت میں سیدو شریف سوات پیر میں حاضر ہوئے، ان سے قرآن مجید حفظ کیا اس کے بعد باطنی اور روحانی تعلیم کے ساتھ عربی صرف و نحو اور فقہ کی تعلیم بھی حاصل کی۔ اور حضرت اخوند صاحب سے بیعت ہوئے مجاہدانہ بیعت کو بھی منظور کیا۔ اور اُن کے ساتھ جنگِ آزادی میں بھی شرکت فرمائی۔

حضرت مولانا عبد الغفور صاحب جہاں ایک مقبول ترین پیشوا تھے۔ اس طرح حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی طرح مردِ مجاہد بھی تھے۔ انگریزوں کی غلامی کے سخت ترین مخالف تھے۔

گوشہ نشینی کے زمانہ میں حضرت سید احمد شہید بریلوی جب سرحد میں جہاد کے لئے تشریف لائے۔ جمادی الاول ۱۲۴۲ھ دسمبر ۱۸۲۶ء میں تو آپ حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ معرکہ میں شامل ہوئے۔ پہلا معرکہ سکھوں سے درخیبر میں ہوا۔ اس میں آپ نے شرکت فرمائی۔ اس کے بعد جب امیر کابل دوست محمد خاں نے سکھوں کے خلاف اعلانِ جنگ۔ ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۵ء میں کیا۔ جو تھکال اور جمرود کے مقام پر جنگ لڑی گئی تو آپ موضع سلیم خاں سے بہت سے غازی صوفی اور شاگردوں کے ہمراہ درخیبر میں شامل ہوئے لیکن امیر دوست محمد خاں اور اس کے فوجی جنگ کی تاب نہ لاکر شکست کھا گئے۔ اس کے بعد ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں سیدو کے مقام پر قیام فرمایا جہاں حفظِ قرآن، دارالعلوم، مجاہدین کا مرکز اور اسلحہ کا کارخانہ اور طالبانِ حق کو ارشاد تلقین کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جو اشخاص آپ سے بیعت کی درخواست کرتے اس سے آپ شریعتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور

بدعات ورسومات بد سے بچنے کا عہد لیتے تھے اور اس کے ساتھ یہ عہد بھی لیا جاتا تھا کہ انگریز دشمن اسلام کی نوکری نہیں کریں گے اس کے بعد اگر کوئی شخص بیعت ہونے کے بعد نوکری کر لیتا تو اس کو خانقاہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

حضرت اخوند صاحب نے اسلام کی عزت اور مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی سے بچانے کے لئے پھر دعوت دی اور تنظیم شروع فرمائی۔ علماء ومشائخ پیرزادوں اور خانوں کو جمع فرما کر اس آنے والے خطرے کو ان کے سامنے رکھا اور فرمایا حضرت سید علی غواص ترمذی عرف پیر بابا رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد سے حضرت سید اکبر شاہ صاحب ترمذی کو امیر بناؤ اور ان کی زیر قیادت انگریزوں سے مقابلہ کرو۔

حضرت سید اکبر شاہ صاحب ستھانہ کے رہنے والے تھے۔ سید احمد بریلوی کے مجاہدین کا ان کے پاس مرکز تھا۔ مجاہدین کے اول امیر شیخ محمد پھلتی ہوئے ان کے بعد حضرت مولانا ولادعلی عظیم آبادی مقرر ہوئے جب حضرت مولانا نصیر الدین صاحب دہلوی نواسہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب بن حضرت مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی ۱۲۵۰ھ میں مجاہدین کے مرکز میں پہنچے تو امیر مقرر ہوئے۔ چھ سال امیر رہ کر ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء وصال فرما گئے۔ ان کے بعد حضرت مولانا سید عبدالرحیم امیر مقرر ہوئے اور حضرت اخوند مولانا عبدالغفور صاحب کو شیخ الاسلام مقرر کیا گیا تمام مقدمات، تنازعات اور جھگڑوں کو شریعت کے مطابق فیصلے فرماتے تھے۔ اس کا پہلا دارالسلطنت موضع غالیگی مقرر ہوا۔ سنت نبوی کے مطابق نظام حکومت چلنے لگا اور رسومات بد اور بدعات مٹنے لگیں، تقریباً سات سال بڑی پرامن حکومت قائم رہی حالانکہ انگریزوں نے ہر قسم کی چالیں چلیں کہ یہ اسلامی حکومت ختم ہو جائے اور اتحاد و نظم وضبط بکھر جائے اور اپنی خود غرضیاں

ہوئے کار لائی جائیں۔ حضرت سید اکبر شاہ نے ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء میں وفات
پائی جس سے آپ کو سخت پریشانی ہوئی۔ اتحاد و تنظیم کے بکھرنے کا خطرہ تھا۔ دوسرے
ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ناکام ہوئی۔ اس کا بہت صدمہ ہوا۔
آپ نے پھر تنظیم کی کوشش فرمائی۔ مجاہدین و سادات نے اپنے بچاؤ کا پورا انتظام کیا۔
حضرت اخوند صاحب نے اپنے علاقہ میں جہاد کا اعلان فرمایا اور معتقدین کو حکم فرمایا
کہ اپنی بساط کے مطابق ہتھیار اور کھانے پینے کا سامان لے کر فوراً میدان جنگ میں
پہنچ جائیں۔ آپ نے نماز جمعہ منگورہ میں ادا کی اور لوگوں کو دعوت جہاد فرمائی اور
فضائل جہاد بیان فرمائے اور فرمایا اگر انگریز اس علاقہ پر قابض ہو گئے تو میں یہاں سے
ہجرت کر جاؤں گا۔ غرض آپ امبیلہ پہنچے، جہاں میدان جنگ تھا وہاں انگریز
کمشنر کا خط آپ کو ملا جس میں اس نے لکھا تھا کہ انگریز اس وقت بہت بڑی طاقت
کے مالک ہیں۔ آپ لوگ بے فائدہ قتل کر دیتے ہیں۔ مجاہدین انگریز کے نئے سامان جنگ
کا مقابلہ کس طرح کر سکتے ہیں۔ آپ بزرگ ہیں گوشہ نشینی اختیار فرمالیں۔ ہم صرف مجاہدین
زندگی سے ملنے آئے ہیں جو آپ کے ہی مخالف ہیں۔ آپ نے جواباً تحریر فرمایا کہ اگر
انگریز بڑی طاقت رکھتا ہے لیکن اس سے بھی بڑی طاقت موجود ہے جس نے ابرہہ کو
ابابیلوں سے اور فرعون جیسی طاقت کو دریا میں غرق فرما دیا اور نمرود جیسے خدائی کا
دعویٰ کرنے والے کو مچھر جیسی حقیر چیز سے ہلاک کرا دیا۔ بے شک میں درویش اور
فقیر ہوں لیکن آپ بھول گئے کہ درویشوں اور فقیروں پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔

یہ جنگ ۱۲۸۰ھ یا ۲۰ اکتوبر ۱۸۶۳ء میں شروع ہوئی۔ سر چیمبرلین سابق
وزیر اعظم برطانیہ سپہ سالار تھا۔ مجاہدین اور انگریزوں میں کئی معرکے ہوئے۔ اس
جنگ میں نواب سعادت خان ریاست دیر سے حضرت مولانا آخوند زادہ محمد غزنے
خان نقشبندی والد ماجد حضرت نسیم احمد صاحب جو حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے

سلسلے سے منسلک تھے اس سلسلے کے دوسرے بزرگ حضرت غازی عمر خان، نیک قال اور فیض خان نقشبندی بھی شامل ہوئے۔

بہر حال آپ اور آپ کی جماعت مل کر مجاہدین کے شانہ بشانہ انگریز سے بڑی بہادری سے ساتھ لڑتے رہے۔ اس وقت آپ پر عجیب حالت طاری تھی۔ بیقرار و بیتاب ہو کر مقابلہ کرتے اور مجاہدین کو ترغیب دیتے اور ہاتھ اٹھا کر دعا فرماتے تھے۔ الٰہی بہ فتح اسلام   بکن غرق خصم بد انجام

آپ نے تقریباً ۵۰ سال مسند ارشاد تلقین اور دعوت اصلاح و تبلیغ اور جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف رہ کر ۸۶ سال عمر پا کر ۷ محرم ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۲ جنوری ۱۸۷۸ء جمعہ کے روز صبح کے وقت فوت ہوئے۔

حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب دہلوی حضرت اخون صاحب کے پاس کافی عرصہ رہنے کے بعد اخون صاحب کے حکم سے دہلی تشریف لے آئے۔ یہاں کتب درسیہ حدیث و تفسیر اور طب کی تحصیل کر کے دوبارہ سیدو شریف حاضر ہوئے جب باطنی تعلیم اور روحانی و سیاسی تربیت مکمل ہو گئی تو حضرت نے آپ کو اجازت خلافت عطا فرمائی آپ کے اساتذہ مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا کریم اللہ دہلوی، حضرت شاہ عبد الغنی دہلوی المعروف بہ حاجی میاں محدث مہاجر مکی و مجددی، سید عثمان مرغنی مدنی اور طب حکیم احسن اللہ خاں دہلوی، حکیم فیض علی گرگانہ والے سے حاصل کی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد آپ نے بنگال رجمنٹ میں تعلیمی ملازمت اور امامت اختیار فرمائی اور پندرہ سال تک فوجیوں کو عربی و فارسی پشتو پڑھاتے رہے۔ اعلیٰ انگریز افسر آپ کے شریفانہ اخلاق اور علمی قابلیت کے ہمیشہ معترف رہے۔ ملازمت کے آخری زمانہ میں حج کے لئے حجاز مقدس حاضر ہوئے۔ واپسی پر اکثر علما مشائخ نے اصرار کیا۔ اور علاقہ ہریانہ میں رسوم بد کے خلاف کوشش کریں جبکہ

راجپوت کے مسلمان نکاح بیوگان کا نام لینے والوں کو مار ڈالتے تھے اور کسی بڑے سے بڑے پیر و مرشد کی پروا نہیں کرتے تھے۔ آپ نے ان تمام عادات کے خلاف سعی کی اور وعظ و نصیحت کی۔ اور چھوٹی چھوٹی کتابوں کے ذریعہ اشاعت کی۔ اپنا خرچ خود برداشت کرتے تھے کسی سے کوئی نذرانہ نہیں لیتے تھے۔ ایک دفعہ رہتک کے بیوپاریوں سے گانا بجانا اور ڈھول باجے بجانا سے توبہ کرائی انھوں نے پانچ سو روپے نذرانہ پیش کیا۔ آپ نے تمام روپیہ مسجد کی تعمیر و مرمت میں خرچ کرایا

آپ کی تصانیف یہ تھیں:۔

رسالہ صرف، مراق القرآن قرات و تجوید میں روضتہ النعیم وعظ میں رحمۃ رحیم حضورؐ کے ذکر مبارک میں اور تزویج الایامیٰ ادر فتح سنت، کفر توڑ، رسم چھوڑ، مکر مروڑ، سانڈوں کی شادی، کتاب اللغات، تحفۃ الصبیان فارسی منظوم، اجیتا وغیرہ وغیرہ۔

ان کتابوں کے طبع کرانے میں نواب صاحب محمد محمود علی خان چھاری نواب شائستہ خاں، نواب مرتضیٰ خاں، نواب سعلی خاں۔ رئیس جہانگیرآباد حاجی فیض احمد خاں رئیس دہلی نواب محمد سعادت خاں والے دو جانہ نے آپ کی ہر ممکن معاونت کی۔ آپ نے جھجر ضلع رہتک میں جامع مسجد اور مدرسہ قوت الاسلام رحیمیہ قائم فرمایا۔ وفات ۱۲ ذیقعدہ ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۵ء بروز سہ شنبہ ظہر و عصر کے درمیان دہلی میں پائی بعض احباب نے تاریخ وفات "قدرضی اللہ عنہ" لکھی۔ نماز جنازہ جامع مسجد دہلی میں پڑھی گئی۔ درگاہ خواجہ باقی باللہ میں دفن ہوئے۔ آخری عمر میں درد گردہ کی بیماری کی وجہ سے پچپن سال کی عمر میں فوت ہوئے تھے۔ آپ کے پانچ صاحبزادے۔ شاہ جمیل الرحمٰن، مولوی امان الرحمٰن اور کیپٹن حبیب الرحمٰن، سعید الرحمٰن۔ حافظ عشاق الرحمٰن اور ایک صاحبزادی مصور غم استاذی علامہ راشد الخیری دہلوی کی اہلیہ تھیں۔

شیخ عبدالسلام بی اے

شیخ صاحب ۵ ؍اگست ۱۹۰۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام شیخ سراج الدین پالش والے تھا۔ جو حویلی حسام الدین حیدر نئی بلیماران میں رہتے تھے۔ شیخ عبدالسلام صاحب نے ابتدائی تعلیم سینٹ اسٹیفن مشن اسکول موری گیٹ سے پائی۔ یہاں سے میٹرک کرنے کے بعد انھوں نے سینٹ اسٹیفن کالج کشمیری گیٹ دہلی میں داخلہ لیا اور وہاں سے گریجویشن کیا۔ یہ غالباً ۱۹۲۰ء کی بات ہے۔ اس زمانہ میں امتحانات پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ہوا کرتے تھے کیونکہ ترکِ موالات کا زمانہ تھا۔ سرکاری اداروں کا بائیکاٹ کیا ہوا تھا۔ اس لیے بی اے کرنے کے باوجود شیخ صاحب یونیورسٹی کانوکیشن میں ڈگری لینے نہیں گئے۔ ان کے اس وقت کے ہم جماعت طلبا میں شیخ عبدالمالک عبدالرزاق، محمد ابراہیم برادر خورد شیخ محمد تقی ایڈووکیٹ، ضمیر احمد ہاشمی سابق کلکٹر آف کراچی اور ڈاکٹر ایس، اے ہاشمی شامل تھے۔

اُنھوں نے کچھ عرصہ امیر علی قمبا کو کمپنی دہلی میں شیخ ریاض الدین شملہ والوں کی زیرِ نگرانی کام کیا اور پھر کاروبار کے بعد عالیہ بامبے کے ساتھ بمبئی چلے گئے اور مختلف کاروباری لائن میں کام کیا اور دُور دراز کے سفر اختیار کئے بعد میں وہ دہلی میں مقیم ہو گئے اور وہیں کاروبار شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں ان کو ملکی سیاست

میں ۱۹۴۷ء کو دلچسپی پیدا ہو گئی جو ان کی فطرت اور طبع کے عین مطابق تھی کیونکہ وہ ایک درد مند دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔ مسلمانان ہند سماجی، سیاسی اقتصادی اعتبار سے پس ماندہ تھے ان کا ہر طرح سے استحصال کیا جا رہا تھا۔ ان پر ملازمتوں تعلیمی اداروں، فوج اور سرکاری محکموں کے دروازے بند تھے۔ جب ظلم و استحصال انتہا کو پہنچ گیا تو بالآخر خوابیدہ مسلمان جاگا۔ اس نے مسلم لیگ کی حمایت کی جس میں شیخ عبدالسلام بھی شامل تھے۔

مسلم لیگ کی تحریک میں حصہ سرگرم حصہ لینے کے بعد وہ دہلی صوبہ مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے۔ قائداعظم محمد علی جناح، نوابزادہ لیاقت علی خاں اور دیگر مسلم زعماء سے اُن کے قریبی تعلقات تھے۔ اور یہ رہنما شیخ عبدالسلام کی خدمات جلیلہ کی باعث ان کی بڑی عزت اور احترام کرتے تھے۔ شیخ عبدالسلام نے دہلی کے مظلوم مسلمانوں کے سیاسی مقدمات کی پیروی، مسلم لیگی کارکنوں کی حفاظت جان و مال کی حفاظت کی۔ اسی زمانہ میں نیتاجی سوبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج کے کرنل عبدالرشید خاں کی گرفتاری کے نتیجہ میں مسلمانوں نے بھی احتجاج کیا۔ اور دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کے الزام میں شہر دہلی کے بیشتر مسلم لیگی علامہ بلیاوی آزاد۔ عبداللہ شمیم ایڈیٹر چنگاری دہلی، مولانا حامد علی قریشی مہتمم انجمن حیات الاسلام دہلی واحد قریشی، سردار علی صابری اور رام کمال وغیرہ وغیرہ پر مقدمات چلائے گئے۔ ڈھائی ڈھائی سو روپے جرمانوں کی سزا ہوئی۔ شیخ عبدالسلام صاحب نے نہ صرف ان مسلمانوں کی قانونی معاونت کی بلکہ ان کے جرمانے کی مجموعی رقم بھی اپنے جیب سے ادا کی۔

شیخ عبدالسلام صاحب کو مسلمانوں کے سیاسی حیثیت اُجاگر کرنے ہی سے دلچسپی نہیں تھی۔ بلکہ وہ اُن کی تعلیمی، سماجی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانے

کا جذبہ رکھتے تھے انھوں نے اُن کی بے لوث خدمت کی۔ لیکن ذرہ برابر بھی صلہ لینے
کی کوشش نہیں کی۔

شیخ عبدالسلام صاحب دہلی کی پنجابی برادری کے رہنماؤں میں سے تھے۔
ان کو برادری کی ترقی و فلاح سے بڑی دلچسپی تھی۔ ایک ایسے دور میں جبکہ برادری
کے اندر تعلیم کے حاصل کرنے کا شوق اور جذبہ نہ ہونے کے برابر تھا شیخ صاحب نے خود
اعلیٰ تعلیم حاصل کی بلکہ انجمن وکیل قوم پنجابیاں کے قائم کردہ پنجابی اسلامیہ ہائی اسکول
کے قیام میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس سے برادری کے تعلیم میں فروغ حاصل ہوا۔ بلکہ
ترقی کے راستہ پر لگی۔ شیخ عبدالسلام سالہا سال تک پنجابی اسکول کے سکریٹری رہے
سے۔ انہی کے زمانہ میں یہ اسکول ہائر سکنڈری اسکول بنا۔ اس میں سائنس کی
تجربہ گاہ قائم کی گئی اور اسکول کے ہارڈنگ ہال میں الیاس میوزیم تیار مکمل ہو
آیا۔ آپ اینگلو عربک کالج دہلی کی گورننگ باڈی کے رکن رہے تھے۔ اور اسپینہ کراز نو
سے ایک سرگرم ممبر بھی رہے تھے۔ نیز بیڈمنٹن کلب دہلی جو برادری کے افراد کی سماجی
سرگرمیوں اور تقریبات کے انعقاد کا مرکز تھا آنریری سکریٹری تھے ان کو بیڈمنٹن
کھیلنے کا شوق بیڈمنٹن کلب لیکر مل گیا۔ تھا انھوں نے برادری کی جانب سے دہلی
میونسپل کمیٹی چیمبر میں ممبری کے دو بار مسلم لیگ پارٹی منظوری اور
اس کے لیڈر منتخب ہوئے۔ اس پلیٹ فارم سے انھوں نے دہلی کے عوام کی
فلاح و بہبود کے لئے انتھک اور بے لوث کام کیا۔ وہ دہلی میونسپلٹی کی مختلف
کمیٹیوں میں منتخب کئے گئے انھوں نے وہاں رہ کر قابل قدر کام انجام دیا۔ ان میں
تعلیمی کمیٹی ڈسٹرکٹ ٹیکس کمیٹی اور ہسپتال کمیٹی شامل تھیں۔ شیخ عبدالسلام نہ
صرف انجمن وکیل قوم پنجابیاں کے ایک سرگرم رکن تھے اس کے لئے پورا وقت
دیتے اور اس کی کارروائیوں میں پوری پوری دلچسپی لیتے تھے بلکہ برادری میں اصلاحی کام

کے داعیان میں سے تھے۔ انھوں نے دہلی میں محلہ محکمہ جلسہ کر کے پنجاب لیگ کی داغ بیل ڈالی اور اصلاحِ رسوم کی تحریک کے لئے میدان تیار کیا۔ خلاف ورزی کرنے والوں کے ہاں کوئی تک بھی نہیں جاتا تھا اور ہر تدبیر سے ان کو باز رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس سلسلہ میں شیخ عبدالسلام پر گندگی پھینکی جاتی تھی اُن کو اور اُن کے ساتھیوں کو گالیاں سنائی گئیں اور لاٹھیوں سے زخمی کیا گیا لیکن وہ صبر و تحمل کے ساتھ کام کرتے رہے جس کے بعد برادری کا ایک جلسۂ عام فتحپوری مسلم اسکول ہال میں منعقد کیا گیا۔ جہاں ایک جامع لائحۂ عمل منظور کر کے تحریک کا باقاعدہ آغاز کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ تک تو تحریک اصلاحِ رسوم کامیابی سے چلی مگر جلد ہی اس کی مخالفت شروع ہوگئی۔ اسی انتشار میں ایک "اینٹی پنجابی مسلم لیگ" بھی قائم ہوگئی جو اصلاحِ رسوم کے پروگرام میں ترمیم چاہتی تھی جس سے تصادم کی فضا پیدا ہوگئی اور پنجابی لیگ کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ بعد میں پنجابی لیگ کے خاتمہ پر پنجابی یوتھ لیگ کے نام سے نوجوانوں کی ایک اور جماعت قائم ہوئی۔ شیخ عبدالسلام صاحب نے اس کی ہمت افزائی فرمائی۔

شیخ عبدالسلام بڑے خوش خلق، ہنس مکھ، ملنسار، نیک طینت اور ایک سچے مسلمان تھے وہ نماز روزے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی سختی سے پابندی کرتے تھے رمضان شریف میں باقاعدہ تراویح پڑھتے، دوبار حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اپنی والدہ سے اس درجہ محبت کرتے تھے کہ بلا ناغہ صبح گھر سے نکل کر سب سے پہلے والدہ ماجدہ سے ملنے جاتے تھے۔ دیر تک ان کے پاس بیٹھ کر اُن کی دلجوئی فرماتے تھے اور پھر کام یا کاروبار کی طرف رخ کرتے تھے۔

ان کے سامنے بڑی سے بڑی مشکل آتی تھی تو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے، اُن پر کسی بھی قسم کی تنقید کی جاتی یا مخالفت میں کہا جاتا یا اُن کو کتابی

ہدف ملامت بنایا جاتا وہ کبھی صبر و ضبط کا دامن نہیں چھوڑتے تھے نہ کسی کی برائی کرتے تھے۔ اُن کا دل بڑا وسیع تھا کسی کو بھی تکلیف میں دیکھتے تو ان کو تکلیف پہنچتی وہ ہر اپنے پرائے کا دُکھ بانٹتے اور اس کی خوشی میں شریک ہوتے تھے وہ اپنے دن رات میں چند ہی گھنٹے ذاتی کاموں یا نجی مصروفیات کے لئے رکھتے تھے ورنہ ان کا بیشتر وقت آنے جانے والوں اور ضرورت مندوں کی خدمت اور دلجوئی میں ہی بسر ہوتا تھا کوئی بھی ان سے ملنے آتا خواہ وہ چھوٹا یا بڑا امیر ہو یا غریب فوراً اپنے کاموں، گھریلو مصروفیات اور راحت و آرام چھوڑ کر پہلے اس کی بات سنتے اور جو کچھ اس کے لئے کر سکتے تھے۔ اس کے بعد اپنی اور اپنے بال بچوں کی خبر لیتے وہ بڑے بلند حوصلہ، بڑے نڈر، بڑے فراخ دل، بڑے مستقل مزاج اور بڑے عالی ظرف انسان تھے۔

پاکستان کے بننے کے بعد ۱۹۴۷ء میں تمام ہندوستان خصوصاً دہلی میں بڑے پیمانہ پر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور بڑا قتل عام ہوا جس میں مسلمان ہی زد میں آئے اس موقعہ پر شیخ عبدالسلام صاحب نے بڑی جرأت اور بے خوفی کے ساتھ دہلی اور قرب و جوار کے مسلمانوں کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا۔ اور اپنی جان پر کھیل کر لاتعداد بے گناہوں کی جان، مال اور عزت کو بچایا۔ وہ بے دھڑک فساد زدہ علاقوں میں جا پہنچتے، کئی بار ان کی موٹر کار فسادیوں کے نرغے میں گھر گئی مگر وہ کبھی اس سے خوفزدہ نہ ہوئے اور اپنے کام میں لگے رہے اسی جرم کی پاداش میں حکومت نے اُن کے متعدد وارنٹ گرفتاری جاری کئے۔ دہلی میں جائے پناہ نہ پاکر وہ لاہور آگئے۔ یہاں اُس وقت کے وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خان صاحب نے ان کو پاکستان ریفیوجی ریلیف کونسل کا اعزازی کارکن مقرر کیا جس کے تحت کام کرکے انہوں نے ہندوستان سے ہجرت کرکے پاکستان آنے والے تباہ حال مسلمانوں کی

زبردست خدمت انجام دی۔ مہاجرین کی حالتِ زار دیکھ کر ان کا دل بھر آتا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے۔ انھوں نے مہاجرین کی آبادکاری اور ان کو برسر روزگار کرانے کے سلسلہ میں زبردست خدمت انجام دی اس کے بعد وہ کراچی چلے آئے اور یہاں اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ انھوں نے الشان میں ایک جینگ فیکٹری بھی قائم کی۔ وہ آخری دنوں میں جمعیت پنجابی سوداگران دہلی کی مجلس منتظمہ کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔ اور انھوں نے برادری کے اجتماعی کاموں میں نمایاں حصہ لیا۔ وہ دہلی مرکنٹائل سوسائٹی اور ایسوسی ایشن کی مجلس عاملہ کے ممبر رہے۔

انسان پیدا ہوتا ہے جانے کے لئے۔ آن کے بھی جانے کا دن آیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوا آگیا۔ ۲۲ مئی ۱۹۶۰ء کو شیخ عبدالسلام اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انّا الیہ راجعون۔

شیخ عبدالسلام کے انتقال کی خبر لوگوں پر کڑکتی بجلی بن کر گری اور جس نے بھی سنا اپنا کلیجہ تھام کر رہ گیا۔ کسی کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ بڑے بڑے طوفانوں اور مصائب و آلام ہنس ہنس کر جھیلنے والا وہ کڑیل اور مضبوط انسان یوں دیکھتے دیکھتے چٹ پٹ ہو کر جائے گا۔

شیخ عبدالسلام صاحب کی وفات پر ماہانہ سوداگر نے ایک خصوصی نمبر نکالا۔ جس میں اکابرین اور زعمائے برادری نے اپنے ذاتی تاثرات بیان کئے اور یوں ایک روشن باب اپنے اختتام کو پہنچا یا غفار یا سبوح

۱۳۷۹ھ

قطعہ ہائے تاریخ بروفات شیخ عبدالسلام بی اے۔

تاریخ ہائے الم آگیں

۱۳۷۹ھ

شمیم صہبا متھراوی صاحب سے

نیک دل، فخرِ قوم، فخرِ وطن — جو خدمات میں تھے جو مشہور
ہوئے رخصت جہانِ فانی سے — باغِ جنت میں پہنچے جب مغفور
دی یہ رضوان نے شمیم ندا
شیخ عبدالسلام ہیں ماجور

۱۹۸۰ء

اختر واصفی سے

آہ سراپا خلوص عبدالسلام — بھائی بندوں کا غم جو کھاتا تھا
چل دیا ایک بیک سوئے جنت — باغِ عالم نہ اس کو بھاتا تھا
خدمتِ خلق کے سوا اس کو — اور کوئی کام ہی نہ آتا تھا
اس کا سالِ وفات ہے اختر
شیخ عبدالسلام داتا تھا

۱۹۸۰ء

انور دہرہ دونی سے

خادمِ اسلام تھے دیندار تھے — بہرِ خدمت ہر گھڑی تیار تھے
نیک خو تھے اور دیانتدار تھے — دل سے اپنی قوم کے غمخوار تھے
باعمل تھے ہوشمند بیدار تھے — وقت کے حالات سے بھی باخبر تھے
فخرِ ملت . حامل کردار تھے
نیک مُلا . صاحب ایثار تھے

۱۳۷۹ھ

۲۴ مئی ۱۹۶۰ء کے اخبار انجام کراچی نے حسبِ ذیل تعزیتی اداریہ لکھا تھا۔

شیخ عبدالسلام دہلوی بی اے کی وفات عام تجار کی حلقوں کے علاوہ دہلی سے
ہاجر حلقوں کے علاوہ دہلی سے ہاجر حلقوں اور سابق مسلم لیگ کے پرانے کارکنوں
کے لئے ایک عظیم سانحہ ہے۔ شیخ صاحب نے قیام پاکستان کی جنگ میں جو جوش و خروش
سے حصہ لیا وہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا وہ دہلی صوبہ مسلم لیگ کے بانیوں میں سے
تھے اور انھوں نے اس کو اپنے جوشِ عمل اور فیاضی سے بامِ عروج پر پہنچایا تھا وہ
دہلی مسلم لیگ کے صدر تھے۔ ہر اعتبار سے صاحب اثر ہونے کے باوجود انھوں نے
کبھی قائدانہ حیثیت اختیار نہ کی اور اپنے آپ کو ہمیشہ جنگِ آزادی کا ایک معمولی سپاہی
سمجھا۔ آپ بہت مخیر تھے۔ بندگانِ خدا کی امداد کے لئے ان کی دولت ہمیشہ وقف
رہتی تھی۔ دہلی میونسپل کمیٹی کے ایک ممبر کی حیثیت سے انھوں نے دہلی کے عام شہریوں
کی جو مفید خدمات انجام دی ہیں۔ ان کا اعتراف نہ کرنا بد دیانتی ہے۔

شیخ عبدالسلام بہت ہی خلیق، متواضع اور وضعدار دوست تھے۔ حلقۂ
احباب بہت وسیع تھا انھوں نے ذاتی اختلافات کو کبھی قومی مفاد اور دوستی کی
راہ میں حائل نہیں ہونے دیا۔ ان کی فراخدلی اور وضعداری کا اندازہ اس واقعہ سے کیا
جا سکتا ہے کہ ۴۳ ۱۹ء میں جب دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس کی
تیاریاں شروع ہوئیں تو شیخ صاحب کو دہلی میں غیر معمولی اثر و رسوخ حاصل تھا اور
اُن کی پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی اور کے اُن کے سبھی پرانے احباب
نے علم بغاوت بلند کر کے مسٹر حسین ملک بیرسٹر کو استقبالیہ کا صدر بنا دیا۔ عبدالسلام
صاحب کو بتقاضائے بشریت اس ناکامی سے متاثر ہونا چاہیے تھا لیکن ان کی یہ
فراخ حوصلگی کبھی فراموش نہیں کی جا سکے گی۔ انھوں نے بددل ہونے کے بجائے دہلی میں
آل انڈیا مسلم لیگ کو کامیاب بنانے کی اپنی تمام کوشش کی تقسیم کے وقت تک
بیڈمن کلب دہلی میں ان کی جانب سے ہر سال بہت وسیع پیمانہ پر اجتماعِ عیدین کا

انتظام کیا جاتا تھا اس کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔

مسجد فتحپوری کے پشتے کو سیٹھ گڑوڈیا کے غاصبانہ قبضے سے نکالنے کے لئے اُنکی پُر خلوص کوششوں کا اعتراف نہ کرنا بددیانتی ہوگی۔ ان کو دہلی میں قائد اعظم اور قائدِ ملت کے معتمدِ خاص ہونے کا فخر حاصل تھا۔ دہلی کے عوام ان کو "فخرِ قوم" کے لقب سے یاد کرتے تھے تقسیم کے بعد بھی اُنھوں نے دہلی کے مصیبت زدہ مسلمانوں اور مسلم لیگ کے پُرانے کارکنوں کو قتل اور قید و بند کے مصائب سے بچانے کی پوری کوشش کی اور بعد میں حالات سے مجبور ہو کر اُن کو دہلی سے ہجرت کر کے پاکستان آنا پڑا۔

آپ نے پاکستان میں سیاسی اعتبار سے خاموشی اختیار کرلی تھی لیکن انکی سوشل خدمات اور فیاضیوں کا سلسلہ اُسی طرح جاری رہا جس طرح دہلی میں تھا۔

شیخ عبدالسلام کی وفات سے ادارہ انجام تہ دل سے متاسف ہے۔ اُنھوں نے مسلمانوں اور دہلی کے عوام و پاکستان کے عوام کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور ان کو باغِ فردوس میں جگہ عنایت فرمائے۔

آمین [1]

---

[1] یادِ رفتگاں مؤلفہ سلطان رفیع صفحہ ۲۸۹

مولوی عزیز مرزا دہلوی

آپ کا قدیم دارالسلطنت دہلی وطن تھا۔ چغتائی ترکوں کے ایک پرانے معزز خاندان
کے چشم و چراغ تھے، جن کے اراکین شاہانِ مغلیہ کے ماتحت اعلیٰ فوجی عہدوں پر سرفراز
تھے اور مختلف معرکوں میں دادِ شجاعت دے کر شاہی قدردانی سے بہرہ ور ہوئے لیکن
جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کے اکثر متمول گھرانوں کی طرح اس خاندان کو بھی
موردِ آفات ہونا پڑا۔

مولوی عزیز مرزا صاحب ۱۸۶۴ء کو دہلی میں پیدا ہوئے تو اُن کے سرپرست مشکل
سے اُن کی واجبی تعلیم کا انتظام و بندوبست کر سکے اور اعلیٰ تعلیم انگریزی سے وہ محروم رہے۔
اگر سر سید انھیں ہونہار اور جوہرِ قابل دیکھ کر اپنے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کالج کے ابتدائی
طلبہ میں شامل نہ کر لیتے تو اس طرح مولوی عزیز مرزا صاحب کو علی گڑھ مسلم کالج کے
شمارِ اوّلین میں ہونے کا فخر نصیب نہ ہوتا۔ اپنے زمانۂ تعلیم ہی میں انھوں نے اپنے
اساتذہ و معاصرین کو اپنی غیر معمولی قابلیتوں کا یقین دلا دیا تھا چنانچہ کالج میں وہ اسٹوڈنٹ
یونین کلب کے سکریٹری منتخب ہوئے اور ۱۸۸۷ء میں حضرت قیصرہ کی جوبلی کی یادگار
قائم کرنے کے لئے جو کمیٹی قائم ہوئی تھی اس کے پریسیڈنٹ بنائے گئے تھے۔ اسی سال
انھوں نے بی اے کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ مرزا صاحب جہاں لڑکپن میں ذہین و
ذکی مشہور تھے، وہاں طالب علمی کے زمانہ میں وہ اپنے ہمعصروں میں ممتاز رہے آپ مسلم

علی گڑھ کالج کے نہایت قابل اور سعید سپوتوں میں سے تھے۔

سرسید نے ان کو تھوڑے عرصہ میں حیدر آباد دکن بھیج دیا جہاں وہ پہلے معین المہام کے پرسنل اسسٹنٹ بنائے گئے اور ۱۸۹۲ء میں لیجسلیٹو کونسل کے سکریٹری ۱۸۹۵ء میں جوڈیشنل ڈپارٹمنٹ کے اسسٹنٹ سکریٹری اور ۱۸۹۶ء کورٹ آف وارڈس کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ اس عہدہ کے فرائض وہ اپنے مستقل منصب کی ذمہ داری کے ساتھ محض آنریری طور پر ادا کرتے رہے اور چار سو روپے ماہوار کی پنشن الاؤنس لینے سے انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یتیموں کے مال میں سے کچھ لینا ناجائز ہے۔ اس دیانتداری و ایثار کے جذبہ و اسپرٹ نے حکام و رعایا میں انھیں بے حد عزیز بنا دیا تھا۔

آخر کار حضور نظام نے ہوم سکریٹری کے مقتدر منصب پر ان کا تقرر کیا جس سے ساری مملکت آصفیہ کے اندرونی انتظام کی نگرانی ان سے متعلق تھی۔ اس اہم و نازک فرائض کی ادائیگی سرگرمی کے علاوہ بہت بڑی معاملہ فہمی و مصلحت اندیشی چاہتی ہے۔ مولوی عزیز مرزا صاحب نے کئی سال تک اس عہدہ کا کام پوری لیاقت اور ہوشیاری سے سرانجام دیا۔ کارگزاری ریاست حیدر آباد میں ضرب المثل تھی۔ آپ کام کرنے میں جلدی اور محنت کرنے میں آندھی تھے۔ معاملات فہمی میں تو اس قدر جلدی پہنچتے تھے کہ جن لوگوں نے انھیں معاملات کو ہفتوں اور مہینوں ملتوی کیا تھا وہ بھی دیکھتے رہ جاتے تھے۔ سرکاری خدمت کی کٹھن اور دشوار منزلیں انھوں نے ہمیشہ اس آسانی سے طے کیا کہ کبھی ان کی طبیعت پر گراں نہ گزرا جو کام دوسرے لوگ آٹھ آٹھ دس دس گھنٹوں میں طے نہیں کر سکتے تھے۔ آپ اس کو دو تین گھنٹوں میں نپٹا دیتے تھے اور پھر اس دقیق نظری کے ساتھ کہ کیا مجال جو کوئی بات رہ جائے۔ اپنے فرائض نہایت دلچسپی کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ آپ کبھی بھی

کام کرنے سے نہیں اُکتائے اور نہ آج کا کام کل پر چھوڑا۔

اُن کے بعض باطن اور خود غرض مخالفین اپنی رکیک چالوں سے جن کے لئے ایسی ریاستیں عام طور سے بدنام تھیں حضور نظام کو مولوی عزیز مرزا کی طرف سے بدظن کرنے اور ایک ناقابل امتیاز الزام انھیں پنشن دلانے میں کامیاب ہوگئے تھے لیکن اس الزام کا فرضی اور بے بنیاد ہونا بہت جلد ثابت ہوگیا۔

جب بعض وجوہ سے وہ خدمت ہوم سکریٹری سے اوّل تعلقداری پر بھیجے گئے تو حالانکہ آپ نے کبھی مال گزاری کا کام نہیں کیا تھا لیکن اپنے فرض منصبی کو اس خوبی و استقلال کے ساتھ ادا کیا کہ لوگوں کو حیرت ہوئی اور سرکاری رپورٹوں میں متواتر ان کی کارگزاری پر اظہار خوشنودی کیا گیا اور مملکتِ آصفیہ کے عوام آپ سے اس قدر خوش تھے کہ اگر آپ کا کسی جگہ پر تبادلہ کیا جاتا تھا تو لوگ افسوس اور رنج کرتے اور آنسو تک ان کی آنکھوں سے نکل جاتے تھے یہی حالت ان کی ہائی کورٹ کے جج ہونے پر ہوئی حالانکہ اُنھوں نے کوئی قانونی ڈگری نہیں لی تھی اور نہ اس قسم کا انھوں نے کوئی امتحان دیا تھا لیکن یہاں اپنے کاموں میں امتیازی حیثیت حاصل کی۔

تھوڑے عرصہ کے بعد مولوی عزیز مرزا صاحب ہوم سکریٹری کے عہدہ پر مقرر ہوئے اس زمانہ میں مرزا صاحب نے ریاست حیدرآباد کی تعلیم پر خاص توجہ کی اور ایسا جامع و مفید اور قابلِ تعریف نوٹ آپ نے تعلیمی حالات و معاملات پر تحریر کیا جو یادگار ہے۔

آپ نے ملازمت سے علٰحدہ ہونے کے بعد اپنی پرانی قومی خدمت کرنے کی خواہش پر عمل کیا مسلم لیگ کے ممبر بنے اس کے پروگراموں پر عمل کیا جس کی وجہ سے مسلم لیگ کے حلقوں اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کی نظروں میں وقعت بڑھ گئی اور مسلمانانِ ہند نے جلد انھیں آل انڈیا مسلم لیگ کا سکریٹری منتخب کرکے

ان کی وفات پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا اور مولوی عزیز مرزا صاحب نے بھی اپنی تین سال کی مسلسل محنت اور انتھک کوششوں سے مسلم لیگ کو ایسا طاقتور اور مفید بنادیا جیسا کہ مسلمانان ہند کے پولٹیکل آرگنائزیشن کو ہونا چاہئے۔

چنانچہ بابائے اُردو علامہ عبدالحق صاحب مولوی عزیز مرزا صاحب کی مسلم لیگ کی سکریٹری کے عہدہ کی خدمات کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

حیدرآباد سے جانے کے بعد انھوں نے اپنی زندگی قومی کاموں کے لئے وقف کردی تھی اور آل انڈیا مسلم لیگ ان کے حوالے کردی تھی ان کے ہونے سے قبل لیگ برائے نام تھی۔ انھوں نے اس کو زندہ کیا ہندوستان کے مختلف صوبوں میں دورہ کرکے اس کے دائرہ افادہ کو وسیع کیا اور اہل ملک اس کے کاموں کی قدر کرنے لگے اور اگر وہ زندہ رہتے تو یہ مسلمانوں کی حمایت میں سب سے پُرزور آلہ ثابت ہوئے۔

علاوہ ازیں اپنی علمی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وہ ہمیشہ ایک سعادت مند فرزند کی طرح خدمت بجالاتے رہے۔ اور بحیثیت ایک ٹرسٹی اور اولڈ بوائز کے وہ ہر موقع پر کالج ویونیورسٹی کو گرانقدر فائدے پہنچاتے رہے۔ مسلمان اہل الرائے کی ایک جماعت نواب وقار الملک کے استعفیٰ پیش کرتے وقت مولوی عزیز مرزا صاحب کو ان کی جانشینی کا اہل سمجھتی تھی اور اس مطلب و غرض کی ایک سے زیادہ تحریریں جیسا اخبار میں شائع ہوئی ہیں اس کے ساتھ مولوی عزیز مرزا صاحب کی زندگی کا ایک لٹریری پہلو بھی نہایت شاندار تھا وہ ملک کے بڑے بڑے رسالوں اور اخباروں کو سالہا سال تک بڑے فراخدلی کے ساتھ قلمی مدد دیتے رہے۔

یہ علمی شوق ان کے دم کے ساتھ رہا۔ آپ محرر و ادیب ہونے کے ساتھ

ایک کامیاب مقرر بھی تھے۔ بلا تکلف بولتے رہتے تھے۔ ان کی تقریر میں بلا کا اثر تھا
آپ کو علم تاریخ سے خاص لگاؤ تھا۔ ان کے کتب خانے میں تاریخ کی کتابوں کا اچھا
خاصہ ذخیرہ تھا۔ انھوں نے محمود گاوان کی سیرت پر ایک کتابچہ لکھا ہے، اس سے
ان کی تاریخی معلومات و تجسس و تلاش کا پتہ چلتا ہے۔ اردو ادب کا بھی ان کا مطالعہ
وسیع تھا۔ جو دو کرم عروسی، کالی داس کے ڈرامے کے ترجمے سے صاف
ظاہر ہے بقول مولانا عبدالحق صاحب۔

ریاست حیدر آباد دکن میں کوئی علمی اور سوشل مجلس، انجمن اور سوسائٹی
ایسی نہ تھی جس کے وہ پریزیڈنٹ یا وائس پریزیڈنٹ سکریٹری یا خزانچی منتخب
نہ ہوئے ہوں۔ مثلاً کتب خانہ آصفیہ دائرۃ المعارف نظام علی گڈھ۔ اولڈ
بوائز ایسوسی ایشن اور انجمن اردو وغیرہ ان سے فیض پاتی تھیں۔

جو بھی کوئی انجمن بناتا یا علمی وادبی جلسہ کرتا وہ اس کا مولوی عزیز مرزا صاحب
کو صدر بناتا اور آپ بھی بخوشی اس کو منظور کر لیتے تھے۔ اس کے لئے عالمانہ صدارتی
خطبہ بھی تحریر کرتے۔ یہ حقیقت ہے کہ مولوی عزیز مرزا صاحب ایسی تمام علمی وادبی
تحریکوں کے بانی اور روح رواں مانے جاتے تھے، ان کو ایسے کاموں سے بے پناہ دلچسپی
تھی۔ ان کی ایسی سوسائٹیوں اور انجمنوں نے بڑے علمی وادبی کارہائے نمایاں انجام
دئے ہیں۔

مولوی عزیز مرزا صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ ملک کے ہر
طبقہ امیر و غریب اور ادنیٰ و اعلیٰ میں ہر دلعزیز اور مقبول تھے۔ سب کے ساتھ
محبت و اخلاق سے پیش آتے۔ ہر ایک کی بات بڑی دلچسپی کے ساتھ سنتے تھے
نخوت و تکبر اور غرور نے ان کو چھوا تک نہیں تھا ان کا گھر کسی پیسے والے کا نہیں لگتا
عام آدمیوں کی چوپال لگتی تھی۔ صبح چھ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک ان کے

گھر میں لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ لوگوں کی ضروریات اور پریشانی کو بڑی
توجہ کے ساتھ سنتے تھے اور اس کو دور کرنے کی کوشش کرتے۔ وقت کی کوئی
قید نہیں تھی جب بھی کسی کو پریشانی پیش آئی اس کو دور کرنے کے لیے اس کے
ساتھ چلے جاتے تھے۔

مولوی عزیز مرزا صاحب کے متعلق بڑا سنجیدہ و متین ہونا چاہیے تھا لیکن
یہ بات نہیں تھی۔ متانت کے ساتھ ظریف اور خوش طبع و ملنسار و متواضع انسان
تھے ان کے مزیدار چٹکلوں اور لطیفوں کو سن کر لوگ بہت محظوظ ہوتے تھے۔ ان کی
مجلس سے تقریباً ہر شخص ناخوش اور مایوس ہو کر نہیں آتا تھا۔

آپ مذہب کے بڑے پابند اور کسی حالت میں بھی نماز قضا نہیں کرتے
تھے۔ ان کی زندگی بڑی سادہ تھی۔ آخری عمر تک آپ اپنے آپ کو ایک طالب علم
سمجھتے اور کہتے رہے اور طریقۂ عمل بھی ان کا زندگی بھر ویسا ہی رہا جن کو بھی کبھی رد
نہیں کیا۔ جو دل میں ہوتا وہی زبان پر آجاتا تھا۔

یہ خبر ملک کے دینی و علمی حلقوں میں بڑے افسوس و رنج کے ساتھ سنی گئی کہ مولوی
عزیز مرزا صاحب سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ ۲۲ فروری ۱۹۱۲ء کو لکھنؤ میں
فوت ہو گئے۔ ان کی وفات پر کئی جلسے ہوئے اور تعزیتی تجویزیں بھی پاس ہوئیں
قائد اعظم محمد علی جناح نے بھی ان کی وفات پر افسوس کا اظہار کیا اور آل انڈیا
مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں تعزیتی ریزولیشن منظور ہوا۔

حافظ محمد عمر بہاؤالدین والے

حافظ محمد عمر نے ۱۹۳۷ء میں خاکساری تحریک سے وابستگی اختیار کی اس کے بعد وہ تحریک میں گم ہو کر رہ گئے ابتدأ آپ خاکسار تحریک کے دہلی شہر کے سالار اعلیٰ بنائے گئے۔ ۱۹۴۲ء میں کلکتہ چلے گئے۔ بنگال میں ناظم باب اعلیٰ کے عہدہ پر سرفراز ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں مشرقی پاکستان چلے گئے اور وہاں آپ نے خاکسار تحریک کو منظم کیا۔ ڈھاکہ میں آپ کا وسیع کاروبار بھی تھا۔ سب سے پہلے اپنی فیکٹری کے بیس آدمیوں کو خاکسار تحریک میں شامل کیا وہ حاکم اعلیٰ خاکسار تحریک مشرقی پاکستان مقرر ہوئے۔

وہ اس تحریک کے ایک ستون اور مشرقی پاکستان میں خاکسار تحریک کے بانی تھے۔ ان میں بہترین سپاہیانہ صلاحیتیں تھیں۔ انھوں نے اپنی زندگی خدمت خلق کے لئے وقف کر دی تھی۔ اور وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک خاکسار تحریک کے لئے کام کرتے رہے۔ انھوں نے اس راہ میں تکالیف اور مصائب برداشت کئے۔ وہ انہی کے دل گردہ کا انسان برداشت کر سکتا تھا۔

جب وہ ڈھاکہ میں لاکھوں کا کاروبار اور وسیع جائیداد چھوڑ کر مغربی پاکستان پہنچے تو عالم بے سروسامانی میں تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے عزیزوں اور ہمدردوں کی امداد قبول کرنی پسند نہیں کی، اپنے زور بازو کے سہارے بقیہ زندگی گذاری۔ آپ کے اکلوتے فرزند محمد اسلم جو خود بھی خاکسار تحریک

کے ایک سرگرم نوجوان رکن ہیں کراچی میں معمولی سی نوکری کر لی۔ خود حافظ صاحب کو ایک چھوٹا ہوٹل لے کر بسر اوقات کرنے لگے۔ لیکن ہرنیا کے مرض نے آپ کو آرام سے نہیں بیٹھنے دیا۔ ایک ماہ ہسپتال میں زیر علاج رہے افاقہ ہوا۔ ایک فیکٹری میں ملازمت کر لی اور اس طرح زندگی گذارتے رہے۔ یکم فروری ۱۹۷۵ء کو ایک حادثے کا شکار ہو کر کراچی میں انتقال فرما گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مشرقی پاکستان کے دوران قیام حکومتِ وقت کے بھی زیر عتاب رہے۔ اور بار ہا پولیس کے تشدد کا نشانہ بنے گران کے پائے استقامت میں ذرہ بھر لغزش نہ آئی۔ وہ خاکسار تحریک کی عسکریت اور مجاہدانہ کردار کا مثالی نمونہ تھے۔ آپ نے مشرقی پاکستان میں خاکسار تحریک کے دشمنوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور خاکسار تحریک کو ایک آنچ آنے نہیں دی۔ علاقائی اور صوبائی تعصبات کے خلاف باقاعدہ مہم چلائی۔ اسلام اور اخوتِ اسلامی کی ترویج کے لیے مسلسل کام کیا اور اس راہ میں بے شمار آلام و تکالیف کا سامنا کیا۔ وسائل کی کمی اور مخالفوں کی ریشہ دوانیوں کے باوجود اپنے عہد و ارادے میں مستحکم رہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بڑی بے سرو سامانی کی حالت میں نیپال کے راستے سے کراچی پہنچے اور وہاں پر ہی ایک حادثہ جانکاہ میں اپنی جان سپرد کر دی اور اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہیں رہی[1]

---

[1] یادِ رفتگاں مرتبہ سلطان رفیع مضمون میاں بشیر احمد صدیقی خاکسار تحریک لاہور ۳۶۹

محمد عمر فاروقی صاحب

یہ خاندان ایسا ہے جن کے تینوں بھائیوں عثمان آزاد، محمد عمر فاروقی اور محمد الیاس رشیدی نے صحافی پیشہ اختیار کیا۔ اور ان تینوں نے اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ شیخ محمد عثمان آزاد ایڈیٹر قومی گزٹ، انجام دہلی و کراچی، محمد عمر فاروقی ایڈیٹر آغاز کراچی۔ محمد الیاس رشیدی ایڈیٹر ہفت روزہ نگار کراچی ہیں۔

انجام اخبار نے جو شہرت پائی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ آغاز اب تک کراچی سے جاری ہے۔ محمد عمر فاروقی صاحب کے صاحبزادے اب تک اس کو نکال رہے ہیں۔ اس کا بھی پاکستان میں ایک حلقہ ہے۔ الیاس رشیدی صاحب پاکستان کی فلمی دنیا میں ایک مقام رکھتے ہیں نگار فلمی رسالہ ہے۔ اس نے بڑے تاریخی نمبر نکالے ہیں۔ رشیدی صاحب ایک آزمودہ صحافی ہیں۔

محمد عمر فاروقی صاحب ۱۹۱۸ء میں حافظ کالے صاحب، گلی قاسم جان دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں دہلی کالج سے بی، اے کیا۔ ان کو بچپن سے مطالعہ اور اخبار بینی کا شوق تھا۔ دہلی سے ہفتہ میں دو بار نکلنے والا اخبار ”الامان“ دہلی اپنا جیب خرچ بچا کر خریدا کرتے تھے۔ اپنی تعلیم کے دوران انھوں نے مسلم طلبا، انجمن مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ نواب زادہ لیاقت علی خان

اس کے صدر تھے۔ فاروقی صاحب اس انجمن کے خازن بھی رہے۔ اُن کے بڑے بھائی شیخ محمد عثمان آزاد قومی گزٹ نکالتے تھے۔ اس اخبار میں فاروقی صاحب آزاد صاحب کا ہاتھ بٹاتے تھے، اس کے کاموں میں دلچسپی لیتے تھے آڑے وقت کام آتے تھے۔ تربیت اور تجربہ حاصل کرنے کے لئے دہلی کے مشہور صحافی شیو نرائن بھٹناگر ایڈیٹر تیج اور اخبار روشن دہلی کی شاگردی میں ان کو اُن کے بھائی آزاد صاحب نے دیدیا تھا۔ بھٹناگر صاحب نے محمد عمر فاروقی صاحب کو اپنے اخبار کے لئے عدالتی رپورٹنگ کا کام سپرد کر دیا تھا۔ صحافت کے میدان میں یہ فاروقی صاحب کی تربیت کا آغاز تھا۔

عثمان آزاد صاحب نے قومی گزٹ بند کر کے جب اخبار انجام جاری کیا۔ حوض قاضی پر اس کا دفتر تھا۔ اخبار کی ابتدا بے سرو سامانی کی حالت میں ہوئی تھی۔ اس کا مقابلہ دہلی کے مشہور اخبارات سے تھا جن کی پشت پر وافر سرمایہ اور زرخیز دماغ کام کر رہے تھے۔ انجام کی ابتدائی رپورٹنگ کمپنی باغ دہلی میں ایک پبلک ریڈیو سیٹ لگا ہوا تھا۔ محمد عمر فاروقی اس ریڈیو سے نشر کی ہوئی خبریں سنتے اور اپنے نوٹ کر کے بھاگم بھاگ اخبار انجام کے دفتر میں پہنچاتے تھے۔ جہاں وہ ترتیب پاکر اخبار میں شائع ہو جاتی تھی۔

جنگ عظیم کے دوران ہندوستان گورنمنٹ نے صحافیوں کا ایک وفد امپھال برما کے محاذ پر چشم دید حالات و مشاہدات کی رپورٹنگ کی غرض سے روانہ کیا تھا جس کے ممبر تھے مسٹر چندرا۔ زمیندار کے مولانا اختر علی خاں، سول اینڈ ملٹری گزٹ کے مسٹر لیپٹنگ امرت بازار پتریکا کے مسٹر گھوش ڈان کے مسٹر ابراہیم پوتھن جوزف کے داماد۔ اور انجام کے عمر فاروقی وغیرہ۔

وفد کے تمام ارکان سے ایک بانڈ بھروایا گیا تھا جس میں اصول منفرداً

فرداً فرداً ممکنہ پیش آمدہ خطرات کی ذمہ داری سے حکومت کو بری الذمہ قرار دیا تھا۔ اس دورہ میں صحافیوں کو محاذِ جنگ کا معائنہ کرایا گیا۔ اور افواج کی کارکردگی اور ان کی ضروریات سے واقف کرایا گیا تھا۔ واپسی پر اس وفد کو بنگال کے دورہ کا موقع بھی ملا۔ اس وقت بنگال زبردست قحط کے زد میں آیا ہوا تھا۔ جو ہندوستان کی انگریزی حکومت کے ماتھے پر بدنما داغ بن چکا تھا۔ ارکان وفد کو قحط کے متاثرین کیمپوں کے معائنہ کا موقع ملا اور اس وقت نا گفتہ بہ روح فرسا واقعات سے آگاہ ہوئے بعد میں ان اخباری نمائندوں نے بنگال کے قحط پر اپنے اخباروں میں مضامین اور نوٹس بھی لکھے۔

عمر فاروقی صاحب انجام میں رپورٹر، نیوز ایڈیٹر اور دیگر ذمہ داریوں کو بھی پورا کرتے تھے۔ مدیر کے عہدہ تک جا پہنچے اور انجام کے بند ہونے تک اسے بڑی خوبی کے ساتھ چلاتے رہے۔ آپ کراچی کے میونسپل کاؤنسلر میونسپل کارپوریشن کی ایڈوائزری کمیٹی کے رکن، فلم سنسر بورڈ میں حکومت کے نامزد کردہ ممبر، اور پورٹ ٹرسٹ میں کے ایم سی کے نمائندہ بھی رہے ہیں۔

آپ آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی کی مجلس عاملہ کے رکن اور پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز کمیٹی کے خازن تھے۔

سماجی دوروں کے سلسلہ میں محمد عمر فاروقی صاحب نے دنیا کے متعدد غیر ممالک کا سفر اختیار کیا۔ اُن میں جرمنی، انگلینڈ، فرانس، چین اور امریکہ وغیرہ شامل ہیں۔ فاروقی صاحب نے سماجی میدان میں بھی خدمات انجام دیں۔ آپ جمعیۃ پنجابی سوداگران کی منتظمہ کمیٹی کے رکن تھے عمر فاروقی صاحب ۲۰ دسمبر ۱۹۶۹ء کو رحلت فرما گئے۔ اِنّا للّٰہ وَ اِنّا اِلیہ راجعون [۱]

[۱] یادگار رفتگاں صفحہ ۴۲۳

حضرت غلام علی شاہ نقشبندی

حضرت غلام علی شاہ صاحب علم و عمل، فضل و کمال میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ آپ کے ایثار کی یہ حالت تھی کہ جو کچھ آتا وہ سب اللہ کے نام پر صرف کر دیتے تھے۔ کل کیا ہو گا اس کا کبھی فکر نہیں کیا۔

آپ کا وطن موضع بٹالہ تھا جو ضلع امرتسر میں ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب سادات علوی سے ملتا ہے۔ آپ کے والد ماجد عبداللطیف صاحب بڑے زاہد و عابد تھے۔ جنگلوں میں ذکر جہر کیا کرتے تھے۔ مہینوں انھوں نے جنگل کی سبزیوں سے پیٹ بھرا۔

حضرت شاہ غلام علی کے پیدا ہونے سے قبل آپ کے والد ماجد نے خواب میں دیکھا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ تمہارے ہاں عنقریب لڑکا پیدا ہونے والا ہے۔ اس کا نام میرے نام پر رکھنا۔ آپ کے عمِ بزرگوار کو جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت ہوئی کہ تم اپنے صاحبزادہ کا نام عبداللہ رکھنا۔ چنانچہ آپ کا نام عبداللہ رکھا گیا اور عرفیت آپ کی غلام علی پڑی۔

شاہ غلام علی صاحب ۱۱۵۶ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادت پر کافی شاعروں نے تاریخیں کہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی :-

چون نجم چرخ ہدیٰ حضرت غلام علی
شدہ ظہور نگی در جہاں جہاں بشگفت
سن ولادش بہ فیض بہ جوست راحت
بہر سپہر ہدایت شدہ طلوع بگفت

آپ نے سولہ برس بٹالہ میں گذارے۔ ۱۱۷۴ھ میں آپ کے والد ماجد نے اس ارادہ سے آپ کو دہلی بلوایا کہ اپنے پیر و مرشد شاہ ناصر الدین قادری سے جن کا مزار عید گاہ کے پیچھے ہے بیعت کرائیں۔ آپ کے پہنچنے سے قبل شاہ نصر الدین صاحب فوت ہو گئے۔ اس کے بعد آپ کے والد ماجد نے ان کو اختیار دے دیا کہ جس سے چاہو بیعت کرو۔ چنانچہ آپ نے ۱۱۷۸ھ میں بائیس برس کی عمر میں جناب مرزا مظہر جان جاناں علیہ الرحمۃ سے بیعت کی۔ بیعت کے بعد اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں کافی عرصہ رہے اور ریاضت کی۔

اگرچہ آپ نے سلسلہ قادریہ میں بیعت کی تھی لیکن ذکر و اذکار اور اشغال طریقہ نقشبندیہ مجددیہ میں جاری کیا اور ہر طریقہ کی اجازت حاصل کی۔ اپنے پیر و مرشد کے انتقال کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ سرسید کے قول کے مطابق اپنے پیر سے بھی فوقیت لے گئے۔ توکل علی اللہ پر عمل پیرا تھے۔ پوری زندگی اسی یقین پر گذار دی۔ اُمراء اور بادشاہ آرزو رکھتے تھے کہ ہم خانقاہ کے فقراء کے لئے کچھ وظیفہ مقرر کر دیں لیکن آپ نے منظور نہیں فرمایا۔

ایک دفعہ نواب امیر الدولہ امیر خاں والئ ٹونک نے چاہا کہ وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔ اس کے جواب میں آپ نے یہ شعر لکھ کر بھیج دیا ؎

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم
با میر خاں بگوئی کہ روزی مقرر است

آپ کی ذات سے دنیا میں فیض پھیلا اور غیر ممالک کے لوگ آپ سے بیعت ہوئے۔ روم، شام، بغداد، مصر، چین اور حبش کے لوگ آپ سے بیعت تھے۔ ہندوستان، پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں ٹڈی دل کی آمد ٹوٹتے تھے۔ آپ کی خانقاہ میں پانچ سو آدمی سے کم نہیں رہتا تھا سب کو آپ روٹی پہنچاتے تھے۔ ایک دانہ بھی کہیں سے مقرر نہیں تھا۔ غیب سے سب کام چلتا تھا۔ فیاضی کا یہ عالم تھا کہ کبھی کوئی سائل محروم نہیں گیا۔ جو مانگا وہ آپ نے اس کو عنایت کیا جو عمدہ شے یا تحفہ آپ کے پاس آتا تھا۔ اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے تھے۔ سب فقراء میں تقسیم فرما دیتے تھے۔

شاہ غلام علی صاحب حافظِ قرآن تھے۔ آپ کا اچھے قاریوں میں شمار ہوتا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد تلاوتِ قرآنِ مجید فرماتے تھے۔ اشراق کی نماز کے بعد حدیث و تفسیر کا درس دیتے تھے۔ جو لوگ اس درس میں شامل ہوتے تھے اُن پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس میں جہاں آقائے نامدار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ نامی آتا تھا۔ تو شاہ صاحب بیتاب ہو جاتے تھے۔ علم حدیث اور تفسیر تبحر تھا۔ درس دینے کے بعد آپ تھوڑا سا کھانا کھاتے اور آرام فرماتے۔ ظہر کی نماز کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو جاتے تھے۔ نمازِ عصر اور نمازِ مغرب کے بعد مریدین کا حلقہ جمع ہو جاتا تھا۔ ہر ایک آپ کی توجہ سے فوائد حاصل کرتا تھا۔

تمام رات شب بیداری فرماتے تھے۔ آپ چارپائی پر نہیں سوتے تھے۔ شریعت کے بڑے پابند تھے۔ ہر کام اتباعِ سنت کے مطابق کرتے تھے جو شخص خلافِ شرع اور سنت ہوتا تھا اس سے خفا ہوتے تھے اور اپنے پاس آنا گوارا نہیں فرماتے تھے۔

سرسید خود اور ان کا پورا خاندان حضرت شاہ غلام علی صاحب کا معتقد تھا اور اس خاندان سے شاہ کو بھی محبت اور قریبی تعلق تھا چنانچہ اس بات کا ذکر سرسید احمد خاں صاحب نے اپنی مشہور تصنیف "آثار الصنادید" میں لکھا ہے:

میرے تمام خاندان والوں کو اور خصوصاً جناب والد ماجد اور میرے بڑے بھائی جناب احتشام الدولہ سید محمدؐ خاں بہادر مرحوم کو آپ ہی سے بیعت تھی اور آپ کی میرے خاندان پر اس قدر شفقت اور محبت تھی کہ میرے والد ماجد کو اپنے فرزند سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ میرے والد ماجد بھی آپ کی صحبت کی برکت سے آزاد مزاج اور وارستہ طبع تھے۔ کبھی کبھی کوئی بات گستاخانہ عرض کرنے یا کوئی حرکت آپ کے خلاف مرضی سرزد ہوتی تو آپ بارہا ارشاد فرماتے۔ اگرچہ میں نے تئیں تم ان فرزندے دور رکھا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی نہ ہوئی کہ اس شخص کی محبت اپنے فرزندوں سے سوا دیدی جو چاہو کہو اور جو چاہو سو کرو میں ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور آپ اپنی شفقت اور محبت سے مجھ کو اپنے مصلیٰ پر بٹھا لیتے اور نہایت شفقت فرماتے "میں نے اپنے دادا کو تو نہیں دیکھا، آپ ہی کو دادا حضرت کہا کرتا تھا"

آپ کا انتقال دہلی میں ۲۲ صفر ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء میں ہوا۔ اپنے مرشد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ صاحب تذکرہ علمار ہند مولوی رحمان نے آپ کی حسب ذیل تاریخ وفات کہی ہے

چو ماہ چرخ ہدیٰ حضرت غلام علی
برخ کشید براہے عدم نقاب نہفت

گزیدہ پیر خود لب بحسرت و افسوس
مہ سپہر ہدایت نہفت سال بگفت

مولوی منشی محمد کرم اللہ خاں شیدا دہلوی

منشی اکرم الدین خاں شیدا کا تعلق دہلی کے ایک علمی خاندان سے تھا۔
ان کے خاندان کے زیادہ تر افراد علوم دفنون سے بہرہ ور رہے۔ منشی عبدالرحیم خاں بیدل، نواب محمد احسان الرحمٰن خاں صاحب عرف منجھلے آغا اور خواجہ محمد شفیع خلف خواجہ عبدالحمید خاں صاحب کے آبا و اجداد ایک ہی تھے۔

منشی کرم اللہ خاں شیدا کے جدِ اعلیٰ خواجہ عبید اللہ احرار تھے جو شیخ خیر اط کہلاتے تھے۔ انھوں نے ہی بابر کا نام ظہیر الدین تجویز کیا تھا۔ مغلیہ خاندان کے لوگ خواجہ صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے اور عقیدت مند تھے۔

شیدا صاحب کے بزرگ خیراط میں رہتے تھے۔ وہاں سے اس خاندان کے کچھ لوگ کشمیر چلے آئے اور وہیں مقیم ہو گئے۔ وہاں یہ لوگ گنئی قبیلہ کے نام سے مشہور ہو گئے۔ گویا انھوں نے وہاں قصائیوں کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اس لئے کشمیر میں گنئی قصائی کو کہتے ہیں۔

اس خاندان میں سے دو بھائی حافظ باقی اور حافظ خیراتی شاہ عالم کے زمانہ میں دہلی چلے آئے۔ حافظ باقی بڑے اور چھوٹے حافظ خیراتی تھے۔ ان دونوں بھائیوں کی مالی حالت انتہائی خراب تھی۔ سرائے میں ٹھہرنے کے بجائے مسجد میں ٹھہرے۔

اس زمانہ میں دہلی میں جو نیا آدمی آتا، شاہی عملہ اس سے لکھواتا تھا کہ تمہارا کیا نام ہے، کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ کہاں قیام کیا ہے اور کتنی مدت دہلی میں رہو گے۔ اس قسم کی عرضیاں معین الدولہ کے سامنے صبح فجر کی نماز کے بعد پیش ہوتی تھیں۔ چنانچہ ان دونوں بھائیوں کی عرضیاں بھی پیش ہوئیں۔ جب معین الدولہ نے اس عرضی میں خواجہ عبید اللہ احرار کے خاندان کا لکھا ہوا دیکھا تو ان سے اس کو دلچسپی پیدا ہوئی۔ یہ بھی خواجہ صاحب کے عقیدتمندوں میں تھا۔ چنانچہ آپ نے اپنا ایک پیادہ ان دونوں بھائیوں کے پاس بھیجا کہ تصدیق کرے کہ آیا یہ خواجہ صاحب کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ پیادہ آیا۔ ان دونوں بھائیوں سے معلومات حاصل کی۔ مطمئن ہو گیا تو اپنے ہمراہ ان کو معین الدولہ کے پاس لے گیا۔ خواجہ صاحب کی عقیدتمندی نے زور مارا تو معین الدولہ نے حافظ باقی سے اپنی لڑکی کی شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انھوں نے منظور کیا۔ شادی ہو گئی۔ شاہی نخرے مجھے ہوتے ہیں۔ خوش ہوئے تو نواز دیا اور ناراض ہوئے تو معتوب کر دیا۔ چنانچہ ان دونوں بھائیوں کے ساتھ بھی ایسا ہوا۔ انھیں معزول کر دیا لیکن جاگیر ضبط نہیں کی۔

حافظ باقی صاحب سے نواب منشی محمد تقی عرف آغا جان اور نواب محمد شفیع پیدا ہوئے۔ یہ دونوں علوم دینی سے بہرہ ور تھے۔ دہلی میں اُن کی علمی طبقے میں وقعت و عزت تھی۔ یہ دونوں بھائی بڑے مخیر اور علم دوست تھے۔ علماء کی قدر کرتے تھے اور غرباء کی پرورش کرنے میں دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ [1]

نواب عبد الرحیم خاں بیدل کے صاحبزادے خواجہ عبد المجید صاحب تھے جنھوں نے سینٹ سٹیفن کالج دہلی سے بی اے کیا اور اسی کالج میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔

---

[1] یہ معلومات میں نے لاہور میں خواجہ محمد شفیع صاحب سے حاصل کی۔

فارسی پڑھاتے تھے۔ یہ کالج سے جو تنخواہ لیتے تھے وہ مسلم اسٹوڈنٹ کی تعلیم پر خرچ کرتے تھے۔ اپنی ذات پر ایک پائی خرچ نہیں کی۔ دس بارہ سال اس کالج میں تعلیم دی۔ کالج کے پرنسپل رنز ورتھ سے اس معاملہ پر جھگڑا ہوا کہ جو انگریزی پڑھانے والے پروفیسر کی تنخواہ ہے وہی تنخواہ عربی و فارسی پڑھانے والے پروفیسر کو ملنی چاہئے۔ پرنسپل نے اُن کی بات کو نہیں مانا تو انھوں نے استعفیٰ دیدیا۔

آپ کو تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا۔ آپ کی مشہور کتابیں قصہ طلب ضرب الامثال اور بڑھاپے کی برکتیں ہیں۔ آپ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے خواب تخلص تھا۔

دہلی میں مسلمان عورتوں کو سوشل کاموں میں حصہ لینے کے لئے تحریک شروع ہوئی حویلی صدر الصدور بازار بلیماراں محل میں نواب محمد حسن خاں کی بیوہ اور ان کا خاندان رہتا تھا جو نواب کرم اللہ خاں کی ایک جنتی اولاد تھی۔ اس حویلی میں دہلی کے بڑے خاندان کی عورتوں کا جلسہ ہوا جس میں بلیماراں محل کی مستورات بھی شریک ہوئیں۔ اس اجلاس پر خواجہ عبدالمجید صاحب نے ایک طویل نظم لکھی جس کے دو شعر خواجہ محمد شفیع صاحب کو یاد رہ گئے وہ یہ تھے۔

زہے بخت بلند بلیماراں محل تو بنا آج خلق و نوشاد
بیوی آئی قنزو سے لینے کو باپ پر چھوڑ کر چلی اولاد

آپ فارسی اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

۱۹۴۷ء کے پُر آشوب زمانہ میں خواجہ عبدالمجید صاحب اپنے صاحبزادے خواجہ محمد شفیع کی اولاد کے ساتھ ہجرت کر کے لاہور چلے آئے وہیں آپ کا انتقال ہوا۔

خواجہ عبدالمجید صاحب کے اکلوتے بیٹے خواجہ محمد شفیع تھے۔

خواجہ محمد شفیع صاحب دہلی میں ۷ ۱۹۰ء کو پیدا ہوئے۔ ع ایک اسکول میں تعلیم پا رہے تھے کہ عدم تعاون کی تحریک میں تعلیم چھوڑ دی مشن اسکول سے میٹرک اور سنیٹ سٹیفن کالج سے بی اے پاس کیا۔

ادب سے لگاؤ تھا تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دی۔ آپ کی مشہور تصنیفات دہلی کا سنبھالا، ہم اور وہ، ناکام، شہر بُرد، میونسپل الیکشن، داغ ہائے قمر، ابلیس، شمع خرابات، گناہ اور عشق جہانگیر ہیں۔

ستمبر ۱۹۴۷ء میں دہلی چھوڑ کر لاہور میں آپ نے مختلف مقامات پر قیام کیا آج کل شریف روڈ لاہور چھاؤنی میں رہائش ہے۔ لاہور آنے کے بعد تصنیف و تالیف کا سلسلہ بند کر دیا۔ صرف ایک کتاب بلا کستان طبع کی تھی جو ایوب خان کے دور میں ضبط کر لی گئی۔

اُردو محفل جو دہلی میں قائم کی تھی اس کی دہلی میں ہر ہفتے نشست ہوتی تھی۔ یہ سلسلہ آپ نے یہاں بھی قائم رکھا ہے لیکن ہفتہ وار نشست کے بجائے مہینے میں ایک مرتبہ ان کے مکان میں ہوتی ہے جس میں مشاعرہ کے ساتھ علمی مقالے بھی پڑھے جاتے تھے۔

خواجہ محمد شفیع اپنے آپ کو شاعر نہیں کہتے لیکن کبھی کبھی کھیلتے ہیں۔

منشی عبدالرحیم خاں بیدل کے والد ماجد مولوی محمد تقی خاں صاحب تھے جو منشی کرم اللہ خاں صاحب کے برادر عزاد تھے۔

جناب بیدل کو بچپن سے شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ سید امداد مرزا انور کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ سالک مرحوم سے مشورہ سخن کیا۔ تیس برس تک حیدرآباد دکن میں عہدۂ جلیلہ ڈپٹی اکاؤنٹنٹ پر مامور رہے۔ پنشن لے کر آخری عمر دہلی

میں گذاری۔

خواجہ الطاف حسین حالی سے آپ کے قریبی تعلقات تھے۔ ان کی روش کو پسند کرتے تھے اپنی طرز خاص میں استادی کا درجہ رکھتے تھے۔ کلام میں سوز و گداز ہے متانت کی چاشنی کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ آپ کی ذات ستودہ صفات اساتذہ کی یاد دلاتی ہے۔ عوام میں خدمت خلق کا جذبہ رکھنے کی وجہ سے بے پناہ مقبول تھے۔

گر میرا کہا مانے تو بیدل کو منالے
ملتے نہیں دنیا میں کہیں چاہنے والے
اب سانس کے لینے کی بھی طاقت نہیں باقی
بیدل کا بُرا حال ہے اللہ بچالے

منشی کرم اللہ خان شیدا کے والد ماجد منشی امو جان عرف منشی آغا جان تھے۔ انھوں نے مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی سے فارسی و عربی کی تدریس دارالبقا میں پڑھیں۔ دہلی کے با اثر اور معزز لوگوں میں تھے۔ دہلی کے علمی طبقہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ٹیامحل میں رہائش تھی۔ جامع مسجد دہلی میں پنج وقتہ نماز ادا کرتے تھے۔ جامع مسجد کے امام سید محمد صاحب سے قریبی تعلقات تھے۔ ان سے ملے بغیر ان کو چین نہیں آتا تھا۔ یہ بھی اگر امام کے پاس جانے میں دیر لگاتے تھے تو وہ ان کے گھر پہنچ جاتے تھے۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق کے حامیوں میں تھے۔ سخن گوئی کا تو ذوق نہیں تھا لیکن سخن فہم بلا کے تھے۔ اساتذہ کے دیوان ان کے مطالعہ میں رہتے تھے جن کے ہزاروں شعر ان کو یاد تھے۔ اگر ذوق کے کلام پر کوئی اعتراض کرتا اور نقص نکالتا تو تنقید میں اساتذہ کے اشعار فوراً پیش کر دیتے تھے۔ صلح کل طبیعت تھی۔ مرزا غالب کی بُرائی بھی گوارا

نہیں کرتے تھے۔ دہلی کا کوئی مشاعرہ ایسا نہیں تھا جس میں ان کو مدعو نہ کیا جاتا ہو اور یہ بھی تقریباً ہر مشاعرے میں شریک ہوتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیا رح سے آپ کو بڑی عقیدت تھی ہر جمعرات کو فاتحہ پڑھنے جاتے تھے۔ سترھویں میں بڑے اہتمام سے ساتھ شریک ہوتے تھے کافی کھانا پکا کر لے جاتے تھے اور تقسیم کرتے تھے۔

منشی کرم اللہ خاں صاحب شیدا عربی و فارسی کے ماہر تھے۔ اوائل عمر سے ہی شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے اور اصلاحی، سماجی و تعلیمی کاموں میں دلچسپی لیتے تھے۔ دہلی کی شاہی جامع مسجد و فتحپوری مسجد کی انتظامیہ کمیٹی کے عرصہ تک ممبر رہے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد جہاں جامع مسجد دہلی پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تھا، وہاں مسجد فتحپوری بھی نہ بچ سکی۔ اس کی نہ صرف دکانیں ضبط کر لی گئیں بلکہ یہ دکانیں انتیس ہزار روپے میں نیلام بھی ہو گئیں نیلام میں ان دکانوں کو چھڑانے والے لالہ چھنامل تھے لالہ چھنامل کو انگریزوں نے ۱۸۹۴ء میں جب ان دکانوں کی قیمت دیکر اپنا قبضہ کر لیا تو مسلمانوں کو واپس کر دیں۔ اس وقت مسجد فتحپوری کی منتظمہ کمیٹی دس اس ممبران کی تھی جس میں منشی کرم اللہ خاں صاحب کے ساتھ حسب ذیل عہدیدار و ممبران بھی تھے۔

شاہزادہ ثریا جاہ صدر۔ اور ممبران حافظ عزیز الدین وکیل، محمد اکرام اللہ خاں، حکیم لطیف حسین خاں، حکیم محمد اجمل خاں، منشی فخر الدین، مولوی محمد انوار الحق ڈپٹی محمد الٰہی بخش خاں، شیخ اللہ دیا۔

منشی کرم اللہ خاں شیدا انجمن موئید الاسلام کے بانی تھے جس کا نام بدل کر بچوں کا گھر رکھ دیا گیا ہے۔ اب تک اس میں یتیم بچے پرورش پاتے ہیں۔ جناب شیدا کا دہلی کے مشہور محقق زبان اور مستند اشخاص میں شمار ہوتا تھا۔ ۱۸۵۷ء

کے بعد جس قدر مشاہیر شعرا آخر میں دہلی میں ہو گئے۔ ان سب سے شیدا صاحب کے دوستانہ تعلقات تھے۔ دہلی کے دیوان خانہ میں جہاں حکیم رضی الدین۔ حکیم اجمل خاں، نواب سعید احمد خاں، ڈپٹی بادشاہ حسین خاں، نواب سلطان مرزا، ڈپٹی اکرام خاں، سب رجسٹرار اور نواب فیض محمد خاں کے دیوان خانے مشہور تھے وہاں شامل میں منشی کرم اللہ خاں عرف نتھے خاں کا دیوان خانہ بھی کافی شہرت یافتہ تھا۔ مولانا الطاف حسین حالی کی نشست اسی دیوان خانہ میں تھی اور مولانا ظہیر، سالک وغیرہ بھی اسی دیوان خانہ میں جمع ہوتے تھے۔ مولانا حالی کے شیدا صاحب کے دوستانہ تعلقات تھے چنانچہ مولانا حالی کے خطوط میں شیدا صاحب کا ذکر ہے۔ ۲۰ ستمبر ۱۸۹۰ء کے ایک خط میں جو خواجہ غلام حسین کو لکھا ہے تحریر کرتے ہیں "شاید مخدومی محمد کرم اللہ خاں صاحب یا شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خاں صاحب تم کو ایک دو دن میں لکھیں گے"۔ دوسرے خط میں لکھتے ہیں "نتھے خاں صاحب سے بقدر ضرورت روپیہ وصول کر لینا"۔

شیدا صاحب تقریباً تمام اوصاف کے مالک تھے چنانچہ صاحب "یادگار دہلی" ان کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"منشی کرم اللہ خاں صاحب منشی آغا جان کے نائق صاحبزادے ہیں۔ بڑے با اخلاق، خوش اشفاق، صائب الرائے، عالی خیال، ہمدرد قوم، مخیر با وضع خود تو دہلی کے لئے باعث فخر ہے جس قدر قومی اور اسلامی کارہائے خیر اس وقت دہلی میں جاری ہیں تقریباً سب ہی کی آپ کے مبارک ہاتھ سے بنیاد قائم ہوئی۔ ہر درد مند اور مصیبت زدہ کے کام میں کشش ورزا و قدر ازیں و ہمدردی میں شریک ہوتے ہیں ان کا دیوان خانہ اہل حاجات کا مسکن ہے شرفاء رؤسا کا مرجع بنا ہوا ہے۔ یتیم خانہ انجمن مؤید الاسلام جس کے اجرا سے تمام قوم اور شہر کو بے حد فائدہ پہنچ رہا ہے۔

اس کے بانی مبانی آپ ہی ہیں۔ شہر کا بچہ بچہ آپ سے واقف ہے اور آپ کے اشفاق واخلاق کا دلدادہ وشیدا ہے۔ آپ کبھی کبھی شعروشاعری کر لیتے تھے۔ رشیدا تخلص تھا۔

رشیدا صاحب دہلی والوں کی خوشی ورنج وغم میں برابر کے شریک رہتے تھے۔ دہلی میونسپل کمیٹی نے یکم جنوری ۱۹۰۲ء کو مکانوں پر ٹیکس لگانے کا اعلان کیا۔ اور تمام صاحب جائیداد کو حکم دیا کہ وہ اپنی اپنی جائیداد کا کرایہ لکھیں۔ نیز یہ بھی تحریر کریں کہ اُن کی جائیداد کہاں کہاں ہے۔ خانہ پُری کر کے یکم سے پہلے میونسپل کمیٹی میں داخل کر دیں۔ ہاؤس ٹیکس تین روپے دو آنے سینکڑہ کے حساب سے لگایا جائیگا۔ مسجدوں، مندروں، شوالوں، گرجاؤں، ہسپتالوں اور مدرسوں پر عائد نہیں ہوگا۔

اس اعلان سے دہلی والوں میں بے چینی وپریشانی پھیل گئی۔ اس ٹیکس کے خلاف دہلی والوں نے آواز اُٹھائی، جلسے کئے، منشی کرم اللہ خاں صاحب نے اس کی مخالفت میں نمایاں حصّہ لیا۔ بلکہ کرتا دھرتا ہی تھے۔ جب اس میں کامیابی ہوئی اور لوگوں میں بے چینی ختم ہوئی تو دہلی کے اخبارات نے منشی صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ چنانچہ دارالعلوم دہلی نے مورخہ ۱۰ر مارچ ۱۹۰۲ء میں منشی صاحب کی ہمدردی کو ان الفاظ میں سراہا۔

منشی محمد کرم اللہ خاں صاحب عرف ننھے خاں عمائدین شہر دہلی میں سے ہیں۔ یہاں کے اکثر رؤسا رقابل اور لائق سنجیدہ مہذب ہیں لیکن خاں صاحب موصوف کی نسبت ہم بڑے زور سے لکھتے ہیں کہ اکثر رؤسا رعائدین سے ممتاز ہیں۔ قومی کاموں میں آپ کو خاص لگاؤ ہے اور ہر ایک مفید عام امورات میں آپ کو طبعی طور پر دلچسپی ہے، نہایت حلیم، بُردبار، خلیق اور منکسر المزاج ہیں، اس کے سوا بڑے متدین اور متشرع ہیں۔ ہاؤس ٹیکس کے بارے میں ایک عظیم الشان جلسہ میں

جس میں بڑے بڑے معززین رؤسا، وکلا شامل تھے۔ چند روز ہوئے، منعقد ہوا تھا۔ اور جلسہ نہایت عمدگی سے ختم ہوا جس کا اثر یہ ہوا کہ ہاؤس ٹیکس کی وجہ سے رعایا میں جو ایک طرح کی اضطرابی بے چینی پھیل گئی تھی وہ بالکل فرو ہو گئی۔ اور یہ سب خاں صاحب کی عمدہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انجمن موئید الاسلام کے آپ ہی بانی ہیں۔ اور ضبط شدہ اوقاف کو گورنمنٹ سے درخواست کر کے واگزار کرانا اور اس کی بوجہ احسن خبرگیری کرنا خاں صاحب ہی کا حصہ ہے۔"

شیدا صاحب شعر گوئی میں کس کے شاگرد تھے یہ پتہ نہیں لگا۔ البتہ شعر اچھا کہتے تھے۔ خواجہ میر درد کا رنگ ان کے کلام میں پایا جاتا ہے۔

رحم مجھ پر ذرا نہیں کرتے	کچھ وہ خوفِ خدا نہیں کرتے
رکھیں احباب یہ وصیت یاد	حسن والے وفا نہیں کرتے
جس کا جی چاہے ان کا ہو جائے	یہ کسی کے ہوا نہیں کرتے
استقامت ان کا اک قیامت ہے	یاں کے ڈوبے تیرا نہیں کرتے
ہے حسینوں کا حسن بدخوئی	ہم کسی کا گلا نہیں کرتے

مفت شیدا کو کر دیا بدنام
لوگ دنیا میں کیا نہیں کرتے

صوفی منش بزرگ

حاجی محبوب الٰہی صاحب دہلوی

حاجی صاحب کے دادا کا نام شیخ عبداللہ تھا۔ ان کے دو صاحبزادے تھے الٰہی بخش اور دوسرے شیخ امیر الدین تھے۔ ملا الٰہی بخش کی کوٹھی مدرسہ حسین بخش کلپوڑی دفعیڈی کی کرڈ پر تھی۔ قلعہ میں اکثر آمد و رفت تھی اہل قلعہ اور شہزادوں سے ان کے تعلقات تھے۔ یہ اپنے وقت کے بڑے بااثر آدمی تھے۔ ملا الٰہی بخش کی شادی حقیقی بھتیجی بنت عبدالرحمن سے بڑی شان و شوکت کے ساتھ ہوئی۔ دہلی کے علماء و مشائخ حتیٰ کہ حضرت شاہ عبدالعزیز نے بھی شرکت فرمائی۔ جن سے فضل الٰہی، محبوب الٰہی اور دو لڑکیاں حشمت النساء زوجہ مولانا رفیع الدین صاحب لطیف النساء زوجہ خواجہ شہاب الدین صاحب ہوئیں۔

حاجی محبوب الٰہی صاحب صوفی منش بزرگ اور درویش صفت انسان تھے۔ وہ اپنی نوجوانی میں کاروبار سے منسلک رہے لیکن عمر کا زیادہ حصہ پھر اس طرح بسر کیا کہ دنیا کے دھندوں سے اپنے آپ کو الگ رکھا۔ دہلی میں جنگلی گیٹ اور حجۃ شیخ منگو کے اتصال پر اس عمارت میں یہاں پہلے کبھی ہلال پریس تھا اور پھر ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء تک اس کے ایک حصہ میں مولانا محمد علی ریڈنگ روم قائم رہا۔ وہ ان کی نشست گاہ تھی

یہ عمارت انھی کی اپنی ملکیت تھی۔ اس کی بالائی منزل کا ایک حصّہ اُنھوں نے اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا۔ وہاں صوفیوں درویشوں، فقیروں اور عالموں کی محفلیں جمتی تھیں۔ اولیائے کرام کے مناقب اور صوفیوں کے فضائل یہاں ہوتے تھے اور علم کے سمندر بہتے تھے۔

حاجی محبوب الٰہی اُردو بھی جانتے تھے اور فارسی کی کتابیں بھی مطالعہ میں رہتی تھیں۔ تصوّف کی کتابوں کا بھی مطالعہ جاری تھا۔ درویشوں، صوفیوں اور سجادہ نشینوں سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ ان لوگوں کے ہاں آمد و رفت بھی رہتی اور قیام بھی رہتے تھے۔ حضرت علّامہ مولانا عبدالسلام نیازی، حضرت علامہ مولانا [illegible] الحق صاحب صدیقی، قادری صابری، منشی عاشق علی صاحب، پیر جی محمد امیر صاحب، حضرت مولانا مطیع اللہ صاحب، امام مسجد فتحپوری شاہی، پیر جی [illegible] رشید صاحب سجادہ نشین قلندر صاحب پانی پتی، سجادہ نشین پیران کلیر شریف جعفر میاں، جناب سید یوسف مہاراج صاحب سجادہ نشین حضرت خواجہ معین الدین چشتی، جناب خواجہ حسن نظامی صاحب، مولوی زین العابدین صاحب، حسن علی شاہ صاحب اور جناب سید احمد صاحب امام جامع مسجد شاہی دہلی ان کے احباب میں سے تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے بیعت تھے۔

پیر حسن علی شاہ صاحب کے بارے میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک [illegible] جب آپ حاجی محبوب الٰہی صاحب کے یہاں مقیم تھے حشمت النساء صاحبہ پر جن کے اثرات تھے۔ اس کا ذکر آپ سے کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ وہ نفل پڑھیں چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور اثرات زائل ہو گئے۔

مشائخ کے عرسوں کی شرکت حاجی محبوب الٰہی صاحب کا محبوب مشغلہ تھا۔ کلیر شریف، اجمیر شریف، پیران کلیر، قطب الاقطاب حضرت بختیار کاکی، سلطان المشائخ

حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت روشن چراغ دہلی کے عرسوں میں بڑے ذوق شوق کے ساتھ شرکت فرماتے تھے اور انتقال سے چند سال پہلے تک یہ سلسلہ شدت سے چلتا رہا لیکن آخر عمر میں باہر پردیس جانا چھٹ گیا تھا لیکن دہلی کے گرد و نواح میں اسی طرح حاضر ہوتے تھے اور شرکت کے لئے کئی کئی دن سلسل جاتے تھے۔

سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں حضرت امیر خسرو کے مزار کے جنوب مشرق میں ایک حجرہ ان کے لئے مخصوص تھا۔

آپ گھر پر کھانا کھانے کے لئے تشریف لاتے تو اکثر یہ ہوتا کہ راستہ میں سے کسی کو اپنے ساتھ لے آتے۔ اور اپنا کھانا اسے دیدیتے یا کھانا کھانے بیٹھتے اور کسی نے آکر آواز دی اور کہا کہ میں بھوکا ہوں تو اپنے سامنے کا کھانا اٹھا کر اسے دے دیا کرتے تھے۔ ان کے لئے گھی کی روٹی پکائی جاتی تھی۔ سادی روٹی چبتی نہ تھی جب بھی وہ اپنا کھانا کسی کو دیتے تو اسے گھی کی روٹی ہی دیتے تھے۔ گھر میں کسی نے کہا بھی کہ دیتے ہیں تو سادی روٹی دے دیجئے۔ نہیں تو آپ کیا کھائیں گے۔ اس پر آپ فرماتے، مجھے ہی روٹی دینی چاہیئے۔ جو میں خود کھاتا ہوں۔

ایک دفعہ آپ کے صاحبزادے غلام محمد صاحب ان کے لئے سفید اون کی بہت خوبصورت شال لائے اور ان سے کہا کہ آپ اسے اوڑھ لیجئے۔ کالا کمبل مجھ کو اچھا نہیں لگتا۔ آپ نے وہ شال لے لی اور اسے پسند بھی کیا۔ ایک دن اسے اوڑھ کر بازار گئے۔ جب آپ گھر پر واپس آئے تو ان کے پاس وہ شال نہ تھی۔ ان کی اہلیہ نے پوچھا کہ وہ شال کہاں گئی۔ فرمانے لگے۔ ایک ضرورتمند راستے میں مل گیا۔ میں نے اسے دے دی۔ اس کو مجھ سے زیادہ اس کی ضرورت تھی۔ غلام محمد صاحب کو بہت رنج ہوا۔ وہ بڑے شوق سے ان کے لئے شال لائے تھے۔ ان کو رنجیدہ دیکھ کر فرمانے لگے میں وہ شال واپس لے آتا ہوں مگر اب میں اسے اوڑھوں گا نہیں۔ وہ آ بھی جائے تو میں اپنا

کالا کمبل ہی اوڑھوں گا اس پر سب چپ ہو گئے۔

حاجی محبوب الٰہی صاحب کی نظروں میں دنیا کی کوئی قیمت نہ تھی۔ انھوں نے رنج و راحت کا کبھی کوئی گہرا اثر نہیں لیا۔ گھر میں بڑے سے بڑے حادثات گزر جاتے تو وہ مضطرب نہ ہوتے تھے شہر میں ان کی کافی جائیداد تھی لیکن انہیں اس کی کوئی پرواہ نہ تھی وہ ٹوٹ پھوٹ بھی جاتی تو اس کی مرمت نہ ہوتی۔ کوئی کرایہ نہ دیتا تو اسے مجبور نہ کرتے۔ بعض کرایہ دار چار چار آنے کر کے دیتے تھے وہ اس پر بھی نہ بولتے تھے۔

۱۹۴۷ء کے پرآشوب زمانہ میں جب دہلی پر قیامت ٹوٹ رہی تھی اور ایک محلے سے دوسرے محلہ میں جانا جان پر کھیلنا تھا اور بیمار پڑ گئے لیڈی ڈاکٹر محمودہ اختر ان دنوں دہلی میں اُردو بازار کے سرے پر ایڈورڈ پارک کے سامنے رہتی تھیں اور جگت سینما کے جنوب مغربی کونے میں اس مکان میں مقیم تھیں جو خواجہ حسن نظامی صاحب کی ملکیت تھا۔ چوڑی والان کے محلہ سے اُردو بازار کے اس سرے تک اس قیامت میں بھی اتنی تھا۔ ڈاکٹر صاحبہ کا علاج ہوتا رہا۔ ۲۴ گھنٹہ میں گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے کرفیو کھلتا تو ڈاکٹر صاحبہ انھیں دیکھنے آتیں وہ بھی ان کے علاج سے مطمئن تھے لیکن موت کا علاج دنیا میں کہاں ہے۔ کرفیو کے اوقات میں تکلیف بڑھتی تو بڑی پریشانی اور دقت ہوتی تھی۔ ساور ڈاکٹر کو بلانے یا ان تک پہنچنے کی کوئی صورت نہ رہتی تھی۔ اُن کے چھوٹے صاحبزادے غلام فرید میاں آخری ایام کے بارے میں لکھتے ہیں۔

وفات سے چند روز پیشتر ان کی طبیعت اور اُن کی صحت اطمینان بخش محسوس ہونے لگی تھی۔ ان ایام میں بیماری میں جس قدر جسمانی کمزوری نظر آتی تھی بتدریج زائل ہو رہی تھی، چہرے پر رونق آ گئی تھی اور ان کی صحت عام دنوں جیسی ہوتی چلی جا رہی تھی سب کا خیال تھا کہ بہت جلد بالکل تندرست ہو جائیں گے لیکن کسے

معلوم تھا کہ یہ موت کا سنبھالا تھا۔

۱۳ر دسمبر تھی اور دوپہر کا وقت تھا گھر میں جو لوگ موجود تھے وہ سب بالائی منزل پر تھے۔ آپ جامع مسجد سے واپس آئے تو نیچے سے آواز دی کہ پان دے جاؤ۔ اتنی دیر میں ادھر سے پان بن کر آئے۔ آپ پلنگ پر لیٹ گئے۔ اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ ان کی صاحبزادی و اہلیہ جناب شیخ رضی الدین پان لے کر پہنچے تو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ ۱۴ر دسمبر ۱۹۴۷ء مطابق ۲۹ محرم الحرام ۱۳۶۷ھ ہفتہ کا دن تھا۔ دہلی کی حالت اس وقت یہ تھی کہ کسی قبرستان کا کوئی راستہ مسلمانوں کے لئے محفوظ نہ تھا۔ ان ہمت شکن حالات میں تدفین کا سوال ایک ایسا مسئلہ تھا جس کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ ان حالات کو غلام فرید کی قلم سے ملاحظہ فرمائیے۔

"جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس سوال کی اہمیت بڑھتی جا رہی تھی لیکن اس سے پہلے ہم لوگوں کی پرواز فکر اپنا دم توڑ دے۔ قدرت نے ان کے لئے ایک ایسی جگہ کا بندوبست کرا دیا جو گمان میں بھی نہ تھی۔ تدفین کا یہ سوال چند لمحہ قبل ایک الجھن اور ناممکن سا نظر آ رہا تھا سکنڈوں میں حل ہو گیا اور اس وقت محسوس ہوا کہ انسانی قوت سے بالا کوئی قوت اور ہے جس نے اس سلسلہ میں رہبری کی۔"

چنانچہ جامع مسجد شاہجہانی دہلی کے شمالی دروازہ کے قریب جامع مسجد کے بڑے امام صاحب کا مزار ہے۔ ان کے پاس حاجی محبوب الٰہی صاحب کی تدفین عمل میں آئی۔ نماز جنازہ جامع مسجد میں پڑھائی گئی اور لوگوں کی بہت بڑی تعداد نماز جنازہ میں شریک ہوئی۔

سید محمد صاحب امام شاہی عیدگاہ دہلی

ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ دینی و تعلیمی امور میں صحیح النسب سادات کو ترجیح دیں۔ امامت، شہزادوں کی اتالیقی، افتاء و قضا پر ہمیشہ سادات بنی ہاشم سرفراز ہوتے تھے۔ شاہجہاں بادشاہ نے جب دہلی میں شاہجہاں آباد کی تعمیر کی اور قلعہ معلّیٰ کی بنیاد ڈالی تو بادشاہی شہر کی پرانی عیدگاہ کی امامت کے لئے اعلیٰ حضرت نے مدینہ منورہ سے صحیح النسب سید بلوائے۔ جنہیں مدینہ منورہ سے بلا کر عیدگاہ کی امامت اور اتالیقی کا کام سپرد کیا۔ حافظ سید محمد صاحب کے اجداد عیدگاہ کے شاہی امام تھے جن کی تنخواہ پانچ ہزار روپے ماہانہ تھی۔

عالمگیر نے جب موتی مسجد اور نئی عیدگاہ کی تعمیر کی تو دونوں جگہ کی امامت انہی بزرگوں کے سپرد ہوئی۔ عالمگیر کے زمانہ میں حضرت باسط کو عیدگاہ کو امام الملک کا خطاب عطا ہوا۔ شاہان مغلیہ کے دلوں میں ان کی بزرگی و عظمت اس قدر تھی کہ انہوں نے ان کے لئے بادشاہی تعظیم معاف کر رکھی تھی اور وہ شاہی رسم و آداب کے پابند نہ تھے۔ یہ لوگ قلعہ معلّیٰ اور عیدگاہ میں امامت کے فرائض انجام دیتے تھے۔

حضرت مولانا باسط کے انتقال کے بعد حافظ سید قاسم علی صاحب مسند امامت پر سرفراز ہوئے۔ آپ مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے تلمیذ خاص

تھے۔ اور بادشاہِ وقت کی طرف سے آپ کو خطیب الملک کا خطاب مرحمت ہوا تھا۔ آپ کے بعد علی الترتیب حافظ سید محمود صاحب اور حافظ نعمت اللہ صاحب شاہی امام مقرر ہوئے۔ ان بزرگوں کو ہر عید کے موقع پر بہادر شاہ ظفرؔ کے زمانہ تک خلعت شش پارچہ دو رقم جواہر قبضۂ شمشیر معہ بلہ مقررہ انعام شاہی کے طور پر مرحمت ہوتے تھے۔ اور یہ انعام و اکرام شاہانِ مغلیہ نمازِ عید کے بعد ہی عیدگاہ میں مرحمت فرماتے تھے چنانچہ بہادر شاہ ظفر اپنے روزنامچہ میں ۲۷ جنوری ۱۸۴۶ء میں لکھتے ہیں :-

"بادشاہ سلامت بقر عید کے دن تنق قرمزی کپڑے پہن کر اور جواہرات نفیسہ زیبِ جسم فرما کر شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ عیدگاہ تشریف لے گئے نماز سے فارغ ہونے کے بعد عیدگاہ کے امام صاحب اور جامع مسجد کے امام صاحب اور کسی دوسرے امام کو خلعت ہائے فاخرہ مرحمت فرماتے پھر اس کے بعد قربانی کی رسم ادا کی گئی۔" صلا۲

حضرت حافظ نعمت اللہ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں عیدگاہ کے امام دیوانِ خاص تھے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل تک اس منصب پر سرفراز رہے۔ وہ اپنے دور کے بہترین حافظ تھے۔ قلعہ معلیٰ میں رمضان شریف کی تراویح میں ختمِ قرآنِ مجید کرتے تھے۔ تاریخوں میں اُن کا ذکر اکثر آتا ہے۔ ایک مرتبہ انھیں ختمِ قرآن پر بہادر شاہ ظفر کی طرف سے دوشالہ مرحمت ہوا جس کا ذکر یہاں شاہ ظفر کے روزنامچہ ۱۶ اکتوبر ۱۸۴۷ء میں ہے۔

"حافظ نعمت اللہ" پیش امام دیوانِ خاص کو کلام اللہ کی ختم کی تقریب میں بادشاہ سلامت نے ایک دوشالہ مرحمت فرمایا۔" صلا۹۹ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں دہلی کے شریفوں کے گھر تباہ و برباد ہوئے اور ان کے قیمتی ذخیرے، دستاویزات

کتابیں اور شاہی فرامین غارت ہوئے۔ اسی طرح اس ہاشمی خاندان کے قیمتی ذخائر اور دستاویزات تلف ہوئے۔ اور سابقہ اعزاز و اکرام بھی اسی کے ساتھ ختم ہوا۔ امام صاحب کے خاندان والوں نے الور جاکر پناہ لی اور جب دہلی میں امن و امان ہو گیا تو یہ لوگ بھی دہلی چلے آئے۔ مگر اب دہلی کا نقشہ بالکل بدلا ہوا تھا شاہی امام حکومت کی سرپرستی اور قدردانی سے بالکل محروم تھے۔ ان کی جاگیر و وظائف کا کوئی انتظام نہ تھا۔ پھر بھی حافظ نعمت اللہ صاحب توکل اور گوشہ نشینی کے ساتھ بدستور اپنے آبائی فرائض انجام دینے میں مشغول رہے۔

حافظ نعمت اللہ صاحب کے فوت ہونے کے بعد ان کے صاحبزادے حافظ سید محمد صاحب نامدار اور عمائد دہلی کی تصدیق اور تائید سے مسند امامت پر سرفراز ہوئے۔ آپ کی بزرگی شرافت اور خلوص کا تمام شہر معترف ہے۔ آپ کے اندر شرافت کے وہ تمام اوصاف موجود تھے جو رسول ہاشمی کے اولاد کے شایان شان ہو سکتے تھے۔ چنانچہ آپ کا تقویٰ، زہد اور پرہیزگاری آج تک ضرب المثل ہے۔ آپ کے زمانہ میں امیر حبیب اللہ شاہ افغانستان دہلی تشریف لائے تھے تو یہاں آپ کا شاہانہ استقبال کیا گیا تھا۔ شاہ نے عید الاضحیٰ کے دن عیدگاہ میں حضرت امام صاحب کے پیچھے نماز عید ادا فرمائی۔ امام صاحب نے ہر چند اصرار کیا کہ آپ نے جس طرح ہندوستان کے دیگر مقامات پر خود امام بن کر نماز پڑھائی بعینہٖ اسی صورت سے دہلی کی شاہی عیدگاہ میں بھی آپ امام بنے لیکن امیر حبیب اللہ نے یہ گوارا نہیں کیا کہ شاہان سلف کے شاہی ائمہ کے ہاشمی الاصل جانشین کے ہوتے ہوئے خود امام بنیں۔ چنانچہ شاہ نے امام بننے سے انکار کر دیا۔ نماز عید کے بعد امیر حبیب اللہ امام صاحب کو ایک دوشالہ اور ایک زریں جبہ مرحمت فرمایا۔ امیر حبیب اللہ خاں شاہ افغانستان کی قدردانی اور طرز عمل نے اس وقت شاہان مغلیہ کے زمانہ کی یاد تازہ کر دی تھی۔ امیر حبیب اللہ صاحب نے امام حافظ سید محمد

صاحب پر کلی اعتماد و اطمینان کا اظہار فرمایا تھا۔

امام سید محمد صاحب ایک قانع صابر اور متوکل شخص تھے باکرامت وزہد وورع کا ایک حسین پیکر تھے۔ آپ کی اکثر راتیں تمام کی تمام نوافل اور تلاوت قرآن مجید میں گذر جاتی تھیں۔ نمود و نمائش سے آپ کی ذات مبرا و پاک تھی۔ آپ محلہ چوڑی والان گلی حمام والی دہلی میں تا حیات سکونت پذیر رہے اور ۱۹۱۹ء مطابق ۱۳۳۷ھ میں بعارضہ فالج آپ کا انتقال ہوا۔

بقول صاحب آثار دہلی ' مولوی حافظ سید محمد صاحب امام عیدگاہ شاہی نہایت متقی، محتاط، پرہیزگار، باوقات قابلِ دیدار ہیں۔' ۷۵

حضرت حافظ سید محمد صاحب نے اپنی زندگی میں اپنے صاحب زادے مولانا قاری سید محمد طاہر حسن صاحب کو یکم شوال ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۲ء میں اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ آپ اپنے آبا و اجداد کے نقشِ قدم پر چلے آپ کی بزرگی و اخلاق کی شہادت ہر شخص دیتا تھا۔ منتظمہ کمیٹی تجہیزی دہلی عیدین کے موقع پر ایک سو روپے نذرانہ پیش کرتی تھی۔ نیز ہائینس نواب جلال الدین خان صاحب والیِ ریاست راد من پور بھی امام سید طاہر حسن کو ہر عید کے موقع پر خلعت فاخرہ بھیجتے رہتے تھے۔ اور کافی سال سفیر کابل دولتِ افغانستان کی طرف سے عیدین پر ایک ایک شال بطریقِ خلعت فاخرہ بعد نماز عید امام صاحب کو دی جاتی رہی۔ آپ خوشنویسی و تجوید اور مسائل فقہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ خاندان نقشبندیہ مجددیہ کی آپ کو خلافت حاصل تھی۔ آپ کا علمی اور عملی فیضان باوجود آپ کی گوشہ نشینی درگاہ قدم شریف، غالباً: درگاہ حضرت سید حسن رسول نما نئی دہلی سے جہاں آپ اقامت گزیں رہے۔
جاری و ساری تھا۔

قاری سید محمد طاہر صاحب مع اپنے خاندان کے ۱۹۴۷ء کے پُر آشوب دور

میں پاکستان چلے گئے اس کے بعد مولانا احمد سعید صاحب مولانا محمد سعید صاحب
مولانا ابرار قریشی نے عیدین کی نماز عیدگاہ میں پڑھائی اور آج کل حضرت شاہ
ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ کے خلف اکبر مولانا زید عیدین کی نماز عیدگاہ میں
پڑھا رہے ہیں۔

سیّد محمّد خاں دہلوی برادر سید احمد خاں

سید محمّد خاں سرسید کے بڑے بھائی تھے۔ وہ اپنے باپ کی طرف سے حسینی سیّد تھے۔ اُن کا سلسلہ نسب ۳۴ واسطوں سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ ان کے اس سلسلہ نسب میں آخرامام حضرت محمّد تقی ابن امام موسیٰ رضا ہیں اس لئے یہ خاندان اپنے آپ کو تقوی سیّد کہتا تھا۔

جس زمانہ میں بنی فاطمہ کو بنی اُمیہ اور بنی عبّاس کے ظلم وستم سے عرب و عراق میں رہنا خاصا دشوار ہوگیا تھا اور اسی لئے اکثر سادات کے خاندان اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں کو جارہے تھے۔ اسی پُرآشوب زمانے میں اس وقت سید محمّد خاں کے اجداد بھی دامغان میں جو ایران کا قدیم شہر ہے چھوڑ کر چلے آئے تھے اور آخر ہرات میں اُنھوں نے مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ ان کے بزرگ ہندوستان میں پہلے پہل شاہجہان کے عہد میں آئے تھے اور اس وقت سے اکبر شاہ ثانی کے زمانہ تک ان کو اسی سلطنت کے ساتھ کسی نہ کسی قدر تعلق ضرور رہا۔

سید محمّد دوست جو سید محمّد خاں کے اجداد میں سے تھے۔ دکن کی مہم میں اورنگزیب عالمگیر کے ساتھ تھے۔ وہ اپنی جمعیت کے ساتھ ایک مورچہ میں متعین تھے جب اس مورچہ کو انھوں نے تنہا بلاشرکت کسی دوسرے افسر کے فتح کرلیا تو عالمگیر نے اُن کو "یکہ بہادر" کا خطاب دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن ہرات چلے گئے۔ اُن کے

بڑے سید برہان وہاں سے آکر دلی میں سکونت اختیار کی۔ سید برہان کے بیٹے سید
عماد الدین کے دو صاحبزادے سید ہادی اور سید مہدی تھے۔ سید ہادی سید محمد خاں
کے دادا تھے۔ ان کو عزیز الدین عالمگیر ثانی نے سنہ ۲ جلوس مطابق ۱۱۶۸ھ
میں خطاب جواد علی خاں اور منصب ہزاری ذات و پانصد سوار پیسہ ملا اور ان
کے بھائی سید مہدی کو بھی وہی منصب اور علی خاں کا خطاب ملا تھا۔ یہ دکن چلے
گئے اور وہیں فوت ہوئے مگر جواد علی خاں دہلی میں بادشاہ کے پاس رہے۔ جب
عالمگیر کا عہد ختم ہوا اور شاہ عالم ثانی بادشاہ بنے تو سید محمد خاں کے دادا کے
خطاب میں اضافہ کیا گیا اور عہدہ احتساب اور صوبہ جہاں آباد عطا ہوا اور سنہ
جلوس شاہ عالم مطابق ۱۱۸۰ھ نقلئے قلعہ کا عہدہ عنایت ہوا اور ۱۷/ شعبان کو
فوت ہو گئے۔ یہ صاحب دیوان تھے، شعر کہتے تھے۔ سر سید احمد خاں کے پاس ان کا
دیوان تھا جو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانے میں ضائع ہو گیا۔ سید ہادی کے بیٹے
سید محمد خاں کے والد میر تقی تھے۔ اگرچہ شاہ عالم کے زمانہ میں ان کے بعد اکبر
شاہ کے عہد میں جو درجہ دربار عام اور دربار خاص میں ان کے والد کا تھا وہی درجہ میر تقی کا
بھی ہوا۔ ان کو اکبر بادشاہ کے ساتھ شاہزادگی کے زمانے سے نہایت قربت تھی۔ اس لئے
شاہ عالم کے انتقال کے بعد ان کا رسوخ دربار میں پہلے سے زیادہ ہو گیا۔

میر تقی اپنی زندگی نہایت آزادی اور بے فکری سے بسر کرتے تھے جس کا اثر سید
محمد خاں اور ان کے خاندان میں اب تک چلا آرہا تھا۔ ان کو حضرت شاہ غلام علی سے
جن کی خانقاہ دہلی میں مشہور تھی عقیدت تھی۔ اور ان سے بیعت تھے۔ شاہ صاحب ان
پر پدرانہ شفقت فرماتے تھے۔ ہر حلقہ کے بعد ایک مرید جس کو حکم دے رکھا تھا میر تقی
کی زنانہ ڈیوڑھی پر آتا اور سب چھوٹے بڑوں کی خیریت پوچھ کر شاہ صاحب کو عرض کر دیتا
میر تقی کے والد سید ہادی اور خواجہ فرید الدین احمد سے بہت مراسم تھے۔ میر تقی بھی

والدہ کے انتقال کے بعد خواجہ فرید سے نہایت ادب کے ساتھ ملتے تھے اور خواجہ فرید بھی ان کے حال پر بہت مہربانی کرتے تھے، جب وہ ایران اور امرا کے سفر سے واپس آئے تو انھوں نے اپنی بڑی بیٹی عزالنسا بیگم کی شادی میر تقی سے کر دی۔ اب میر تقی اپنے قدیم موروثی دکان سے تبدیل ہو کر مہدی قلی خاں والی حویلی میں جو خواجہ فرید نے خریدلی تھی آرہے تھے۔

میر تقی نہایت وضعدار و متقی آدمی تھے۔ معین الدین اکبر شاہ کے ایک بھائی مرزا شمس الدین تھے جن کی طرف سے بادشاہ کو پرخاش تھی۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ میر تقی کا مرزا شمس الدین سے بڑا تعلق تھا وہ ان کے ہاں برابر آتے جاتے رہتے تھے مرزا شمس الدین سے ملنے سے منع کیا۔ میر تقی نے ہاتھ جوڑ کر کہا "کیا حضور کو فدوی کی جاں نثاری میں کچھ تردد ہو رہا ہے۔" بادشاہ نے ہنس کر فرمایا نہیں نہیں۔ میر تقی نے عرض کیا تو پھر میں اپنے قدیم طریقے میں مفت میں کیوں روپ ہی لوں۔ بادشاہ نے پھر ان سے کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ وہ بدستور مرزا شمس الدین سے ملتے رہے۔

میر تقی کے دو صاحبزادے، سید محمدؐ خاں اور سید احمدؐ خاں ہوئے۔ سید محمدؐ خاں جب پیدا ہوئے تو ان کے والد نے شاہ غلام علی صاحب سے نام رکھنے کی درخواست کی۔ شاہ صاحب نے بڑے بھائی کا نام محمدؐ رکھا تھا اور چھوٹے بھائی کا نام احمدؐ تجویز کیا تھا۔

سید محمدؐ خاں نے معمولی تعلیم حاصل کی تھی مگر بہت زندہ دل تھے شگفتہ مزاجی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ بھی شاہ غلام علی صاحب سے بیعت تھے۔ مگر وضع شریعت کے خلاف تھی۔ اکثر ان کے والد کے ملنے والے ان سے کہتے کہ اپنے بیٹے کو سمجھاؤ، اپنی وضع شریعت کے مطابق کرے اور داڑھی نہ منڈوایا کرے۔ وہ یہ جواب دیتے عمر کا تقاضا ہے اس کا جو دل چاہے کرنے دیجیے۔ کبھی نہ کبھی خود درست ہو جائے گا۔ آخر

ایک مدت کے بعد وہ خود بدل گئے۔ داڑھی رکھ لی اور نماز کے سخت پابند ہو گئے یہاں تک کہ تہجد اور اشراق کی نماز بھی ترک نہیں کرتے تھے۔ روزے پورے رمضان کے رکھتے تھے اور قرآن مجید کی بھی تلاوت کرنے لگے تھے۔ سید محمد خاں صاحب نے ایک ہفتہ وار سید الاخبار ۱۸۳۷ء کو جاری کیا تھا۔ اس میں ان کے چھوٹے بھائی سر سید احمد خاں کا بھی دخل تھا۔

سر سید احمد خاں کی تنخواہ سو روپے ماہوار تھی۔ سارے کنبے کا خرچ تھا۔ سر سید ابتدا سے نہایت فراخ حوصلہ اور کشادہ دل تھے۔ خرچ کی تنگی کے سبب اکثر متفکر رہتے تھے۔ لہٰذا ان کو یہ خیال ہوا کہ کسی تدبیر سے یہ تنگی ختم ہو۔ سید الاخبار جو ان کے بھائی کا جاری کیا ہوا اخبار تھا کچھ اس کو ترقی دینا چاہی اور کچھ عمارات دہلی کے حالات پر ایک کتاب مرتب کرنے کا ارادہ کیا۔

اس اخبار کی وجہ تسمیہ بھائیوں کی آپس میں محبت تھی۔ جب بڑے بھائی سید محمد کو اخبار جاری کرنے کا خیال آیا تو ان کو اپنے چھوٹے بھائی سید احمد خاں صاحب سے بے انتہا محبت تھی جن کو ان کے خاندان کے لوگ سید کہا کرتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنے اخبار کا نام ان کی عرفیت کی مناسبت سے سید الاخبار رکھا۔ اس کے مالک سید محمد خاں صاحب تھے اور مہتمم سید عبدالغفور صاحب مقرر ہوئے۔ ماہانہ چندہ دو روپے تھا اور مطبع سید الاخبار میں چھپتا تھا۔ علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی اخبار کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کھوج اور تلاش میں لگ جاتے ہیں کہ یہ اخبار کب تک جاری رہا۔ وہ پرانے اخباروں کی ورق گردانی میں لگنے کے بعد ثبوت نکالنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اگر کیفی صاحب کو شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی کی مشہور و معروف تالیف حیات جاوید کا خیال آ جاتا کہ اس کتاب میں اس اخبار کا ذکر ہوگا تو علامہ کیفی کو اس جستجو و تحقیق کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑتی۔ اس

کو حسب ذیل معلومات فراہم ہو جاتی۔

اس اخبار کے ایڈیٹر مولانا سید محمدؒ کا انتقال عین عالم شباب میں ہوا۔ جب ان کی عمر ۲۴ سال کی تھی۔ اس کے بعد سر سید نے اس اخبار کا انتظام ایک اور شخص کے سپرد کر دیا تھا لیکن زیادہ تر سر سید خود اس میں مضامین لکھا کرتے تھے یہ اخبار اس وقت وجود میں آیا جب سر سید کی عمر سترہ یا اٹھارہ سال کی تھی سر سید کے ابتدائی مضامین غالباً اسی اخبار میں شائع ہونا شروع ہوئے تھے۔ آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن بھی مطبع سید الاخبار میں چھپا تھا۔

"مسٹر لارنس نے ۱۸۴۴ء میں سید الاخبار دہلی کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی تھی"

"سید الاخبار کی خبریں گھٹیا درجے کی اور مبالغہ آمیز ہوتی ہیں۔ اس کا لب و لہجہ متعصبانہ اور مناظرانہ ہوتا ہے"

یہ رائے درست نہیں ہے جس میں تعصب جھلکے معلوم ہوتا ہے کہ سید الاخبار میں کوئی مضمون "انجیل میں تحریف" کے عنوان سے شائع ہوا تھا جو لارنس صاحب کو اس کا لہجہ و طرز متعصبانہ اور مناظرانہ معلوم ہوا۔

سید محمدؒ صاحب چونکہ سرکاری ملازم تھے۔ اس لئے اخبار کے انتظام و اہتمام کی ذمہ داری سید عبدالغفور صاحب کو انھوں نے سپرد کر دی تھی۔ عبدالغفور صاحب قانون داں تھے۔ اس لئے اخبار میں قانونی مضامین نمایاں طور پر شائع کرتے تھے بلکہ اس کا علیحدہ ضمیمہ نکلتا تھا جس کو میں نے کتب انجمن ترقی اردو آثار دہلی میں ایک فائل کی صورت میں دیکھا ہے۔ افسوس ہے کہ اس کا ادبی اور خبروں والا کوئی پرچہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ قانونی ضمیمہ وکیلوں میں پسند کیا جاتا تھا۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل کے اخبارات میں سید الاخبار دہلی سے

مرزا غالب کا خصوصی تعلق تھا۔ مرزا غالب سے سر سید کو دیرینہ تعلقات تھے۔ اس لئے ان کے بڑے بھائی سید محمد خاں کے اخبار میں ان کا تعلق کیوں نہ ہوتا۔ مرزا غالب سید جان آپ کے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں۔

"بی اتم اول کہ چگرف بخشش است آنکہ دوبارہ سید الاخبار داد
محمد شمس داده اند۔ صفحہ دیگر بر من نہادہ اند۔ نہان سپارکہ نقش
طبع سید الاخبار انگیزہ طبع یکے از دوستاں روحانی من است"

سید محمد خاں ضلع فتحپور میں منصف تھے۔ ١٨٤٥ء میں سر سید محمد خاں تہاکام سے دھہرہ کی تعطیل میں دلی آئے رہاں اس وقت بخار کی فصل تھی۔ سید محمد خاں کو بخار آنے لگا تعطیل کے بعد جب سر سید جانے لگے تو رخصت کے وقت ان کے بھائی نے ایسے کلمات کہے جس سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کو اپنے زندہ رہنے کی امید نہیں ہے۔ اس کے بعد فی الواقع ان کا مرض بڑھتا چلا گیا اور وہ اسی حالت میں خواجہ باقی باللہ گئے اور وہاں اپنی قبر کے لئے خود جگہ منتخب کی۔ ہر چند لوگ کہتے تھے کہ ایسی بیماری نہیں ہے۔ تم کیوں اس خیال وہم میں پڑے ہوئے ہو مگر ان کو اپنے مرنے کا یقین ہو گیا تھا جب سر دادا تیار ہو گیا تو سوار ہو کر وہاں پہنچے اور سر دادے میں اتر کر لیٹے اور قبر کو پسند کیا۔ وہاں سے آکر دوسرے دن کفن کے لئے کپڑا منگوایا اور اس کو سلوا کر پہنا اور بہت پسند کیا۔ اب مرض اور بھی زیادہ بڑھ گیا۔ ایک دن شاہ احمد سعید صاحب کو جو اس وقت سجادہ نشین تھے بلایا۔ ان کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی اور تیسرے دن فوت ہو گئے۔ مفتی صدر الدین صاحب نے سر سید کو ان کی تعزیت کا خط بھیجا تھا اس میں یہ شعر درج تھا:

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت
مرگے کہ زندگاں بہ دعا آرزو کنند

جناب محمد مسلم صاحب

محمد مسلم صاحب کے آبا و اجداد ریواڑی کے رہنے والے تھے۔ سالار مسعود غازی سے ان کے خاندان کا سلسلہ ملتا ہے۔ ریواڑی کے مفتی صدیقی برادری سے ان کا تعلق تھا۔ آخری دور میں مفتی نظام الدین آپ کے خاندان کے ایک فرد تھے جن کی ریواڑی میں ایک حویلی ہے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں اس خاندان نے حصہ لیا جس کی پاداش میں خاندان کے ۱۹ (انیس) آدمیوں کو پھانسی دی گئی۔ اس دور کے خاندان میں ایک کمسن بچے قمر الدین رہ گئے تھے وہ کسی طرح بچ بچا کر بھوپال پہنچ گئے تھے۔ قمر الدین صاحب محمد مسلم صاحب کے دادا تھے۔ انھوں نے ریاست بھوپال میں فوج میں ملازمت کی تھی۔ ان کے صاحب زادے مستقیم الدین صاحب جوانی میں محکمہ اکاؤنٹ میں ملازم تھے انھوں نے بہت اصلاحی اور رفاہی کاموں کی بنیاد رکھی جن میں دو بڑی انجمنیں امداد بیوگان و یتیمی اور اصلاح المسلمین بلا سود کی قرضہ دینے والی انجمن قائم کی۔ مستقیم الدین صاحب کے ایک عزیز قاضی ضمیر الدین صاحب تھانہ صدر بازار دہلی میں انسپکٹر پولیس تھے حکمت بھی جانتے تھے۔ دہلی میں ان کے پاس علاج کے لئے مریض بھی آتے تھے۔ دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔ بھوپال کے کسی شاعر نے ان کے انتقال پر ایک مرثیہ لکھا تھا جس کے تین مصرعے مسلم صاحب کو یاد تھے وہ یہ تھے ؎

اے زمیں شہر دہلی شکوہ ہا دارم ز تو

زاں کہ گم گردید در ارضِ تو آں درِّ یتیم
ہم چو نام خویش در راہ شریعت مستقیم

مستقیم صاحب کے دو صاحبزادے غیور حسن صاحب اور محمد مسلم صاحب
تھے۔ مستقیم صاحب جب فوت ہوئے تو اس وقت غیور حسن صاحب کی عمر پانچ سال
اور محمد مسلم صاحب کی ڈیڑھ سال تھی۔ ان کی والدہ کا والد صاحب سے قبل انتقال
ہو چکا تھا۔ ان دونوں بھائیوں کی پرورش ان کے نانا عبد المتین صاحب اور
ان کی نانی نے کی۔ متین صاحب سجادہ گدی بننے والے تھے جو اس وقت الور میں تھے
متین صاحب اچھے مصنف اور شاعر تھے۔ کئی کتابیں سائنس و فلسفہ اور فلسفۂ
اخلاق پر لکھیں جو چھپ چکی ہیں۔ عربی، فارسی، انگریزی، ترکی اور سنسکرت کے
ماہر تھے۔ کئی عربی و ترکی کتابوں کے ترجمے بھی شائع کئے۔ نظم میں سائنس کے
موضوعات کو بچوں کے لئے منتقل کیا۔ یہ کام انھوں نے ۱۹۱۰ء، ۱۹۱۱ء میں
انجام دیا تھا۔ بھوپال کی ریاست کی سروس میں تحصیلدار تھے۔ اس زمانہ میں ریاستوں
میں اخبار پڑھنا ممنوع تھا جو پولیس کی نگرانی اور حکومت کی ناراضگی کو دعوت دیتا
تھا۔ ان کے پاس ملک بھر کے اخبارات آتے تھے اور وہ ان کا مطالعہ کرتے تھے
اور اخبارات کو مضامین لکھ کر بھیجتے تھے جن کی پاداش میں ان کو نوکری سے علٰحدہ
کر کے چوبیس گھنٹے کا اخراج کا حکم ملا۔ جائیداد ضبط کر لی گئی۔ چنانچہ یہ بھوپال سے
نکل کھڑے ہوئے۔ پہلے لاہور گئے۔ پیسہ اخبار کے ادارتی شعبہ میں شامل ہوئے
کچھ عرصہ وہاں کام کرنے کے بعد دہلی آ گئے۔ دہلی کے مؤید الاسلام انجمن کے
سکریٹری مقرر ہوئے۔ جامع مسجد تاج محمد ٹیلی والے کے مکان میں رہائش اختیار کی۔ حضرت
مفتی اعظم محمد کفایت اللہ صاحب سے متاثر ہوئے لیکن بعض علماء کا کردار پسند
نہیں آیا۔ اس بنا پر دہلی سے ہجرت کا ارادہ کیا۔ پٹیالہ کے پاس ایک گاؤں بھرولی میں

سکونت اختیار کی۔ یہ ملا قادر اس کے پاس کے دو تین گاؤں ان کے سالے قاضی رفیع الدین کی زمینداری میں تھے۔ ان کے سالے اس علاقہ کے ممتاز زمیندار شمار کئے جاتے تھے۔ اس گاؤں میں متین صاحب نے ایک مسجد بنوائی جس میں جمعہ کی نماز شروع کرائی۔ یہ میوات میں تعلیم کا پہلا مرکز تھا۔

قاضی رفیع الدین صاحب نے ایک بنیہ کا مکان لٹوایا اور پولیس کو بلوا کر گرفتار بھی کرا دیا۔ متین صاحب نے اس ظلم و زیادتی پر ناراضگی کا اظہار کیا لیکن ان کے سالے اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے اور ان کو انھوں نے کہلوا دیا کہ یہ ہماری زمینداری کے معاملات ہیں ان میں مداخلت نہ کیجئے۔

متین صاحب ظلم و زیادتی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ وہ کوئی اور قدم اٹھاتے کہ عین اسی وقت بیگم بھوپال سلطان جہاں کا یہ پیغام پہنچا کہ تمہارے اخراج کو واپس لیتی ہوں اور یہ خواہش رکھتی ہوں کہ مولوی عبدالمتین صاحب بیگم صاحبہ کے نوجوان پوتوں کے لئے اتالیقی کا منصب قبول کرلیں۔ غالباً یہ بات بیگم صاحبہ نے کسی خواب کے دیکھنے کے بعد کہلوائی تھی۔ متین صاحب بیگم صاحبہ کی خواہش کے مطابق بھوپال واپس چلے گئے اور انھوں نے اتالیقی منظور کرلی لیکن سرکاری ملازمت سے انکار کر دیا۔ بھوپال میں انھوں نے تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بعض انگریزوں نے ان سے فارسی بھی پڑھی۔ تعلیم دینے کے ساتھ متین صاحب نے تالیف و تصنیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ان کے بہت سے غیر مطبوعہ مسودات بھی تھے۔ جن کو ارشد تھانوی صاحب لے گئے تھے لیکن باوجود تقاضوں کے واپس نہیں کئے۔ متین صاحب نے ۳۰ اپریل ۱۹۲۷ء کو بھوپال میں انتقال کیا۔ بہت عالی ظرف وسیع المزاج انسان تھے۔ اور بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ آپ مسلم صاحب کے نانا محترم تھے۔

محمد مسلم صاحب ۲۰ ستمبر ۱۹۲۰ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول تک تعلیم پائی گھر پر عربی فارسی اور انگریزی کی تحصیل کی۔ مالی حالت خراب ہونے کی وجہ سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھوپال سے قدم باہر نہ رکھ سکے۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں ان کے نانا فوت ہو گئے۔ پرائیویٹ طور پر انٹر کا امتحان دینے کی کوشش کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب لکھنے پڑھنے کا شوق ہو گیا تھا۔ انھوں نے محلہ میں ایک لائبریری قائم کی جس میں اخبارات و کتابوں کا لوگ مطالعہ کرتے تھے اور تبادلہ خیال بھی ہوتا تھا۔ ۱۹۳۸ء نے اخبار ندیم میں آنریری سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ اسی زمانہ میں خاکسار تحریک چل چکی تھی بھوپال میں اس کی تنظیم ہوئی تو مسلم صاحب بھی اس میں شامل ہو گئے جب تحریک ختم ہو گئی تو مسلم صاحب بھی قدرتی طور پر اس جماعت سے علٰحدہ ہو گئے۔

۱۹۴۶ء میں غذائی تحریک کو ناکام کرنے کے لئے جو ظلم توڑے جا رہے تھے اس کے خلاف مسلم صاحب نے احتجاج کیا تو دفعہ ۴۴ کے ماتحت گرفتار کر لئے گئے۔ مہینوں تک مقدمہ چلا جس کی پیروی خود ہی کی اور خود ہی اپنی طرف سے وکیل پیش نہیں کیا۔ مقدمہ میں کوئی جان نہیں تھی۔ آخر کار بحث بھی خود ہی کی سرکاری وکیل معقول جواب نہ دے سکا تو عدالت نے مقدمہ خارج کر دیا اور باعزت بری کر دیا۔

۱۹۴۷ء میں باقاعدگی کے ساتھ ندیم اخبار کی ایڈیٹری کی ذمہ داری سنبھالی اخبار میں جو لوگ کام کرتے تھے، اخبار ان کی ملکیت میں آ گیا تھا مسلم صاحب بھی اخبار کے مالکوں میں ہو گئے کچھ عرصہ بعد مسلم صاحب ندیم اخبار سے علٰحدہ ہو گئے۔ غالباً ۱۹۴۸ء میں نواب صاحب کے آخری دور میں گرفتار ہوئے لیکن چند مہینوں کے بعد رہا کر دئے گئے۔ ۱۹۵۰ء میں چیف کمشنر راج کے خلاف لکھنے کے الزام

میں نظر بند کر دیے گئے۔ تین مہینوں کے بعد رہا ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں جماعتِ اسلامی
میں شامل ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں دہلی آئے۔ اگست ۱۹۵۳ء میں اخبار دعوت دہلی
سے جاری ہوا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر اصغر علی عابدی صاحب تھے۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء میں
مسلم صاحب نے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۹۵۶ء میں
ایڈیٹر مقرر ہوگئے۔ اخبار دعوت سہ روزہ سے ۱۹۵۹ء میں روزنامہ ہوگیا۔ اخبار
دعوت کے ایڈیٹر کی حیثیت سے پانچ مقدمات حکومت نے دائر کئے۔ تین مقدموں
میں جرمانہ ہوا اور دو میں بری ہوئے۔ کافی دنوں سے اخبار کی ادارت کی ذمہ داری سے
سبکدوش ہو چکے تھے۔

مسلم صاحب نے صحافتی زندگی آزادانہ طور پر گذاری۔ ان کے اداریوں میں
پبلک جذبات کی ترجمانی ہوتی تھی۔ ان کا قلم کبھی خوشامدی نہیں رہا۔ ایک لفظ بھی
خوشامد میں نہیں لکھا۔ ان کا قلم بڑا خوددار اور رعب گر رہا۔ مقدمات سے کبھی ہراساں نہیں
ہوئے۔ بڑی جرأت و ہمت کے ساتھ پیروی کی۔

۱۹۶۴ء میں ہندوستان میں مصر کے صدر ناصر آئے تو تیرہ دن تہاڑ جیل میں
اپنے ساتھیوں کے ساتھ نظر بند کئے گئے۔ ۱۹۷۱ء میں جبکہ ہندوستان و پاکستان
میں جنگ میں ۴۷ دن نظر بند کئے گئے۔ تیسری مرتبہ ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی کے زمانہ
میں نظر بند ہوئے۔ دہلی کی تہاڑ جیل اور انبالہ جیل میں ۲۱ مہینے گزارے۔ راقم الحروف
امداد صابری انبالہ جیل میں مسلم صاحب کے ساتھ تھا۔ انبالہ جیل میں جب میں بیمار
پڑا اور روزانہ کافی دست آنے شروع ہوگئے، تو مسلم صاحب اس حالت میں مجھے
بیت الخلاء لے جاتے تھے بعض مرتبہ جاتے جاتے اجابت ہو جاتی اور پاجامہ سن
جاتا تو تہمد باندھ لیتا تھا اور وہ سنا ہوا پاجامہ مسلم صاحب دھوتے اور میری
ٹانگوں کو دھلاتے بعض مرتبہ بیت الخلاء میں گھنٹوں بیٹھنا پڑتا تو مسلم صاحب

دروازہ پر گھنٹوں کھڑے رہتے تھے جب میں نکلتا تھا تو اپنے سہارے مجھ کو لے کر
آتے تھے۔ رات کو کمرہ سے باہر برانڈے میں سوتا تھا۔ رات کو کمرہ سے نکل کر
نہ معلوم کتنی پھیرے لگاتے تھے۔ دستوں کی وجہ سے رات کو مشکل سے سونا
ملتا تھا تو اس صورت میں مسلم صاحب کیسے سوتے ہوں گے۔ رات کو بھی مجھ کو
بیت الخلاء لے جاتے اور لاتے تھے جب انبالہ اسپتال چلا گیا تو روزانہ کسی نہ
کسی صورت سے پرچہ بھجوا کر مولانا یوسف صدیقی کی اور میری خیریت معلوم کراتے
تھے اور مشورہ بھی دیتے تھے۔ یہ خدمت گذاری کا جذبہ صرف میرے ہی ساتھ
نہ تھا بلکہ جیل کے ساتھیوں کے ساتھ بھی یہی سلوک تھا۔ بہت سے ساتھیوں کے
کپڑے تک دھوتے تھے۔ ہمارے ساتھیوں میں ہندو زیادہ تھے۔ ان کے دماغ میں
خدمت کرنے کے معاملہ میں ہندو مسلمان کی کوئی تمیز نہ تھی۔ سیاسی معاملات
میں ان کی جچی تلی رائے ہوتی تھی، جذبات میں کبھی نہیں بہتے تھے۔ متانت و سنجیدگی کے
ساتھ حقائق بیان کرتے تھے۔

مسلم صاحب نے بڑی سادہ زندگی گذاری۔ فقیرانہ زندگی کو زیادہ پسند کرتے
تھے شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا انبالہ جیل میں میں نے ان کو شعر کہتے اور لکھتے دیکھا۔
بیماری تو انبالہ جیل سے لگ گئی تھی کبھی سنبھل جاتے تھے لیکن ان کا بیماری نے پیچھا نہیں
چھوڑا۔ جیل کی بیماری جان لیوا مولانا یوسف صدیقی کی طرح ثابت ہوئی۔ ۳ جولائی
۱۹۸۶ء کو فوت ہوئے اور مہندیوں میں شاہ ولی اللہ و شاہ عبدالعزیز کے قبرستان
میں دفن ہوئے۔ مسلم صاحب نے ۱۹۶۵ء میں جج کیہدار سٹرک پریم نرائن محلہ چوڑی والان
دہلی میں سکونت اختیار کی۔

۱۱ جولائی ۱۹۸۶ء کے اخبار دعوت دہلی میں انعام الرحمٰن صاحب بیباک کا
مضمون معنونہ "مسلم جیتا جاگتا مسلم" یعنی نہایت اندیشہ کمال جنون چھپا ہے۔ جس میں مسلم صاحب

کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، اس لئے نقل کیا جاتا ہے:۔

برادرم محمد مسلم صاحب مرحوم کی وفات سے کولار اور علاقہ پر بہت سے اصحاب نے اپنے قلبی غم واندوہ کا اظہار کیا ہے اور ان کے اعلیٰ اور کمیاب اوصاف پر روشنی ڈالی ہے لیکن میں تو بس اتنا کہوں گا کہ اگر مرحوم کے جسم میں کسی جگہ شگاف لگایا جاتا تو اس میں سے خون کے بجائے درد و محبت اور جذبۂ خدمت نکل کر بہتا لیکن چونکہ میری اور ان کی رفاقت کی عمر چالیس سال ہے جس کو مرحوم کی محبت نے اتنا قریبی بنا دیا تھا جتنا تصور کیا جاسکتا ہے، ظاہر ہے کہ اس طویل مدت میں ان کی سیرت شخصیت کے ایسے پہلو میرے سامنے آئے جو اس طویل و قریبی رفاقت کے بغیر نہیں آسکتے تھے۔ ان کا لوگوں کے سامنے لانا اس لئے مناسب ہے کہ اگر کوئی شخص چاہے خصوصاً نوجوان اگر ارادہ کریں تو وسائل و ذرائع کے بغیر اللہ کی توفیق و مدد سے محض اپنے اخلاص درد اور ہمت کے سہارے اپنی شخصیت کو ثمر بار و خیر مجسم بنا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اب وہ مدح و ثنا سے بے نیاز ہیں۔

بالکل نو عمری میں ان کی شخصیت کیا تھی۔ اس کے تعلق سے کچھ کہنا تو مبالغہ ہوگا کہ ان کی تعریف سے بھوپال کی گلیاں گونج رہی تھیں لیکن یہ کہنے میں ذرا مبالغہ نہیں کہ ہر مجلس میں جہاں مرحوم کا ذکر نکل آتا تو ان کی تعریف ہی کے گن گائے جاتے تھے۔ ایک عربی ضرب المثل ہے کہ "فضل و شرف وہ ہے جسے مخالف بھی تسلیم کرے" یہی حال اس مرحوم مرد قلندر کا تھا جو لوگ خاکسار تحریک جیسی چیزوں کی وجہ سے ان کے خیالات سے اتفاق نہیں رکھتے تھے وہ بھی ان کی تعریف کے طلسم میں گرفتار تھے اور غائبانہ بھی ان کے لئے مدح و ثنا کا خراج پیش کرنے پر مجبور تھے۔ انہی گرفتاروں میں سے ایک میں تھا پہلی ملاقات میں ان کی جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ یہ تھی کہ باوجود اس کے کہ مرحوم ایک ممتاز باپ کے بیٹے تھے لیکن اپنے حالات بیان کرتے ہوئے میرے سوال پر اپنے

والد صاحب مرحوم کا ذکر انھوں نے ان الفاظ میں کیا کہ "ایک اوسط درجہ کے انسان تھے" جو لوگ "پدرم سلطان بود" کی وبا سے کام پر نظر رکھتے ہیں وہی اس بات کی قدر کر سکتے ہیں۔

مرحوم کے اوصاف اور اُن کی جدائی پر لوگوں کے تاثرات صاف بتاتے ہیں کہ ایک فارسی شاعر نے بالکل صحیح کہا تھا کہ ؎

یاد داری کہ وقت زادن تو
ہمہ خنداں بوند و تو گریاں
آں چناں زی کہ وقت مردن تو
ہمہ گریاں بوند و تو خنداں

(ترجمہ) یاد کرو کہ جب تم اس دنیا میں آئے تھے تو تم رو رہے تھے اور سب ہنس رہے تھے۔ اب اس طرح زندگی بسر کرو کہ جب اس دنیا سے جاؤ تو سب رو رہے ہوں اور تم ہنس رہے ہو۔"

مرحوم ان اشعار کی زندہ تفسیر تھے۔

میں خود تو ہوائی جہاز کے لیٹ ہو جانے کی وجہ سے مرحوم کے آخری دیدار سے محروم رہا لیکن دیکھنے والے کہتے ہیں کہ انتقال کے بعد ایسا سکون اور تبسم بہت ہی کم چہروں پر نظر آتا ہے جیسا ان کے چہرے پر تھا۔ یہی بات اقبال نے کہی ہے ؎

نشان مرد مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم برلب اوست

اس دنیا میں ہر انسانی تعلق کے درمیان دو چیزیں لازماً ہوتی ہیں حقوق اور ذمہ داریاں۔ موجودہ دنیا میں حقوق کی چیخ پکار مچی ہوئی ہے، جسے دیکھو وہ اپنے حق کے لیے چیخ رہا ہے اور ذمہ داری کا بوجھ ہلکا ہے، ایسے وقت کامیاب

کہلاتے ہیں جو کم ہیں کہ اپنے حقوق وصول کرنے کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کا حق بھی ادا کرتے ہیں لیکن ایک شخص ایسا تھا جو اپنے حقوق تو بالکل بھولا ہوا تھا بس اسے تو ذمہ داریاں یاد تھیں اور یاد ہی نہیں تھیں بلکہ ان کی فکر میں بےچینی اور مضطرب رہتا تھا۔ اور خود ہی نہیں گھلا جا رہا تھا بلکہ دوسرے کے اندر بھی یہی فکر و اضطراب پیدا کرنے کی دھن اس پر سوار تھی۔ اس تڑپتے ہوئے اور تڑپانے والے وجود کا نام تھا محمد مسلم۔ اطاب اللہ ثراہٗ۔

مرحوم کے قلم کی یہ خصوصیت تو سب ہی جانتے ہیں کہ وہ بہت ہی کم الفاظ میں وسیع مطالب بیان کر دیتے تھے۔ کہنا چاہیے کہ ان کے جملے ایسا کوزہ ہوتے تھے جن میں معانی کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا تھا اور ان کے قلب کا درد و سوز ان کی تحریر سے پھوٹا پڑتا تھا مگر شاید یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہو کہ وہ شعر بھی کہتے تھے اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو وہ سچے "دیدہ بینائے قوم" مگر آنسوؤں سے ڈبڈبایا ہوا۔

"عبادت چشم مسلم کی تھی ہر دم باوضو رہنا" اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ اس مرحوم مسلم کو اللہ نے کیا خصوصیات بخشی تھیں تو میں کہوں گا اور انھیں جاننے والا ہر شخص میرا ہم زبان ہوگا کہ ؎

بتاؤں آپ کو مسلم کی زندگی کیا تھی

وہ تھی نہایت اندیشہ و کمال جنوں

اور اسی "نہایت اندیشہ" اور "کمال جنوں" کی خراب ظہور بنانے میں اس "خردمند جنوں" نے اپنی پوری زندگی کھپادی۔ میرا خیال ہے کہ دردِ محبت کا یہ پیکر نفرت نہ کرنے اور اپنے اندر محبت رکھنے اور دینے کے علاوہ کسی اور چیز کی قدرت ہی نہیں رکھتا تھا۔ یہ کہنا کہ وہ اتحادِ ملت کے داعی اور مسلم و غیر مسلم اتحاد کے علمبردار

تھے۔ واقعے بہت کم ہے حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اس ملک میں محبت کے ایسے
دریا بہانا چاہتے تھے جس میں مسلم و غیر مسلم سب تر دامن بھی ہوں اور سیراب بھی۔
ان کو خدمت کرنے میں وہ مزہ آتا تھا جو کسی لیڈر کو لیڈری کرنے میں اور کسی
حکمراں کو حکمرانی کرنے میں نہیں آتا ہوگا۔ کتابوں میں تو پڑھا ہے کہ خود بھوکا رہ کر دوسروں
کو کھلانا سخاوت و نیک نفسی کا بہت اونچا مقام ہے جس کے نمونے کسی زمانے میں نظر
آتے تھے لیکن میں نے تو ایسا عملی نمونہ صرف ایک دیکھا ہے جس کو سب سے زیادہ معذور
واپاہج اور بوڑھے، بوڑھیاں روئیں گے۔ اور جیسے مرحوم لکھنے میں قلم کانپنے لگتا ہے۔
۱۹۵۳ء میں جب مرحوم "دعوت" کی خاطر دہلی منتقل ہوئے تو ان کی آمدنی اتنی نہیں
تھی کہ بیوی بچوں کے ساتھ معمولی درجہ کی فراغت سے بسر کر سکیں۔ ہر مہینہ اتنی
رقم اپنے لئے رکھ کر روکھی سوکھی کھا کر مہینہ میں باقی رقم بھوپال بھیج دیتے تھے اور بھوپال
بھیجی ہوئی رقم میں وہ ماہانہ وظیفے شامل ہوتے تھے جو سلطنت فقر کے اس بادشاہ
کے "خزانہ" میں سے کچھ لوگوں کو پہلے سے ہر مہینے ملتے۔ اسی حالت میں پہلے رمضان
آئے اور انھوں نے باہر سے آئے ہوئے ایک صاحب کو مستقل طور پر اپنا شریک
طعام بنا لیا نتیجہ یہ ہوا کہ اس حقیقی روزہ دار نے پورے رمضان بغیر سحری کے روزے
رکھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ مستقل طور پر دہلی آنے والے تھے، ان دنوں ایک معمر
بزرگ نے جن کو یہ خیال ہو گیا تھا کہ ان کے دہلی منتقل ہونے میں میرا ہاتھ ہے۔ ایک
روز غصہ کے ساتھ روتے ہوئے حملہ آور انداز میں مجھ سے کہا تھا کہ "مسلم کو تم دہلی
بھیج رہے ہو، جانتے ہو کتنی بیوائیں بیوہ ہو جائیں گی، کتنے بچے یتیم ہو جائیں گے۔
کتنے معذور بے سہارا ہو جائیں گے۔ کتنے بوڑھے اور کتنے بیمار دل توڑ دیں گے۔
ان سب کی ہائے تم پر پڑے گی"۔
انھیں دیکھ دیکھ کر مجھے اکثر مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے صاحبزادے مولوی محمد عمر

صاحب یاد آتے ہیں۔ جن کا حال یہ تھا کہ کوئی چیز مانگتا تو اسے کرتہ بھی دیدیتے۔ ان کی اس صفت کی وجہ سے ان کے دوست آشنا انہیں "گھر لٹاؤ" کہنے لگے تھے غالباً مولانا محمد عمر صاحب کی بھی یہی عادت ہو گی۔ اور مسلم صاحب کا حال بھی یہ تھا کہ ان کا جنہ یا کرتا دینا کسی سوال کا انتظار نہیں کرتا تھا۔ ان کے اس مزاج کی وجہ سے ان کے بیوی بچوں کو جو تکلیف ہوتی تھی، اس کی وجہ سے بارہا میں نے ان پر تنقید کی۔ سن لیتے تھے مگر اپنی اس روش سے باز نہیں آتے تھے۔ مجھے اپنا بڑا اجانی ملنتے تھے۔ شاید وہ اپنی یہ عادت چھوڑنے پر قادر ہی نہ تھے۔ دہلی میں ان کا چھوٹا سا گھر بیشتر بلکہ کہنا چاہیے کہ ہر وقت مہمانوں سے بھرا رہتا تھا۔ کبھی کبھی تو گھر کے بچوں کو سونے کی جگہ نہیں ملتی تھی، اور یہ ان کے اخلاص و تربیت کی برکت ہے۔ کہ ان کی اہلیہ محترمہ سے لے کر سب سے چھوٹے بچے تک ہر ایک اسی رنگ میں رنگ گیا ہے۔ اللہ ان کے بچوں میں ہر ایک کو مسلم ثانی بنائے۔ مرحوم کے اس مزاج کی وجہ سے نوجوان ان کے ساتھ سفر کرنے سے گھبراتے تھے۔ ان کے ہم سفر کسی نوجوان نے ٹرین میں کوشش کر کے کسی طرح بیٹھنے کی جگہ حاصل کی۔ اور اگر کوئی بوڑھا یا کمزور مسافر آ گیا تو مسلم صاحب کی طرف سے اس نوجوان کو حکم ملے گا کہ "اٹھو انہیں بیٹھنے دو" اور یہ حکم خود کسی کے لئے جگہ چھوڑ دینے کے بعد ہو گا۔

ڈاکٹر اقبال نے اگر اس مرد قلندر کو دیکھا ہوتا تو شاید انہیں یہ نہ کہنا پڑتا کہ ؎

وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

اس مرد مجاہد کی سخت کوشی دیکھ کر اقبال کے مثالی مرد مومن کی کچھ خصوصیات لوگوں کی سمجھ میں آتی تھیں۔ "نرم دم گفتگو گرم دم جستجو" کی بہترین مثال یہی تھے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مسلم

اس میں کوئی مبالغہ نہیں، نرم و گرم حالات سے نمٹنے والا یہ مرد مجاہد دل کے چٹکے ہوئے جگر کو ٹھنڈک پہنچانے والی شبنم تھا، اور ظلم و جور کی دیواروں کو ڈھانے والا طوفان۔

میں ۱۹۵۳ء میں پہلی بار جیل گیا۔ جون کا مہینہ اور رمضان المبارک بھوپال کی جیل شہر سے دور پہاڑ پر ہے۔ اور راستہ میں چڑھائی پڑتی ہے۔ اس لئے میں نے بچوں کو سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا کہ میرے لئے کوئی چیز نہ لایا کریں۔ مگر دیکھتا ہوں کہ روزانہ عصر کے بعد تربوز چلا آ رہا ہے۔ اس پر ناگواری تھی مگر کیا کر سکتا تھا نیری تھا۔ رہائی کے بعد کئی روز تک تو اس کا خیال نہیں آیا جب یاد آیا تو اپنے متعلقین سے تنبیہ کے انداز میں کہا کہ میں نے کتنا منع کیا تھا مگر تم نہیں مانے۔ اور اتنی دور اور اتنی گرمی میں تربوز لاتے رہے۔ وہ حیرت زدہ ہو کر بولے۔ کون، کیسا تربوز ہمیں نہیں معلوم میں نے سمجھ لیا کہ یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے جب ملے اور میں نے احتجاج کے انداز میں اس کا ذکر کیا تو ہنس دیئے۔ میری اہلیہ کو اس کی سخت شکایت ہوئی کہ مسلم صاحب ہم کو تو روزانہ آ کر منع کرتے تھے اور ناواقفیت کی وجہ سے ان کی بات ہم مانتے رہے۔ اور وہ خود یہ حرکت کرتے رہے۔

اب آنسوؤں کی دھار کو روک دینا مناسب ہے مگر یہ بات تو دل میں اتار لینے کی ہے کہ عقیدہ توحید کا عملی نمونہ بہت ہی کمیاب ہے جو میں نے نشۂ توحید کے اس سرشار میں دیکھا کہ چھوٹا بڑا ان کی نظر میں برابر تھا۔ نہ بڑے کو بڑا سمجھا نہ چھوٹے کو چھوٹا۔ مثال کے طور پر اگر وہ مسٹر راجیو گاندھی سے ملتے تو مسٹر گاندھی یہ محسوس نہیں

کرپاتے کہ میں اپنے سے کمتر کسی شخص سے مل رہا ہوں۔ اور اگر تم خود بدھو جیسے کسی کم حیثیت آدمی سے ملتے تو وہ یہ محسوس نہیں کر پاتے کہ وہ اپنے سے بلند کسی شخصیت سے مل رہا ہے بلکہ اگر وہ غریب یا بدھو یا بڑا عاجز یا مصیبت زدہ نظر آتا تو وہ ان سے مل کر یہ سمجھتا کہ مجھے ایک خدمت گار مل گیا۔ آدمی کو وقار و انکسار کا ایسا مرکب زندہ عقیدۂ توحید ہی بنا سکتا ہے۔

اگر یہ بات صحیح ہے کہ نیکی اور بدی دونوں متعدی یعنی دوسروں کو لگ جانے والی ہوتی ہیں اور اسلامی نقطۂ نظر سے اگر کوئی شخص حضورؐ کے الفاظ میں مفتاح الخیر اور مغلاق للشرور بن جائے۔ ایک ایسے شخص کی عملی زندگی دیکھ کر جتنے زیادہ لوگ اپنی زندگی سنوارنے میں لگ جائیں اتنا ہی زیادہ وہ شخص اجر و ثواب کا سرمایہ دار ہوگا۔ اگر یہ سچ ہے کہ اللہ کی رحمت بندوں کو بخش دینے کے لیے بہانہ ڈھونڈتی ہے (رحمتِ حق بہانہ مے جوید) اور اگر یہ بھی سچ ہے کہ "زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو"۔ تو ماننا چاہیئے کہ رحمتِ حق مسلم صاحب کو بخشنے کے لیے بے چین اور جنت کی تمام نعمتیں ان کی منتظر ہوں گی۔ ہر جاننے والے کی زبان پر ہے "کیا نویلا آدمی تھا خدا مغفرت کرے"۔ اللہ جانے والے کی قبر کو نور سے بھر دے۔ اس کو اپنی رحمت خاص سے نوازے۔ اور پیچھے رہ جانے والوں کو اس کی طرح خیر کا پتلا بننے کی توفیق بخشے۔ کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

پنڈت موتی لال

پنڈت جی دہلی کے کشمیری پنڈت تھے۔ دہلی کالج کے بہت ممتاز طلبا میں سے تھے اور دہلی کالج کو فخر تھا۔ انگریزی کی اعلیٰ قابلیت تھی۔ ۱۸۴۹ء میں سالانہ مضمون نویسی کے لئے مسٹر جے کنیز نے ذیل کا مضمون تجویز کیا تھا۔

"ان دنوں ہندوستان میں اہل علم، اہل فہم کون کون پیشہ عمدہ اور فائدہ بخش اختیار کرسکتے ہیں اور ہر ایک سے کامیابی کے واسطے کیا کیا تعلیمیں اور پھر کیسی محنت اور کوشش درکار ہے؟"

اس مضمون کے جوابی پرچوں میں تاریخی اور عام معلومات اچھی پائی گئی اور لکھنے والے قومی تعصبات سے بری تھے۔ موتی لال کا مضمون انگریزی میں اور محمد حسین کا اردو میں سب سے بہتر خیال کیا گیا۔ موتی لال نے اس کے علاوہ مضمون نویسی کے دو تمغے بھی حاصل کئے۔ ایک نقرئی انگریزی مضمون کا تاریخ برطانیہ ہند پر یہ سر ہنری مٹکاف کا عطا کردہ تھا۔ دوسرا طلائی تمغہ جو اردو مضمون کے لئے سر ہربرٹ نے رکھا تھا یہ مضمون دونوں شعبوں کے طلبا کے لئے تھا مضمون کا عنوان یہ تھا۔

"مختلف آزاد پیشے اور مفید کاروبار جو ہندوستانی دیسی ریاستوں میں پائے جاتے ہیں اور ہر ایک میں کامیابی کے بہترین طریقے خواہ ابتدائی تربیت کے لحاظ یا بعد کی مساعی کے اعتبار سے۔"

ان کے وظیفے کی توسیع کے لئے گورنمنٹ میں سفارش کی گئی تو منظوری دیتے وقت خصوصیت کے ساتھ ان کے متعلق یہ الفاظ لکھے گئے تھے ۔

”وہ اس رعایت کا خاص طور پر مستحق ہے کیونکہ انگریزی زبان کی تحصیل میں اس نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے اور وہ اپنی فرصت کا وقت ترجمہ کرنے اور اردو رسالوں کے اڈیٹ و مرتب کرنے میں صرف کرتا ہے ۔“

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اخبار قرآن السعدین کے تیسرے ایڈیٹر پنڈت موتی لال مقرر ہوئے ۔ قرآن السعدین کی ایڈیٹری سے سبکدوش ہونے کے بعد سنہ ۱۸۵۵ء میں بورڈ آف ایڈمنسٹریشن لاہور کے ۱۵۰ روپے ماہانہ پر فارسی مترجم مقرر ہوئے ۔ کئی سال تک گورنمنٹ پنجاب کی میر منشی گیری کے عہدہ پر ممتاز رہ کر بعد اکسٹرا اجوڈیشنل کمشنر درجہ اول مقرر ہوئے ، بعد میں ڈسٹرکٹ جج بھی ہو گئے تھے ۔ اس عہدہ سے پنشن پائی اور گجرات میں مقیم ہو گئے تھے [۱]

اگرچہ یہ ایسے محکمہ میں چلے گئے تھے جہاں تعلیم و تعلم کا چرچا نہ تھا ۔ لیکن ان کا علمی ذوق ہمیشہ قائم رہا ۔ پلوٹارک کے تذکرے   کا اردو میں ترجمہ کیا ۔ جو ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوا ۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک تذکرہ شعراء لکھا تھا ۔ تعلیم نسواں اور دیگر مضامین کے صلے میں سرکار کی طرف سے طلائی تمغے انعام میں ملے ۔ اردو فارسی میں بھی کافی دستگاہ تھی ۹۲ برس کی عمر میں سنہ ۱۸۹۰ء کو لاہور میں فوت ہوئے ۔ رندانہ مزاج پایا تھا ۔ شعر گوئی کی طرف طبیعت مائل تھی ۔ بسمل تخلص رکھتے تھے ۔

در پر آتے ہی ترے پاس سے مر جاتا ہوں
بس ادھر آتا ہوں اور ادھر جاتا ہوں

---

[۱] مرحوم دہلی کالج صـ ۱۶۵

ہیں سمجھے دیکھ کر ہم خالِ لب اس آفتِ جاں کا
بجائے خضر زنگی پاسباں ہے آبِ حیواں کا

عاقبت تک رہے، پابستۂ زنجیرِ بلا
دیکھ پائے جو تری زلفِ گرہ گیر کے بل

بہا دیں اشک کے طوفاں سے کشتی نوح کی ہم
اُٹھا دیں ایک پل کو ہم جو پردہ چشمِ گریاں کا

چمن میں سرو کہتے تھے تمہارے سایۂ قد کو
فلک پر چاند رکھا نام عکسِ روئے تاباں کا

بہت سا فرق تجھ میں اور ماں جبکہ کر دیکھی
مہ نو ہمسری ناخن و ابروئے جاناں کا[1]

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد اول صفحہ ۵۸۶

مولانا شاہ نسیم احمدؒ صاحب دہلوی

مولانا نسیم احمد صاحب کے دادا مولوی حسن علی صاحب تھے۔ جو دہلی کے قدیمی رہنے والے تھے۔ آپ نے شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر صاحب سے علوم دینی کی تحصیل کی۔ دہلی میں فوت ہوئے۔ مولوی حسن علی صاحب کے صاحبزادے مولوی حبیب احمد صاحب تھے۔ جو دہلی میں ۱۲۷۱ھ کو پیدا ہوئے۔ مولوی کرامت اللہ صاحب دہلوی سے تکمیل علوم کی۔ پہلے مدرسہ فتحپوری دہلی میں مدرس دوم ہوئے۔ بعد میں صدر مدرس مقرر ہوئے دہلی میں انتقال ہوا۔

مولوی حبیب احمد صاحب کے چار صاحبزادے بشیر احمد، نسیم احمد۔ جمیل احمد اور شفیق احمد ہوئے۔ بشیر احمد کا پہلے دہلی سے ملتان تبادلہ ہوا۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد دہلی چلے آئے تھے تقسیم ملک کے بعد ۱۹۴۷ء میں ملتان چلے گئے وہیں فوت ہوئے حافظ جمیل احمد صاحب نقشہ نویس تھے۔ اسی کام میں زندگی بتائی۔ شفیق احمد حضرت مولانا مفتی مظہر اللہ صاحب امام مسجد فتحپوری شاہی دہلی کے داماد تھے اور یہ بھی نقشہ نویس تھے، یہ دونوں ملک کی تقسیم کے بعد ۱۹۴۷ء میں کراچی چلے گئے۔ وہیں شفیق احمد صاحب ۱۹۶۷ء میں اور حافظ جمیل احمد صاحب ۱۹۷۱ء میں فوت ہوئے۔

مولانا نسیم احمد صاحب نے قرآن مجید اپنے والد ماجد مولوی مفتی حبیب احمد صاحب سے حفظ کیا۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ فتحپوری دہلی میں اپنے والد کی نگرانی

میں پائی۔ دہلی سے لاہور چلے گئے مولانا نسیم صاحب لاہور میں ایک مقامی کالج میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کر کے دہلی تشریف لائے تو آپ کے والد نے اپنی جگہ شاہی سنہری مسجد چاندنی چوک دہلی کی امامت آپ کے سپرد کی۔

اس سنہری مسجد کی امامت کا سلسلہ حافظ اسلام صاحب کے پردادا حافظ عبدالرزاق صاحب سے چل رہا ہے۔ یہ حضرات اس مسجد کے امام رہے ہیں۔ جو بعد میں مولانا حبیب احمد صاحب کو منتقل ہو گیا مولانا حبیب احمد صاحب کا ذاتی مکان تھا۔ عرصہ تک مولانا اس میں مقیم رہے۔ آپ نے ایک برج کی مسجد میں ۳۵ سال تک محرم کے مہینے میں ۱۵ محرم سے لیکر ۲۵ محرم تک شہادت کا ذکر فرمایا آپ سے پہلے اس مسجد میں حضرت مولانا کرامت اللہ صاحب نے انہی دنوں میں عرصہ تک شہادت کا بیان کیا۔

۱۹۴۷ء کے پرآشوب اور ہنگامہ خیز زمانہ میں مولانا نسیم احمد صاحب کراچی چلے گئے تو اس وقت سے مفتی مظہر اللہ صاحب کے صاحبزادے مولانا مشرف احمد صاحب نے یہ سلسلہ جاری کیا جو ان کی وفات تک چلتا رہا۔

یہ ایک برج کی مسجد ۱۲۱۱ھ مطابق ۱۷۹۶ء سے قبل شاہی زمانہ میں تعمیر ہوئی تھی جس میں ایک مقبرہ ہے، اس مقبرہ میں تین مزار ہیں۔ ایک مزار شاہ محمد علی صاحب کا اور دوسرا ان کے بھائی اسداللہ کا ہے تیسری قبر مزار رہ گئی ہے وہ خبر نہیں کس کی ہے غالباً شاہ صاحب کے کسی متعلق کی ہوگی۔

شاہ صاحب بڑے بزرگ تھے ان کی زندگی کا مقصد وعظ و تلقین ہی تھا آپ گجرات میں وعظ فرمایا کرتے تھے۔ گجرات کے صوبیدار جینت سنگھ کے مظالم سے تنگ آکر آپ مع اپنے ساتھیوں کے دہلی چلے آئے تھے۔ یہاں آنے کے بعد جینت سنگھ کے اشتعال دلانے اور غلط قسم کی اطلاع دینے پر فرخ سیر نے آپ کو

قلعہ کی چوبی کی مسجد میں قید کردیا تھا۔ بادشاہ کو اس ناشائستہ حرکت کرنے پر خواب میں عتاب ہوا۔ اس سے متاثر ہو کر بادشاہ نے آپ کو ان کے ساتھیوں کے ہمراہ فوراً رہا کر دیا۔ اس کے بعد آپ جامع مسجد دہلی میں رہنے لگے۔ اور وہیں درس و تدریس اور وعظ کا سلسلہ جاری کیا۔ شاہ صاحب عالمگیر ثانی کے مرشد بھی تھے۔ یہ ۱۲۱۰ھ مطابق ۱۷۹۵ء میں فوت ہوئے۔ (۱۹۰)

سنہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء دہلی میں انجمن مؤیدالاسلام قائم ہوئی۔ جس کے بانی منشی کرم اللہ خاں، مولانا عبدالحق صاحب مؤلف تفسیر حقانی، حاجی عبدالغنی اور حافظ اسحاق صاحبان وغیرہ تھے، اس انجمن کے مقاصد میں یتیم خانہ قائم کرنا لڑکے اور لڑکیوں کو تعلیم دلانا۔ نو مسلموں کو تربیت دلانا اور ان کی نگرانی کرنا اور لاوارث مسلمان میتوں کو اپنے ہاتھوں دفنانا تھا۔

مولانا نسیم احمد صاحب انجمن مؤیدالاسلام کی تبلیغ بھی کرتے تھے اس کے مبلغ تھے۔ اس کام کے لئے مولانا نسیم صاحب نے بھی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے کافی عرصہ تک تبلیغ کا کام کیا۔ مبلغ کی حیثیت سے انجمن کی طرف سے آپ دنگوں، برما وغیرہ میں بھی تشریف لے گئے تھے والد صاحب کی علالت کی وجہ سے آپ نے باہر کے دورے منسوخ کر دئے اور دہلی تک تبلیغی کام محدود کر دیا اور مستقل طور پر شہری مسجد کی امامت کی ذمہ داری لے لی۔

مولانا نسیم صاحب کو مثنوی مولانا روم سے عشق تھا۔ آپ روزانہ بعد نماز فجر باڑہ ہندو راؤ کی چھوٹی سی مسجد میں حضرت مولانا شاہ کرامت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں مثنوی شریف کے درس میں حاضر ہوتے تھے۔ حضرت مولانا کرامت اللہ کو آپ سے بے حد محبت تھی۔ مولانا نے اپنی منجھلی صاحبزادی سے آپ کا نکاح کر دیا تھا اس کے بعد مولانا نسیم صاحب نے مولانا کے مکان کے قریب باڑہ ہندو راؤ میں

سکونت اختیار کر لی تھی اور روزانہ حضرت مولانا کرامت اللہ صاحب سے مثنوی کا سبق حاصل کرتے رہے۔ سلسلہ صابریہ چشتیہ میں آپ سے بیعت بھی ہوئے۔ مولانا نے مولانا نسیم صاحب کو اپنی زندگی میں خلافت عطا فرمائی۔

حضرت مولانا کرامت اللہ صاحب کے انتقال کے بعد چوڑی مسجد بارہ ہندو راؤ میں مسلسل بیس سال تک نماز فجر ترجمہ قرآن مجید اور درس مثنوی شریف کا دیتے رہے۔ آپ روزانہ بعد نماز عشاء مسجد نواب دوجانہ بیالی جامع مسجد دہلی میں درس دیا کرتے تھے اور بعد نماز عصر شاہی مسجد سنہری نوابہ پر اپنے حجرہ میں مخصوص حضرات مولانا احمد غزالی جو بنگالی کھاڑی کی ایک اونچی مسجد میں مقیم تھے۔ دوسرے مولانا عبدالرحمٰن کابلی اور مولانا عبدالحق کابلی وغیرہ کو مثنوی مولانا رومؒ کا سبق دیا کرتے تھے۔ مولانا کے ہم جلیسوں میں مولانا محمد ایوب دہلوی، حکیم علی رضا خان، حاجی عنایت حسین، حضرت مولانا اشرف الحق صاحب، حاجی محمد اسحاق، مولانا مظہر الدین ایڈیٹر الامان و وحدت دہلی اور نواب فیض احمد صاحب قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا نے اپنی پوری زندگی میں کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ اسلام کی تبلیغ فرماتے رہے۔ مولانا کے دوستوں میں قاری عطاء الرحمٰن جریری، پیرجی عبدالصمد صاحب چشتی فخری، فریدی، پیرجی کرار حسین صابری دریا گنج دہلی، حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی، حضرت مفتی مظہر اللہ صاحب امام مسجد فتحپوری، مولانا عبدالسلام نیازی وغیرہ تھے۔

مولانا نسیم احمد صاحب نے اپنے والد ماجد مولانا حبیب احمدؒ کے انتقال کے بعد تقریباً ۲۵ سال سنہری مسجد چاندنی چوک دہلی میں امامت کی۔ ایک مرتبہ آپ دہلی میں سخت بیمار ہوئے تو آپ نے اپنے بھتیجے اور چھوٹے داماد مولانا شبیر احمد کو اپنی جگہ سنہری مسجد کی امامت منتقل

کر دی تھی۔

۱۹۴۷ء کے پُر آشوب زمانہ میں مولانا نسیم صاحب ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ کراچی میں مقیم ہوئے مارٹن روڈ پر ایک مسجد کی بنیاد ڈالی۔ اس کا نام نوری مسجد رکھا۔ اور وہاں تقریباً دس سال امامت و خطابت کے فرائض انجام دیئے۔ اور خان صاحب محمد اشرف خان کے ساتھ اس مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا۔ اپنی بقایا زندگی اس مسجد کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ اس مسجد میں بھی بعد نماز فجر درس قرآن مجید اور درس مثنوی شریف دیتے رہے۔ انتقال سے ایک سال قبل آپ پر فالج کا حملہ ہوا حکیم سید اشفاق احمد اشرفی نے علاج کیا۔ اللہ کے فضل سے طبیعت سنبھلی آپ نے پھر اس مسجد کی امامت کے فرائض اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ چھ ماہ بعد دوبارہ فالج کا حملہ ہوا۔ آپ اپنے بھتیجے اور چھوٹے داماد مولانا شبیر احمد امام مسجد الفردوس پاکستان کوارٹرز کے مکان میں چلے گئے ڈاکٹر منیر حسن، ڈاکٹر عبدالصمد اور ڈاکٹر عبدالرحیم برابر آپ کا علاج کرتے۔ کمزوری بے حد بڑھتی چلی گئی بیماری کے ایام میں مثنوی شریف کا مطالعہ کرتے رہے۔ آپ کی یکم ربیع الاول ۱۳۸۵ھ مطابق ۱۹۵۷ء کو طبیعت زیادہ خراب ہوئی۔ گیارہ ربیع الاول کی صبح کو بے ہوشی طاری ہو گئی۔ مغرب کے وقت ہوش آیا مغرب کی نماز لیٹے لیٹے ادا کی۔ پھر غنودگی طاری ہو گئی۔ گیارہ بارہ ربیع الاول کی درمیانی شب صبح صادق چار بج کر دس منٹ پر اس دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے۔ آپ نے پس ماندگان میں تین صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں چھوڑیں آپ خاموش کالونی کے قبرستان واقع فردوس کالونی میں آرام فرما ہیں۔

حافظ نصیر الدین صاحب

حافظ نصیر الدین صاحب بن حافظ عبدالعزیز صاحب بن حاجی نتھو صاحب ہماری برادری کے ہی نہیں بلکہ دہلی کے نامور معروف شخصیت تھیں۔ جن کا علمی وادبی طبقہ اور معززین میں بڑا احترام کیا جاتا تھا میری دادی کرامت النساء ان کی حقیقی بھانجی تھیں۔ ان کی تین بہنیں، ایک میری دادی کرامت النساء کی والدہ دوسری ڈپٹی فخرالدین صاحب کی اہلیہ تیسری والدہ قاری ایوب وغیرہ تھیں۔

میرے والد ماجد مولوی شرف الحق صاحب اور میرے چچا غلام اولیاء ان کو اپنا ماموں کہا کرتے تھے۔ یہ گلی جوتیوالی محلہ چوڑی والاں میں حافظ عبدالحق صاحب والے مکان میں رہتے تھے اسی مکان میں تجارت کرتے تھے۔ تھوک کے بیوپاری تھے چشتیہ خاندان کے سلسلے میں مُرید تھے۔ انکے پیر مرزا الٰہی بخش صاحب رحمتہ اللہ علیہ چشتی نظامی، فخری تھے جن کے پیر حاجی لعل صاحب تھے جن کا مزار حضرت امیر خسرو علیہ الرحمتہ کے مزار کے قریب جو دروازہ ہے۔ اس کے برابر ہے۔

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانہ میں جب کہ انگریزوں کا دہلی پر قبضہ ہوگیا تھا یہ اپنے پیر بھائی مولوی محمد عمر صاحب کے ہمراہ پرانے قلعہ چلے گئے تھے جب سکون ہوا تو یہ شہر میں داخل ہوئے ایک روز چاندنی چوک میں گھنٹہ گھر کے پاس سے گذر رہے تھے کہ وہاں ان کی اپنے پیر سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ان کو

دو آنے دے اور کہا کہ مغرب کی طرف چلے جاؤ۔ جب لاہوری دروازے کے پاس پہنچے تو وہاں تقریباً دہلی شہر کے بہی کھاتوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ وہاں ان کے پیر بھائی محمد عمر صاحب بھی موجود تھے۔ جب ان بہی کھاتوں کا نیلام شروع ہوا تو ان دونوں نے نیلام میں بولی دے کر اپنے نام چھڑا لیا اور جب بہی کھاتے دیکھنے شروع کئے تو حافظ نصیر الدین صاحب کے بہی کھاتے بھی مل گئے۔ اور جن لوگوں کے ان کے پاس بہی کھاتے تھے ان کو اطلاع دی کہ وہ اپنے بہی کھاتے ان سے لے جائیں۔ چنانچہ وہ وہاں آکر اپنے اپنے بہی کھاتے لے گئے۔ ان کو فائدہ ہوا کہ جس پر ان کا چاہیے تھا۔ ان سے انھوں نے وصول کیا۔ دوسرے ان کی بہی کھاتے پہنچانے سے ان کی دیانت داری کی اور شہرت ہوگئی۔ ان کے پاس کافی دولت تھی۔ اتنا روپیہ تھا کہ گنا نہیں جاتا بلکہ تولا جاتا تھا۔

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد جامع مسجد پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تھا اور جو تبرکات جامع مسجد میں تھے۔ ان کو بھی لوگ لوٹ کر لے گئے تھے، ان تبرکات کی فراہمی میں حافظ نصیر الدین صاحب کی تنہا کوششوں کا دخل تھا چنانچہ میرے دوست جناب سید یوسف بخاری صاحب دہلوی جو امام سید احمدؒ صاحب کے بھتیجے ہیں انھوں نے اس واقعہ پر اپنی کتاب میں روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب روزنامہ انجام کراچی میں بالاقساط شائع ہوئی جس قسط میں اس واقعہ کا ذکر ہے وہ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۵۶ء کے انجام کا شمارہ ہے ملاحظہ ہو:۔

> ”آثار شریف میں زمانۂ قدیم کے کچھ تبرکات اسلامی چلے آتے تھے۔ ان کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ یہ تبرکات امیر تیمور کو بایزید بادشاہ روم سے حاصل ہوئے تھے اور ان میں سے بعض قسطنطنیہ سے چلے گئے تھے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے گیارہ تبرکات میں سے

درگاہ شریف میں اس وقت چند تبرکات باقی رہ گئے ہیں۔ سابقہ گیارہ تبرکات
کی تفصیل یہ ہے :۔

۱۔ چند پارہ ہائے کلام مجید نوشتہ حضرت علی رضؓ
۲۔ کامل قرآن مجید نوشتہ حضرت امام حسین رضؓ
۳۔ چند پارے نوشتۂ حضرت امام جعفر صادق رضؓ
۴۔ چند پارہ ہائے کلام مجید نوشتہ حضرت امام حسین رضؓ
۵۔ موئے مبارک حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
۶۔ نعلین شریف رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
۷۔ نشانِ قدم شریف حضرت رسول کریم صلعم
۸۔ غلاف شریف مزارِ اقدس رسولِ خدا صلعم
۹۔ پنجہ شریف حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ
۱۰۔ چادرِ مبارک حضرت فاطمۃ الزہرہ رضؓ
۱۱۔ غلاف مبارک کعبہ شریف۔

غدر کے زمانے میں یہ تبرکات خورد برد ہو گئے تھے لیکن جب نصیر الدین صاحب
مرحوم سوداگر چیفت دہلی کو اس بات کا علم ہوا تو وہ سینہ سپر ہو کر غاصبوں کے
پاس پہنچے اور اُن سے جو کچھ بٹور کر لا سکتے تھے بٹور لائے۔ ۵۱

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد حکومتِ برطانیہ نے جامع مسجد پر قبضہ کرنے کے
بعد ۲۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو واگذار کیا تو ایک منتظمہ کمیٹی کے سپرد اس کا انتظام کیا جس
کے دس معزز مسلمان ممبر بنے ان میں حافظ نصیر الدین صاحب کا نام بھی ہے

---

۵۱ رسالہ فطے دیر کراچی جنوری ۱۹۵۷ء صفحہ ۱

اُن دس حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں:-

(۱) مرزا الٰہی بخش صاحب (۲) محمدؐ ابراہیم صاحب (۳) محمدؐ صدرالدین صاحب (۴) محمدؐ حسین صاحب (۵) نصیرالدین صاحب (۶) تراب علی صاحب (۷) حافظ داؤد صاحب (۸) محمدؐ تفضل حسین صاحب (۹) محبوب بخش صاحب (۱۰) حافظ میر محمدؐ صاحب [۱]

چنانچہ جب تک حافظ نصیرالدین صاحب زندہ رہے، اس وقت تک جامع مسجد میں ان کے لئے ایک کمرہ علٰحدہ مقرر رہا۔

حافظ نصیرالدین صاحب کا حضرت حاجی امداداللہ صاحبؒ مہاجر مکی سے خاص تعلق تھا۔ انھوں نے بقول بھائی بدرالدین صاحب، حضرت نظام الدینؒ اولیا، رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ میں لنگر خانہ کھلوایا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد اس کا انتظام خلیل احمدؐ صاحب اور سراج احمدؐ صاحب نے سنبھالا تھا۔

حافظ محمدؐ نصیرالدین صاحب کا انتقال دہلی میں ہوا ان کا مزار حضرت نظام الدین صاحب اولیار کی باؤلی کے مشرقی چبوترہ پر ہے۔ ان کے صاحبزادے عبدالمغنی صاحب ریاض احمدؐ صاحب، غلام نبی صاحب اور ایک صاحبزادی حمیدالنسار زوجہ ڈپٹی نورالدین صاحب تھیں۔

عبدالغنی صاحب اپنے والد کے ہمراہ کام کرتے تھے۔ اُردو بازار جامع مسجد میں کیفی لائبریری اور شاہراہ بکڈپو کے درمیان کی دکانوں میں ان کی دکان تھی بہت خوش خط تھے حضرت نظام الدینؒ اولیار کی درگاہ پر زیادہ آمدورفت تھی اور وہیں زیادہ وقت گذارتے تھے۔ حافظ عبدالخالق بنے والوں اور جناب محبوب الٰہی صاحب

---

[۱] یادگار دہلی

سے ۔خواجہ حسن نظامی صاحب کے زیادہ تعلقات تھے خواجہ حسن نظامی صاحب کو تعلیم دلوائی، آپ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ غالباً ۱۸۹۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔

حضرت امیر خسرو کے لنگر خانہ کی پشت پر جہاں خواجہ حسن نظامی صاحب کا حجرہ ہے وہاں آرام فرما ہیں۔ ان کے صاحبزادے حافظ غلام محمد صاحب بدر الدین صاحب اور رکن الدین صاحب ہوئے۔

غلام احمد صاحب نے قاری حکیم محمد ابراہیم صاحب شاگرد قاری عبدالرحمن صاحب نابینا سے قرآن مجید حفظ کیا۔ ان کے ہم سبق حاجی احسان الٰہی صاحب حافظ زین العابدین صاحب بابو حبیب احمد صاحب، حافظ شمس الدین صاحب حافظ ارشاد الٰہی صاحب تھے۔ حافظ رحم الٰہی صاحب کا کچھ تھوڑا قرآن مجید حفظ کرنا باقی رہ گیا تھا جس کی انھوں نے قاری فضل الدین صاحب سے تکمیل کی۔ اس کے بعد یہ اپنے نانا عبدالحکیم صاحب جن کا مکان بنارس میں تھا ان کے پاس رہے۔ اسی عرصہ میں ان کے نانا نے ان کو لکھنؤ پڑھنے کے لئے بھیج دیا۔ ان کے استاد مولوی احمد خاں صاحب حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے جن سے انھوں نے گلستان بوستان اور مثنوی شریف پڑھی۔ غلام احمد صاحب نور کی زندگی کے بہت سے پہلو ہیں۔ اور ہر پہلو کامیاب ہے۔ آج انھیں محض ایک کاروباری آدمی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جنگ عظیم کے دوران میں انھوں نے جو شہرت حاصل کی وہ قابل رشک ہے۔ انھوں نے دہلی سے ماہانہ رسالہ شعلہ جاری کیا جس کے ایڈیٹر جناب مولانا ناصر جلالی صاحب تھے۔ یہ رسالہ بڑا معیاری تھا۔ اس میں چوٹی کے ادیب لکھتے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد ہی رسالہ شعلہ مہاراجہ سر کشن پرشاد کی سرپرستی میں ایک عرصہ تک حیدرآباد دکن میں بھی نکلا۔

اس کے بعد انھوں نے تجارت کی طرف رُخ کیا اور رحیمیہ بوٹ ھاؤس آگرہ میں کمیشن ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ وہ آسام و بنگال کا دورہ کرتے تھے۔ اپنے زمانہ کے کامیاب ایجنٹ تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کا ایک مذہبی رُخ بھی ہے۔ آسام و بنگال میں بہت سے لوگ انھیں عقیدت کی نظروں سے دیکھتے تھے اور انھیں اپنا پیر مانتے تھے۔

اسی اثنا میں حیدرآباد دکن کی ایک بٹن کی وطن فیکٹری نے ان کو ایجنسی ۱۹۴۷ء تک یہ کام کیا۔ ہنگامۂ ۱۹۴۷ء میں لاہور چلے گئے۔ کچھ سال بدرگھی اسٹور کا مال ڈھاکہ میں سپلائی کیا۔ اب آرام کر رہے ہیں۔ ان کی شادی مولوی بشیرالدین صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔

مولوی بشیرالدین صاحب ڈپٹی فخرالدین صاحب کے چھوٹے بھائی تھے جو مولوی شرف الدین صاحب مرحوم کے صاحبزادے تھے۔ غلام احمد کے چار لڑکے نور احمد صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔ محمد نسیم صاحب پی، ایچ، ڈی الیکٹرانکس، انعام احمد صاحب بی، اے، ایل ایل بی، نعیم احمد صاحب بی ایس سی آنرز اور صاحبزادیاں چار جن کی شادی اجمیر شریف کے خاندان میں ہوئی۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ جمیل النساء کی شادی بھی اجمیر شریف میں ہوئی۔ بتول زوجہ عبدالخالق بدی والے، شمیمہ اختر بی اے اور شاہجہاں بیگم زیر تعلیم ہیں۔

لہ رسالہ قند ویر کراچی جون ۱۹۵۴ء

شیخ بدرالدین صاحب دہلی میں ۱۸۹۱ء کو پیدا ہوئے۔ سٹرک پریم نرائن محلہ چوڑی والان کے ایک کایستھ اور جناب احمد شاہ صاحب سے تعلیم پائی۔ حاجی اخلاق احمد صاحب کے ہاں کئی برس ملازمت کی اُن کے بعد ذکی الدین صاحب کی شراکت میں کشمیری گیٹ، ورجبر پاس پروکٹری بوٹ ہاؤس کے نام سے اپنا کاروبار شروع کیا۔ گرمیوں میں یہ دکان مسوری جاتی تھی۔ ۱۹۲۶ء میں اپنے چھوٹے بھائی محکم الدین صاحب کی دکان پر کلکتہ میں چلے گئے۔ ان کے ساتھ کچھ عرصہ کام کیا۔ ۱۹۳۱ء میں لکھنؤ چلے گئے۔ وزیرآباد میں پاپوش کا ایک کارخانہ کھولے ہوئے ہیں۔ محنتی اور جفاکش انسان ہیں۔ اس عمر میں بھی ہمت نہیں ہارے۔

شیخ بدرالدین صاحب نے ابتدائی عمر سے انگریزوں کی غلامی کی لعنت کو دور کرنے کی جدوجہد شروع کر دی تھی۔ رام لیلا کا جلوس پہلے چاوڑی بازار سے ہوتا ہوا جامع مسجد کے سامنے سے گزرتا تھا چنانچہ جس زمانے میں شیخ صاحب کی عمر گیارہ سال کی تھی، اُس وقت کا یہ واقعہ ہے کہ چاوڑی بازار سے رام لیلا کا جلوس ہوتا ہوا جامع مسجد کی پشت پر گزرا۔ پولیس کپتان سنبر اس کے انتظام پر مامور تھا۔ اس نے اس جلوس کو آدھے گھنٹے تک روکے رکھا اور ہندوؤں کو شہ دے کر باجا بجوایا اور مسلمانوں کے خلاف غیر مہذب باتیں کہلوائیں۔ اس وقت مسلمانوں نے سمجھ داری کا ثبوت دیا اور کچھ نہیں بولے۔ جب کپتان نے دیکھا کہ میرا مقصد پورا نہیں ہوا تو مسلمانوں کے مجمع کے پاس پہنچا اور ان کو مشتعل کرنے کے لئے کہا کہ تمہارا ایمان کہاں چلا گیا۔ تم مسجد کے سامنے باجا بجتے ہوئے دیکھ رہے ہو۔ اور ہندوؤں کی گالیاں سن رہے ہو اور کچھ نہیں بولتے۔ مسلمان چونکہ اس کی پہلی حرکت دیکھ چکے تھے، اس لئے اس کی شرارت کو سمجھ گئے۔ اس کو کچھ جواب

نہیں دیا اور نہ کوئی حرکت کی۔ اسی اثنا میں جلوس جامع مسجد سے آگے بڑھ گیا چلا گیا۔ اس واقعہ کا اثر بدر الدین صاحب پر ہوا۔

۱۹۲۰ء میں جب کہ عدم تعاون کی تحریک شباب پر تھی۔ اس تحریک کی ہمنوائی اور حمایت کرنے کے لئے دہلی میں جنگل والی مسجد باڑہ ہندو راؤ میں ایک تاریخی اجلاس ہوا تھا جس میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے بھی شرکت کی تھی اور اس اجلاس میں وہ پوسٹر بھی تقسیم ہوا تھا جس پر عدم تعاون کی تحریک کی حمایت میں پانچ سو علماء کے دستخط تھے۔ اس وقت جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ لوگ گردنوں میں یہ پوسٹر ڈال کر شہر میں پھرتے تھے۔ چنانچہ شیخ بدر الدین صاحب شیخ سلیم الدین صاحب و شیخ عبد الواحد صاحب نے بھی سینہ و پشت پر یہ پوسٹر لگا کر شہر میں گشت لگایا تھا اور ان ہی ایام میں یہ تینوں حضرات شیخ الہندؒ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے تھے۔

شیخ صاحب نے خلافت کی تحریک کی ابتداء سے کانگریس کی ہر تحریک میں حصہ لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ لیڈر گر ہوتے ہیں اور ان سے ہی انقلابی تحریکیں کامیاب ہوتی ہیں۔ شیخ صاحب نے بڑے نازک اور خطرناک موقعوں پر بہت اہم اور تاریخی کام انجام دیئے ہیں۔ اُن کی پوری زندگی قوم وملک کی خدمت میں گذاری ہے۔

شیخ بدر الدین صاحب کے کارنامے بہت طویل ہیں۔ چند واقعات سے اندازہ لگائیے کہ یہ کس طبیعت کے مالک ہیں۔ اور انھوں نے وطن کی آزادی کے لئے بلا کسی طمع ولالچ کے کیا کچھ نہیں کیا۔

۱۹۱۸ء و ۱۹۱۹ء میں امان اللہ خان کے عہد حکومت میں نادر خان نے انگریزوں کو کابل کی سرحد ٹل پر شکست دی تھی۔ ان سنوں میں کابل کے حکمران

اور انگریزوں کی مصالحت کے لئے مسوری میں کانفرنس ہوئی۔ حکم الدین صاحب اور بدرالدین صاحب اتفاق سے اس زمانہ میں مسوری میں تھے کرنل عبدالہادی محمود طرزی امان اللہ صاحب کے خسر وغیرہ سوائے ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ مسوری کے چپہ چپہ پر سی، آئی، ڈی پھیلی ہوئی تھی اور ان کابلی حکمرانوں اور ان کے ساتھیوں کی سخت اور کڑی نگرانی ہورہی تھی۔ ان کے پاس اخبارات بھی نہیں پہنچنے دیتے تھے اس وقت ہندوستانی عوام ان مسائل میں بے حد دلچسپی لے رہے تھے۔ چنانچہ دونوں فریق کی ہر نقل و حرکت دیکھ رہے تھے۔ بدرالدین صاحب حکم الدین صاحب کے ساتھیوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ کابل کے سفارخانے کا میر منشی ان کی ایک ایک بات کی انگریزوں کی سی آئی ڈی کو اطلاع دیتا ہے تو انھوں نے اس وقت ان سے اخبار نہ ملنے کی پریشانی کا ذکر کیا۔ انھوں نے قاضی عبدالغفار کو اخبار "صبا" نکلتا تھا وہ اپنے بہاری ملازم کے ذریعے بھجوانا شروع کیا۔ غرض بدرالدین صاحب کی دکان ایک باغیانہ اڈہ بن گئی تھی۔

اسی اثنا میں مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی اور مولانا احمد سعید صاحبان نے خفیہ پیغامات حنیف وغیرہ صاحبان کی معرفت کابلی حاکموں کو دہلی سے بھیجے تھے ان کے پاس ان پیغامات کا پہنچانا بڑا مشکل کام تھا۔

مسوری کے جنگلوں میں قدرتی آبشار ہیں۔ بدرالدین صاحب حکم الدین صاحب اپنے مہمانوں کو دکھانے کے لئے آبشاروں کو دیکھنے کے لئے آرہا تھا حنیف صاحب نے ان کو سلام کیا اور گفتگو شروع کی۔ رکشا چلتا رہا۔ اسی دوران محمود طرزی کو چٹھی دی۔ رکشا والا سی آئی ڈی کا آدمی تھا۔ اس نے فوراً اس کی اطلاع افسران کو پہنچادی۔ مسوری کی سی آئی ڈی کی طرف سے بدرالدین صاحب حکم الدین صاحب وغیرہ کو چھ گھنٹے کے اندر مسوری سے نکل جانے کا نوٹس ملا یہ آرڈر اقبالی

حسین صاحب بلند شہری لائے تھے۔ دوران گفتگو معلوم ہوا کہ اقبال صاحب بدرالدین صاحب کے چچا غلام نبی صاحب کے جاننے والے ہیں اس وقت انھوں نے بدرالدین صاحب وغیرہ کو سمجھایا ایسے خطرناک موقع پر یہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ اس وقت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی سی آئی ڈی کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے تعین تھے۔ اقبال حسین ان کے پاس گئے اور ان سے چھ گھنٹے کا نوٹس منسوخ کرایا اور اس دکان پر اپنی ڈیوٹی لگوائی تب یہ قضیہ ختم ہوا۔

جس زمانہ میں بدرالدین صاحب لکھنؤ میں کام کر رہے تھے اس وقت پیر بخش کمار ٹرہا لمرکشنڈ پھاٹک سے ۱۶۱ ایم ٹی مدراس کے لئے چپلوں کا آرڈر دینے کے لئے بدرالدین صاحب کے پاس آئے۔ اس سے ان کے ابتدائی ایام میں تعلقات اتنے بڑھ گئے تھے کہ یہ بدرالدین صاحب سے فوج کے اہم راز بھی نہیں چھپاتے تھے۔ پیر بخش نیتاجی سبھاش چندر بوس کے معتقد تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد کی بے پناہ عزت کرتے تھے۔

اس نے بتایا اس وقت امپھال پر جنگ ہو رہی ہے۔ ۱۶۰۰ ایم ٹی مدراس ختم ہو چکی ہے۔ تینتیس ہزار فوجیوں نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ اب انگریزی حکومت کے خاتمہ کا وقت آگیا ہے۔ ہم کو بھی کچھ کرنا چاہئے اس کے مشورہ کے مطابق بدرالدین صاحب نے اپنے طرف نے بین ایک میٹنگ کی جس میں یوپی کے انقلابی لوگ خاص طور پر مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی وغیرہ شریک ہوئے۔ میٹنگ کا آغاز ہی ہوا تھا کہ کسی نے اس کی اطلاع سی آئی ڈی کو دے دی۔ سی آئی ڈی افسران نے تصدیق کرانے کے لئے عبداللہ نائک کو میٹنگ میں بھیجا۔ جب یہ میٹنگ میں پہنچے تو لوگوں میں بے چینی پھیل گئی۔ عبداللہ نائک تھے۔ تو سی آئی ڈی کے ملازم لیکن پیر بخش کی طرح محب وطن تھے اور انقلابی لوگوں کی مدد کرتے تھے۔ انھوں نے لوگوں

سے کہا کارروائی جاری رکھو فکر مت کرو۔ لیکن میٹنگ کی کارروائی خاطر خواہ نہ ہو سکی۔ جب میٹنگ ختم ہو گئی تو عبداللہ نائک نے بدرالدین صاحب کو سمجھایا کہ ایسے نازک وقت میں ایسی میٹنگوں سے احتراز کرنا چاہیئے۔ ایسے جرم کی سزا صرف گولی ہے۔

بدرالدین صاحب کی شادی ۱۹۳۱ء کو زبیدہ خاتون بنت محمد عمر صاحب ٹونوسے ہوئی۔ جن سے ایک صاحبزادے حبیب الدین صاحب اور ایک صاحبزادی خانجہاں ہوئیں۔

حبیب الدین صاحب نے قرآن مجید گھر پر پڑھا۔ عربک اسکول میں آٹھویں کلاس تک تعلیم پائی لکھنؤ کے کارخانے میں والد صاحب کے ساتھ کام کیا۔ اس کے بعد تین سال تک بالو جہ شو کمپنی فتحپوری چاندنی چوک میں ملازمت کی۔ آج کل ممبئی کی چپل کی مشہور اجنتا کمپنی قرول باغ کی شاخ میں ملازم ہیں۔ تجربہ کار اور معاملہ فہم نوجوان ہیں۔ اچھی سوجھ بوجھ پائی ہے۔ خدا ان کو ترقی دے۔

محکم الدین صاحب حقیقتاً ایک ولی صفت انسان ہیں۔ اپنے والد صاحب کا چربہ ہیں۔ دولت کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ خدمت خلق کو مقدم سمجھا اسی میں زندگی بتائی۔ انھوں نے تعلیم حافظ حسین اشرف صاحب سے پائی۔ پہلے بشیرالدین صاحب کی دکان بلیماران میں کام سیکھا۔ بعد میں محمد ابراہیم صاحب کی دکان بلی ماران میں اور برٹش بوٹ ہاؤس چاندنی چوک میں ملازمت کی۔ وکٹری بوٹ ہاؤس کشمیری گیٹ خیبر پاس میں اپنے بڑے بھائی بدرالدین صاحب کے ساتھ کام کیا۔ کلکتہ پہنچے۔ نیو مارکیٹ کلکتہ میں ہی آر۔ دس آنجہانی جو اس وقت کلکتہ کے میر تھے۔ انھوں نے یہ جگہ دلوائی۔ اور اس کا انھوں نے ہی افتتاح کیا۔ اس دکان کی بڑی شہرت ہوئی۔ اس زمانہ کے گورنر اور وزراء حتیٰ کہ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب، پنڈت موتی لال نہرو صاحب

سہروردی صاحب، خواجہ ناظم الدین صاحب، پیر سعد اللہ صاحب، گورنر آسام عبدالرحمٰن صاحب صدیقی اور ایس کے دہلوی کی یہ دکان آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ کمشنر کلکتہ سے قریبی تعلقات تھے۔ لوگ ان سے ملنے کے متمنی رہتے تھے۔ جو بھی دہلی سے آتا اس کے میزبان یہ ہوتے۔ اور یہ کوشش کرتے تھے کہ میزبانی کے ساتھ زاد راہ بھی دیں۔ ایک عجیب شاہانہ زندگی انھوں نے کلکتہ میں گذاری ہے۔ ۱۹۴۷ء میں بلی ماران کو اُجڑنے سے بچانے والے یہ ہیں۔ ان کی زندگی ایک سبق آموز ہے۔ جو پیسے کو ایمان و دین سمجھتے ہیں انھیں اپنی آنکھیں کھولنی چاہئیں یہ وہ معشوق بے وفا ہے جو کبھی کسی سے وفا نہیں کرتا۔ ایک جھلک دکھا کر بے چین و مفلس و قلاش بنا دیتا ہے۔ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

صدیقی برادری دہلی کی جو حال میں تنظیم ہوئی ہے اس کے کرتا دھرتا یہ با عمل، آہنی عزم والے مخلص و بے لوث انسان ہیں جو کسی کی مصیبت کو نہیں دیکھ سکتے۔ دوسروں کی مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھ کر بے چین ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے دور کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں۔ یہ ابن الوقت نہیں ہیں۔ چاپلوسی اور خوشامد سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ حق بات کہنے سے کبھی نہیں چوکتے۔ سرمایہ ان کی لونڈی بنی کبھی سرمایہ داروں کے لئے پالک نہیں بنے۔ ان کا مقولہ ہے ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

محکم الدین صاحب کی شادی بلقیس جہاں بنتِ جناب غلام نبی صاحب سے ۱۹۲۷ء میں ہوئی جن سے دو صاحبزادے احمد کمال صاحب اور احمد جمال

صاحب اور تین لڑکیاں زاہدہ خاتون، خالدہ خاتون اور فریدہ خاتون ہوئیں۔
احمد کمال تیرہ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ احمد جمال صاحب ۱۹۲۱ء
کوگلی جوتے والی میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں گھر پر تعلیم پائی۔ اور عربک اسکول
میں کچھ عرصہ پڑھا۔ انگریزی اچھی لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ اچھے ادیب ہیں ڈرامہ
نگاری کا شوق ہے۔ زاہدہ خاتون کی علاوہ الٰہی ابن قاری محمد ایوب صاحب
سے شادی ہوئی۔

جناب ریاض احمد صاحب حاجی محبوب الٰہی صاحب کے ساتھ تقریباً
ہر وقت رہتے تھے۔ کچھ دنوں کاکاروبار کیا۔ بعد میں اللہ توکل پر پوری زندگی
گزاری، صوفی منش انسان تھے۔ ان کی پہلی شادی عنایت صاحب کی لڑکی سے
ہوئی۔ جن سے غلام فخر اور غلام حافظ ہوئے۔ ان دونوں بھائیوں کی شادی
نہیں ہوئی تھی۔ غلام فخر صاحب نے فقیری لے لی تھی۔ بزرگان دین کے مزار پر
جاتے تھے۔ وہیں قیام وطعام رہتا تھا۔ ان کا انتقال ۳۰ برس کی عمر میں حضرت
قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر ہوا۔ غلام حافظ صاحب بھائی محکم الدین صاحب
کے ہاں کلکتہ میں ملازم تھے۔ ان کو تپدق ہو گئی تھی۔ ۲۳۔۲۴ سال کی عمر میں دہلی
آکر فوت ہوئے۔

ان کی دوسری شادی غیر برادری کی لڑکی سے ہوئی۔ جن سے آپا حافظہ اور
بچہ دو لڑکیاں ہوئیں۔ ان دونوں کی غیر برادری میں شادی ہوئی۔

غلام نبی صاحب اپنے زمانہ کے اچھے بیوپاری اور اپنے دور کے
خوب صورت لوگوں میں سے تھے۔ چاندنی چوک میں پاپوش کی دوکان
تھی۔ ان کی دوکان علی گڈھ اور مظفر نگر کی نمائشوں میں جاتی تھی۔
رنگین مزاج تھے۔ ملنسار طبیعت پائی تھی۔ ان کی شادی اصغری بنت

عظیم الدین صاحب سے ہوئی تھی۔ جن سے بلقیس جہاں زوجہ محکم الدین صاحب ،
امرت جہاں کا جوانی میں انتقال ہوا۔ ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ جورنی
کی شادی لالہ میر خان سے ہوئی۔ جو سرہند کے رہنے والے تھے [1]

(اس خاندان کی معلومات شیخ بدرالدین صاحب، بھائی محکم الدین
صاحب عرف گھمن، حافظ غلام احمد صاحب نور اور صابرہ خاتون سے
ہوئی)۔

---

[1] رسالہ صدیقی گزٹ دہلی۔ اپریل ۱۹۶۳ء۔

حافظ محمدؒ تقی نور

حافظ صاحب کے والد ماجد چودھری محمدؐ ابراہیم صاحب گذر رہے تھے۔ آپ سنہ ۱۹۰۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ وجاہت میں اپنے والد کی مکمل شبیہ تھے میانہ قد، بھرا بدن، سرخ و سپید رنگ، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں لمبی لمبی پلکیں الغرض وجاہت کے مرقع تھے۔ اپنے والد بزرگوار کی طرح ان کے بھی کانوں کی لَو اور رُخساروں کی سرخی جھلکتی تھی۔ بچپن ہی سے ہاکی کھیلا کرتے تھے اس لیے ان کی صحت بہت اچھی تھی۔ ان کا یہ شوق عہدِ جوانی تک قائم رہا۔

بہر طور کے کاروبار کی ذمہ داری ان کو اپنے والد صاحب سے منتقل ہوئی۔ جن لوگوں نے تقی نور صاحب کو قریب سے دیکھا ہے وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ کاروبار سے زیادہ ان کی طبیعت علم و ادب کی طرف مائل تھی۔ بچپن سے ان کو مطالعہ اور کتب بینی کا شوق تھا۔ چنانچہ ان کی ذاتی لائبریری میں انگریزی اور اردو ادب کی سیکڑوں کتابیں موجود تھیں جن سے ان کے اعلیٰ ذوق کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ ایک اچھے مقرر بھی تھے۔ تحریر میں ان کا اپنا انفرادی رنگ جھلکتا تھا۔ انھوں نے دہلی سے مظہر انصاری صاحب کے ساتھ سنہ ۱۹۳۶ء میں رسالہ جہانستان جاری کیا تھا انھوں نے بچوں کے لیے بھی ایک رسالہ نکالا تھا جس کا نام "کھلونا" تھا۔

صحیح معنی میں تقی نور صاحب کو پنجابی برادری کے پہلے افسانہ نویس اور ڈرامہ نگار

ہونے کا فخر حاصل ہے۔ وہ پنجابی برادری کے پہلے ادیب تھے۔ انھوں نے برادری کو صحافت سے روشناس کرایا۔ برادری کے نوجوانوں میں ادبی ذوق پیدا کیا اور اپنی مختصر مدت میں اپنے لئے پنجابی ادب میں ایک امتیازی مقام حاصل کیا۔ ان کے مضامین، افسانے، فیچر اور ڈرامے ہندوستان کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہونے لگے تھے ۔ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا جس کا نام تھا "درد تھے سے محبت ہے" جو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ اس کا پہلا ایڈیشن بہت جلد فروخت ہو گیا آپ کے تحریر کردہ ڈرامے آل انڈیا ریڈیو دہلی اور لکھنؤ سے بار ہا نشر ہوئے اور بہت پسند کئے گئے۔

حافظ محمد نقی ادبی و علمی مجالس کے روحِ رواں تھے۔ وہ ان مجالس کے انعقاد میں گہری دلچسپی لیتے تھے ۔وہ اکبر حیدری، عشرت رحمانی، حافظ محمد یوسف دہلوی مدیر شمع دہلی اور خواجہ محمد شفیع دہلوی کے ہم جلیس تھے۔ مشہور فلمی ماہنامہ شمع کی داغ بیل انھوں نے ہی ڈالی تھی جو اس وقت ہندوستان کا سب سے کثیر الاشاعت جریدہ ہے۔ حافظ انوار الحق حقی بھی ان کے احباب میں تھے۔ چنانچہ حقی صاحب کی انجمن ضیاء الادب کے زیرِ اہتمام جن مشاعروں اور علمی و ادبی مجالس کا انعقاد کیا جاتا تھا اس کو کامیاب بنانے میں نقی نور سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ اور نیشنل پبلک لائبریری کے اہم مسائل کے حل کرنے میں حقی صاحب کے ساتھ پوری طرح اشتراک کرتے تھے ۔

جس طرح کراچی سے برادری کا ایک ادبی ماہنامہ سوداگر شائع ہوتا ہے جو برادری کی کوائف کی عکاسی کرتا ہے اسی طرح تقسیم سے قبل دہلی سے برادری کا ایک ادبی ماہنامہ پنجابی گزٹ شائع ہوتا تھا۔ نقی نور نے سالوں تک اس ماہنامہ کی ادارت کے فرائض انجام دیے اور اسے کامیابی سے چلایا۔ انھوں نے پنجابی گزٹ میں اصلاح

رسوم اور برادری کے دوسرے اہم مسائل پر پُر اثر پیرایہ میں مضامین لکھے۔

نقی نور کو قوم اور برادری کی خدمت کا جذبہ اپنے والد سے ترکہ میں ملا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ برادری کے فلاحی اور رفاہی کاموں میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے تھے۔ چنانچہ برادری کی اصلاحی رسم کی تحریک میں اُنھوں نے نمایاں حصہ لیا۔ اصلاح رسوم کی خلاف ورزی کے سلسلہ میں جب پنجابی یوتھ لیگ کو "پکٹنگ" جیسا انتہائی قدم اٹھانا پڑا تو وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ حالانکہ اس ناخوشگوار قدم کی وجہ سے ان کو اپنے کئی عزیز و اقارب اور احباب کی ناراضگی مول لینی پڑی۔

نقی نور نے دہلی میں برادری کی ہر دلعزیز تنظیم انجمن وکیل قوم پنجابیاں میں بھی سرگرم حصہ لیا۔ اس انجمن میں ترقی پسند گروپ کے ڈپٹی لیڈر رہے تھے۔ آپ انجمن وکیل قوم پنجابیاں کی منتظمہ کمیٹی کے رُکن پنجابی اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول سب کمیٹی کے رکن اور پنجابی یوتھ لیگ دہلی کے صدر اعلیٰ تھے۔ آپ کو ملکی سیاست سے بھی دلچسپی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ دہلی صوبائی مسلم لیگ کی کونسل اور متعدد سب کمیٹیوں میں شامل ہوئے۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں برادری کے چند درد مند نوجوانوں نے جن میں عبدالہی سوت والے، محمد صالحین پھول مشین والے اور دیگر متعدد احباب شامل تھے۔ بیڈ منٹن کلب دہلی میں عید کے موقع پر ایک قومی میلہ کا انعقاد کیا جس میں ڈرامہ، مشاعرہ، بیت گوئی، اور اسپورٹس کے دلچسپ مقابلے پیش کئے گئے۔ اس میلہ کی تمام آمدنی پنجابی اسکول دہلی کے تعلیمی فنڈ کو دی گئی کیونکہ تعلیمی فنڈ مقروض تھا۔ اس قومی میلہ میں نقی نور نے بھی سرگرمی سے حصہ لیا بالخصوص ڈرامے اور تمام ادبی مجلس ان کی نگرانی میں منعقد ہوئی۔

اُنھوں نے اسپورٹس کے مقابلوں کو کامیاب بنانے میں پوری پوری

دلچسپی لی چنانچہ رسہ کشی کے مقابلے میں ایک ٹیم کی طرف سے حصہ لے کر رسہ اپنی کمر سے باندھا اور مقابلہ کے وقت پوری کوشش کی۔ ان کی ٹیم ہارتے ہارتے بچی۔ رسہ کشی کا یہ مقابلہ قابل دید تھا۔ اسی رسہ کشی میں حصہ لینے کی وجہ سے کچھ عرصہ بعد ہی ان کو اچانک اسپنڈکس کے درد کی انتہائی شدید تکلیف لاحق ہوئی۔ مرض کی صحیح تشخیص تاخیر سے ہوئی۔ حالت جب زیادہ بگڑی تو "الھارون ہاسپٹل" میں داخل کیا گیا۔ اسپنڈکس کا آپریشن بھی ہو گیا لیکن حالت یکایک بگڑ گئی۔ اور ۴ جنوری ۱۹۴۵ء کی ایک طوفانی رات میں جب انتہائی تیز بارش ہو رہی تھی انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

اس طرح قومی خدمت کے جذبے سے بھرپور۔ یہ انتہائی ملنسار اور غمگسار انسان عین جوانی کے عالم میں اپنے عزیز و اقارب اور احباب کے ایک وسیع حلقہ کو اشکبار چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔

(بشکریہ عبدالمتین صدیقی) [1]

---

[1] یادِ رفتگاں مؤلفہ سلطان رفیع ص ۲۰۹

جسٹس وحید الدین صدیقی دہلوی

جسٹس وحید الدین صاحب صدیقی تھے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت ابو بکر صدیق رضؓ تک پہنچتا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد سرہند سے بندہ بیراگی کے ظلم سے تنگ آکر دہلی چلے آئے تھے یہیں بس گئے اور صدیقی برادری کی شکل اختیار کر لی۔ راقم الحروف امداد صابری کا بھی اسی صدیقی برادری سے تعلق ہے۔

جناب حاجی غلام محمد صاحب جسٹس وحید الدین صاحب کے پردادا تھے جن کو مذہبی معلومات سے زیادہ دلچسپی تھی۔ آپ حضرت خواجہ باقی باللہ صاحب سے خاص طور پر عقیدت رکھتے تھے۔ مغرب کی نماز روزانہ جا کر درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ کی مسجد میں پڑھتے تھے۔ آپ کے خاندان کے لوگوں میں سچ بولنے پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی اور جھوٹ بولنے کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ہر بزرگ اپنے چھوٹوں کو سچ بولنے کی عادت ڈالتا تھا۔ عزیز و اقارب میں اس خاندان کے صدق و صفا کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔

حاجی موسیٰ صاحب، جناب غلام محمد صاحب کے صاحبزادے تھے۔ حاجی غلام محمد کے کسی مقدمے میں ان کے بیٹے حاجی موسیٰ کی شہادت تھی جس بات کو حاجی موسیٰ صاحب سچ اور حقیقت سمجھتے تھے، وہ ان کے والد صحیح نہیں بتلاتے تھے چنانچہ حاجی موسیٰ صاحب نے باپ کی پرواہ نہیں کی جو بات حق سمجھتے تھے وہ شہادت میں کہہ دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حاجی غلام محمد صاحب کا مقدمہ خارج ہو گیا، باپ کا کافی نقصان

ہوا لیکن باپ نے بیٹے سے گلہ شکوہ نہ کیا حالانکہ باپ حق پر تھے۔

حافظ محمد اسمٰعیل صاحب، حاجی غلام محمد صاحب کے فرزند تھے۔ ان کے دہلی کے عمائدین، شائقین اور علماء سے گہرے تعلقات تھے۔ جناب سید محمد صاحب امام جامع مسجد دہلی، شمس العلماء مولانا محمد منشی محمد ذکا اللہ صاحب دہلوی، جناب مولانا محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد صاحب وغیرہ کے ہاں کا ہر وقت اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ان کی حق گوئی کا بھی ایک واقعہ مشہور ہے۔

جامع مسجد میں جناب سید محمد صاحب امام جامع مسجد شاہی دہلی اور منشی محمد ذکا اللہ صاحب اور دوسرے معززین موجود تھے۔ اس محفل میں حافظ محمد اسمٰعیل صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ اس خاندان کی حق گوئی کا ذکر آیا تو جناب امام سید محمد صاحب نے حافظ محمد اسمٰعیل سے دریافت کیا۔ سچ بولنے کا کیا ثبوت ہے؟ اور کون سی ایسی نشانی یا پہچان ہے جو معلوم ہو جائے کہ یہ آدمی سچ بولتا ہے؟

حاجی محمد اسماعیل صاحب نے بتایا کہ ہمارے خاندان میں اس کی شناخت اور پہچان یہ ہے کہ سچ بولنے والا کو آگ کوئی گزند یا تکلیف نہیں پہنچا سکتی چنانچہ حافظ محمد اسمٰعیل صاحب نے اسی وقت ایک آدمی سے پیسہ دیکر ایک موم بتی اور ایک ماچس کا بکس منگوایا جب وہ یہ دونوں چیزیں لے کر آ گئے تو انھوں نے ماچس سے موم بتی جلائی۔ اس کی لو پر اپنا دایاں ہاتھ ایک منٹ کے قریب رکھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس لو سے اُن کا ہاتھ نہیں جلا۔ اور نہ اُن کو اس عرصہ میں کوئی تکلیف پہنچی اور سچ بولنے کا ثبوت مل گیا۔

آپ جامع مسجد کے شرقی دالان میں پڑھاتے تھے سینکڑوں شاگرد تھے۔ باہر کے لوگ رمضان شریف میں ان کو تراویح پڑھانے کے لیے اپنے مقامات پر لے جانا چاہتے تھے لیکن کبھی دہلی کے باہر جانے کے لئے تیار و آمادہ نہیں ہوئے۔

یہ دونوں بھائی حاجی موسیٰ اور حاجی اسمٰعیل بہت نیک تھے۔ دنیاداری سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے تھے حسب ضرورت کما لیتے تھے جب وہ ختم ہو جاتا تو دکان پر چلے جاتے تھے اور ضرورت کے مطابق بکری کر کے گھر آجاتے تھے۔ یہ طریقہ ان دونوں کا عمر بھر جاری رہا۔

جناب حافظ محمد اسمٰعیل نے علم تجوید دہلی کے مشہور قاری عبدالرحیم صاحب سے حاصل کی جس کے متعلق سر سید احمد خاں صاحب دہلوی اپنی مشہور تصنیف "آثار الصنادید" میں تحریر فرماتے ہیں۔

اگرچہ علم قرأت حاصل نہیں اور تجوید حروف جس قدر چاہئے اور اس کا نام قرأت رکھا جائے ان کے پڑھنے میں وقت محسوس نہیں ہوتی لیکن فضل واہب العطیات سے آواز خوش اور طیبات سے لہجہ اس طرح عطا ہوا ہے کہ طیور کو سیران اور بادی کو جو یان سے باز رکھتا ہے۔ اس کا ایک ادنیٰ وصف ہے۔ جس مجلس میں اس مرد خدا نے قدم رکھا اور بارادہ قرأتِ قرآن لب ہلایا۔ اہل مجلس سراپا گوش، اور گوش سراپا ہوش ہو کر متوجہ ہو جاتے ہیں بلکہ جس وقت خاص و عام کے گوش محو یہ ہوتا ہے کہ آج اس مجلس میں اس صاحب کمال کا گزر ہوگا۔ اجتماع خلق کا ہے وہ مجلس حکم میلہ کا ہم پہنچاتی ہے اور ان کے قرآن مجید پڑھنے میں وہ اثر ہے کہ وقت اجتماع کے سامعین کو دنیا و مافیہا فراموش ہو جاتے ہیں۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء (۴۲)

حافظ محمد اسمٰعیل صاحب کی شادی محمد النساء بنت خدا بخش سے ہوئی جن سے محمد یوسف صاحب، محمد یاسین صاحب اور جناب محمد ابراہیم صاحب ہوئے۔ یہ تینوں بھائی ہمدرد و خلائق تھے عبادت وریاضت کے بعد انسانوں کی خدمت کو اپنے اوپر فرض سمجھتے تھے۔ کافی غریب اور لاوارث بچے اور بچیوں کی اپنی نگرانی میں اپنے گھروں

پر پرورش کی اور ان کی شادی بیاہ بھی خود ہی کرتے تھے یتیم خانوں کے بچوں کی دیکھ بھال کرتے تھے اور ان کے لیے کھانا پکوا کر لے جاتے تھے یتیم بچوں کو گھر پر بلا کر کھانا کھلانے کو معیوب سمجھتے تھے۔

جناب حاجی محمد یوسف صاحب دہلی کی صدیقی برادری کے با اثر لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ ان کی دیانتداری مسلمہ تھی۔ بلا کے ذہین تھے۔ نازک مسائل اور اُلجھے ہوئے جھگڑوں میں لوگ اُن سے مشورہ کرنے آتے تھے۔ مولوی کرامت اللہ صاحب مولوی محمد ابراہیم صاحب مولانا عبدالرحمٰن راسخ دہلوی اور مولانا شرف الحق صاحب سے گہرے مراسم تھے۔ انھوں نے خاموشی کے ساتھ خلافت تحریک میں بھی حصہ لیا ڈاکٹر انصاری صاحب اور حکیم اجمل خاں صاحب کے ہاں آمد و رفت رہتی تھی۔ حکیم اجمل خاں صاحب ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور بعض معاملات میں اُن سے مشورہ بھی لیتے تھے۔ خلافت تحریک میں انھوں نے بلی ماران، چوڑی والان اور جامع مسجد کے بازاروں سے ہزاروں روپے کا چندہ کرا کے دیا۔

مدارس کی بھی مالی اعانت کرتے تھے۔ مدرسہ امینیہ کی تعمیر میں کافی مالی مدد کی اور مدرسہ امینیہ کے بعض طلبہ کے وظیفے بھی مقرر کر رکھے تھے۔ بیمار ہوئے تو کافی عرصہ صاحب فراش رہے اور ۱۹۵۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔ خواجہ باقی باللہؒ میں آرام فرما ہیں۔ حاجی محمد یامین صاحب انتہائی خوش مزاج، مخیر، دوست نواز اور متواضع انسان تھے۔ ان کی فراست و دیانت مشہور تھی۔ اب بھی ان کے دیکھنے والے جب ان کا نام سنتے ہیں تو تعریف کے پل باندھ دیتے ہیں۔ ان کی دوست نوازی اور انسانی ہمدردی کے واقعات لوگوں کی زبان پر ہیں۔ حاجی یامین صاحب بھی سیاسی اور قومی کاموں میں دلچسپی لیتے تھے حکیم اجمل خاں صاحب اور ان کے خاندان کے لوگوں سے ان کے قریبی تعلقات تھے بلکہ خلافت کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ اس

وقت اُنھوں نے حکیم اجمل خاں صاحب سے تین ہزار روپے چندہ دینے کا وعدہ کر لیا
تھا۔ حالانکہ ان کے پاس اتفاق کی بات ہے اس وقت ایک پائی بھی نہ تھی۔ گھر پہنچے
تو متفکر تھے ان کی اہلیہ نے معلوم کیا کیا بات ہے کس سوچ و فکر میں ہو۔ اُنھوں نے
بہت مشکل سے بتایا تو ان کی اہلیہ نے ان کے سامنے اپنے تمام زیورات لاکر رکھ دیے
کہ یہ ایسے وقت ہی کے لئے ہوتے ہیں۔ اس میں سے جو زیور چاہو لے لو اور حکیم صاحب
کو تین ہزار روپے اس نیک تحریک کے لئے دیدو چنانچہ حاجی یاسین صاحب نے اسی
وقت کچھ زیور گروی رکھے اور تین ہزار روپے لے کر حکیم صاحب کو پہنچا دیے۔

جناب شیخ محمد ابراہیم صاحب کا دہلی کے مشہور سوداگروں میں شمار ہوتا
تھا۔ بلی ماران گلی سوداگران کی نکڑ پر اُن کی دوکان تھی۔ اس دوران میں آپ نے
جائیداد کی فروختگی کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ شہر میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے
تھے۔ سیاسی معاملات میں بھی دلچسپی لیتے تھے اور ہر ایک مسئلہ کو مسلم زاویے سے دیکھتے
تھے۔ جھوٹ سے خاندانی روایات کے مطابق سخت نفرت تھی۔ غلط بات ہرگز تسلیم
نہیں کرتے تھے۔ مقدمہ بازی میں بھی اچھی سوجھ بوجھ تھی۔ ان کی شادی ممتاز النساء
سے ہوئی جن سے وحید الدین صاحب، محمد حنیف صاحب، محمد عارف پیدا ہوئے
شیخ وحید الدین صاحب ۱۹۰۷ء میں گلی بندوق والی دہلی میں پیدا ہوئے ان پر سچ بولنے
کا اثر بہت زیادہ تھا جس کا اظہار بچپن سے شروع ہو گیا تھا۔ بھائی بہنوں میں کے
اختلاف ہو۔ یہ جو بات دیکھتے اس کو چھپاتے نہیں اور جو چھپاتا اس کی بھی پول کھول
دیتے تھے۔ اسکول اور کالج میں بھی اس کا اظہار شروع ہوا۔ ان کے ساتھی ان کی حق
گوئی سے پریشان ہوئے۔ اساتذہ بھی بچنے لگے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اُن کے
کی موجودگی میں خواہ کلاس فیلو یا ان کا اُستاد ہو محتاط رہنے لگے تھے اور کوئی خاص بات
نہیں کرتا تھا۔ وحید الدین صاحب نے دہلی کالج سے بی اے کیا اور غالباً سنہ ۱۹۲۹ء

میں دہلی کالج سے بی اے ایل ایل بی کیا پریکٹس شروع کی تو سچ بولنے اور سچے مقدمات لینے کا بھوت سوار ہوا۔ کوئی جھوٹا کیس نہیں لیتے تھے سچے کیس کی تلاش میں رہتے تھے۔ جھوٹے کیس کی شناخت بھی مشکل تھی۔ اس میں وقت لگتا تھا۔ اس صورتِ حال سے ان کے والد شیخ محمد ابراہیم اور ان کے دوست واحباب پریشان ہوئے۔ اس پریشانی میں تقریباً دو سال لگ گئے۔ بزرگوں اور دہلی کے باثر لوگوں نے سمجھایا تو کچھ دماغ میں بیٹھا اور بمشکل تمام ہر قسم کے کیس لینے لگے۔ اس ضد سے یہ ضرور فائدہ ہوا کہ دہلی کی عدالتوں، ججوں، مجسٹریٹوں کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ وحیدالدین جیسس کیس میں آتے ہیں وہ جھوٹا نہیں بلکہ سچا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس وجہ سے آپ اپنے کیسوں میں کامیاب ہونے لگے۔ موکل کو اور کیا چاہیے تھا کامیابی۔ لوگ اُن کے پاس خوشی خوشی کیس لے کر جانے لگے اور کامیاب ہو کر مسرور و شاداں ہوتے۔ چنانچہ دہلی میں ان کی بہت اچھی پریکٹس ہونے لگی اور دہلی کے مشہور و تجربہ وکلاء میں شمار ہونے لگے ہوتے ہوتے سیاسی مسائل میں دلچسپی لینے لگے۔ شروع شروع میں کچھ دنوں کے لئے کانگریس کی ترک تحریک میں حصہ لیا۔ موتی لال نہرو پیکٹ کئے، بعد میں مولانا محمد علی، شوکت علی نے کانگریس کو خیرباد کہہ دیا اور تقریباً پوری مسلم قوم نے کانگریس کو چھوڑ دیا۔ اُن حضرات میں وحیدالدین صاحب بھی تھے۔ انھوں نے کانگریس کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔

دہلی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں بلی ماران کے حلقہ سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر میونسپل کمیٹی کا الیکشن لڑا۔ کامیاب ہوئے۔ ملک تقسیم ہوا تو پاکستان آگئے۔ جج بنائے گئے۔ سچ بولنے کا خیال دل و دماغ میں پیوست ہو چکا تھا۔ بے انصافی کو پسند نہیں کیا اور اپنے پرائے کی تمیز کو اپنایا نہیں۔ کئی دوست اپنے کیس لے کر ان کے پاس گئے۔ سفارش کی۔ انھوں نے کوئی

تجربہ نہیں دی کیس میں جو پایا اس کے مطابق فیصلہ کیا۔ ریٹائرڈ ہوئے گھر پر آرام کرنے کے لئے گئے تو بیماری نے گھیر لیا۔ اس کا پامردی سے مقابلہ کیا۔ ۱۴ر اگست ۱۹۸۱ء کو دوپہر کے وقت اس دُنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اخبار جنگ کراچی ۷ر جنوری ۱۹۸۲ء

مفسرِ قرآں مولانا محمد یوسف فقیر دہلوی

مولوی محمد یوسف صاحب ۱۹۰۲ء میں دہلی ہی میں پیدا ہوئے وہ خالص دہلی والے تھے۔ ان کے اجداد ذی عزت اور خوش حال تھے۔ مولوی صاحب کے والد محترم علی محمد صاحب بمبئی میں رہنے کی وجہ سے وہ جدید خیالات کے دلدادہ تھے۔ "انگریزی تہذیب" کو قریب سے دیکھنے کا انھیں موقع ملا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا اس نئی تہذیب اور جدید تعلیم سے مستفید ہو۔ مولوی صاحب ان دنوں اینگلو عربک کالج دلی میں پڑھ رہے تھے۔ میٹرک کرنے کے بعد والد کے ایما پر پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بی اے کا امتحان دیا اور پھر بمبئی چلے گئے۔ جہاں کچھ دن قیام کے بعد وہ کلکتہ گئے۔ مولوی صاحب کے والد انھیں بمبئی میں اعلیٰ تعلیم دلاکر ولایت بھیجنا چاہتے تھے لیکن مولوی صاحب کو اپنے والد کی یہ ادا ایک آنکھ نہ بھائی اور وہ دلی واپس آگئے اپنی والدہ کی تربیت کے باعث مولوی صاحب دینی تعلیم حاصل کر کے دین وملت کی خدمت کرنا چاہتے تھے چنانچہ ۱۹۲۲ء میں وہ مظاہرالعلوم (سہارنپور) میں داخل ہوئے اور ۱۹۲۴ء تک وہاں رہ کر علمِ دین حاصل کیا۔ اس کے بعد وہ دارالعلوم دیوبند پہنچے۔ جہاں ۱۹۲۹ء میں فارغ التحصیل ہوئے اور پھر دلی آکر سبزی منڈی کی ایک مسجد میں قرآنِ مجید کی تفسیر شروع کی۔ ابھی تفسیر شروع کیے چند ہی دن ہوئے تھے کہ مولوی صاحب کے چرچے ہونے لگے۔ سبزی منڈی والے علاقہ جامع مسجد میں آکر

کہتے ہمارے ہاں جو نئے مولوی صاحب آئے ہیں کیا تفسیر بیان کرتے ہیں مسجد سے اُٹھنے کو دل نہیں چاہتا بس یہی چاہتا ہے کہ عمر بھر اسی طرح بیٹھے ہوئے قرآن کی تفسیر سُنتے رہیں۔

اُنھیں دنوں مسجد حوض والی چوڑی والان میں نماز پڑھانے کے لئے امام کی ضرورت پیش آئی۔ کچھ لوگ سبزی منڈی پہنچے۔ مولوی صاحب قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر بیان کر رہے تھے۔ اس بیان کے بعد جب مولوی صاحب مسجد سے باہر آنے لگے تو ان لوگوں نے مولوی صاحب سے درخواست کی کہ وہ مسجد حوض والی کی امامت قبول فرمائیں۔ مولوی صاحب نے کہا بھائی مجھے تفسیر شروع کئے ابھی چند ہی دن ہوئے ہیں یہاں لوگ کیا سوچیں گے۔ درخواست کرنے والوں نے اصرار کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ہم یہاں والوں کو منا لیں گے۔ چنانچہ موقعہ کے معتبر اشخاص سے مولوی صاحب نے باقاعدہ اجازت لی اور چوڑی والان آگئے۔ ۱۹۳۰ء سے مولوی صاحب نے ۱۵ دسمبر ۱۹۸۵ء تک عمر کا تمام حصہ اسی مسجد میں گزارا اور اعلیٰ سے اعلیٰ پیش کش کو ٹھکرا دیا۔

ابتدائی زمانے ہی سے مولوی صاحب کی تفسیر، وعظ اور بیان کے تذکرے ہونے لگے تھے۔ چنانچہ نواب بھاولپور نے پیغام بھیجا کہ مولوی صاحب ان کی ریاست کے قاضی بن جائیں مگر مولوی صاحب نے اسے بھی قبول نہیں کیا۔

دارالعلوم میں مولوی صاحب کا شمار ان طالب علموں میں ہوتا تھا جنہیں استاد بہت عزیز رکھتے ہیں۔ علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی نے مولوی صاحب کو فلسفہ اور منطق کا درس دیا تھا۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ انتہائی مشفق استاد تھے وہ چاہتے تھے کہ مولوی صاحب دیوبند میں رہ کر ہی طلبا کو درس دیں۔ لیکن مولوی صاحب کو دلی بہت عزیز تھی۔ مولوی صاحب کہتے تھے کہ "میاں یہاں خواجہ میر درد جیسا

عاشقِ رسولؐ ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ہیں۔ شاہ عبدالقادرؒ ہیں۔ مجھے تو انھیں بزرگوں کے قدموں میں جگہ چاہیے''۔

مولوی صاحب شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے اُردو ترجمہ کو قرآن کا مستند ترجمہ سمجھتے تھے اور تفسیر بیان کرنے سے پہلے عربی متن کے بعد شاہ صاحب کا ترجمہ پڑھ کر سُناتے تھے۔

مولوی صاحب کے لیے یہ مشہور ہے کہ ان کی طبیعت میں جلال تھا اور مزاج میں درشتی تھی۔ اچھے خاصے ذی حیثیت عمر لوگ بھی مولوی صاحب سے بات کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ مسجد حوض والی چوڑی والان کے سامنے سے گزرنے والے اکثر دیکھتے تھے کہ مولوی صاحب غصہ کے عالم میں کسی شخص کو ڈانٹ رہے ہیں تعویذ لینے والی کسی عورت کو دھتکار رہے ہیں لیکن شاید ہی کسی نے اس بات پر غور کیا ہو کہ یہ عالمِ دین، یہ عاشقِ رسولؐ جس نے تقریباً پچاس سال میں تین بار قرآن (از پارہ اول تا آخر) کی تفسیر بیان کی۔ چار حج کئے اور جسے پانچ مرتبہ خواب میں بشارت ہوئی اور آنحضرتؐ کے دیدار کی سعادت نصیب ہوئی۔ ایسے شخص کو جتنا ملنسار اور منکسر المزاج ہونا چاہیے تھا۔ اتنا سخت کیوں ہے؟ مولوی صاحب کا یہ عام رویہ تھا ان کے گھر کے افراد بیٹے اور داماد تک مولوی صاحب سے ایک خاص فاصلے سے گفتگو کرتے تھے۔

فیروزصاحب دہلوی جنھوں نے یہ مضمون حضرت مولانا صاحب کے حالات پر لکھا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

شروع شروع میں مولوی صاحب کے اس رویے سے مجھے بھی صدمہ پہنچا۔ کئی کئی دن میں ان کے پاس نہیں جاتا۔ پھر وہ کسی سے بلواتے۔ میں ان کی خدمت میں سر جھکائے حاضر ہوتا۔ سلام کے جواب کے بعد پہلا جملہ یہی ہوتا۔ میاں خیریت ہے گھر پر سب

خیریت ہے نا، کہاں رہے اتنے دن.... میں خاموش رہتا یا کبھی نہ آنے کی کوئی دوسری وجہ بتلاتا۔ مولوی صاحب بھی ہنس کر ٹال جاتے۔ چائے، کھانے کا وقت ہوتا تو کھانا، ورنہ پھر شب برات کا حلوہ یا مدینۂ منورہ سے آئی کھجوروں سے تواضع کرتے۔ دن گزرتے رہے اور میں مولوی صاحب کے اس سخت رویہ کا عادی ہو گیا۔ مولوی صاحب جو کچھ کر رہے ہیں وہ صحیح ہے۔

مولوی صاحب آج ہمارے درمیان نہیں اگر انھیں زندگی میں کسی ماہر نفسیات کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ اپنے تجزیے میں یہی بتاتا کہ یہ مولوی، یہ عالم دین یہ مفسر قرآن، یہ عاشق رسول اتنا برہم محض اس لئے ہے کہ اس نے اپنے اندر چھپے ہوئے اس شوخ، شرپر اور کھلنڈرے آدمی کو کچلا ہے جو اسے کبھی پتنگ اڑانے پر اکساتا ہے تو کبھی گلی ڈنڈا اور کرکٹ کھیلنے پر کبھی وہ اسے سینما لے جانا چاہتا ہے تو کبھی رقص و موسیقی کی محفل میں وہی آدمی اسے بار بار دھمال کرنے اور شطرنج کھیلنے پر مجبور کرتا ہے۔ بظاہر سخت اور بد دماغ نظر آنے والا یہ آدمی اپنے اندر ایک بھولے بھالے بچے کا نرم و نازک دل رکھتا ہے۔ یہ شخص مولوی اور عالم دین بن کر دنیا کی ان تمام لذتوں سے اپنا دامن جھٹکنا چاہتا ہے لیکن بچپن کی معصوم خواہشیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔

جن لوگوں کو مولوی صاحب سے قربت رہی ہے۔ وہ میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ مولوی صاحب زاہد خشک نہیں تھے ان میں جلال و جمال کی دونوں کیفیتیں پائی جاتی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اکثر جمال پر جلال غالب آجاتا۔

مولوی صاحب علم دین کے علاوہ عربی فارسی اور اردو کے منتہی تھے۔ بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ مولوی صاحب معیاری انگریزی لکھتے تھے۔ وہ انگریزی

میں بہت کم گفتگو کرتے لیکن جب کبھی انھیں انگریزی بولتے سُنا تو یہی محسوس ہوا کہ انگریزی اسے کہتے ہیں کچھ ایسی ہی قدرت انھیں پشتو پر تھی میں ایسے کئی اشخاص سے واقف ہوں جنھوں نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا اسکولوں اور کالجوں میں انگریزی میں لکھا تو مولوی صاحب کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کیا۔ دس سال پہلے مولوی صاحب کو ہندی سیکھنے کا شوق ہوا۔ فرمایا مجھے ہندی کا کوئی اچھا سا قاعدہ لا دو اور ہندی کی ایک لُغت بھی لا دو۔ میں نے مطلوبہ کتابیں فراہم کیں، دو ماہ بعد دیکھتا ہوں کہ مولوی صاحب ہندی کے ایک ضخیم ناول کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ تعجب ہوا کہ اس عمر میں اتنے جلدی مولوی صاحب نے ایسی ہندی سیکھ لی۔ اُن سے دریافت کیا کہ مولوی صاحب آپ نے کس وقت اور کس سے ہندی پڑھنا سیکھی۔ وہ مسکرائے اور پھر کہنے لگے میاں بڈھے طوطے کو کون پڑھاتا بس اُس نے سکھادی جس کے پاس اس ساری کائنات کا علم ہے۔ اور اس طرح تحصیل علم کا شوق عمر بھر رہا حساب، الجبرا جیومیٹری، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، ادب، جفر، فلسفہ منطق، اور معقول و منقول پر ان کی گہری نظر تھی جب کبھی کسی علمی مسئلہ پر گفتگو کرتے تو معلوم ہوتا کہ اُنھوں نے ساری دُنیا کا علم چاٹ رکھا ہے۔

رمضان المبارک اور عیدین کے موقع پر دہلی میں چاند کی رویت کے لیے کمیٹیاں بیٹھتی تھیں اور ۲۹ تاریخ کو کمیٹی کے اراکین چشم دید گواہوں کے منتظر رہتے تھے۔ دہلی میں اکثر ایسا ہوا کہ مطلع ابر آلود ہونے کے باعث چاند نظر نہ آیا۔ رات گئے شہادتیں ملیں کہ چاند ہو گیا لیکن مولوی صاحب عام طور پر ہفتہ بھر قبل ہی بتا دیتے تھے کہ ۲۹ یا ۳۰ کا چاند ہوگا۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی ان کی پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی ہو۔ چند سال پیشتر رمضان المبارک کے آخری ایام میں مولوی

صاحب نے کہا کہ ۲۹ر کا چاند ہوگا۔ ۲۹ر شب میں چاند نظر نہ آیا لوگوں نے روزہ رکھ لیا۔ صبح نماز فجر کے بعد مولوی صاحب سے چاند نہ ہونے کا تذکرہ ہوا۔ مولوی صاحب بولے۔ میاں مانو یا نہ مانو چاند تو ہوگیا۔ اب رویت ہلال کمیٹی نے فیصلہ نہیں کیا تو میں کیا کروں۔ بھائی کمیٹی کے چشم دید گواہوں کے بیان پر فیصلہ دیتی ہے کوئی شہادت پہنچی نہیں۔ وہ لوگ خود فیصلہ کر نہیں سکتے تھے اور ایسا ہی ہوا کہ چند گھنٹے بعد جامع مسجد دلی سے گولے داغے گئے اور اعلان ہوا کہ معتبر شہادتوں سے ابھی ابھی معلوم ہوا کہ کل رات چاند نظر آیا تھا اس لئے آج روزہ نہیں ہوگا جن لوگوں نے روزہ رکھ لیا ہے وہ افطار کرلیں۔ مولوی صاحب نے اسی وقت نماز عید کا اعلان کیا۔ ان کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنی مسجد میں سب سے پہلے عیدین کی نماز پڑھاتے تھے۔ جامع مسجد اور دوسری مسجدوں میں نماز ہوتی تھی۔ مولوی صاحب مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ذکر بڑے احترام اور عقیدت سے کرتے تھے۔ مولوی صاحب کے گلے میں ایک تعویذ پڑا رہتا تھا جو بہت کم نظر آتا تھا۔ مولوی صاحب اس تعویذ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس تعویذ کے متعلق مولوی صاحب نے کبھی کسی کو نہیں بتایا۔ مولوی صاحب کے بڑے صاحبزادے مولانا خورشید عالم اور داماد حافظ سید فضل الرحمٰن کا بیان ہے کہ یہ مولانا تھانویؒ کا عطیہ تھا۔ یہ دائرہ والا تعویذ ہے جس کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ جب تک یہ گلے میں رہتا ہے جسم سے رُوح پرواز نہیں کرتی چنانچہ زندگی بھر جس تعویذ کی حفاظت مولوی صاحب نے جان سے زیادہ کی اس تعویذ کے متعلق انتقال سے چند دن پہلے فرمایا کہ اسے کاٹ دو، اور اسے بہت دُور لے جاؤ۔ چنانچہ مولوی صاحب کی صاحبزادی نے اپنے والد ماجد کے حکم پر قینچی سے اس کا ڈورا کاٹ کر گردن سے الگ کیا۔ جس روز یہ تعویذ علیحدہ کیا گیا اس کے بعد ہی سے مولوی صاحب کی حالت خراب ہونے لگی۔ ایک روز پہلے جب ڈاکٹر نے معائنہ کیا بلڈ پریشر دیکھا، پیشاب ٹیسٹ

کیا تو اتنا کہا کہ "مولوی صاحب ہر طرح صحت مند ہیں۔ بس نہ کھانے کی وجہ سے جسم کمزور ہو گیا ہے"۔ ۱۱ جنوری کو جب مولوی صاحب پر غشی طاری ہوئی تو انھیں ہندوراؤ ہسپتال لے گئے۔ وہاں چیک اپ ہوا۔ ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ مولوی صاحب نے ۲۸ روز تک کچھ کھایا پیا نہیں ہے۔ اس لئے اتنے لاغر ہو گئے ہیں۔ سید فضل الرحمٰن صاحب نے ایک ڈاکٹر کے حوالے سے کہا کہ جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب نے اتنے دن سے کچھ بھی نہیں کھایا پیا تو اُسے بہت تعجب ہوا کہ اتنے دن بغیر کھائے پیئے مولوی صاحب زندہ کیسے رہے۔ ڈاکٹر کو بتایا گیا کہ مولوی صاحب عام آدمی نہیں۔ عالم دین ہیں تو اس کا سر عقیدت سے جھک گیا۔ اور اس نے کہا کہ اپنی روحانیت کی وجہ سے ہی یہ اتنے دن زندہ رہے۔

مشہور احراری لیڈر عطا اللہ شاہ بخاری سے مولوی صاحب کو خاص عقیدت تھی۔ انھیں کی قیادت میں مولوی صاحب نے تحریکِ آزادی میں حصہ لیا۔ بخاری صاحب بھی انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انھیں آل انڈیا احرار کا پریذیڈنٹ بنایا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد مولوی صاحب کو کسی نے سیاسی پلیٹ فارم سے تقریر کرتے نہیں دیکھا۔ کانگریس اور دوسری جماعتوں کے سربرآوردہ لوگوں نے مولوی صاحب کو الیکشن کے دنوں میں اسٹیج پر لانے کی کوشش کی لیکن مولوی صاحب نے انھیں سختی سے منع کر دیا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مولوی صاحب سیاست سے متنفر تھے۔ انھوں نے ایک عام جمہوری شہری کی طرح اپنے ووٹ کا استعمال کیا۔ انھوں نے کب اور کس کو ووٹ دیا۔ یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ البتہ مولوی صاحب اتنا ضرور کہتے کہ میں اسی شخص کو ووٹ دوں گا جو تمام اُمیدواروں میں بہتر ہو گا۔ اس بہتر اُمیدوار کا معیار دیگر ان مولوی صاحب کے نزدیک محض "ایمانداری" اور

دیانت داری" تھا۔ مولوی صاحب کہا کرتے تھے جو شخص ایماندار اور دیانتدار نہیں وہ کبھی اچھا کونسلر یا لیڈر نہیں بن سکتا۔ مولوی صاحب خود بھی امین تھے اور دوسروں کو بھی رزق حلال اور دیانتداری کی تلقین کرتے تھے۔ میں ذاتی طور پر اس بات سے بخوبی واقف ہوں کہ ہر سال مولوی صاحب کے عقیدت مند ہزاروں روپے زکوٰۃ وخیرات کے بھیجتے تھے کہ وہ ضرورتمندوں تک پہنچا دیں مولوی صاحب کے پاس بڑی بڑی رقمیں بطور امانت رکھی جاتی تھیں۔ کبھی کسی نے یہ نہیں سُنا کہ مولوی صاحب نے کسی کا پیسہ ادھر سے اُدھر کیا ہے جس نے جتنا بھیجا مولوی صاحب نے پائی پائی کا حساب اپنے پاس رکھا۔ دہلی کے مسلمانوں میں گزشتہ تیس سالوں میں مجھے ایسی کوئی شخصیت نہیں نظر آئی جس پر لوگ اتنا اعتبار اور بھروسہ کرتے ہوں۔

مولوی صاحب دہلی کی پولی ٹولی کے خوش بیان واعظ تھے۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۸۴ء تک مولوی صاحب کا یہ معمول رہا کہ وہ رمضان المبارک کے مہینے میں دہلی کے گلی کوچے میں صبح اور رات کو بیان کرتے تھے۔ ابتدا میں مولوی صاحب ربیع الاول کے مہینہ میں پہلی تاریخ سے ۱۲ تاریخ تک سیرت کا بیان کرتے تھے۔ بعد ازاں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ شب قدر میں مولوی صاحب کا بیان سننے کے لائق ہوتا تھا۔ وہ لوگ جو سال بھر اِدھر اُدھر بھٹکتے پھرتے تھے وہ بھی رات کو مولوی صاحب کا بیان سننے آتے تھے۔ ایسے نہ جانے کتنے لوگوں کو میں نے اس رات زار وقطار روتے دیکھا ہے۔

مولوی صاحب نے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۶ء تک دہلی کی مشہور دینی درسگاہ مدرسہ امینیہ میں درس دیا۔ اور مفتی کفایت اللہ صاحب کی ہدایت پر فتوے لکھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام کے نظام وراثت کو صحیح طور پر پڑھانے والے اپنے دور میں صرف مولوی صاحب ہی تھے۔ یہ انتہائی پیچیدہ درس ہے اور اس کے لئے

حساب و ریاضی کا وسیع مطالعہ چاہیئے۔ اپنی اسی حساب دانی کے باعث مولوی صاحب نے سو سال کا ایک ایسا کلنڈر تیار کیا تھا جس سے عیسوی سنہ کے ساتھ ہجری ماہ و سال کی تاریخ بھی بآسانی نکالی جا سکتی تھی۔

مولوی صاحب نرے مولوی صاحب نہیں تھے۔ وہ ادب کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ اور ان کا تخلص فقیر تھا۔ مولوی صاحب کی شعری تخلیقات حمد، نعت اور غزل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذوقِ شعری کس قدر بلند تھا۔ جگر مرادآبادی اور مولوی صاحب نے ایک مرتبہ ساتھ ساتھ حج کیا۔ مکہ معظمہ میں دوران قیام مولوی صاحب نے ایک غزل جگر صاحب کی خدمت میں بہ طور اصلاح پیش کی۔ جگر صاحب نے پہلے تو غزل دیکھنے سے انکار کیا جب مولوی صاحب کا اصرار بڑھا تو انھوں نے غزل پڑھی اور پھر مودبانہ انداز میں کھڑے ہو گئے۔ مولوی صاحب میں اور آپ کی غزل پر اصلاح۔ مجھ سے یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ آپ تو تلامیذ الرحمٰن ہیں۔ آپ کو اصلاح کی ضرورت نہیں۔ پھر مولوی صاحب نے اپنا کلام کسی کو نہیں دکھایا۔ البتہ دلّی والوں نے انھیں رسا کے ان مشاعروں میں جو وہ اپنے استاد بیخود دہلوی صاحب کی یاد میں منعقد کیا کرتے تھے، مشاعرے کے صدر کی حیثیت سے کلام پڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس کے علاوہ وہ کبھی کسی مشاعرے میں شریک نہیں ہوئے۔

مجھے مولوی صاحب کی نثر اور نظم دونوں ہی دیکھنے اور پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے میں بلا جھجک یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ مولوی صاحب نے جس قدر بیان کیا ہے اس کا چوتھائی حصہ بھی اگر وہ لکھ دیتے تو ان کا شمار اس عہد کے صفِ اوّل کے نثر نگاروں میں ہوتا۔ کم لفظوں میں بہت بڑی بات کہہ جانا مولوی صاحب کے لئے معمولی بات تھی۔ تاریخ گوئی میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔ انھوں نے نثری اور منظوم بہت سی تاریخیں

نکالی ہیں۔ دسمبر ۸۵ء کے پہلے ہفتہ میں مولوی صاحب نے اپنی تاریخ وفات خود نکالی۔
"عفرالحکیم فقیرۃ العاصی" اس عبارت سے ۱۹۸۶ء برآمد ہوتے ہیں گویا مولوی صاحب
کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ دنیا میں ان کے قیام کے دن پورے ہو چکے ہیں چنانچہ ۱۵
دسمبر ۸۵ء کو وہ مسجد کا حجرا چھوڑ کر اپنے منجھلے داماد سید فضل الرحمٰن صاحب کے گھر
آگئے۔ مولوی صاحب نے چند مختصر سے مذہبی اور دینی رسالے لکھے ہیں صفحات
کی تعداد کے اعتبار سے ان تحریروں کا شمار کتابچوں میں ہوگا لیکن اپنی قدر و قیمت
کے اعتبار سے یہ کتابچے بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہیں۔ یہ رسالے مولوی صاحب نے
خود ہی شائع کئے تھے۔ انھوں نے ۱۹۵۵ء میں ایک ادارہ انجمن محبان القرآن قائم کیا تھا
اس سے پہلے مخزن ادب کے نام سے ایک اشاعتی ادارے کی بنیاد رکھی تھی لیکن انجمن
محبان القرآن قائم کرنے کے بعد اس ادارے کو مولوی صاحب خود ہی بھول گئے تو دوسرے
لوگ کیا یاد رکھتے۔

رات کا ایک بج رہا ہے اور میں مولوی صاحب کی "چند یادیں کچھ باتیں" لکھ
رہا ہوں۔ جو لکھنا چاہتا ہوں وہ لکھا نہیں جاتا۔ لفظ ساتھ نہیں دے رہے ہیں بس ایک
منظر ہے جو بار بار آنکھوں کے سامنے آرہا ہے۔ مولوی صاحب تو مردم بیزار تھے۔ گوشہ
نشین تھے۔ اکیلے رہتے تھے عورت ہو یا مرد ان کے قریب جاتے ہوئے کانپتے
تھے پھر یہ ہزاروں انسانوں کا سیلاب مولوی صاحب کے آخری سفر میں کندھا دینے کے
لئے اتنا بے قرار کیوں ہے؟

میرے سامنے دلی کے میئر مہندر سنگھ ساتھی کھڑے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ
اسٹینڈنگ کمیٹی کے دوسرے ممبران اور کارپوریشن کے افسران بھی ہیں۔ مولوی صاحب
تو سیاسی آدمی نہیں تھے۔ ان کا تو کارپوریشن سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ زندگی میں
کبھی کارپوریشن سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ زندگی میں شاید ہی کبھی وہ کارپوریشن

کی عبادت میں گئے ہوں۔ پھر یہ لوگ کیوں آئے۔

سید فضل الرحمٰن صاحب بتاتے ہیں۔ آج کارپوریشن کی اسٹینڈنگ کمیٹی کی بہت اہم میٹنگ تھی۔ مالی سال کے آخری دن ہیں۔ آئندہ چند دنوں میں جو پیسہ خرچ کرنا ہے اسی سے متعلق یہ میٹنگ تھی۔ میں اسٹینڈنگ کمیٹی کا ممبر ہوں اس لئے صبح فون کیا کہ محمد یوسف صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔ اس لئے میٹنگ میں شریک نہیں ہوں گا۔ میرے وہاں نہ ہونے سے میٹنگ پر کوئی اثر نہیں پڑتا مگر مولوی صاحب کا نام سنتے ہی یہ میٹنگ آئندہ کے لئے ملتوی کر دی گئی۔ مولوی صاحب ایسے ہی تھے۔ آج کی مادی خود غرض دنیا میں ہر شخص کے ان گنت چہرے ہیں مگر مولوی صاحب کا ایک ہی چہرہ تھا۔ شاید انھیں بھی اس کا احساس ہو گیا تھا اس لئے اس سے پیشتر کہ لوگ اس ہر چہرے کو بغور دیکھیں انھوں نے ہمیشہ کے لئے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اور تاکید کی کہ مرنے کے بعد ان کا چہرہ کسی کو نہ دکھایا جائے گھر کے کسی فرد کو بھی چنانچہ غسل کے بعد مولوی صاحب کا چہرہ کسی نے نہیں دیکھا۔ مولوی صاحب کی خواہش تھی کہ ان کی آخری آرام گاہ مدینہ میں ہو یا پھر مہندیان میں محدث دہلویؒ کے پائنتی۔ بیس سال پہلے انھوں نے محدث دہلویؒ کے مزار مبارک کے پائنتی اپنے لئے جگہ تجویز کر کے سرداب بنوا دیا تھا اور کہا تھا کسی وجہ سے یہ جگہ میسر نہ آئے تو مجھے گٹھری بنا کر ان بزرگان دین کے قدموں میں ڈال دینا۔" مولوی صاحب کی آخری خواہش بھی پوری ہوئی۔

کاش مولوی صاحب ابھی چند دن اور زندہ رہتے مگر کیوں۔ مولوی صاحب نے تو خود ہی کہا تھا ع

نہ یہ گلشن رہے گا اور نہ اس کا رنگ و بو باقی
فنا ہے ذرے ذرے کو رہے گا تو ہی تو باقی

فیروز دہلوی صاحب

جنھوں نے

حضرت مولانا محمد یوسف مفسر دہلوی کے حالاتِ زندگی پران کی وفات کے بعد سب سے پہلے مضمون قومی آواز دہلی مورخہ ۲۱ جنوری ۱۹۸۶ء میں تحریر کیا تھا۔ مولانا صاحب سے اپنے تعلق کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میرے دادا مولانا صاحب کے پاس مجھ کو لائے۔ مولوی صاحب کے زیرِ سایہ تعلیم و تربیت کے لئے انھوں نے مدرسہ کریمیہ میں تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے علیحدہ ہونے کے بعد مولانا سے ان کا تعلق قائم رہا۔ اسی مضمون میں انھوں نے اس پر بھی حسبِ ذیل روشنی ڈالی ہے۔

۱۹ جنوری ۱۹۸۶ء علی الصباح بیدار ہوتے ہی سب سے پہلے جو خبر سُنی وہ یہ تھی کہ رات ایک بجے "مولوی صاحب" کا انتقال ہوگیا۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلیہِ راجعون۔

کون مولوی صاحب؟ دلی جیسے لاکھوں کی آبادی والے شہر میں اَن گنت مولوی اور مولانا ہیں۔ مگر آج دلی میں "مولوی صاحب" کہنے والے کی مراد صرف اس شخص سے ہوتی تھی جو ان بے شمار مولویوں اور مولاناؤں میں سب سے مختلف اور سب سے الگ تھلگ تھا۔ ایسا کون سا دلی والا ہوگا جس نے "مفسرِ قرآن مولوی محمد یوسف" کا نام نامی نہ سُنا ہوگا ــــــ مولوی صاحب تو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے لیکن اپنے پیچھے ان سینکڑوں ہزاروں سوگوار و غمزدہ معتقدین کو چھوڑ گئے جو مولوی صاحب کی تفسیر، وعظ اور سیرتِ رسولؐ کا بیان سُننے کے لئے اپنی تمام تر مصروفیات ایک طرف اُٹھا کر رکھ دیتے تھے۔ وہ لوگ جن کے لئے مولوی صاحب "دور کا جلوہ" تھے اور جنھوں نے ان کے علم و فضل کی تعریفیں غائبانہ سُنیں وہ آج اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ان کے درمیان سے کون اُٹھ گیا۔ دلی والوں اور بالخصوص مسلمانوں کو چند دن بعد ہی معلوم ہوگا کہ مولوی صاحب کا دم کتنا غنیمت تھا۔

مئی ۱۹۵۶ء کی ایک شام تھی جب میں نے مولوی صاحب کو پہلی بار قریب سے دیکھا۔ میرے دادا حافظ محمد یوسف صاحب (مرحوم) مجھے مولوی صاحب کی خدمت

میں لے گئے تھے۔رسمی گفتگو کے بعد مولوی صاحب نے پوچھا! حافظ صاحب آج کیسے زحمت کی ہ۔دادا نے کہا مولوی صاحب! یہ میرا پوتا ہے میں چاہتا ہوں اس کی تعلیم وتربیت آپ ہی کے سایہ میں ہو۔مولوی صاحب نے نہایت انکساری سے جواب دیا۔ حافظ صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں۔آپ کے صاحبزادے اور میں تقریباً ہم عمر ہیں۔یہ آپ کا پوتا میرا بھتیجا ٹھہرا۔آپ سے بہتر کون تربیت دے گا لیکن دادا نے مولوی صاحب کی ایک نہ سنی اور چلتے چلتے کہہ دیا۔"کل صبح سے یہ آجائے گا۔بہتر ہے آپ کل کریمیہ میں بھیج دیں"۔مولوی صاحب نے اس مختصر سے جملے میں اپنی بات ختم کر دی۔اور ہم رخصت ہو کر گھر آگئے۔اگلی صبح مدرسہ کریمیہ چوڑی والاں پہنچے مولوی صاحب مدرسہ کے دفتر میں بیٹھے مدرسہ میں داخل ہونے کے خواہش مند بچوں کا امتحان لے رہے تھے۔امتحان سے فارغ ہونے کے بعد مولوی صاحب نے خود ہی داخلے کا فارم بھرا۔مولوی صاحب مدرسہ کریمیہ کے پرنسپل تھے۔یہ مدرسہ کریم احمد جوہری (مرحوم) کی یاد میں ۱۹۴۳ء میں قائم ہوا تھا۔مولوی صاحب ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۷ء تک مدرسہ کے پرنسپل رہے۔وہ جب تک اس عہدہ پر برقرار رہے مدرسہ نے ترقی کی۔دلی کے مسلمان رؤسا، اور شرفا اپنے بچوں کو یہاں داخل کرانا قابل فخر سمجھتے تھے۔ مدرسہ میں صرف پانچ درجے تھے اور دنیاوی علوم کے ساتھ دینی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔میرا داخلہ پانچویں کلاس میں ہوا تھا اس لئے صرف گیارہ مہینے یہاں پڑھنے کے بعد اگلے سال مولوی صاحب کے مشورہ پر اینگلو عربک ہائر سکنڈری اسکول میں داخل ہو گیا۔اینگلو عربک اسکول پہنچنے کے بعد مولوی صاحب سے تعلیم و تربیت کا رشتہ ٹوٹ جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔مئی ۱۹۵۶ء سے مولوی صاحب کے انتقال تک تقریباً تیس سال کا طویل عرصہ مولوی صاحب کی قربت اور شفقت میں گزرا۔ان تیس برسوں میں مولوی صاحب کو جس طرح دیکھا، سمجھا ان سے جو کچھ حاصل

کیا اس کا ایک ہلکا سا خاکہ اس مختصر سے سوانحی مضمون میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے چند صفحات میں ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔ میں نے مولوی صاحب کو جس عالم اور جس کیفیت میں دیکھا وہ سب یادداشت میں محفوظ ہے۔ (انشاء اللہ جلد ہی ان تمام واقعات اور مولوی صاحب کی شخصیت و کردار کی دھوپ چھاؤں کو سپرد قلم کروں گا۔ تاکہ وہ لوگ جنہوں نے مولوی صاحب کی دور سے صرف ایک جھلک بھی تھی جان لیں کہ مولوی صاحب کیا تھے . . . .)

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی خواہش تھی کہ عورتیں قرآن مجید ڈھنگ سے پڑھیں۔ ان کی ادائیگی اور اخراج درست ہوں۔ وہ اپنے وعظوں میں عورتوں کو پڑھانے کے لیے ذکر کیا کرتے تھے لیکن عورتیں توجہ نہیں دیتی تھیں۔ نے اس کام کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس طرح وہ میری اہلیہ صابرہ خاتون

صابرہ خاتون گھر پر عرصہ سے لڑکیوں کو قرآن مجید پڑھاتی ہیں۔ ایک روز ایک عورت گھر پر آئی اس نے بچیوں کو قرآن مجید پڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس نے غلطیاں نکالیں اور صابرہ خاتون سے کہا کہ ادائیگی درست کراؤ۔ یہ بات اس عورت کی ان کے دل میں بیٹھ گئی۔ اسی اثنا میں یہ حج کو گئیں، جہاز میں قرآن مجید پڑھ رہی تھیں۔ چند عورتیں سن رہی تھیں انہوں نے ان سے یہی کہا کہ اپنی ادائیگی اور اخراج درست کراؤ۔ ان کو اس وقت اس عورت کی بات یاد آ گئی۔ اس فکر میں لگ گئیں کہ قرآن مجید صحیح ڈھنگ سے کس سے پڑھوں۔ ایک مرتبہ آپا کنیزہ نے صابرہ خاتون سے کہا کہ تم میرا قرآن مجید سن لیا کرو۔ انہوں نے سوچا کہ میں خود غلط پڑھتی ہوں تو ان کے لیے کیا مفید ثابت ہوں گی۔

اسی اثنا میں چھوٹی دلہن احمدی بی صاحبہ ایک روز صابرہ خاتون سے ملنے آئیں

انھوں نے خود ذکر نکالا کہ مولانا یوسف صاحب اپنے وعظ میں بار بار کہتے ہیں کہ قرآن مجید پڑھنا سیکھ لو ہم توجہ نہیں دیتیں۔ یہ بات سُن کر صابرہ خاتون نے آپا کنیزہ سے ذکر کیا۔ فاطمہ اور دوسری عورتوں سے بھی ذکر آیا چنانچہ حسب ذیل پندرہ عورتیں تیار ہوگئیں۔

(۱) صابرہ خاتون زوجہ امداد صابری (۲) آمنت لبصیر زوجہ حاجی نبی احمد (۳) فاطمہ زوجہ محمد سعید عرف بابو (۴) رحمت بی زوجہ حاجی نواب الدین (۵) کنیزہ زوجہ شیخ رضی الدین (۶) شکیلہ بیگم زوجہ چودھری اشفاق احمد (۷) احمدبی سرفراز۔ (۸) مخدومہ بنت حاجی محمد مسلم (۹) کنیز فاطمہ زوجہ عارف الٰہی (۱۰) شفیق فاطمہ (۱۱) شابانہ بنت حاجی نبی احمد (۱۲) آپا بیگم زوجہ محمد اسحاق (۱۳) احمدبی زوجہ محمد ابراہیم۔ (۱۴) سکینہ زوجہ محمد عمر (۱۵) سترت جہاں زوجہ شاکر الاسلام۔

حضرت مولوی محمد یوسف صاحب کو جب صابرہ خاتون نے لکھ کر بھیجا کہ ہم پندرہ عورتیں آپ سے قرآن مجید پڑھنا چاہتی ہیں تو مولانا صاحب نے فوراً منظوری دیدی۔

اب سوال تھا جگہ کا۔ پندرہ عورتوں میں مشورہ ہوا تو اہلیہ حاجی نبی احمد صاحب نے کہا کہ میرا مکان حاضر ہے۔ مولانا یہاں آکر پڑھا دیں۔ مولوی صاحب کو جگہ کے متعلق لکھا تو انھوں نے ظہر کے بعد ڈیڑھ بجے کا ٹائم دیا۔ ایک گھنٹے کا۔ جس کی منظوری کے بارے میں مولوی صاحب نے صابرہ خاتون کو یہ پرچہ تحریر کیا:۔

محترمہ صابرہ خاتون صابرہ سلمہا۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

دن چھوٹا ہونے کی وجہ سے میرے لئے بہت زیادہ تنگی کا باعث ہے لیکن اگر مستورات کے لئے بعد عشاء مناسب ہے تو پھر ظہر ہی کا وقت رکھ لیجئے۔

لیکن تاکید کر دیجئے کہ میرے ہاں ایک بجے اذان ہوگی ہے تمام مستورات ڈیڑھ بجے تک آجائیں تاکہ میں پونے تین بجے تک فارغ ہو جاؤں۔ جگہ کونسی رہے گی کون کون

شریک ہوگا اور قرآن مجید دہرانے کے علاوہ کیا پڑھنا ہے۔
سبق انشاء اللہ تعالیٰ بدھ ۲۲ دسمبر سے شروع ہوگا

فقیر۔۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء

یہ پندرہ عورتیں وقت مقررہ پر حاجی نبی احمد صاحب کے مکان میں پہنچ گئیں تو پہلے روز حرفوں کی اصلاح کرائی اور کہا کل جب آؤ تو ایک لال پن، ایک کاپی اور ایک قاعدہ بغدادی لانا۔ جب دوسرے روز یہ عورتیں پہنچیں تو مولوی صاحب نے ابا تا ثا ناما کا پورا سبق دیا تو سب عورتیں ایک دوسری کی شکل دیکھنے لگیں مولوی صاحب کی رعب کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکیں ایک ہفتہ میں قاعدہ ختم ہوا۔ قرآن مجید لگا تو مولانا صاحب نے تجوید کے قواعد لکھوانے شروع کئے اور اس کے مطابق پڑھائی شروع کی ان عورتوں کو فکر ہوئی کہ ہمارے پاس تو یہ قواعد نہیں ہیں۔ وہ حاصل کیسے کیا جائیں تو نواب ہاشمی صاحب آپا کنیزہ کے داماد نے حضرت مولانا اشرف علی صاحب کی کتاب جمال القرآن پندرہ عدد لا کر دی۔ مولوی صاحب جو سبق دیتے مخدومہ صابرہ خاتون وغیرہ لکھ لیا کرتیں۔ جب مولانا صاحب پڑھا کر چلے جاتے تو یہ پندرہ عورتیں ایک گروہ ہو کر بیٹھ جاتیں اور قواعد کو سمجھتیں جن میں ان کو رات تک فرصت نہ ملتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک دو ایسی بھی تھیں کہ جو اس وقت نہ سمجھ سکیں تو صابرہ خاتون کے ساتھ گھر پر آ کر سمجھ لیتیں۔ بڑے شوق اور محنت کے ساتھ ان عورتوں نے چار مہینے میں قرآن مجید ختم کیا۔ جب کبھی مولوی صاحب بہت تھک جاتے اور پڑھانے نہ آتے تو اس دن کی مشق کرانا صابرہ خاتون کے ذمہ کر دیتے تھے چنانچہ ایک روز مولوی صاحب بہت تھک گئے تھے تو ان کو پڑھانے کے لئے نہیں آنا تھا۔ تو مولوی صاحب کو پڑھانے کے سلسلہ میں صابرہ خاتون پر اعتماد تھا

اس لئے آپ نے صابرہ خاتون کو حسب ذیل پرچہ لکھا بڑا پ

آج میری جگہ مشق کرادیں۔

محترمہ صابرہ خاتون صاحبہ سلمہا۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

رات کے تین بجے کا اُٹھا ہوا ہوں اب ۹½ بجے قرآن مجید کے ختم سے آیا ہوں وہاں کے لوگوں کے بے حد اصرار سے دوپہر کے کھانے پر بلایا ہے میں نے انکار کرتے کرتے حد کر دی مگر کوئی نہیں مانا۔ پھر حکیم (محمد شریف) صاحب نے فرمایا کہ میرے لڑکے کے دواخانہ کا افتتاح ہے۔ عصر کی نماز سید رفاعی کی مسجد میں پڑھنا۔ پھر حاجی عبدالحکیم صاحب نے کہا کہ مغرب کھانے کے لئے میرے ہاں آنا۔ ضروری ہے دوپہر کوئی ملاوں کی دعوت ہے نہ معلوم کب فرصت ہو اس لئے آج تو آپ ہی سب کو مشق کرادیجئے۔ میں تو تھک کر چور چور ہو رہا ہوں۔

تقیر ۷۲ - ۹ - ۱۰

مولوی صاحب ان عورتوں کو پڑھانے میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔ کسی پڑھنے والی کی تعریف بے جا نہیں کی تاکہ دوسری عورتیں بُرا نہ مانیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ ان عورتوں میں قواعد کو جلدی سمجھنے والی اور سمجھانے والی صابرہ خاتون ہیں اور یہ سب عورتیں ان کی عزت کرتی ہیں اور ان کی فہم و فراست کو تسلیم کرتی ہیں اس کے باوجود ان کی کبھی تعریف نہیں کی۔ جب قرآن مجید کے ختم کرانے کا وقت آیا تو اس میں مولوی صاحب نے قرعہ اندازی کی جس کے نام آٹھ نمبر کی پرچی آجائے گی اس سے ختم کرایا جائے گا قرعہ اندازی ہوئی تو خدا کی شان دیکھئے، صابرہ خاتون کا ہی نام آیا چنانچہ آپ نے اپنی احتیاط اور قرعہ اندازی کا ذکر صابری خاتون کے نام کی حسب ذیل چٹھی میں کیا ہے

محترمہ صابرہ خاتون صاحبہ سلمہا۔ السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی جماعت کی "شرکار" کے متعلق میں نے ختم سے پہلے جو بات لکھی تھی اس کے

متعلق مجھے بے حد تردد ہے۔ آخر مجھے معلوم تو ہو کہ میری طرف سے کیا بے اعتدالی ہوتی ہے، مجھے افسوس ہے کہ میں جس قدر احتیاط کرتا ہوں اس کا نتیجہ برعکس ظاہر ہوتا ہے اس مرض کو دور کرنے کے لئے سب جانتی ہیں کہ میں نے آج تک ہر اچھا پڑھنے والی کی تعریف کی ہے لیکن آپ کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا محض اس لئے کہ کسی کو شکایت نہ ہو کہ مولوی صاحب جاؤ بے جا صابرہ خاتون کی تعریف کرتے ہیں۔ حالانکہ میرا دیانتداری کے ساتھ اعتقاد ہے کہ قرأت کے سلسلہ میں میں نے جن باتوں کی ہدایت کی ہے ان پر سب سے زیادہ آپ عمل کرتی ہیں۔ آپ کے پڑھنے پر قلب کو خوشی ہوتی ہے کہ میری محنت وصول ہوگئی۔

آج ہی کے واقعہ پر غور کیجئے کہ ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ قرآن مجید ختم کرنے پر دلوں میں کدورت نہ پیدا ہو۔ اس لئے میں نے قرعہ اندازی کا طریقہ نکالا کیا۔ اب اگر قدرت ہی کو یہ منظور ہو کہ صابرہ خاتون اور ساری کے ہاتھ میں وہ پرچی آ جائے تو اس میں میرا کیا دخل ہے۔ میں نے نہ صابرہ خاتون کو اشارہ بتلایا نہ کوئی علامت اس پرچی پر لگائی۔

کنیز فاطمہ کے شریک نہ ہونے کا مجھ کو بے حد رنج ہے کیونکہ ان کے پڑھنے سے میری روح خوش ہوتی ہے اب اگر وہ شرعی عذر کی وجہ سے شریک نہ ہو سکیں۔ تب تو خیر۔ اگر میری طرف سے بدگمانی ہے تو میرے لئے یہ بات بہت زیادہ رنج و قلق کا باعث ہے۔

میں اپنی عادت اور کم سخنی کے خلاف جس اہتمام سے آپ لوگوں کی خدمت کرتا ہوں میرا دل چاہتا ہے کہ مجھ سے پڑھنے والیاں شیر و شکر سگی بہنوں کی طرح رہیں۔ ورنہ میری محنت کا کچھ بھی حاصل نہیں۔ ان شریک نہ ہونے والیوں کو جو شکایت ہو وہ خفیہ طور پر مجھ تک پہنچائیں میں حتی المقدور بدمزگی دور

لینے کی کوشش کروں گا۔

فقیر محمد یوسف الدہلوی ۷۲-۸-۲۵

ان ہی دنوں میں حاجی نبی احمد صاحب کے یہاں کسی کی شادی کی تیاری شروع ہو گئی جس کے سلسلہ میں گھر میں سفیدی کرائی تھی۔ اس لئے گھر کی تبدیلی کی گئی۔ حاجی نعیم الدین صاحب کا مکان چھتہ حاجی یوسف گلی حکیم جی والی محلہ چوڑی والا (۱) تجویز کیا گیا جس کی اطلاع صابرہ خاتون نے ۱۸ر نومبر ۱۹۷۲ء کو حضرت شاہ مولوی محمد یوسف دہلوی کو حسب ذیل پرچہ کے ذریعہ دی۔

محترم المقام حضرت مولانا صاحب۔ السلام علیکم

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا آپ کب تشریف لا رہے ہیں پڑھانے کے لئے دن مقرر کر کے آپ بتا دیں۔ تو ہم سب کو اطلاع کر دیں۔ حاجی نبی احمد صاحب کے ہاں شادی ہے اس لئے کہ ان کے ہاں سفیدی وغیرہ کا مسئلہ ہے اس وجہ سے پڑھنے کا انتظام حاجی نعیم الدین صاحب کے مکان پر ہوگا۔

صابرہ - ۱۸ر نومبر ۱۹۷۲ء

جس کا جواب حضرت مولوی محمد یوسف صاحب نے اسی پرچہ کی پشت پر تحریر فرمایا۔

عزیزہ محترمہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

میں باتوں میں مشغول تھا کوئی بچہ یہ پرچہ دے گیا میں اس بچے کو پہچانتا نہیں۔ غالباً یہ آپ کا پرچہ ہے پڑھائی کے متعلق تو کوئی تردد نہیں۔ سب سے بڑا تو بڑھاپا ہے مگر خیر کام تو کرنا ہی ہے۔

مجھے سب سے زیادہ دشواری وقت کے متعلق پیش آرہی ہے ظہر اور عصر کے درمیان کا وقت میرے لئے مشکل ہو رہا ہے باقی چوبیس گھنٹوں میں جو وقت بھی آپ سب مل کر مقرر کرلیں تو جب جی چاہے شروع کر لیجئے۔ فقیر - ۲۱ر نومبر ۱۹۷۲ء

غرض پرچوں کے ذریعے ظہر کی نماز کے بعد کا ایک گھنٹہ اور حاجی نعیم الدین صاحب کا مکان تجویز ہوا جہاں دوسرے گروپ نے ادھوری تعلیم جو ختم ہونے والی تھی شروع کی۔ چھ سات دن کے بعد اس دوسرے گروپ کی تعلیم ختم ہو گئی تو ۱۶ دسمبر ۱۹۷۲ء کو صابرہ خاتون نے حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کو دوسرے گروپ کے قرآن مجید ختم کرانے کے سلسلہ میں حسب ذیل پرچہ روانہ کیا۔

الحمد للہ علیٰ احسانہ۔ بچیوں کا قرآن مجید ختم ہونے کے قریب ہے آپ سے گزارش ہے کہ آپ تشریف لا کر ختم کرا دیں سب چھوٹی بڑی ... ختم میں شریک ہو جائیں گی۔ وہ بہت خائف ہیں کہ ہم مولوی صاحب کے سامنے پڑھ کر پڑھ نہیں سکیں گے پرسوں ہفتہ کا دن مقرر کیا ہے چھوٹی بچیاں جو تیار ہیں ان کے اسکولوں میں ٹیسٹ ہو رہے ہیں خیال ہو رہا ہے کہ اتوار رکھ لیا جائے۔ اکثر بڑی عورتوں نے اہتمام شروع کیا ہے تو نہیں کے ظہر کے بعد ٹائم رکھ لیا جائے تو آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ تقریباً دو گھنٹے صرف ہوں گے کیونکہ مکرر اور سہ بارہ پڑھیں گی جب پوری ہو جائیں۔ اس پروگرام میں آپ اگر تبدیلی کریں تو ہم کو منظور ہوگا۔ دن بہر حال ہفتہ ہی کا رکھنا ہے۔

صابرہ ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۲ء

اس پرچے کے کونے پر حضرت مولوی محمد یوسف صاحب نے جواب صابرہ خاتون کو اسی روز بھجوا دیا تھا۔ وہ یہ تھا۔

محترمہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

ظہر کی نماز سے سوا دو بجے فراغت ہوتی ہے اور مجھے پونے چار بجے مسجد میں آجانا ضروری ہے کیونکہ عصر کی اذان چار بجے ہوتی ہے اس لئے یہ وقت کسی طرح مناسب نہیں۔

ایک دن، دو دن، تین دن جتنے دن ہوں۔ میں حاضر ہوں یا صبح نو بجے سے بارہ بجے تک یا مغرب کے بعد آپ جو اوقات منظور کریں مجھ کو عذر نہ ہوگا فقیر۔

بڑی رد و کد کے ساتھ ظہر کے بعد کا وقت طے ہوا۔ دو بجے مولوی صاحب تشریف لائے۔ شاگردوں سے اپنی حسب منشا قرآن مجید کے رکوع سُنے۔ تجوید کے قواعد معلوم کئے جوابات سُن کر بہت خوش ہوئے، پندرہ منٹ آپ نے اپنی خوشنودگی کی اظہار میں لگا دیا۔ دعا مانگی۔

۱۹۷۳ء میں شیخ رضی الدین صاحب کے اُس مکان میں جو منہدم ہو گیا تھا۔ دوبارہ تعمیر ہوا تھا۔ اس میں صبح نو بجے سے دس بجے تک اپنی فارغ التحصیل چھ سات شاگردوں کو عربی پڑھانی شروع کی۔ اس کا انتظام بھی صابرہ خاتون صاحبہ نے کیا ان اسباق کا سبق پانچ چار مہینے تک چلا اس لئے کہ وہ کو مولوی صاحب ان شاگردوں کو بہت جلدی ختم کرانا چاہتے تھے جو ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ یہ سلسلہ زیادہ دن نہیں چلا۔ چار پانچ مہینے کے اندر ختم ہو گیا۔

ہر سال کوئی نہ کوئی گروپ آٹھ نو عورتوں کا نیا پیدا ہو جاتا تھا تو مولوی صاحب ان کو تعلیم دینے لگتے۔ مکان بھی ایک مقرر نہیں تھا مختلف مکانوں میں مولوی صاحب نے تعلیم دی۔ ۱۹۷۷ء میں ایک نیا گروپ عورتوں کا پیدا ہوا۔ تو صابرہ خاتون نے ان کے بارے میں مولوی صاحب کو لکھا کہ وقت مقرر فرما دیں۔ مکان تو حاجی نبی احمد صاحب کا متعین کر لیا تھا چنانچہ اس پرچہ کا جواب مولوی صاحب نے یہ دیا۔

محترمہ - السلام علیکم ورحمۃ اللہ

پڑھانے کے سلسلے میں یہ پہلی مرتبہ ہے جو میں نے آپ کے حکم کی تعمیل میں تاخیر کر رہا ہوں اور شرمندہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ جواب میں دیر اس وجہ سے ہوئی کہ میں امتحانی طور پر سوچتا رہا کہ میں اس صورت کو یعنی ترجمہ سے فراغت کے بعد

نبھاسکوں گا یا نہیں۔ مجھ کو اندازہ ہوا۔ کہ ترجمہ کے بعد میں بہت تھک جاتا ہوں۔ عمر کا بھی تقاضہ ہے۔ پھر بھوک بے حد لگ آتی ہے اور ناشتہ کے تیار کرنے میں کم از کم پون گھنٹہ لگ جاتا ہے، ورنہ میرے لئے تو یہ صورت بہت آسانی اور آرام کی ہے۔

ظہر کے وقت تو آپ مدرسہ کے لئے چلی جاتی ہیں عورتیں تو ڈیڑھ بجے ہی ظہر پڑھ سکتی ہیں اگر آپ پہلے جا کر پڑھا دیں تو جلد واپس آجائیں تو بہتر صورت یہ ہے کہ چار بجے میں خدمت کے لئے حاضر ہوں خواہ مسجد میں یا کسی مکان میں۔ اور اگر یہ بھی دشوار ہو تو عشاء سے گھنٹہ بھر پہلے مسجد میں شروع کرلیں۔ پھر سہ دری میں نماز پڑھ کر جب تک جی چاہے عشاء کے بعد بھی پڑھتی رہیں چاہے عشاء کے بعد شروع کریں لیکن اس صورت میں کبھی کبھی میرا دعظ ہوگا تو ناغہ ہو جائے گی جس طرح آپ حکم فرمائیں میں حاضر ہوں۔

فقیر۔ ۲۷ اپریل ۱۹۷۷ء

مولانا محمد یوسف صاحب نے جن عورتوں کو تعلیم دی وہ نوجوان نہیں تھیں۔ بلکہ کثرت کے ساتھ چالیس سال سے زیادہ کی عمروں کی تھیں اور تھیں بھی اچھے کھاتے پیتے گھروں کی بیویاں۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے اس عمر میں یہ جذبہ پیدا کرایا کہ قاعدہ بغدادی سے اپنی اصلاحی تعلیم کی ابتدا کریں۔ صابرہ خاتون علامہ مولانا شرف الحق کی بہو اور شاہ ابوالخیر صاحب کے خادم و مشیر خصوصی حاجی عبدالحکیم صاحب مالک جنرل بوٹ ہاؤس چاندنی چوک کی صاحبزادی تھیں۔ حاجی نبی احمد، حاجی نواب الدین، حاجی مسلم اور حاجی محمد شاکر جن کی بیویاں اور بیٹیاں اس تعلیم میں شامل تھیں دہلی کے مانے ہوئے تاجر اور سرائے حافظ بنّے صدر بازار کے مالکوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان مستورات کے نام پندرہ ان عورتوں کے گروپ میں شامل ہیں

جن کی فہرست دی جا چکی ہے۔ یہ پوری فہرست اسی قسم کی مستورات کی ہے۔ ان عورتوں کے دلوں میں حضرت مولوی صاحب کے علم کی اس قدر منزلت تھی کہ قرآن مجید سناتے ہوئے کانپتی تھیں۔ بات کرنا تو کجا، بات کرنے کے لئے صابرہ خاتون کو مقرر کر رکھا تھا۔

حضرت مولوی محمد یوسف صاحب اس طرح عرصہ تک مختلف مکانوں میں ان قرآن مجید کی اصلاحی و تجویدی تعلیم دیتے رہے۔ خانگی مکانوں میں پڑھانے میں جو پریشانیاں ہوتی ہیں حضرت مولوی صاحب جیسا حساس انسان اس کو ہر وقت محسوس کرتا تھا۔ معاملہ معمولی نہ تھا، قرآن مجید کی درستگی اور ورتل القرآن ترتیلا پر عمل کرانا تھا۔ اس لئے بخوشی یہ سلسلہ جاری رکھا لیکن اس عرصہ میں یہ خیال بھی رہا کہ کوئی اس کام کے لئے کرایہ کا مکان مل جائے یا مستقل اس مدرسہ کے لئے اپنی جگہ ہو جائے۔ قدرت نے پہلے حضرت مولوی صاحب کو گلی جوتیاں والی (گلی مسجد والی) محلہ چوڑی والاں میں ایک کرایہ کا مکان دلوا دیا اس میں مدرسہ نسواں تعلیم القرآن قائم کیا اس کے انتظام کے لئے ایک منتظمہ کمیٹی تشکیل کی اس منتظمہ کمیٹی نے حضرت مولوی محمد یوسف صاحب کو صدر اور افتخار احمد صدیقی کو جنرل سکریٹری منتخب کیا۔ اس منتظمہ کمیٹی میں احمد جمال صاحب ... والے، حاجی نبی احمد صاحب حافظ عبدالمنان نواب میاں اور عرفان الہی صاحب وغیرہ تھے۔ اندرون مدرسہ انتظام چلانے کے لئے حضرت مولوی صاحب نے صابرہ خاتون کو مقرر کیا اور اسکول کے مشورہ کے لئے حسب ذیل پرچہ ان کو بھیجا۔

محترمہ صابرہ خاتون صاحبہ سلمہا۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مدرسہ نسواں گلی مسجد والی کے دوبارہ جاری کرنے کے متعلق کچھ مشورہ کرنا ہے بہتر ہو کہ آپ کل پیر کو صبح ۹ بجے حاجی نبی احمد صاحب کے مکان پر آجائیں۔

کیا یہ درست رہے گا اور استانیوں کو آپ بلالیں اُن سے کہلا دیں۔

فقیر۔ ۷ر اکتوبر ۱۹۷۹ء

حضرت مولوی صاحب نے مدرسہ نسواں کی استانیوں کی تنخواہ کے بارے میں مشورہ کیا تھا کہ کیا ہونی چاہئے اور جو تنخواہ مقرر ہو جائے وہ آپ ہر ماہ قمرست منگوا لیا کیجئے۔ اس سلسلہ میں یہ پرچہ مولانا صاحب نے بھیجا تھا۔

محترمہ صابرہ خاتون صاحبہ سلمہا۔ السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ٹھیک تاریخ تو یاد نہیں کہ مدرسہ نسواں کب سے شروع ہوا تھا لیکن اندازہ ایک مہینے سے زیادہ گذر گیا۔ آپ کو کلی اختیار دیدیا گیا ہے کہ آپ استانیوں اور کام کرنے والیوں کی تنخواہ مقرر کر دیں اور مہینہ ختم ہونے پر تمام خرچ منگا لیا کیجئے۔ لیکن آپ کی طرف سے ابھی کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا۔

محترمہ آپ کا ذاتی کام نہیں ہے اس میں تکلف نہ کیجئے۔ آپ ہر ضرورت تحریر فرما دیا کریں۔ اور تمام خرچ ایک پرچہ پر لکھ کر منگوا لیا کریں۔ آخر میں بھی تو سکریٹری صاحب کو حساب لکھ کر روپیہ منگاتا ہوں۔ اور پھر کرمیہ کے ملازموں کو تقسیم کرتا ہوں اگر آپ تکلیف دیں گی تو ہمارے لئے دشواری ہوگی حساب بھیجدیں تا کہ میں خرچ بھیجدوں۔ امید ہے کہ آپ بخیر وعافیت ہوں گی۔

فقیر ۲۲ر جنوری ۱۹۸۰ء۔

اس پرچہ کے بعد کچھ باتیں صابرہ خاتون نے مولوی صاحب سے دریافت کی ہونگی تو ان باتوں کا سلسلہ وار مولوی صاحب نے یہ جواب تحریر فرمایا تھا:۔

محترمہ صابرہ خاتون صاحبہ سلمہا۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ۔

آپ کے پرچہ کا درجہ وار جواب دے رہا ہوں۔

(۱) استانیوں کے عمل اور وقت کا ہم کو علم نہیں۔ یہ کام تو آپ کا ہے کہ آپ

ان کے کام اور وقت کے مطابق ان کی تنخواہ مقرر کریں۔ آپکو شاید اندیشہ ہو کہ کسی کو ناگوار نہ گزرے تو آپ اطمینان رکھیں کہ آپ کی مقررہ کی ہوئی تنخواہ ہم خود اپنی طرف سے لکھ کر بھیج دیں گے کہ فلاں کو یہ دو فلاں کو یہ دو کسی اور کو ہرگز خبر نہیں کریں گے کہ آپ نے یہ تنخواہ مقرر کی ہے نہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کونسی استانی کتنی دیر تعلیم دیتی ہے۔

(۲) صفائی کرنے والی عورت کی تنخواہ بھی آپ مناسب سمجھ کر مقرر کر دیں۔

(۳) جو لڑکیاں قرآنِ مجید کی ابتدا کرنے والیاں ہیں ان کو فی الحال پورا قرآن مجید دینا مناسب نہیں ہے بہتر ہے کہ میں پارہ عم، تبارک، الم، سیقول کے علیحدہ علیحدہ پارے لے آتا ہوں یکے بعد دیگرے جب یہ چاروں پارے ختم ہو جائیں تو پورا قرآنِ مجید دیا جائے۔

(۴) جو بچیاں پاؤ آدھا قرآنِ مجید پڑھ چکی ہیں اُن کے لئے پورے قرآن مجید آجائیں گے۔

(۵) یہ بات یاد رکھئے کہ جو لڑکیاں قاعدے، قرآن مجید کا ہدیہ برداشت کر سکتی ہیں وہ برداشت کرلیں اور جن کو آپ سمجھیں کہ برداشت نہیں کر سکیں تو ان کے متعلق مجھے لکھ دیں رمضان المبارک والے چندہ میں سے خرچ کر دوں گا۔

(۶) قرآنِ مجید میں انشاء اللہ تعالیٰ خود لا دوں گا۔ سردی نے مجھ کو بیکار کر رکھا ہے۔

(۷) عصر کے بعد حاجی نبی احمد صاحب اور افتخار احمد صاحبان آئیں گے اس لئے اگر اس پرچہ کا جواب آپ اس وقت تک دیدیں تو اچھا ہو گا۔

فقیر ۲۲ جنوری ۱۹۸۰ء

حضرت مولوی صاحب کو مدرسہ کی استانیوں کے متعلق کچھ معلومات حاصل

ہوئی تو اس کے بارے میں اور ان حالات کی روشنی میں اُستانیوں کی تنخواہ بھی مقرر کر کے حسب ذیل پرچہ صابرہ خاتون کو روانہ کیا۔

محترمہ صابرہ خاتون صاحبہ سلمہا۔ السلام علیکم ورحمۃ و برکاتہ

معلوم ہوا ہے کہ چاروں اُستانیاں ۹ بجے سے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک رہتی ہیں یعنی شام کے دوسری اُستانیاں ہیں اگر یہ صحیح ہے تو دو ڈھائی گھنٹے کے لیے سو روپے زیادہ ہیں، مدرسہ کریمیہ میں چھ گھنٹے تعلیم دینے والے ایک مدرس اس وقت بھی ہیں جن کی تنخواہ ایک سو روپے ہے سو لیے بھی گذشتہ مہینے میں چندے کے دو سو چالیس روپے وصول ہوئے ہیں۔ کل عرصہ کے بعد یہ طے پایا کہ ان میں سے ہر ایک کی تنخواہ ساٹھ روپے ہونی چاہئے۔ اور صفائی کرنے والی کے بیس روپے ٹھیک ہیں۔

ہمارے ہاں انگریزی مہینے سے حساب ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ اس مہینے کے ختم پر ہر ایک کو سوا مہینے کی تنخواہ دے دی جائے گی پھر یکم فروری سے ہر ایک کا حساب ہمارے ہاں انگریزی مہینے سے حساب

شروع ہوگا کیا آپ نے روپے وصول کر لیے؟ میں ۲۶ قرآن مجید لے آؤں۔ علیحدہ علیحدہ پاروں کے متعلق آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اگر آپ ابھی جواب بھیجدیں تو بہتر ہے۔ میں نے ۲½ بجے لالہ صاحب کو بلایا ہے۔

فقیر۔ ۲۲ر جنوری ۱۹۸۰ء

اٹھ نوروز کے بعد حضرت مولوی صاحب نے اُستانیوں کی تنخواہ کے ساتھ یہ پرچہ بھی روانہ کیا تھا۔

محترمہ صابرہ خاتون صاحبہ سلمہا۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

اُمید ہے کہ بفضلہ تعالےٰ آپ خیریت سے ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و

توانائی عطا فرمائے۔ آمین

ان چاروں استانیوں کے سوا سوا مہینے کے ۵۷ روپے اور صفائی کرنے والی کے سوا مہینے کے ۲۵ روپے۔ کل تین سو پچیس روپے بھیج رہا ہوں۔ ۲۳ دسمبر ۳ جنوری تک کی تنخواہ ہے۔ لیجر میں حساب لکھتے وقت ان کے ناموں کی ضرورت ہے ان پانچوں کے نام تحریر فرمادیں۔

فقیر یکم فروری ۱۹۸۰ء

چار مہینے کے قریب ہوگئے تو طالبات کے امتحان کا وقت آگیا۔ صابرہ خاتون نے مولوی صاحب کو لکھا کہ آپ امتحان لینے کی کونسی تاریخ مقرر فرماتے ہیں تو مولوی صاحب نے جواب دیا۔

محترمہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اگر آپ چاہیں تو اتوار ۹ مارچ صبح ساڑھے آٹھ بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک کا وقت امتحان کے لئے رکھ لیجئے۔ اور اگر چاہیں تو آئندہ اتوار کو رکھ لیجئے۔

فقیر ۵ مارچ ۱۹۸۰ء

صابرہ خاتون نے اس پرچے کے کونے میں لکھا:۔

وعلیکم السلام۔ اگلے اتوار ۱۵ مارچ کو رکھ لیجئے مہربانی ہوگی۔

کئی پرچوں کے آمد و رفت کے بعد ۱۲ مارچ مقرر ہوئی اور مقام امتحان گلی ٹیکوں والی بر مکان حاجی محمد مسلم نمبر ۲۹۵ مقرر ہوا۔ اور حسب ذیل مطبوعہ دعوت نامہ تقسیم کیا گیا۔

خوش خبری

قرآن مجید سے دلچسپی رکھنے والی خواتین کو مطلع کیا جاتا ہے کہ مدرسہ نسواں جوڑی والاں کی تیس طالبات کی قرآن حکیم کے ختم کی ایک مبارک تقریب جمعرات

۱۲ مارچ ۱۹۸۱ء کو صبح ۹ بجے منعقد ہو رہی ہے۔ تمام حضراتِ خواتین وقتِ مقررہ پر گلی ٹیکوں والی بر مکان حاجی محمد مسلم نمبر ۹۵ ۴ تشریف لاکر سعادت حاصل کریں۔

منجانب۔ جماعتِ منتظمہ مدرسہ نسواں۔ چوڑیوالان دہلی

یہ تاریخ مقرر ہوگئی تو مولوی صاحب نے امتحان کا پرچہ بھیجنے کے بارے میں کچھ ہدایتیں حسبِ ذیل پرچہ میں لکھ کر بھیجیں:۔

محترمہ صابرہ خاتون سلمہا۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

آج میرے ذمہ مدرسہ کی چوتھی جماعت کا سالانہ امتحان ہوگیا ہے۔ اس لئے میں دوپہر کو نہیں آسکوں گا، آپ تمام کا امتحان آج ضروری ہے، چند باتوں کو ذہن نشین کر لیجئے:۔

(۱) سوال کا پرچہ ٹھیک سوا دو بجے مسجد سے منگا لیجئے، میں آپ کو اس وقت نہیں بھیج رہا کسی کو یہ اعتراض نہ ہو کہ میں نے پہلے سے آپ کو پرچہ دکھا دیا۔

(۲) اپنے سامنے سب کو پرچہ لکھوا دیجئے، یہ سب اپنے پرچوں پر جواب تحریر کریں اور کوئی نہ کسی سے پوچھے نہ کسی کی نقل کرے۔

(۳) جواب کے لئے صرف یہ کرنا ہے کہ سوال ۱ کا جواب لکھنا ہو تو ۱ لکھ کر جواب لکھدیں۔ ۲ لکھ کر اس کے آگے ۲ کا جواب لکھ دیں مجھ کو جو جواب کا پرچہ دیں اس میں سوال کی عبارت چاہے نہ لکھیں۔

(۴) سب کے پرچے سب کے سامنے اکٹھے کر کے ۴½ بجے مجھے مسجد میں بھیج دیں۔

(۵) تاکید کر دیجئے کہ ہر ایک کو اپنے پرچہ پر اپنا نام لکھنا ضروری ہے۔

فقیر۔ ۱۵ مارچ ۱۹۸۰ء

امتحان کا پرچہ جو مولوی صاحب نے ڈھائی بجے بھجوایا تھا، وہ یہ تھا:۔

وقت ۲½ بجے ۵ بجے تک کل نمبر ۱۰۔ خوشخطی کے دو نمبر زیادہ ملیں گے۔

ہر سوال کے نمبر

(۱) قرآن مجید کا ایسا لفظ لکھیے جس کے آخر میں را پر ٹھیرا جائے مااس را سے پہلے کا حرف ساکن ہے اور اس سے بھی پہلے حروف کے نیچے کسرہ ہے۔ ۱۲

(۲) قرآن مجید میں کئی مقامات پر لام کے آگے الف ہے۔ یہ لام کسی حرف سے مل بھی نہیں رہا ہے۔ پھر بھی اس کے آگے الف کا پڑھنا حرام اور نا جائز ہے۔ اس کی کوئی مثال لکھیے۔ ۱۰

(۳) حروفِ قلقلہ کون کون سے ہیں۔ ان کی ادائے گی میں کیا بات پیدا ہوتی ہے۔ ۱۰

(۴) ۱۰

(۵) حروفِ شمسی کون کون سے ہیں۔ ان کو حروف شمسی کیوں کہتے ہیں؟ ۱۰

(۶) انا کے علاوہ قرآن مجید کا کوئی ایسا لفظ لکھیے جس کے نون کے آگے الف ہے لیکن حالتِ وصل میں یہ الف پڑھا نہیں جاتا۔ ۸ / ۶۰

وقتِ مقررہ پر امتحان ہوا اور اسی روز امتحان ختم ہونے کے بعد مولوی صاحب کو امتحانات کے پرچے بھی بھجوا دیے۔ مولوی صاحب نے ان پرچوں کو پڑھا اور اس کے نتائج سے بہت خوش ہوئے اور اس سلسلہ کا حسبِ ذیل ایک پرچہ روانہ کیا۔ وہ یہ تھا:۔

صدر معلمہ صابرہ خاتون صاحبہ سلمہا۔ مدرسہ نسواں چوڑی والان۔ دہلی

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

اللہ رب العالمین آپ کو اور تمام استانیوں کو جزائے خیر عطا فرمائے اور آپ سب کے قلوب اور سینوں کو قرآن مجید کے انوار سے روشن اور منور کرے آمین۔

میں ناسازئ طبع کی بنا پر کمزور ہو رہا ہوں۔ پھر بھی میں نے آپ کے حکم سے پرچے بغور دیکھے۔ باری تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے اندیشے کے خلاف اور میری امیدوں کے موافق بچیاں بہت کامیاب ہیں اور بہت زیادہ عمدہ جوابات انھوں نے تحریر کئے ہیں۔ خدائے تعالیٰ ان کو نظر بد سے بچائے۔ میری [illegible] کمیٹی کی طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کی ترقی لازوال نعمتوں سے نوازے۔

فقیر محمد یوسف الدہلوی ۱۸ مارچ سنہ [illegible]

حضرت مولوی محمد یوسف صاحب کافی عرصہ اور کافی گردوں کی تکلیف [illegible] کے بعد جب سے گلی مسجد والی میں مدرسہ نسواں قائم ہوا خود طالبات کی تعلیم [illegible] کر یا طالبات کو استانیاں درس دیتی تھیں اس اسکول میں ایک مرتبہ [illegible] کے بعد امتحانات کے پرچے بھی بنانا بند کر دئے تھے۔ یہ تمام [illegible] اور جو استانیوں [illegible] استانیوں کی [illegible] بھی ہیں اور استانیاں تنخواہ لیتی ہیں لیکن [illegible] بلامعاوضہ پڑھاتی ہیں۔ ایسی پڑھانے والی [illegible] حاجی بی احمدی [illegible] حاجی [illegible] اور [illegible] چودھری کی [illegible] اشفاق احمد بھی رہتی ہیں۔ مولوی صاحب کے بعد امتحانات کے پرچے بنانا ان کو چیک کرنا نمبر دینا۔ مدرسہ کے اندرونی انتظامات کی دیکھ بھال کرنا [illegible] خاتون کے ذمہ ہو گئے تھے۔ لیکن مولوی صاحب مدرسہ کی نگرانی سے کبھی غافل نہیں ہوئے ہر وقت دیکھ بھال رکھتے تھے۔ استانیاں اور صدر معلمہ قدم قدم پر مولوی صاحب

سے مشورہ لیتی تھیں، کوئی نیا کام ان کے مشورے و منظوری کے بغیر نہیں کرتی تھیں۔ مولوی صاحب نے بھی طالبات کو بڑی لگن اور مستعدی کے ساتھ پڑھایا۔ سوائے اخلاص و للہیت کے کسی قسم کا لالچ نہ تھا۔ بلا معاوضہ تعلیم دیتے تھے۔ قرآن مجید سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ عرصے اس بات کی خواہش تھی جو پوری ہوگئی۔

۱۹۸۳ء میں مسجد حوض والی میں حوض کے اوپر بالاخانہ کی تعمیر کی گئی حضرت مولوی محمد یوسف صاحب، حاجی نبی احمد صاحب، حافظ عبدالمنان اور نواب میاں صاحب کی نگرانی میں اس کی تعمیر شروع ہوئی اور ۱۹۸۴ء میں مدرسہ نسواں میں تعلیم شروع ہوگئی جو اب تک بحمد اللہ مولوی صاحب کے انتقال کے بعد تک جاری ہے۔ افتخار احمد صاحب کے انتقال کے بعد عرفان الٰہی صاحب مدرسہ نسواں کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ بڑی خوش اسلوبی سے مدرسہ کو چلا رہے ہیں۔ صابرہ خاتون صدر معلمہ ہیں منتظمہ کمیٹی سابقہ ممبران پر مشتمل ہے۔ مدرسہ نسواں کی طالبات سو اسو کے قریب ہیں اور چار استانیاں ہیں جو بہت کم ہیں۔ تنخواہ بھی باوا آدم کے زمانہ کی ساٹھ روپے ماہوار مل رہی ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے۔ استانی فاطمہ اس مدرسہ پر کافی محنت کر رہی ہیں۔ ہمہ وقت اس کی ترقی کے لئے کوشاں رہتی ہیں۔ ان کے پڑھانے کا ڈھنگ بھی اچھا ہے۔ خدائے تعالیٰ اس اسکول کو قائم و دائم رکھے اور موجودہ قسم کی مخلص، بے لوث استانیاں اس کو ملتی رہیں۔ حضرت مولوی محمد یوسف صاحب کا یہ کارنامہ رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ یہ دہلی والوں پر مولوی صاحب کا احسانِ عظیم ہے اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ کام لے لیا۔

مولوی محمد یوسف صاحب کو بعض لوگ تیز طبیعت اور غصیل کہتے ہیں۔ جو درست نہیں ہے مولوی صاحب کو غلط کار لوگوں پر غصہ آتا تھا۔ اپنے ملنے جلنے والوں اپنے دوست احباب اور اپنے خدمت گذار لوگوں پر مولوی صاحب جان دیتے تھے۔ عزت و

شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے، اپنے اسکول کی استانیوں اور طالبات کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ان کی خوشی میں خوش ان کے رنج و غم میں برابر کے شریک اختیار احمد صاحب جو مدرسۂ نسواں تعلیم القرآن کے سکریٹری تھے ان سے عمر میں بہت چھوٹے تھے مولوی صاحب کے ہاں آتے جاتے تھے، ان کی نوجوانی کی موت پر مولوی صاحب کو بے حد رنج، صدمہ اور قلق ہوا۔ ہفتوں اپنے وعظ میں ان کی موت پر اپنے رنج و غم کا اظہار کیا۔ اور اس کو بڑا نقصان عظیم قرار دیا یہ انسانی ہمدردی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی میرا جوان بھانجہ واصف کمال ایکا ایکی فوت ہو گیا مولوی صاحب گھر آئے اظہار غم کیا اور اپنے سامنے غسل کرایا۔

مفتی ضیاء الحق صاحب نے اپنے گھر پر ایک اجتماع کیا تھا۔ اس میں مدرسہ نسواں تعلیم القرآن محلہ چوڑیوالان کی استانیوں کو بھی پڑھنے کے لئے بلوایا چنانچہ استانیوں نے اس وقت عورتوں کے اجتماع میں قرآن مجید کی تلاوت کی۔ اس کو ٹیپ کیا گیا کہ وہ کیسٹ سنائی جارہی ہے جس کو مرد بھی سن رہے ہیں۔ استانیوں کو جب اس بات کا پتہ چلا تو انھوں نے مولوی صاحب سے شکایت کی۔ مولوی صاحب نے مفتی ضیاء الحق سے گفتگو کی انھوں نے وعدہ کیا کہ میں یہ کیسٹ کسی کو نہیں سناؤں گا۔ چنانچہ اس گفتگو کی اطلاع مولوی صاحب نے صابرہ خاتون کو حسب ذیل پرچے کے ذریعے دی۔

محترمہ صابرہ خاتون صاحبہ سلمہا۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

آج شاکر الاسلام صاحب کے کمرہ کے نیچے مولوی صاحب سے اچھی خاصی تیز گفتگو ہو گئی۔ انھوں نے اقرار کر لیا کہ آپ سے میں نے ٹیپ کرنے کی اجازت نہیں لی تھی انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ میں ٹیپ کو بالکل صاف کر دوں گا اور آپ کی استانیوں کی بھی قرأت کسی کو نہیں سناؤں گا۔ آپ یقین کیجئے، اگر وہ مجھ سے ٹیپ کی اجازت

مانگتے تو میں ہرگز اجازت نہ دیتا۔ یہ گفتگو شاکر الاسلام کی موجودگی میں ہوئی۔ فقیر مولوی صاحب کی خواہش ہوتی تھی اور حاجی نبی احمد صاحب کی بھی۔ کہ اس تعلیم کا زیادہ سے زیادہ پروپیگنڈہ ہو تاکہ مستورات زیادہ سے زیادہ قرآن مجید کی تعلیم حاصل کریں۔ چنانچہ ایک پرچہ میں مولوی صاحب نے اس بات کا اظہار بھی کیا ہے تحریر فرماتے ہیں:۔

کل ہفتہ کو صبح نو بجے محمد عادل صاحب کے مکان پر طالبات کا قرآن مجید ختم ہے۔ حاجی نبی احمد صاحب کی خواہش تھی کہ اس کا اعلان لاوڈ اسپیکر پر ہوتا تاکہ سب کو معلوم ہو کہ ہمارے مدرسہ میں کیا کام ہو رہا ہے۔ اعلان تو میں کر دوں گا لیکن پہلے آپ نے بتایا تھا کہ زیادہ طالبات کی جگہ نہیں ہے اب اگر اعلان سے دوسری بچیوں نے داخل ہونا چاہا تو کیا ہوگا۔ ۱۲ طالبات جو فارغ ہو رہی ہیں کیا یہ اعلان کر دوں کہ فقط ۱۲ طالبات کے داخلہ کی گنجائش ہے۔ اس سے زیادہ کی نہیں تو یہ کیسا ہوگا۔

فقیر۔ ۲۶ اگست ۱۹۸۰ء

یہ طالبہ بڑا نیک اخلاص اور بڑے کرتی کی تھی اور بڑی عقیدت رکھتی تھیں۔۔

مولانا بھی طالبات پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور ان کا خیال رکھتے تھے۔ مولانا نے ایک مرتبہ کسی طالبہ کو بڑی سی غلطی پر بھی جھڑکا بھی نہیں ہو نہ کہ دینا فقی ہوتا تھا طالبات سننے کے وقت کانپنے لگتی تھیں اور آواز بھرا جاتی تھی تو مولانا ایسے وقت فرماتے تھے۔ ایا تم کیا کھاتی پیتی نہیں ہو۔ ایک مرتبہ صابرہ خاتون کو احساس ہو گیا کہ شاید مولانا صاحب مجھ سے ناراض ہیں۔ اس بات کا ایک پرچہ بھی مولانا صاحب کا جو ملا صاحب نے دیا اس کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھیے کہ کس انداز و ڈھنگ سے کس حالت میں اس بات کی تردید کی ہے۔ مولانا کو اپنے طالبات پر کتنا زیادہ اعتبار تھا۔ اس عبارت کو وہ لوگ ضرور پڑھیں جو مولانا کے طفیل ہونے

بڑے شد و مد سے پروپگنڈہ کرتے ہیں۔ رہا اُن کا غصہ تو ہر وہ آدمی جو دیانتدار ہوتا ہے وہ لازمی طور پر غصیل ہوتا ہے اور اس کو غلط بات پر غصہ آتا ہے۔ اُس پرچہ کی عبارت یہ ہے:۔

محترمی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آپ اندازہ نہیں کر سکیں گی کہ اس وقت کس دشواری میں پرچہ لکھ رہا ہوں۔ اور فقط اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آپ پریشانی میں نہ رہیں۔ تین چار دن برابر ڈاکٹر کے ہاں گیا ہوں۔ میں نے گھنٹہ گھنٹہ بھر دانتوں کو دبایا ہے نکالا ہے سیر اسر درد سے پھٹنے لگا اسی دوران آپ کا پرچہ آ گیا فقط اتنا لفظ پڑھا تھا کہ "مفتی صاحب نے ذکر نہیں کیا آپ سے کہہ دیا" میں سمجھ گیا کہ کسی غلط فہمی کا ازالہ ہوگا۔ درد سے دو دن سے مجھے کا پرچہ تھا میں نے یونہی رکھ دیا پڑھا بھی نہیں۔ آپ نے نامعلوم میرے ناراض ہونے کا کہاں سے نتیجہ نکال لیا۔ اب وہ پرچہ میں نے نکال کر دیکھا۔ میں حیران ہوں کہ اس میں ناراض ہونے کی کیا بات تھی۔ نہ میں بچہ ہوں اور نہ مجھ میں بچپن ہے کہ بگڑ جاؤں اور پھر آپ جیسی دیندار اور قرآن مجید کی خدمت گذار سے ناراض ہو جاؤں۔ مجھے جہنم میں اپنا ٹھکانا نہیں بنانا۔ افسوس ہے کہ آپ کو مجھ پر اتنا بھی اعتماد نہیں آپ کو ابھی تک خبر نہیں کہ آپ کی استانیوں کی میری نظر میں کیا قدر و قیمت ہے۔

ماشاءاللہ ماشاءاللہ مجھ پر رائی کے برابر بھی اثر نہیں۔ یہ باتیں تو آپ نے میرے آرام پہنچانے کے لئے لکھی ہیں۔ ترجمہ ہونے چار مہینے تک ناغہ رہا۔ اس لئے ہمت کر کے بیٹھ رہا ہوں جس طرح آپ نے لکھی ہے اسی طرح پڑھاؤں گا۔ دل میں سے تمام وسوسے نکال دیجئے۔

فقیر یکم دسمبر ۱۹۸۰ء

مولانا صاحب طالبات کے پڑھانے کے انتظام میں کافی وقت صرف

کرتے تھے، ان کے لئے قاعدوں، پاروں اور قرآن مجید کا فراہم کرنا انھوں نے اپنے ذمّہ لے رکھا تھا۔ صلاح الدین حسام الدین بک سیلر، قرآن مجید، پارے اور قاعدے وغیرہ ہدیہ کرتے ہیں۔ اس وقت پریس اور دوکان کا کاروبار جو کرتے ہیں ان کی عرفیت لاٹھ صاحب ہے اور نام صلاح الدین ہے یہ مولانا صاحب کا بہت لحاظ کرتے ہیں اور ان سے متاثر بھی ہیں، اس لئے آپ یہ چیزیں ان سے منگوا کر صابرہ خاتون کی معرفت طالبات کو پہنچا دیتے تھے۔ چنانچہ ایک پرچہ میں لکھتے ہیں :۔

محترمہ صابرہ خاتون سلمہا۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

(۱) مدرسۂ نسواں کی بچیاں پارے، قاعدے لینے کے لئے آتی ہیں بعض دفعہ وقت غلط ہوتا ہے بعض مرتبہ نہیں ملتا۔

(۲) میرا خیال تھا کہ پارے تو پاس ہیں نہیں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ قاعدہ پڑھانے والی استانیاں مجھ سے ۳۰، ۴۰ قاعدے لے کر اپنے پاس رکھ لیں۔ جب فروخت ہو جائیں تو مجھے قیمت بھیج دیں یا اپنے پاس جمع کر لیں اور پھر اور منگا لیں اس صورت میں میرے اور بچیوں کے لئے آسانی ہو گی۔

(۳) دوسرا پرچہ میں نے لاٹھ صاحب کو بھی لکھا۔ انھوں نے جواب میں تین پارے بھیجے ہیں۔ اوّل تو یہ بڑے سائز کے ہیں پھر پارہ عمّ، الم اور تبارک بھی نہیں ہیں۔ کیا یہ پارے آپ کے ہاں چل سکتے ہیں۔ منگا کر رکھ لوں۔ اُمید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گی۔ اس سال زیارت حرمین کے متعلق کیا ارادہ ہے۔

فقیر۔ ۲۵ اگست ۱۹۸۰ء

یہ مستورات کسی جگہ بھی قرآن مجید ختم کراتیں تو مولوی یوسف صاحب کے ہاتھوں کراتی تھیں۔ چنانچہ جب بارہ دری شیر افگن خاں میں ختم قرآن مجید کی تقریب ہونے لگی تو صابرہ خاتون نے مولوی صاحب کو یہ پرچہ لکھا۔

قبلہ جناب مولوی صاحب۔ السلام علیکم

یارہ دری میں جواب قرآن شریف ختم کرائے خدا کا شکر ہے کہ ان کا
قرآن شریف ختم ہوگیا ہے۔ اور میں نے دُھروا بھی دیا ہے اور وہ جمعرات کے دن
ختم کرانا چاہتی ہیں، آپ ہی سے۔ کیا آپ جمعرات کے روز تشریف لا سکتے ہیں۔
آپ منظوری دیدیں تو میں ان لوگوں کو خوش خبری سُنا دوں۔ آپ ٹائم اور وقت
مقرر فرما دیجئے۔ ویسے ان لوگوں کی خواہش جمعرات کی ہے۔ میں یہ پرچہ عصر کے
بعد بھیج دیتی مگر میں عصر کے وقت یہاں موجود نہیں ہوں گی۔

۲۶ عورتیں ہیں جس میں پندرہ تو پکی ہیں اور گیارہ کچی ہیں۔ قرآن شریف
سب کے ختم ہوگئے ہیں۔ پندرہ تو ایسی ہیں آپ چاہے جہاں سے سُن سکتے ہیں اور
گیارہ ایسی ہیں جو بعد میں ایک دفعہ اور دُہرا دیں گی۔

صابرہ خاتون۔ ۱۴ جون ۷۱ء

اس پرچہ کا جواب مولوی صاحب نے اسی پرچے کے کونے میں یہ دیا۔

عزیزہ محترمہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

جس دن آپ فرمائیں میں حاضر ہوں۔ میرے لئے آسانی ساڑھے آٹھ بجے شروع
کرانے میں ہے، پڑھنے والیوں کی ترتیب اور خاص طور پر تکبیرات کے سلسلہ
میں کون کون سی عورتیں پڑھیں گی یہ آپ نقشہ بنالیں۔ سیدھی آنکھ دکھ رہی ہے،
میرے ترجمہ کی نقل بھی آج ہو گئی۔ نزلہ کا اثر ہے آپ دعا کریں۔ فقیر

مولوی یوسف صاحب نے عورتوں کے تین گروپوں کو تعلیم دی۔ پہلا گروپ
پندرہ مستورات کا دوسرا ۳۴۱ ، ۳۵ کا اور تیسرا گروپ ۱۲۹ خواتین کا تھا جیسا کہ میں
اوپر لکھ آیا ہوں یہ عورتیں مری گری عورتیں نہیں تھیں بلکہ اچھے کھاتے پیتے
گھرانے کی تھیں۔ ان میں ایم اے، بی اے ہائر سکنڈری اور میٹرک شدہ عورتیں

تھیں اور ایسی بھی تھیں جو ٹیچر تھیں۔ انھوں نے مولوی صاحب سے قرآن مجید کی اصلاح کرائی۔ یہ خواتین مولوی صاحب کا بڑا احترام کرتی تھیں۔

مولوی صاحب نے تیسرے گروپ کے بعد مستورات کو تعلیم نہیں دی۔ ان کی فارغ شدہ خواتین صابرہ خاتون، فاطمہ بیگم، امت البصیر زوجہ حاجی نبی احمد، بیگم زوجہ ابراہیم نے پھاٹک تیلیاں، کوچہ ناہر خان، بارہ دری شیر افگن خاں میں اس تعلیم کو پھیلایا۔ اس کے بعد اسکول کھل گیا۔ یہ سب عورتیں اسکول میں لگ گئیں۔ اور اب تک لگی ہوئی ہیں۔

مولوی صاحب نے ان خواتین کو دو ہدایتیں کی تھیں، ایک یہ کہ پڑھنے کے بعد قرآن مجید کی تعلیم کو پھیلاؤ گی یعنی پڑھاؤ گی۔ دوسرے یہ کہ زندگی میں ایک مرتبہ پورا قرآن مجید پڑھ کر میرے نام خدائے تعالیٰ کے ہاں جمع کرا دو گی چنانچہ مولوی صاحب نے تیسرے قرآن مجید کے ختم ہونے کے دن ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۹۸۱ء کو فرمایا تھا کہ عورتوں نے دوسری ہدایت پر بھی پوری طرح عمل کیا۔ مجھ کو ان خواتین نے لکھ کر مطلع کیا کہ ہم نے قرآن مجید اتنے اتنے ختم کیے ہیں اور آپ کے نام جمع کرا دیے۔ اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم ہے۔ میں نے ان کے پرچوں سے اندازہ لگایا کہ ڈھائی ہزار قرآن مجید ان مستورات نے میرے نام جمع کرائے ہیں جو قیامت کے روز میرے کام آئیں گے۔ اس تقریر میں مولوی صاحب نے ان استانیوں کی بے حد تعریف کی اور ان کی محنت پر اپنی مسرت کا اظہار فرمایا۔

مولوی صاحب کی قرآن مجید کی تعلیم دینے کی خواہش آخر عمر میں پوری ہوئی جو مرنے کے بعد بھی جاری ہے لیکن مولوی صاحب کا عمر کا بہت بڑا حصہ ہندوستان کے دینی مدارس کی تعلیم و مالی امداد پر گذرا۔ کسی مدرسہ کو کتابیں پہنچائیں کسی کو سردی میں لحاف پہنچا دیے، کسی مدرسہ کے طلبا کے وظائف میں اعانت کی، کسی مدرسہ کی

تعمیر میں حصہ لیا یوں تو یہ کام مولوی صاحب کا بارہ مہینے جاری رہتا تھا لیکن رمضان شریف میں مدارس دینی پر خاص توجہ رہتی تھی، اپنے رمضان کے دن کے اور رات کے وعظوں میں مدارس کی مالی امداد کی اپیل کرتے رہتے تھے بقر عید کے مہینے کے ابتدائی عشرہ میں اپنے حلقے سے قربانی کے روپے جمع کرا کر مدرسوں میں روانہ فرماتے تھے مولوی صاحب کے یہ دونوں کام ثواب جاریہ میں شامل ہیں جس کا ثواب مولوی صاحب کو قیامت تک اور قیامت کے روز بھی پہنچے گا۔

مولوی صاحب کے صاحبزادے مولوی خورشید عالم صاحب سے ایسے دینی مدارس کی فہرست میں نے مانگی تھی جو انھوں نے حسب ذیل فہرست دی ہے۔

۱۔ جمعیۃ علما صوبہ دہلی

۲۔ مسجد حسن گڈھ محلہ قلعہ دیوبند۔

۳۔ مدرسہ زینت العلوم المعروف بمدرسہ سبحانیہ اسلامیہ عربیہ مسجد نواب والی قصاب پورہ صدر بازار دہلی۔

۴۔ مدرسہ عربیہ احیاء العلوم ویٹ ضلع میرٹھ

۵۔ مدرسہ تجوید القرآن قاضی خیل قصبہ سیانہ ضلع میرٹھ

۶۔ قومی مدرسہ (نسواں) مسجد شہتوت والی کشمیری گیٹ دہلی

۷۔ مدرسہ عربیہ تعلیم القرآن حسن پور ضلع مراد آباد

۸۔ مدرسہ اسلامیہ عربیہ اشاعت العلوم کلھیڑی ضلع مظفر نگر

۹۔ مدرسہ اسلامیہ عربیہ انوار العلوم محلہ [illegible] اکھاڑے والی مسجد دیوبند

۱۰۔ مدرسہ عربیہ دار العلوم حسینیہ تاؤلی مظفر نگر

۱۱۔ مدرسہ سراج العلوم فتح پور، بھادون ڈاکخانہ جھنجھل پور ضلع سہارنپور

۱۲۔ مدرسہ الحمد اللہ عربیہ موضع پرسہ تکیہ تحصیل بستی ضلع بستی پوسٹ بستی۔

۱۳۔ مدرسہ تعلیم القرآن حسین آباد بھنیاڑہ پوسٹ نکلہ ضلع مظفر نگر

۱۴۔ مدرسہ امینیہ عربیہ اسلامیہ دہلی۔

۱۵۔ مدرسہ مولانا عبدالرب صاحبؒ مملش روڈ کشمیری گیٹ دہلی

۱۶۔ مدرسہ رحیمیہ عربیہ درگاہ صاحب داد خانؒ پیر قصبہ پہاڑی ضلع بھرتپور راجستھان۔

۱۷۔ مدرسہ اسلامیہ عربیہ دار القرآن موضع دھولا بٹہ ڈاک خانہ سرساوہ ضلع سہارنپور۔

۱۸۔ مدرسہ تعلیم القرآن اسلامیہ اسکول تکیہ قصبہ پاؤنٹہ ضلع سرمور ناھن۔ ہماچل پردیش۔

۱۹۔ مدرسہ جامعہ عربیہ انوار العلوم دندی پورہ ضلع اسلام آباد جموں کشمیر۔

۲۰۔ مدرسہ اسلامیہ عربیہ مرادیہ مظفر نگر

۲۱۔ انجمن تدریس القرآن اونہ گام بانڈی پورہ ضلع بارہ مولا کشمیر۔

۲۲۔ انوار القرآن ڈاک خانہ نعمت پور خاص ضلع سہارنپور۔

۲۳۔ مدرسہ قادریہ مظہر العلوم بندر جوڑ ضلع سہارنپور

۲۴۔ مدرسہ جامعہ شریفیہ، گلی پیچھے والی تیلی واڑہ صدر بازار دہلی

۲۵۔ دارالعلوم دیوبند

۲۶۔ جامعہ اسلامیہ ریڑھی تاجپورہ ضلع سہارنپور

۲۷۔ مدرسہ اسلامیہ عربیہ رشیدیہ جامع مسجد تحصیل حسن پور ضلع مراد آباد

۲۸۔ مدرسہ اشرف العلوم قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور

۲۹۔ مدرسہ رحمانیہ عربیہ قصبہ پاکبڑ ضلع مراد آباد۔

۳۰۔ مدرسہ فیض ہدایت رحیمی قصبہ رائے پور ضلع مراد آباد

۳۱- مدرسہ اسلامیہ رحیمیہ حفظ القرآن مرزا پور پول ضلع سہارنپور
۳۲- مدرسہ قاسمیہ عربیہ اسلامیہ بلند شہر
۳۳- مدرسہ جامعہ اشرفیہ قصبہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر
۳۴- مدرسہ عربیہ اشاعت الاسلام ہریانہ روڈ کیرانہ ضلع مظفر نگر
۳۵- مدرسہ تعلیم القرآن بادل خاں والی مسجد حسن پور ضلع مراد آباد۔
۳۶- مدرسہ اسلامیہ عین العلوم کوٹلی کمیرہ ڈاک خانہ خاص ضلع سہارنپور۔
۳۷- مدرسہ عربیہ ضیاء الاسلام موضع کاشی ڈاک خانہ خاص ضلع میرٹھ
۳۸- مدرسہ جامع عربیہ اسلامیہ ہتورا ضلع باندہ اتر پردیش۔
۳۹- مدرسہ فیض رحمانی سکندر پور ضلع سہارنپور
۴۰- مدرسہ اسلامیہ عربیہ رحمانیہ ویتیم خانہ قصبہ ٹانڈہ باولی۔
۴۱- مدرسہ اسلامیہ عربیہ حفظ القرآن نوگانوہ، ڈاک خانہ خاص
۴۲- مدرسہ تجوید القرآن مسجد تکیہ والی محلہ فیاض گنج، آزاد مارکیٹ،

پل بنگش دہلی

۴۳- مدرسہ خادم العلوم بانو والی بھیڑی پوسٹ خاص ضلع مظفر نگر۔
۴۴- مدرسہ عربیہ خادم الاسلام جامع مسجد ہاپوڑ ضلع میرٹھ
۴۵- جامعہ عربیہ حسینیہ مدرسہ رحمانیہ ہاپوڑ ضلع میرٹھ
۴۶- مدرسہ اسلامیہ عربیہ کاشف العلوم چھٹمل پور ڈاک خانہ خاص۔
۴۷- مدرسہ جامع اشرفیہ جسر سلطان نگر ضلع میرٹھ
۴۸- مدرسہ فیض القرآن موضع تاہر پور ضلع انبالہ ہریانہ۔
۴۹- مدرسہ اسلامیہ تعلیم القرآن حلاوہ تحصیل سردھنہ ضلع میرٹھ
۵۰- مسجد کتاب گھر سعودی پہاڑ۔

۵۱ - مدرسہ یتیم خانہ رحمانیہ ڈاک خانہ وڈاؤں دربھنگہ بہار

۵۲ - مدرسہ اسلامیہ ولی الاسلام قصبہ سینہ ضلع بلند شہر

۵۳ - مدرسہ اصلاح المسلمین مجھنا ملک ڈاکخانہ جھنگی نسب آفس گھوٹی باری ضلع گورکھپور۔

۵۴ - مدرسہ مخدومیہ تعلیم القرآن حوض والی مسجد محلہ خیل قصبہ کاندھلہ۔

۵۵ - مسجد کندن والی جھنے والان ۷۹۹ دہلی

۵۶ - مدرسہ اسلامیہ عربیہ حسینیہ حیات العلوم موضع میرپور ڈاک خانہ بھٹ ضلع سہارنپور۔

۵۷ - مدرسہ انعامیہ تجوید القرآن حاکی دیوبند سہارنپور

۵۸ - ادارہ اسلامیہ محلہ کسرتی شاہ جہاں پور

۵۹ - مدرسہ امداد العلوم قصبہ بوسانہ ضلع مظفرنگر

۔ مولوی محمد یوسف صاحب نے مسجد حوض والی محلہ چوڑی والان میں سنہ ۱۹۳۰ء ترجمہ شروع کیا مولوی صاحب سے کہنے کے مطابق اس مسجد میں ان کا ترجمہ کرانے والے جناب حافظ عبدالخالق بیچنے والے حاجی عبدالحکیم صاحب، حاجی عبدالمغنی صاحب حاجی شفیق احمد صاحب، حاجی شمس العارفین صاحب، حاجی عبدالحلیم صاحب، حاجی عبدالعظیم صاحب تھے۔ مولوی صاحب جب اس مسجد میں نماز فجر کے بعد ترجمہ شروع کردیتے تھے تو شروع کرنے سے پہلے حافظ عبدالحکیم صاحب اس رکوع کو جس کا مولوی صاحب ترجمہ کرتے تھے اس کی تلاوت فرماتے تھے۔ یہ سب حضرات مولوی صاحب سے کافی بڑی عمر کے تھے بعض تو ان کے والد کے برابر تھے مولوی صاحب کی اس وقت ۲۸، ۲۹ برس کی عمر تھی مولوی صاحب ترجمہ کرتے تھے وہ اس کی تلاوت فرماتے تھے۔

مولوی صاحب

اُن کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان بزرگوں نے مجھ کو اپنے بچوں کی طرح سمجھا۔ مولوی صاحب نے پہلا ترجمہ دس سال میں ختم کیا۔ مولوی صاحب کے اور حاجی عبدالحکیم صاحب کے مراسم تھے۔

اس زمانہ کا یہ واقعہ ہے کہ مولوی یوسف صاحب مدرسہ امینیہ میں درس دیا کرتے تھے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ جب مدرسہ امینیہ میں داخلہ کے دن ختم ہو چکے تھے طلبہ کو تمام کتابیں تقسیم ہو گئی تھیں۔ طلباء کو دینے کے لئے کوئی نہیں رہی تھی کہ ایک غریب طالب علم ان دنوں داخلہ کے لئے آیا حالات سامنے تھے انکار ہوا۔ لیکن ایک شرط رکھی گئی تھی کہ اگر اپنی درسی کتابیں لے آؤ گے، تو داخل ہو جاؤ گے۔ طالب علم کے پاس یہ رقم کہاں۔ وہ مولوی صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے دردناک غریبی کی داستان سنائی۔ وہ داستان مولوی صاحب نے دوسرے روز تفسیر کے وقت مسجد میں لوگوں کو سنائی۔ حاجی عبدالحکیم صاحب سن کر اٹھے، گھر گئے۔ گھر سے رقم لے کر چلے اور مطلوبہ رقم مولوی صاحب کو اسی روز پہنچا دی۔

مولوی صاحب کا بیان ہے کہ دوسرے روز حافظ عبدالحکیم صاحب میرے پاس پہنچے اور فرمایا مولوی صاحب میری رقم تو مجھ کو مل گئی۔ رات کو آقائے نامدار حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں تشریف لائے اور مجھ کو بہت سارے روپے عنایت فرما گئے۔

دوسرے ترجمہ کے زمانہ میں حافظ محمد سعید ایڈوکیٹ جناب سلطان العارفین صاحب، حاجی نعیم الدین صاحب، حاجی ثواب الدین صاحب، محمد یعقوب صاحب اور شیخ بدرالاسلام تھے۔ یہ حضرات بھی مسجد کی دیکھ بھال، ترجمہ کا انتظام، مصارف کیلئے

روپے کی فراہمی اور مولوی صاحب کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔

تیسرا ترجمہ ۱۱ مئی ۱۹۵۸ء کو شروع ہوا اس وقت حافظ احمد جمالی صاحب حاجی نبی احمد صاحب، حافظ حاجی عبدالمنان صاحب، حاجی نواب میاں صاحب نورالاسلام صاحب، مولوی خورشید عالم صاحب، اور عرفان الٰہی صاحب تھے یہ لوگ بھی اپنے پچھلے لوگوں کی طرح مسجد کی دیکھ بھال و انتظام اور مصارف فراہم کرتے تھے۔ یہ ترجمہ و تفسیر ساڑھے تیئس سال کے بعد ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو ختم ہوا۔ اس روز مولوی صاحب نے قرآن مجید ختم کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرکے فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جس نے اپنے محسن انسان کا شکریہ ادا نہیں کیا وہ خدا کا شکریہ کیسے ادا کردے گا اس لئے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنے کے بعد میں ان پچاس سالوں میں میرے ساتھ میرے دوستوں نے مجھ پر جو احسان کئے تھے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ مولوی صاحب نے ان تینوں ترجموں کے منتظمین کے گروپوں کے مذکورہ نام گروپ وار بڑے احترام سے لئے اور فرمایا اس پچاس سال کے عرصہ میں کسی شخص نے مجھ کو تجارت کرتے یا کاروبار کرتے ہوئے نہیں دیکھا ان حضرات نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ میری پرورش کی۔ مجھ کو اپنے بچوں کی طرح رکھا اور مجھ کو اتنا سہارا جس کا اندازہ نہیں بتا سکتا۔ انھوں نے مجھ کو قرضدار ہوتے نہیں دیا۔ میں نے اس زمانہ میں اپنی چار بچیوں کی اور ایک بچے کی اور الحمد للہ علیٰ احسانہ چار حج کئے۔ اللہ تعالیٰ اس کا ان کو اجر عطا فرمائے گا۔

مولوی صاحب نے اپنی تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں نماز پڑھاتے تھے تو ان مسلمانوں پر افسوس فرماتے تھے کہ جو مسجد نبویؐ میں نماز پڑھنے نہیں آتے تھے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا میرا جی چاہتا ہے کہ میں جاکر ان کے گھروں میں آگ لگا دوں۔ مولوی صاحب نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لئے غصہ آتا تھا کہ

مجھ کو اور میرے ساتھیوں پر مخالفین نے کتنے مظالم توڑے ہیں کتنے مظالم برداشت کئے اور مسلمانوں نے کتنی سختیاں جھیلیں۔ اس کے باوجود اللہ کا حکم ہوتے ہوئے بھی مسجد نبوی میں نماز پڑھنے نہیں آتے۔ مولوی صاحب نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمت اللعالمین تھے۔ ان کو اپنے نافرمانوں پر یہ غصہ آیا۔ مجھ گنہگار و عاصی کا ان سے کیا مقابلہ۔ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ میرے وعظ کے سننے والے بازاروں میں کھڑے ہو کر لڑکیوں کو تکتے ہیں اور کھڑے ہو کر پانی پیتے ہیں۔ کیا مجھ جیسے جذباتی آدمی کو غصہ نہیں آئے گا۔

مولوی صاحب نے اسی محفل میں حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ میں نے اس پچاس سال کے عرصہ میں اپنے سننے والوں اور سننے والیوں کو بہت سخت الفاظ کہے ہیں۔ اور بری طرح ڈانٹا ہے۔ میں کھلے لفظوں میں ان سے معافی مانگتا ہوں۔ خدا کے لئے مجھ کو اپنا بچہ اور خادم سمجھ کر معاف فرمائیں۔ آپ لوگ بھی انسان ہیں آپ نے بھی مجھ کو کبھی برا بھلا کہا ہوگا۔ میرے خلاف الفاظ استعمال کئے ہوں گے۔ اس لئے میں بھی آپ کو معاف کرتا ہوں۔ میں معافی بھی اس لئے مانگ رہا ہوں کہ میری پچاس سالہ محنت رائیگاں نہ چلی جائے۔[۱]

مولوی یوسف صاحب کے متعلق میری معلومات یہ ہے:۔

مولوی یوسف صاحب کے والد ماجد علی محمد صاحب دہلی کے رہنے والے تھے مولوی صاحب کے والد ماجد مولوی صاحب کی بیوی سرور جہاں کی بیوی کی اماں کی پھپھی کے بیٹے کے بھائی تھے گویا مولوی صاحب کے والد کا رشتہ مولوی یوسف صاحب

---

[۱] مولوی صاحب کے پچاس سالہ ترجمہ کی معلومات مولوی صاحب کی تقریر مورخہ ۲۴ اکتوبر کی کیسٹ سے لی گئی ہے۔ یہ کیسٹ فاطمہ بیگم کے پاس ہے۔

کی اہلیہ سے قریبی رشتہ تھا۔ اور ان کی اہلیہ دہلی صدیقی برادری کی تھیں۔ ان کے والد ماجد محمدؒ یعقوب صدیقی تھے جن کے بھائی محمدؒ زکریا تھے ان کے بیٹے محمدؒ ادریس ہوئے ان کے خاندان کے لوگ پاکستان میں سندھ میں کراچی میں سکونت رکھتے ہیں۔

علی محمدؒ صاحب تلاش روزگار کے لئے بمبئی چلے گئے۔ وہاں ایک کپڑے کی مل میں منیجری کی ذمہ داری سنبھالی اور بمبئی کی ایک عورت سے نکاح کر لیا۔ ان سے چار اولادیں دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں۔ ایک فرزند نور احمدؒ اور ایک لڑکی نوجوانی میں فوت ہو گئیں اور ایک صاحب زادے محمدؒ یوسف اور ایک لڑکی خاتون زندہ رہیں۔ ان کی والدہ کا جب بمبئی میں انتقال ہو گیا تو محمدؒ یوسف کے والد ماجد دہلی آ گئے اور حکیم جی والی گلی محلہ چوڑی والاں میں سکونت اختیار کی جب محمدؒ یوسف کی والدہ کا انتقال ہوا ہے تو ان کی عمر ساڑھے چار سال اور نور محمدؒ کی عمر دو سال کی تھی۔

محمدؒ یوسف کے والد ماجد نے دہلی میں اگر بتی ماران میں ایک دکان لی اور پارچہ کا کاروبار شروع کیا۔ اور دہلی میں صدیقی برادری کی ایک لڑکی محمودہ سے شادی کر لی علی محمدؒ صاحب بمبئی سے اپنی والدہ کو اپنے ہمراہ لائے۔ انھوں نے محمدؒ یوسف اور خاتون زبیدہ کی پرورش کی مولوی صاحب کہا کرتے تھے کہ ہم جب دونوں بھائی پڑھنے صبح کے وقت جاتے تھے تو ہم کو ہماری دادی بسکٹ پر دودھ رکھ کے کھلایا کرتی تھیں۔ گویا مولوی صاحب کی پرورش ان کی دادی نے کی۔ مولوی صاحب کی دوسری والدہ سے ایک لڑکا محمدؒ کامل اور ایک لڑکی کنیز خاتون عرف ممو ہوئیں۔

مولوی صاحب کے والد ماجد بھی زندہ نہیں رہے۔ مولوی صاحب کی اس وقت دس برس کی عمر تھی جب ان کا انتقال ہوا۔ جائیداد کی تقسیم ہوئی تو مولوی صاحب کے حصہ میں بلی ماران کی دوکان اور بمبئی کی ایک زمین آئی۔ مولوی صاحب اس وقت نابالغ تھے۔ مولوی صاحب کے والد کے دوست حاجی عبد الحکیم صاحب کے چھوٹے

بھائی عبدالعلیم تھے تقسیم کے وقت انھوں نے علی محمد صاحب کے داماد محمد عمر کو اُن کا شریک بنا دیا۔ دکان چلانے کے لیے ان کو مل گئی۔ انھوں نے غضب یہ کیا کہ مولوی صاحب کے مال زرجو پہلے سب کھاپی کر برابر کر دی بمبئی کی زمین کسی وقت بمبئی جاکر مولوی صاحب نے فروخت کر دی تھی۔

مولوی صاحب نے قرآن مجید ناظرہ مولوی یار محمد صاحب کے بھائی مولوی نیاز محمد سے گلی تخت والی محلہ چوڑی والان میں پڑھا اس کے بعد آخر چوڑی والان میں ایک دکان کرایہ پر لی اس میں کتابوں کا کاروبار کیا[1]۔

مولوی صاحب کے والد ماجد کے انتقال کے بعد مولوی صاحب کی رہائش کا مسئلہ بڑا پریشان کن ثابت ہوا۔ دات کبھی کسی کے ہاں گذار دی کبھی کسی کے ہاں۔ گلی بیگز ین والے اسکول میں تعلیم شروع کی۔ اس اثنا میں اپنی خالہ افروز کے ہاں رہنے لگے۔ انھوں نے اپنی خالہ مہر کی لڑکی سے شادی کی بات کی مولوی صاحب کی اس وقت مالی حالت اچھی نہیں تھی خالہ مہر انکار کرتی رہیں یہ پڑھنے کے لیے مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور چلے گئے۔

سال بھر میں ایک مہینے کی رمضان کی چھٹی مولوی صاحب کو ملتی تھی وہ مہینہ دہلی میں گذارتے تھے تعلیم سے فارغ ہونے سے دو سال پہلے مولوی صاحب رمضان کی چھٹیاں دہلی میں گذارنے کے لیے آئے۔ تو حاجی عبدالحلیم صاحب، حاجی یوسف صاحب کے صاحبزادے محمد یونس اور دوسری رشتہ کی عورتیں خالہ مہر کے پاس گئیں۔ اُن کو شادی کے لیے تیار کیا گیا تو اسی سال مولوی صاحب کا سرور جہاں بنت محمد یعقوب صاحب کے ساتھ نکاح ہو گیا۔ نکاح

---

[1] یہ معلومات سرور جہاں اہلیہ مولوی یوسف صاحب سے معلوم ہوئی۔

میرے والد ماجد حضرت العلامہ مولانا شرف الحق صاحب صدیقی، قادری وصابری
نے پڑھایا۔ وداع ہوکر اس مکان میں آئیں۔ جہاں آجکل نثار احمد صاحب گلی حکیم جیت
والی کے مکان میں رہتے ہیں۔ مولوی صاحب تعلیم سے فارغ ہوکر دیوبند سے دہلی آگئے۔
تو اس مکان کے سامنے والے مکان نمبر ۵۴۷ کے بالاخانہ پر رہائش اختیار کی۔ اسی
مکان میں مولوی صاحب کا انتقال ہوا۔ اس میں ان کی اہلیہ اور صاحبزادیاں رہتی ہیں

مولوی یوسف صاحب کو نوجوانی کے زمانہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے
بے پناہ لگاؤ تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ بھی مولوی یوسف صاحب کے
طرف تھی۔ یہ مولوی یوسف صاحب ۵۷ سال مسجد کے ایک حجرہ میں رہ کر درویشی اور
فقیرانہ زندگی گذار کر تفسیر و حدیث کی وہ خدمت انجام دی جس کی ابتدا دہلی میں حضرت
شاہ عبد الحق محدث دہلوی اور ان کے خاندان والوں نے کی۔ اور شاہ ولی اللہ رحمۃ
اللہ علیہ اور ان کے فرزندان نے اس کی تکمیل کی۔ اس کے بعد اس کے نقش قدم پر مولانا
محمد حسین فقیر اور ان کے صاحبزادگان مولانا حبیب الرحمن، مولانا عبد الرحمن راسخ،
مولانا ابراہیم اور مولانا اسحاق علی الخصوص مولانا عبد الرحمن راسخ اور تلمیذ رشید
حضرت سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب چلے اور اس کی آخری کڑی دہلی والوں
میں مولانا محمد یوسف صاحب فقیر تھے۔ ان کی بھی دینی تعلیم کی طرف توجہ نہیں ہوئی
تھی اور تعلیم بلا فیس سکھنے بہار پور نہیں گئے تھے لیکن اس عالم جوانی میں درود پڑھنے
کا شوق تھا۔ ان وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر التفات آپ
پر پڑی۔

ایک رات خواب میں دیکھتے ہیں کہ مٹیا محل کی طرف سے جامع مسجد کے
دروازہ کے سامنے باہر کے چبوترہ پر ایک تخت بچھا ہوا ہے۔ کافی نورانی بزرگ صورت
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب

مولوی یوسف صاحب بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ آقائے نامدار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مولوی یوسف صاحب کے سر پر ہاتھ رکھا۔ چنانچہ مولوی یوسف صاحب اس واقعہ کے بیان کرنے کے بعد اپنی تقریر میں بیان فرمایا کرتے تھے یہ اسی مقدس و مطہر و پاکیزہ ہاتھ کا صدقہ ہے جو میں اس مسجد میں کافی عرصہ دراز سے قرآن مجید کے نکات تفسیر کی شکل میں بیان کر رہا ہوں [1]۔

ایک واقعہ اور گوش گزار کر لیجئے۔ اخصاص طور پر ان لوگوں کے قابل توجہ ہے جو یہ تسلیم نہیں کرتے قرآن کی تفسیر اور میلاد النبی کی محفلوں میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہیں لاتے۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی تو اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسی محفلوں میں تشریف فرما ہوئے ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ مسجد حوض والی محلہ چوڑی والان دہلی میں ہوا۔ جب مولوی محمد یوسف تفسیر ما کان محمد ابا احد کی تفسیر فرما رہے تھے کہ سامعین میں سے ایک صاحب حوض کے پاس اس کے دسے پر ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے اور مولوی صاحب کی تفسیر سن رہے تھے کہ ان کو غنودگی طاری ہو گئی تو دیکھتے کیا ہیں کہ اس محفل میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ آنکھ کھل گئی تو یہ واقعہ انھوں نے حاضرین کو بلند آواز سے سنایا۔

محمد تقی پہلوان مولوی محمد یوسف کے خدمت گزاروں میں سے ہیں جو بہت عرصے مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب بھی

---

[1] یہ دونوں خواب کے واقعے میری اہلیہ صابرہ خاتون نے سنائے جو مولوی صاحب اپنے وعظوں میں بیان کر چکے تھے۔

پہلوان کو بڑی قدر و منزلت سے دیکھتے تھے اپنی تقریروں اور خاص طور پر ختم کے موقع پر اپنے مضمونوں کے ساتھ پہلوان کا بھی شکریہ ادا کرتے تھے۔

محمد تقی پہلوان نے ایک واقعہ مجھ کو ۷ ارنومبر ۱۹۸۶ء کو میرے گھر پر سنایا کہ رمضان کا مہینہ تھا مولوی صاحب افطار کر کے سو گئے تھے عشاء کی نماز سے پہلے حسب دستور پہلوان نے مولوی صاحب کو جگایا تو مولوی صاحب مجھ پر ناراض ہوئے کہ پہلوان تم نے غضب کر دیا اللہ تعالیٰ کا مجھ کو دیدار ہونے والا تھا تم نے مجھ کو جگا دیا تقی پہلوان نے مولوی صاحب سے دریافت کیا مولوی صاحب کیسے دیدار ہونے والا تھا تو مولوی صاحب نے بتایا کہ

میں خواب دیکھ رہا تھا کہ ایک بہت بڑا وسیع میدان ہے جس میں بڑے بڑے صحابہ اور انبیاء تشریف فرما ہیں اور فرشتوں کی قطاروں پر قطاریں لگی ہوئی ہیں ایک صاحب سے معلوم کیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے تو اس نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ جلوہ افروز ہونے والے ہیں۔ یہ بات ختم ہوئی تھی کہ تم نے بیدار کر دیا اللہ تعالیٰ کا دیدار نہ ہو سکا اور دیدار سے محروم ہو گیا۔ تقی پہلوان کا یہ بھی کہنا ہے کہ مولوی صاحب کے دونوں آنسو بہتے رہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مولوی یوسف صاحب نے اپنی تقریر میں جس میں آپ تفسیر بیان کر رہے تھے (جو مسجد جامع ہجری مولیٰ میں) بتایا کہ میرے پاس تین پولیس افسران آئے جس میں ایک مسلمان افسر بھی تھے یہ ایمرجنسی کا زمانہ تھا اس وقت حکومت نس بندی پر بہت زیادہ زور دے رہی تھی جو نس بندی کی مخالفت کرتا تھا اس کو اپنا مخالف سمجھتی تھی اور اس کو قید بند کر دیا جاتا تھا۔

ان پولیس افسران نے ایک فتویٰ مولوی صاحب کو دکھایا جو نس بندی کے خلاف تھا اس میں مولوی صاحب کا نام تھا۔ انھوں نے معلوم کیا اس فتوے پر آپ نے

دستخط کئے ہیں یہ نام آپ کا اس میں درست ہے؟ مولوی صاحب نے اس فتوے
کو پڑھا اور کہا کہ میں نے اس فتوے پر دستخط نہیں کئے لیکن اس پر جو لکھا ہے وہ بالکل
درست ہے اور صحیح ہے۔ نس بندی نسل کشی اسلام میں جائز نہیں ہے میں اس
فتوے سے کلی طور پر اتفاق کرتا ہوں اگرچہ میرے اس پر دستخط نہیں ہیں مگر یہ
شریعت کے مطابق ہے اس لئے میں اپنا نام اس میں صحیح مانتا ہوں تب پولیس
افسر نے کہا مولوی صاحب آپ گرفتار کئے جائیں گے مولوی صاحب نے کہا
بھائی شریعت اسلامیہ تو یہی کہتی ہے میں شریعت کے خلاف کیسے جا سکتا ہوں
خدا کو شریعت کے خلاف فیصلہ دے کر کیا جواب دوں گا۔ اس افسر نے کہا آپ
اپنا بیان لکھ کر دے دیں چنانچہ مولوی صاحب نے نس بندی کے خلاف بڑی
وضاحت کے ساتھ اپنا بیان لکھ کر پولیس افسر کو دے دیا۔ وہ بیان لے کر
پولیس افسر نے مولوی صاحب سے کہا کہ حکومت آپ سے ناراض ہو جائے گی
مولوی صاحب نے جواب دیا کہ میں شریعت کے خلاف ایک لفظ نہیں کہہ سکتا
اور نہ لکھ سکتا ہوں [1]۔

مولوی یوسف صاحب کی زندگی کا اچھا خاصا حصہ بیوی کی خوشی کے بغیر تنہا ہی
تنہا گذرا تنہائی مولوی صاحب نے اس لئے اختیار نہیں کی تھی کہ انھیں عورتوں سے
نفرت تھی بلکہ اس لئے کہ مولوی صاحب بچپن ہی سے حج پر جانے کے لئے روپے
جمع کر رہے تھے۔ انھوں نے اسی زمانہ میں اپنی چار لڑکیوں اور ایک صاحبزادے
کی شادی کی اور چار حج بھی کئے۔
لکھنے پڑھنے والے اور اللہ تعالیٰ کے لوگ تنہائی کو تنہائی اتنا نہ

---

[1] یہ بیان فاطمہ بیگم اہلیہ محمد سعید عرف بابو کے پاس ہے۔

ضروری ہے مولوی صاحب عمدہ قسم کے مفسر قرآن تھے۔ پچاس برس تفسیر بیان کی شاعر
بھی تھے ان کا اچھا خاصہ کلام موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ و
سلم سے بے پناہ محبت و عقیدت رکھتے تھے مفسر قرآن جب تفسیر بیان کرتا ہے
تو اس کی تیاری کے لئے وقت چاہیے۔ احادیث اور تفاسیر کی کتابوں کا مطالعہ کرنا
ضروری ہوتا ہے، شاعری کے لئے وقت چاہیئے۔ اللہ کی عبادت میں پنجگانہ نمازوں
کے علاوہ تہجد کے نفل ضروری ہیں تہجد کے نفلوں سے مسلمان کو بڑے درجات
حاصل ہوتے ہیں جتنے اولیاء اللہ گذرے ہیں۔ وہ تہجد کے نفلوں کے ہی مرہون منت
ہیں۔ مولوی صاحب کو رات کو تنہائی میں تفسیر کی بیان کرنے کی تیاری کے لئے وقت
ملتا تھا۔ تہجد کے نفل بھی اسی تنہائی میں پڑھتے تھے اور تنہائی کے وقت ہی شعر
کہنے کا موقع ملتا تھا۔

اگر رات کو گھر میں سوتے تو کہاں یہ تنہائی ملتی بچوں اور بچیوں کی چیخ و پکار
میں یہ اطمینان حاصل ہو سکتا تھا قطعاً نہیں۔ اس لئے مولوی صاحب نے تنہائی
کو پسند کیا۔ گھر میں رہتے تو ان کو وہ سکون و اطمینان نہیں ملتا جو ان کو ملنا چاہیئے تھا۔

مولوی صاحب حساب، الجبرا اور جیومیٹری میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ اسی
دلچسپی کے پیش نظر میں نے اپنے ایک دوست ماسٹر بلرام صاحب (جو گاندھی
میموریل اسکول شاہدرہ میں سینئر کلاسوں کو حساب پڑھاتے ہیں) سے ملاقات
کرائی۔ چند ملاقاتوں کے بعد بلرام صاحب اکثر و بیشتر میری غیر موجودگی میں اکر مولوی
صاحب سے ملتے کبھی کبھی مولوی صاحب ان کے ساتھ شطرنج کھیلتے تھے۔ ایک
روز مولوی صاحب نے بلرام صاحب کو بلوایا جب وہ آ گئے تو ان سے کہا۔ بھئی
بلرام صاحب، یہ ایک سوال ہے دو دن سے کوشش کر رہا ہوں مگر صحیح جواب نہیں
آتا۔ ذرا اسے حل کیجئے۔ بلرام صاحب نے قلم کاغذ سنبھالا دس منٹ گذر گئے۔ پھر بھی

طرح ایک گھنٹہ ہوگیا مگر کوشش کے باوجود صحیح جواب نہیں آیا۔ بلرام صاحب نے
کہا: "مولوی صاحب یہ جوری کا مار ہوتا ہے۔ میں اسے جرمنی ایمبیسی بھیج دیتا ہوں وہاں
سے یہ سوال حل ہو کر آجائے گا۔" مولوی صاحب نے کہا: "یہ کام تو میں بھی کر سکتا
ہوں مگر سوچتا ہوں کہ ایمبیسی والے کہیں گے کہ اتنے بڑے ملک میں ایک بھی آدمی
ایسا نہیں جو یہ سوال حل کر سکے۔ اس طرح اس ملک کی توہین ہوگی نہیں۔ بھائی یہ
صحیح طریقہ نہیں ہے۔ میں خود کوشش کروں گا۔" بات ختم ہوگئی۔ چند دن بعد مولوی
صاحب نے مجھے بلوایا اور کہا: "بلرام آئیں تو کہنا مولوی صاحب نے سوال حل کر لیا
ہے آکر دیکھ جائیں۔" دو دن بعد اتفاق سے بلرام صاحب آئے اور پھر مولوی صاحب
نے انہیں حل شدہ سوال دکھایا۔ بلرام صاحب حیران رہ گئے اور کہا: "میں
ایم ایس سی ہوں بیس سال سے حساب الجبرا پڑھا رہا ہوں مگر میں یہ سوال حل
نہیں کر سکا، آپ نے حل کر دیا۔" مولوی صاحب بولے: "بھائی سب میرے مولا کا
کرم ہے۔ چند دن پہلے عشا کی نماز پڑھ کر لیٹا تھا کہ اس سوال کا خیال آیا۔ بیٹھے
لیٹے سوچنے لگا۔ اسی طرح سوچتے سوچتے ایک حل نظر آیا۔ اسی وقت بستر
سے اٹھا قلم کاغذ لے کر بیٹھ گیا۔ بس دو منٹ میں صحیح جواب آگیا۔"

مولوی صاحب عمدہ شطرنج کھیلتے تھے۔ شطرنج میں ان کی ساری توجہ اس
بات پر مرکوز رہتی تھی کہ دوسرے کھلاڑی کو کم سے کم ہر چال کے ساتھ پیدل مات
دی جا سکے۔ وہ ہمیشہ دیسی شطرنج کھیلتے تھے، اور کہا کرتے تھے کہ انگریزوں نے اپنی
آسانی اور وقت بچانے کے لیے انگلش شطرنج کی چالوں میں فرق کر لیا ہے۔ جو بات
دیسی شطرنج میں ہے وہ انگلش میں کہاں۔ اصل دماغ سوزی کا کام تو دیسی شطرنج ہے۔
مولوی صاحب کو اسی کے ساتھ دیسی طریقہ علاج بھی پسند تھا۔ وہ کہتے تھے
کہ نزلہ زکام کا علاج ڈاکٹروں کے پاس نہیں۔ ہمارے حکیم ہی اس کا صحیح علاج

کرسکتے ہیں۔ مولوی صاحب اپنی صحت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کے کھانے
پینے، کام کرنے، سب کے اوقات مقرر تھے۔ دوپہر کا کھانا عام طور پر گیارہ بجے
اور رات کا کھانا بعد نماز مغرب۔ اس معمول میں کبھی فرق نہیں آیا۔ دعوتوں
میں بہت کم جاتے تھے۔ انتقال سے پانچ سال پہلے تک مولوی صاحب میرے دوست
نعیم صاحب کے گھر پر ہر مہینہ دو مہینہ میں اتوار کے دن آتے تھے۔ ہم لوگ مولوی صاحب
کے پسندیدہ اور مرغوب کھانے پکواتے۔ مولوی صاحب کی خوراک صرف دو چپاتیاں
تھیں۔ اگر دسترخوان پر ان کی پسندیدہ دو تین ڈشیں ہوتیں تو وہ ایک چپاتی
کم کر دیتے۔ ہم نے کبھی انھیں زیادہ تعداد میں کھاتے نہیں دیکھا۔ مگر مولوی صاحب اپنے
اصولوں پر سختی سے عمل کرتے تھے وہ کہتے تھے کہ زبان اور پیٹ کا کہنا ماننے والے
ہمیشہ بیمار رہتے ہیں۔ مولوی صاحب رات کا کھانا کھانے کے بعد مسجد کے صحن میں
ہی ٹہلا کرتے تھے تاکہ عشاء کی نماز تک کھانا ہضم ہو جائے۔ وہ عام طور پر عشاء کی
نماز کے بعد اپنا حجرہ بند کر لیا کرتے تھے پھر کسی کو اجازت نہ ہوتی تھی۔ کہ وہ مولوی صاحب
کا حجرہ کھٹکھٹائے۔ ایک بار میں ایک ضرورت کے تحت ایسے وقت پہنچا جب
مولوی صاحب سو چکے تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر بعد مولوی
صاحب نے انتہائی غصہ میں دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھا اور پھر لہجہ بدلتے ہوئے بولے
اس وقت کیوں آئے ہو؟ میں نے آمد کی وجہ بتائی۔ سُنا اور پھر کہا۔ آج زندگی
میں تم پہلی مرتبہ اس وقت آئے ہو اس لئے معاف کرتا ہوں مگر آئندہ
کبھی اس وقت نہ آنا۔ میں نے معذرت کے ساتھ کہا مولوی صاحب میں اس
بات سے بخوبی واقف ہوں لیکن جن صاحب کے لئے میں آیا ہوں وہ مسجد کے باہر
موجود ہیں ان کی ہمت نہ ہوئی۔ میں نے ان کی حالت دیکھ کر یہ گستاخی کی۔ ہاں تم
اپنے لئے نہیں آئے اتنی بات میں بھی سمجھتا ہوں۔"

میں اپنے پروگرام کی ریکارڈنگ کے لئے ریڈیو اسٹیشن جاتا تو وہاں اردو مجلس اور ایکسٹرنل سروس کے لئے پروگرام تیار کرنے والوں نے مجھ سے کئی مرتبہ کہا کہ "ہم مولوی صاحب کی تقریر نشر کرنا چاہتے ہیں مگر وہ ہمیشہ انکار کر دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں تم مولوی صاحب سے بات کرو۔ جب میں نے مولوی صاحب سے اس سلسلہ میں درخواست کی تو انھوں نے کہا میاں ریڈیو والے تقریر کا وقت مقرر کرتے ہیں۔ بھائی یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ میں سیرت رسول ﷺ پر صرف دس پندرہ منٹ کی تقریر کروں۔ کیا سیرت اور فضائل دس منٹ میں بیان ہو سکتے ہیں انھیں میری آواز کی نشر کرنی ہے تو میرے وعظ دلی میں ہوتے رہتے ہیں آکر ریکارڈ کرلیں اور پھر جتنا چاہیں نشر کر دیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔[1]

مولوی محمد یوسف صاحب نے شعر و شاعری بھی کی ہے۔ ان کا کلام کسی شاعر سے کم نہیں ہے نعتیہ کلام میں جواب نہیں رکھتے تھے، وہ اُن کے دل کی آواز ہوتی تھی اپنے وعظوں میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے جس عقیدت و محبت کا اظہار فرماتے تھے وہ اُن کے وعظوں کی جان ہوتی تھی اور یہی ان کے نعتیہ اشعار کی شان ہے ۔

بگڑی ہوئی تقدیر کو کس طرح بنا لوں / روٹھے ہوئے محبوب کو کس طرح منا لوں

اے فخر رسل راحت جاں رنج دو عالم / دل چاہتا ہے آپ کو مہمان بنا لوں

جبریل نہیں حلہ نہیں عرش نہیں یاں / ہاں اگر آپ آئیں تو آنکھوں میں بٹھا لوں

اک لمحہ ٹھہر جاؤ چلے جانا میری جاں / میں درد محبت کا فسانہ تو سنا لوں

رکھ دیجئے ذرا پائے منور مرے سر پر / پاپوش مبارک کو آنکھوں سے لگا لوں

کیا لطف ہو گر حشر میں سردار دو عالم
فرمائیں فقیر آ تجھے دامن میں چھپا لوں

دل چاہتا ہے اُڑ کے مدینہ کو دیکھ لوں / اس زندگی میں گلشن طیبہ کو دیکھ لوں

[1] یہ معلومات فیروز دہلوی صاحب نے مجھ کو لکھ کر دی۔

کنعاں کے حُسنِ طور کے جلوے کو میں فقیرؔ — دیکھوں نہ دیکھوں گنبدِ خضرا دیکھ لوں

جو تھا جبینِ آدم و حوّا میں جلوہ ریز
نورِ اوّلین کے سراپا کو دیکھ لوں

اے خدائے پاک کی صنعت کے نقشِ اوّلین — اے کلام اللہ کا یک ایک نقطے کے امین
آپ سرتاجِ ملائکؑ آپ سرتاجِ رُسل — آپ سرتاجِ خلائق اوّلین و آخرین

صد شکر عفو میرے گناہ حشر میں ہوئے — حُرمت گدا کی مجلسِ شاہی میں رہ گئی
صد شکر منھ سے نام محمدؐ نکل گیا — بات اپنی بارگاہِ الٰہی میں رہ گئی

پردہ بجز اس کی ذات کو کیا کام تھا فقیرؔ
چھپ کر صفاتِ لاانتہاہی میں رہ گئی

جو مدینہ میں جانا ہو شوق، تو چلو اجازتِ عام ہے
یہاں نیک و بد کی تمیز ہے، نہ کوئی فرق شاہ و غلام ہے
یہاں نور کی ہے تجلیاں، یہاں ماند طور کی جھلکیاں
یہی برجِ شمسِ منیر ہے، یہ مقامِ بدرِ تمام ہے
یہ ہے جنس دانش و ملائکہ کے رسولؐ کی خوابگاہ
یہیں جلوہ فرما خدائے پاک کے انبیاء کا امام ہے
چلو آمنہ کے یتیم پر، دل و جان و مال فدا کریں
ہوں نثار ہائے حبیبؐ پر، یہی عشقبازوں کا کام ہے
یہ ہزاروں عاشقِ دل آمتی، درِ آستاں پہ ہیں سرنگوں
مگر کرم کے بھکاریوں کو تلاش ساقی و جام ہے
کوئی جام سلفئے حشر تشنہ کو لطفِ عمیم کا
انہیں ایک قطرۂ معرفت ہی سرورِ کیف دوام ہے

جو نظر پڑی تھی بلالؓ پر مری سمت بھی   دوسرا

یہ فقیر بے کس و بے نوا بھی حضوری کا غلام ہے

الٰہی میں خلدِ بریں سے نکل کر جہنم کے طبقے میں کیوں آ پڑا ہوں

حرم ہے نہ کعبہ، منیٰ ہے نہ زمزم، نہ وہ سبز گنبد نہ روزے کی جالی

الٰہی یہ کیوں ہے مدینے سے دوری نگاہِ کرم پھر گئی کیوں خدایا

فقیرِ جگر سوختہ بھی وہی ہے، وہی شاہِ یثرب کا دربارِ عالی

خدایا مدینے میں ان کو بلا لے، تری رحمت اللعالمین کا صدقہ

نہ لگ جائے ٹھیس ان کے دکھی دلوں کو، یہ مسکیں ہیں تیرے در کے موالی

ہم بیکسوں کے ہیں سائل ہیں اے کریم   سب سے زیادہ آپ کی رحمت کا واسطہ

تو بخش دے ہمارے گناہوں کو اے کریم   ہم عاصیوں کے اشکِ ندامت کا واسطہ

ہم کو بھی ہو نصیب جنونِ ابوذری   اس عاشقِ رسول کی الفت کا واسطہ

ہم کو بھی تو مدینے میں پہنچا دے اے کریم   یارب تیرے حبیب کی عزت کا واسطہ

ہم سب کو ہو نصیب مدینہ کی سرزمیں   یارب مکینِ گنبدِ خضریٰ کا واسطہ

کر لے قبول دکھی دلوں کی یہ آرزو   اس کعبۂ خلیلؑ کی عظمت کا واسطہ

جو دشمنوں کو دیتے رہا عمر بھر دعا   اس آمنہ کے لال کی تربیت کا واسطہ

محروم کیجئے نہ ہمیں اپنے فضل سے   اللہ میاں تمہاری محبت کا واسطہ

محروم رہ نہ جائے ترا بے نوا فقیر

اے رحمتِ خدا تیری وسعت کا واسطہ

حسینؓ ابن علیؓ کے بیکس غلاموں کا صدقہ   گرفتارِ مصیبت امتِ با ایمان کا صدقہ

خدا مضطرب کے دردِ ملال کا صدقہ   حلیمہ کے کلیجے آمنہ کے لال کا صدقہ

تو اپنے فضل سے ہم سب کو پہنچا دے مدینے میں   سفینہ بھی بھنور میں تیری قدرت سے ابھرتا ہے

تو ہر بیکس کی ہر لاچار کی فریاد سنتا ہے
تو کافر تک کا دامن اسکے ارمانوں سے بھرتا ہے
مرا دل بھی مدینے کی زیارت کو ترستا ہے
رسول پاک کا دربار دکھلائے مدینے میں

نہ یہ گلشن رہے گا اور نہ اس کا رنگ و بو باقی
نہ کوئی حسن پروانہ اور نہ کوئی شمع رو باقی
فنا ہے ذرہ ذرہ کو رہے گا تو ہی تو باقی
الٰہی بس ایک ہی رہ گئی ہے آرزو باقی

فقیر دہلوی کی قبر بنوا دے مدینہ میں
تو اپنے فضل سے ہم سب کو بلوائے مدینہ میں

مدینہ ہند سے ہم کاش جاتے اپنی آنکھوں سے
مزار مصطفےٰ کو دیکھ آتے اپنی آنکھوں سے
نہ ہوتا درد اور گر گنہگاران امت کا
محمد مصطفےٰ کیوں خوں بہاتے اپنی آنکھوں سے
اگر تصویر رخسار محمد ہاتھ آجائے
سے قرآن کی صورت لگاتے اپنی آنکھوں سے
خدا کے سامنے محشر میں بہر بخشش امت
محمد آئیں گے آنسو بہاتے اپنی آنکھوں سے
اگر تھوڑی سی بھی خاک مدینہ ہاتھ آجاتی
ہم آنکھوں کے لئے سرمہ بناتے اپنی آنکھوں سے

فقیر اچھا اگر ہوتا مقدر ہند سے جاکر
محمد مصطفےٰ کو دیکھ آتے اپنی آنکھوں سے

الٰہی کر مشرف مجھ کو دیدار محمد سے
میری آنکھیں بھی قربانی ہوں بہ تو ائے محمد سے
در مقصود سے ہر فیض ہے ہر سائل کا یہی بس
نہیں محروم جاتا کوئی در بار محمد سے
غم امت میں روئے ہیں جناب مصطفےٰ اکثر
رواں ہیں چشمے ہمیشہ چشم خونبار محمد سے
کئے رکھتا ہے سایہ اسکے سر پہ اپنی رحمت کا
خدا کو شرم آتی ہے گنہگار محمد سے

فقیر ان کے رخ پر نور سے خورشید شرمایا
خجل ہے ماہ نو ابروئے خمدار محمد سے

علی حسین و حسن، فاطمہ رسول کریم
یہ پنجتن ہیں ہر اک میری جان پیارا ہے

قبول ان کی شفاعت ہو محشر میں فقیر ہو بیڑا پار انہی کا مجھے سہارا ہے

فقیر قبر میں منکر نکیر پوچھے جو ملے ستم ہے بدلہ ترے جرم ہائے بے حد کا

میں رو کے بولا ہے تسلیم سب گناہ مگر قسم خدا کی میں ہوں امتی محمدؐ کا

جہنم کی نہ کھٹک ملی گل کی جب میری تربت میں فرشتے چیخ اٹھے یارب یہ کس کی تربت ہے

یہ قدرت نے سینہ چیر کر دکھلایا مرا کہ اس بندے کے سینہ میں تو تصویر محمدؐ ہے

فقیر اک بلبل نالاں سے گلشن میں کہا یعنی کہا کس کا کہہ کر تو ہوا عاشق محمدؐ تیرا کا

کہا عاشق حقیقت پوچھ گل عشق بازی کے پسینہ ہے وہ بوئے پاک کے جسم مطہر کا

زمانہ ٹھوکریں کھا کھا کے تھک گیا آخر محمدؐ عربی سا خدا نما نہ ملا

کیا حسینوں میں حق نے جو تھا یہ جنبہ یتیم مکہؐ سا کوئی دوسرا نہ ملا

اُمت البصیر عرف چنّو اور حاجی نبی احمد صاحب

اُمت البصیر عرف چنّو کے دادا حافظ عبد الخالق صاحب تھے۔ جو چمڑے کی تجارت کرتے تھے۔ اُن کی دکان تیلی واڑہ میں تھی، اچھے کھاتے پیتے تھے، اُن کی گدّی تھی جس پر بیٹھ کر دکان چلاتے تھے اور سیر و تفریح بھی اسی پر کرتے تھے۔ یہ غریبوں یتیموں اور بیواؤں کا خیال کرتے تھے۔ یتیم بچوں کی پرورش کرتے تھے۔ بڑے ہو جاتے تو شادی بیاہ کر کے کاروبار میں لگا دیتے تھے۔ یتیم بچیوں کی پرورش کرنے کے لئے اُن کی ماؤں کی تنخواہ مقرر کر دیتے تھے۔ بیوائیں گھر پر آتیں جو ضرورت لاتیں وہ پوری کرتے تھے۔

عبد الخالق صاحب کی پہلی بیوی سے عبد المالک صاحب اور دو لڑکیاں حسینہ بیگم زوجہ نور الٰہی صاحب کلکتہ والے اور برکت النساء زوجہ حافظ نذیر احمد صاحب ہوئیں۔ عبد الخالق صاحب دوسری بیوی سے شیخ سلیم الدین صدیقی عبد الواحد صدیقی اور عبد الجبار صدیقی ہوئے۔ شروع میں تینوں بھائیوں نے فتحپوری مسجد کے سامنے کورونیشن ہوٹل کے نیچے ایک دکان میں پاپوش کا کاروبار کیا۔ تینوں بھائیوں میں پیش پیش تھے۔ کوئی غریب، کوئی یتیم اور کوئی بیوہ ان کے گھر سے مایوس ہو کر نہیں جاتی تھی۔ اُن کی ہر ضرورت کا یہ بھی خیال کرتے تھے۔ اگر کسی کسی غریب کا ذکر کر دیا اور اس کی ضرورت معلوم ہو گئی تو خود اس کے گھر جا کر اس کی

ضرورت پوری کر دیتے تھے۔

سلیم الدین صاحب کی شادی امت السائرہ بنت حاجی یوسف صاحب سے ہوئی جن سے بشیر الدین صاحب، حاجی تراب الدین صاحب، حاجی نعیم الدین صاحب، محمد عاقل صاحب عبدالرحمٰن صاحب اور لڑکیاں امت النقیر زوجہ محفوظ الٰہی صاحب، امت البصیر عرف جنو زوجہ حاجی نبی احمد صاحب، کنیز فاطمہ زوجہ محمد عارف، سلطان بی، اور رقیب النساء ہوئیں [1]

ان بہن بھائیوں میں بھی خاندانی خیرات کرنے کا جذبہ تھا۔ دل کھول کر غریبوں کی مدد کرتے اور کرتی ہیں۔ امت البصیر عرف جنو بھی انہی میں سے ہیں۔

حاجی نبی احمد صاحب امت البصیر عرف جنو کے شوہر ہیں۔ ان کے سکڑ دادا نور محمد صاحب، پردادا نعمت اللہ صاحب، دادا حافظ عبدالغنی صاحب اور والد ماجد محمد امیر صاحب تھے۔

حاجی صاحب کے سکڑ دادا جناب نور محمد صاحب اور ان کے صاحبزادے نعمت اللہ صاحب نے دہلی میں جب جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں شروع ہوئی تو بہادر شاہ ظفر کی طرف سے انگریزی فوج کا مقابلہ کیا جب جنگِ آزادی ناکام ہو گئی تو دہلی والوں کو انگریزوں نے چن چن کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ ان حالات میں دہلی والے اپنی جانیں بچانے کے لئے دہلی سے نکل کھڑے ہوئے اور جس کا جدھر منہ اٹھا وہ اللہ کا نام لے کر ادھر چلا گیا۔ نور محمد صاحب اپنے صاحبزادے نعمت اللہ صاحب اور اپنے پوتے حافظ عبدالغنی صاحب کو لے کر دلی سے نکلے اور ملتب صاحب چلے

---

[1] دہلی صدیقی برادری کی شخصیتیں ص ۲۹۳

گئے۔ بہت دنوں تک دہلی ویران پڑی رہی ، نام کو بھی مسلمان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جو نظر پڑ جاتا، اُس کو سولی دیدی جاتی تھی[1] حافظ نور محمد صاحب کا انہیں دنوں قطب صاحب میں انتقال ہوا۔ گندھک کی باؤلی کے نزدیک ان کا مزار ہے۔

حاجی صاحب کے پردادا نعمت اللہ صاحب اور ان کے صاحبزادے حافظ عبدالغنی صاحب اُنیس مہینے تک قطب صاحب میں رہے۔ اس کے بعد دہلی آئے۔ جاتے وقت بھرے ہوئے گھر کو چھوڑ کر گئے تھے۔ کافی سامان، زیورات اور روپیہ تھا۔ دولتمندوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ صدقہ وخیرات کرنے میں ان باپ بیٹوں کا ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ دل کھول کر خیرات وصدقہ کرتے تھے۔ رمضان شریف میں زکوٰۃ کافی نکلتی تھی۔ دیگر مدرسوں غریب عزیزو اقارب اور دوسرے مستحق لوگوں میں تقسیم کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اس خاندان پر کسی قسم کی مصیبت نہیں آئی۔ یہ خاندان غریبوں کی دعائیں لیتا تھا۔

حافظ عبدالغنی صاحب اپنے محلہ چوڑی والان میں آگئے تو ان کے سامنے روزگار کا سوال تھا۔ وہ بڑی ہمت کے آدمی تھے۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد کی مصیبتیں جھیلنے کے بعد قوتِ برداشت اور بڑھ گئی تھی اور تکلیفوں کا مقابلہ کرنا جان گئے تھے اس لئے انھوں نے کاروبار کرنے کے لئے کلکتہ جانے کا فیصلہ کیا۔ اس زمانہ میں دہلی سے کانپور تک پیدل کا سفر تھا۔ وہاں سے الہ آباد تک ریل جاتی تھی اور پھر وہاں سے کلکتہ تک پانی کا راستہ تھا اور خشکی کی بھی راہ تھی لیکن وہ دہلی سے کلکتہ تک پیدل گئے اور تین مہینے میں ان کا قافلہ کلکتہ پہنچا۔ کلکتہ میں چھ برس رہے، وہاں پاپوش کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ وہ دہلی کے لئے ۱۸۹۴ء میں روانہ ہوگئے، اپنے ساتھ شیشے کا کافی سامان لائے۔ دہلی پہنچ کر یہ سامان فروخت کیا اور سڑک پریم نرائن کٹرہ بیری والا میں

---

[1] دہلی صدیقی برادری کی شخصیتیں صفحہ ۲۹۶

اپنا کارخانہ کھولا۔ اخوندجی صاحب کے مرید تھے صوفیوں سے ملنا جلنا تھا۔ دینی مدارس کا بڑا خیال رکھتے تھے، دہلی اور بیرون دہلی کے مدرسوں میں چندہ بھیجتے تھے طلبہ کے لئے ماہانہ وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ صدقات وخیرات دینے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ ان کا انتقال دہلی میں ہوا خواجہ باقی باللہ میں اخوندجی صاحب کے مزار کے قریب آرام فرما ہیں۔

ان کی شادی بسم اللہ صاحبہ سے ہوئی جن سے عبدالغنی صاحب، حاجی عبدالملک صاحب اور جناب محمد امیر صاحب اور دو لڑکیاں ہوئیں۔

جناب محمد امیر صاحب حاجی نبی احمد صاحب کے والد ماجد تھے انھوں نے عبدالرزاق صاحب کے ساتھ پاپوش کا کاروبار کیا اس کے بعد انھوں نے چاوڑی بازار کے نکڑ پر جامعہ ہوٹل کے پاس قاری جلال الدین صاحب کے قریب دکان لی۔ بمبئی بھی گئے وہاں بھی پاپوش کی تجارت کی[1] دہلی آگئے تو گھر پر کاروبار کیا توت کے بیوپاری تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے کام میں بڑی برکت دی۔ یہ کہا کرتے تھے جتنا خدا کی راہ میں دو گے اتنا ہی اللہ زیادہ دے گا۔ اس بات پر انھوں نے عمل کیا تو اللہ کا کرم ہی کرم رہا۔ دل کھول کر خیرات کرتے اور صدقہ دیتے تھے۔

یہ دونوں خاندان حاجی نبی احمد صاحب کا اور امت البصیر عرف چنو کا خاندان خیر، خدا ترس اور دینی معاملات میں دلچسپی لینے والا تھا۔

امت البصیر عرف چنو کو بھی اپنی خاندانی عادت تھی کہ کوئی غریب و یتیم و مسکین و بیوا ان کے گھر سے مایوس و نامراد ہو کر نہیں جاتی تھی۔ یہ بھی دینی معاملات میں دلچسپی لیتی تھیں۔ کافی عرصے سے جمعہ کے جمعہ ان کے گھر پر بعد نماز جمعہ تبلیغی اجتماع ہوتا تھا اس

---

[1] دہلی صدیقی برادری کی شخصیتیں صفحہ ۲۷۲

میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں جو اب تک جاری ہے۔ مذہب سے محبت اللہ اور اس کے رسول سے عقیدت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ یہ دو حج اور ایک عمرہ کر چکی ہیں مولوی محمد یوسف تقیہ دہلوی کے دینی پروگراموں کو چلانے اور کامیاب کرانے والی مخصوص عورتوں میں اُن کا شمار ہوتا تھا اپنے وعظوں میں مولوی صاحب دونوں میاں بیوی کا ان کے مذہب سے محبت وعقیدت کا ذکر کیا کرتے تھے۔

امت البصیر عرف چنّو قرآن مجید کی تعلیم میں بڑی دلچسپی لیا کرتی تھیں۔ اُن کا کافی وقت اس کام میں گزرتا تھا۔

جب پندرہ عورتوں کا پہلا گروپ قرآن مجید کی تعلیم لینے کے لیے تیار ہو گیا جس میں امت البصیر صاحبہ خود بھی تھیں تو مولوی صاحب اور ان عورتوں کے سامنے جگہ کا مسئلہ آیا کہ تعلیم کہاں دی جائے۔ یہ پندرہ عورتیں جمع ہوئیں اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے تو آگے بڑھ کے امت البصیر عرف چنّو صاحبہ نے کہا میرا گھر حاضر ہے۔ اس میں یہ تعلیم دی جائے۔ چنانچہ مولوی محمد یوسف صاحب کو اس بات کی اطلاع دی گئی۔ امت البصیر صاحبہ اپنے گھر میں مستورات کے آنے سے پہلے جگہ صاف کراتیں دری اور چاندنی بچھواتیں، پان چھالیا کا انتظام کرتیں گرمی کا موسم ہوتا تو ٹھنڈے پانی کا بندوبست کرتیں جاڑے کے موسم میں چائے تیار کراتیں مولوی یوسف صاحب تشریف لاتے اور تعلیم دیتے۔

بارہ دری شیر افگن خاں میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو صابرہ خاتون، فاطمہ، سکینہ وغیرہ عورتوں کے ساتھ امت البصیر صاحبہ بھی پڑھانے جاتیں۔ پھاٹک تیلیان اور کوچہ ناہر خاں وغیرہ میں تعلیم کا سلسلہ پھیلا یا تو وہاں بھی جانے سے گریز نہیں کیا ان مذکورہ مستورات کے ساتھ جا کر قرآن مجید کی تعلیم دیتیں۔ مدرسہ نسواں گلی مسجد والی میں جاری ہوا۔ تو وہاں بھی جا کر پڑھایا۔ قرآن مجید کی تعلیم دینے میں ان مستورات نے کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی۔

دولتمند عورتوں کی طرح ان میں رعونت نہ تھی۔ ان کی ساتھی عورتیں ہر قسم
کی تھیں ان سے برابری کا سلوک کرتی تھیں۔ اپنی دینی بہنیں سمجھتی تھیں۔ ان مستورات
میں آپس میں سگی بہنوں جیسا سلوک ہوتا تھا اور ہوتا ہے۔

امت البصیر عرف چترو صاحبہ کا انتقال ۲۴ نومبر ۱۹۸۷ء کو ہوا۔ ان دینی
بہنوں نے مل کر کافی قرآن مجید ختم کر کے ان کو ثواب پہنچایا جس کا سلسلہ اب تک جاری
ہے یہ دینی بہنیں ان کا نام لے کر ان کی محبت بھرنے والے واقعات یاد کر کے
محبت بھرے انداز میں پرنم ہو جاتی ہیں۔

اللہ تعالےٰ امت البصیر عرف چترو صاحبہ کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔
آمین۔ اب ایسی عورتیں پیدا نہیں ہوں گی۔ جن کو دین سے اور دینی معاملات سے
اتنا شغف ہوگا۔ اور قرآن مجید کی تعلیم سے ایسا لگاؤ ہوگا۔

یہ مضمون ختم کرنے نہ پایا تھا کہ ۱۱ دسمبر ۱۹۸۷ء جمعرات کو دن کے ایک بجے
آپا رئیسہ کے لڑکے نے ایک منحوس و پریشان کن خبر گھر پر آکر دی کہ آج دن کے تقریباً
بارہ بجے حاجی نبی احمد کا انتقال ہسپتال میں ہو گیا۔ یہ خبر انتہائی تعجب خیز تھی سن کر
ایک دم سکتہ طاری ہو گیا یقین نہیں آتا تھا۔ معلوم ہوا کہ صبح اپنی اہلیہ کے ناشتہ کا
سامان لا کر پکوانے کے لیے جا چکے تھے بارہ بجے کے قریب گھبراہٹ محسوس کی ڈاکٹر
معین الدین صاحب کو بلوایا گیا انھوں نے مشورہ دیا قریب کے ہسپتال میں لے
جائیے۔ چنانچہ لے جایا گیا۔ پلنگ پر لٹا دیا گیا۔ ڈاکٹر نے کہا گھبرائیے نہیں۔ آپ
ٹھیک ہیں ابھی معائنہ کرتا ہوں اسی اثنا میں روح نکل چکی تھی گھر سے چلنے سے
پہلے کلمہ کا ورد جاری تھا۔ کہا تو یہ جائے گا کہ اہلیہ کی موت کا صدمہ بستر [illegible] سے
ان کو گھلا رہا تھا۔

۱۰ دسمبر کی رات کو بچوں سے بات کی تھی درمیان گفتگو میں بچوں نے کہا کہ آپا

ہم آپ کی وجہ سے نہیں روتے حاجی جی نے بچوں سے کہا میں تمہاری وجہ سے نہیں روتا۔ یہ حقیقت ہے کہ میاں بیوی میں آپس میں بہت محبت تھی۔ حاجی نبی احمد صاحب طبعاً حلیم الطبع اور بُردبار انسان تھے اپنی طبیعت کی وجہ سے اندر ہی اندر گھٹ رہے تھے۔ غرض یہ عجیب و غریب واقعہ ہوا ہے کہ اہلیہ کے رنج میں سترہ دن کے اندر غم کھاتے کھاتے حاجی نبی احمد صاحب نے اپنی جان دیدی۔

یہ واقعہ تو ظاہرہ طور پر اہلیہ کے انتقال کا ہو سکتا ہے لیکن ان کی موت کا یہ وقت اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھا تھا یہ وجہ ہوئی دوسری وجہ ہوتی۔ ان کے مرنے کی ساعت تو یہی مقرر تھی۔

لیکن اس واقعہ نے عزیز و اقارب اور متعلقین کو ہلا کر رکھ دیا ہے جس جاننے والے نے سُنا۔ اس کو سُنکر بے پناہ حیرت ہوئی جو سُنتا سکتے میں رہ جاتا۔

حاجی نبی احمد صاحب ۱۹۱۶ء میں دہلی محلہ چوڑی والاں میں پیدا ہوئے۔ قاری فتح محمد صاحب سے ابتدائی قرآن مجید کی تعلیم پائی آٹھ نو سال کی عمر میں حاجی عبد الحکیم صاحب کی دکان جنرل برٹش ہاؤس میں کام سیکھا۔ اُن کے بھائی حافظ نصیر احمد صاحب نے نئی سڑک پر ایک دکان کر لی تھی اس میں بھائی کے ساتھ کام کیا۔ ۱۹۴۸ء میں تحصیلدار اینڈ کو کے نام سے بلی ماران میں ہول سیل کا کاروبار شروع کیا جو اب تک جاری ہے۔ ان کی شادی ۱۹۴۴ء میں امت البصیر صاحب بنت شیخ سلیم الدین صاحب صدیقی سے ہوئی [1]

راقم الحروف امداد صابری نے جب سے ہوش سنبھالا ہے حاجی نبی احمد کو ایک وضع قطع کا سیدھا سادہ آدمی ہمیشہ دیکھا اور حلیم الطبع ہنس مکھ ملنسار انسان پایا۔ ان کی تمام زندگی دیکھ کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ حاجی نبی احمد صاحب بچپن سے ان خصوصیات کے حامل چلے آتے

[1] دہلی صدیقی برادری کی شخصیتیں صـــ ۲۷۵

ہونگے کتنے بندگانِ خدا کو اُن سے فائدہ پہنچا ہوگا کتنے غریبوں مفلسوں مسکینوں ضرورتمندوں بیواؤں دینی مدارس کی خفیہ امانت کی ہوگی اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ وہ ان مخیر لوگوں میں سے تھے جو صدقات، خیرات اور زکوٰۃ دینے میں ایک ہاتھ دینے والے کے علاوہ کسی کو بھی پتہ نہیں چلتا تھا۔ وہ دینی کاموں میں انتہائی دلچسپی لیتے تھے، دینی مدارس اور طلباء کی دل کھول کر امداد کرتے تھے، ختم بخاری وغیرہ میں شریک ہونا ضروری سمجھتے تھے۔ دہلی اور بیرونِ دہلی کا علمی طبقہ حاجی نبی احمد صاحب کے اُن کے اخلاق و عادات اور اُن کے کاموں سے بخوبی واقف تھا۔

حاجی نبی احمد صاحب صرف خدمت کرنا جانتے تھے عہدہ اور شہرت سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ حال میں دہلی صدیقی برادری کی وقف کمیٹی کے عہدیداروں کا انتخاب ہوا اور اُن کو جنرل سکریٹری بنایا جانے لگا تو حاجی نبی احمد کرسی سے اٹھ کر میٹنگ میں سے نکل کر کمرے کے باہر یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ میں اس کو پسند نہیں کرتا۔ جب ذمہ دار لوگوں نے اُن کو یقین دلایا کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے اُس پر عمل کیا جائے گا جب حاجی نبی احمد صاحب میٹنگ میں شریک ہوئے۔ ان کے نام پر کسی ایک فرد کو بھی اختلاف نہ تھا۔

حوض والی مسجد محلہ چوڑیوالان اور مدرسہ تعلیم القرآن نسواں کی تعمیر اور کامیاب کرنے میں حاجی نبی احمد صاحب اور ان کے ساتھیوں کا بڑا حصہ ہے۔ مولوی محمد یوسف صاحب حاجی نبی احمد صاحب اور حاجی نبی احمد صاحب کے بڑے معتقد تھے اور حاجی نبی احمد صاحب کی باتیں مانتے تھے اسی کتاب میں مولوی یوسف صاحب کے حالات زندگی چھپے ہیں۔ ان کے خطوط پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ حاجی صاحب کی رائے کو مولوی یوسف صاحب کتنی وقعت دیتے تھے۔ مولوی صاحب کے علاوہ کاروباری علمی دینی و سیاسی طبقہ بھی اس طرح حاجی نبی صاحب کی قدر و منزلت کرتا تھا۔ ۲ دسمبر کی رات کو بڑی مسجد کے سلسلہ میں دہلی میں ہونے والی کانفرنس کو کامیاب کرنے کیلئے جمعیۃ علماء کی تمام جلی جنتا کی بڑی کے کمرہ کی میٹنگ میں راقم الحروف بلا دعوت ہی پہنچا اور حاضرین کو اُس انتقال کی خبر سنائی تو مولانا اخلاق حسین قاسمی اور مولانا نعیم الدین جو ان کے بڑے معتقد تھے سنا تو بیتاب ہو کر بول اُٹھے ہائیں حاجی نبی احمد کا ہائیں حاجی نبی احمد صاحب کا انتقال ہو گیا کیا تھا ہم یہ لگ کہے رہے ہیں حاجی نبی احمد صاحب دہلی کے مخیر لوگوں کی ایک نشانی تھے اللہ تعالیٰ اُن کو غریقِ رحمت کرے اور اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین

حرفِ آخر

دہلی کی تاریخ اتنی وسیع ہے اور ہندو مسلمان اور سکھ خاندان اور شخصی لوگوں کے حالاتِ زندگی اس قدر ہیں کہ ایک کتاب ہی کیا جتنی کتابیں لکھی جائیں اتنی ہی کم ہوں گی اور یہ احساس ہوگا کہ کچھ نہیں لکھا گیا۔

دہلی کی برادریاں، یہاں کے فنکار، یہاں کے اہلِ علم اور اہلِ علموں کی شاخیں، محلوں اور گلیوں کے حالات لکھے جائیں تو بھی پورے نہیں ہوں گے۔

دہلی کی پنجابی سوداگران برادری ہے، صدیقی برادری ہے، قریشی برادری ہے اور بہت سی برادریاں ہیں، دو برادری پنجابی سوداگران اور صدیقی برادری پر تو لٹریچر مل جاتا ہے لیکن دوسری برادریوں کے نام کے علاوہ اُن کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔

میں پچھلے سال پاکستان گیا تھا۔ وہاں پنجابی سوداگران کے حالاتِ زندگی پر "یادِ رفتگان" ملی اسمیں تاجر بھی ہیں، ادیب بھی ہیں، صحافی اور علمی و سیاسی لوگ بھی ہیں۔ مذہبی خیالات کے اشخاص بھی ہیں۔ میں نے اس کتاب میں سے اپنی اس کتاب کے لئے بیس کے قریب لوگوں، حاجی رشید احمد صاحب، ایس ایم عبداللہ، خان بہادر حبیب الرحمٰن، شیخ محمد تقی ایڈوکیٹ، شیخ عثمان آزاد اور عمر فاروقی وغیرہ جیسے نامور لوگوں کے حالاتِ زندگی تحریر کئے ہیں، اُن میں اس برادری میں وہ حضرات بھی ہیں جنھوں نے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں شرکت کی تھی۔ ایک عنوان کے تحت ان انقلابی لوگوں کے حالاتِ زندگی اس کتاب میں قلمبند کئے ہیں۔ اس کتاب کو سلطان فیض صاحب

نے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ اردو کے ادبی حلقوں پر یہ کتاب طبع کرا کر بڑا احسان کیا ہے۔ میں نے
بھی دہلی کی صدیقی برادری پر ایک کتاب تالیف کی تھی۔ اس میں سے حافظ جی کے حالات اخذ کئے ہیں۔

دہلی صدیقی برادری کی ایک مشہور شخصیت حضرت مولانا محمد یوسف فقیر دہلوی دہلی کے
شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندانی سلسلے کی ایک آخری کڑی تھے جنہوں نے اپنے بزرگوں کی یاد کو
اور علمی کمالات کو زندہ رکھ رکھا تھا۔ انکی وفات کے بعد فیروز دہلوی صاحب نے ایک مضمون قومی آواز دہلی میں
مولوی یوسف صاحب کے حالات زندگی پر شائع کرایا جو بڑا جامع و مفید ہے۔ اس کتاب میں میں مولوی صاحب کے
حالات زندگی شائع کرنا چاہتا تھا۔ فیروز صاحب کے مضمون کا حصہ بھی نقل ہوا ہے۔ میرا قاعدہ ہے کہ اگر میں
کسی کے مضمون سے اخذ کرتا ہوں تو میں چاہتا ہوں کہ اس حصہ کے مقابلہ میں پانچ گنا اضافہ کروں
چنانچہ میں نے اس مضمون میں بھی اس بات کی کوشش کی ہے۔

مولوی یوسف صاحب نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں قرآن مجید کی تعلیم کو دہلی میں پھیلایا۔
اس متبرک کام میں میری اہلیہ صابرہ خاتون، اہلیہ حاجی نبی احمد، اہلیہ حاجی نواب الدین اور فاطمہ
بیگم وغیرہ نے بہت حصہ لیا۔

مولوی محمد یوسف صاحب نے مدرسہ نسواں جاری کیا جس کا اندرونِ مدرسہ ہیڈ صابرہ خاتون
کو مقرر کیا۔ وقتاً فوقتاً ان کو اس سلسلے میں پرچے بھی تحریر کرتے اور اپنے مشورے بھی دیتے رہے۔
اور استانیوں کو مشورے بھی کرتے رہے۔ ان پرچوں کو انہوں نے حفاظت سے رکھا اور فاطمہ
بیگم نے مولوی صاحب کی تقریروں کی کیسٹ اپنے پاس محفوظ رکھے۔ مولوی صاحب کے
انتقال کے بعد مولوی صاحب کے تمام کاغذات انکے صاحبزادے مولوی خورشید عالم صاحب کے قبضہ
میں آئے۔ خورشید صاحب نے اس مضمون میں میری مدد کی۔ مولوی صاحب کی اہلیہ سرور
جہاں نے مولوی صاحب کے حالات لکھنے میں اعانت کی۔ فاطمہ بیگم نے کیسٹ سنائے۔ میری اہلیہ
صابرہ خاتون نے مولوی صاحب کے چند واقعات بتائے جن سے یہ مضمون تیار ہوا۔

دست بصیر عرف چراغ مستورات ہیں جنہوں نے مولوی یوسف کی تعلیم القرآن کو

پھیلانے میں کافی مدد کی۔ اپنا گھر اس تعلیم کے لئے ہمیشہ کھلا رکھا۔ اور ہمہ تن مصروف رہیں۔ افسوس کہ مولوی یوسف صاحب کے انتقال کے بعد ان کا بھی ۲۴ نومبر ۱۹۸۶ء کو انتقال ہوگیا۔ میں نے ضروری سمجھا کہ آپ کے حالات زندگی اس کتاب میں شائع کئے جائیں۔ چونکہ پوری کتاب کی کتابت ہو چکی تھی اس لئے ان کے حالات زندگی کتاب کے آخر میں دیئے گئے۔ امت البصیر عرف چھو کے خاوند حاجی نبی احمد صاحب کا خاندان بھی خیر اور دینی کاموں میں حصہ لینے والا تھا۔ اسی طرح امت البصیر صاحبہ عرف چھو کا خاندان بھی اللہ کی مخلوق کی خدمت کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ چنانچہ ان دونوں میاں بیوی نے اپنے خاندان کے نقش قدم پر چل کر دین کی خدمت کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ اس کا ذکر اس مضمون میں اختصار کے ساتھ آیا ہے۔ اس شیطانی اور مادی دنیا میں جب ایسے لوگ نظر آتے ہیں تو خدا کا فضل و کرم یاد آتا ہے کہ ابھی ایسے انسانیت نواز لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ مولوی یوسف صاحب نے تین گروپ کو خود تعلیم دی تھی جس کی وجہ سے آج دہلی میں قرآن مجید صحیح اور تجوید کے ساتھ پڑھنے لگیں اور اس تعلیم کو دینے میں مصروف ہیں۔ ان عورتوں میں خصوصیت کے ساتھ امت البصیر عرف چھو، فاطمہ بیگم، سکینہ، زوجہ ابراہیم، شفقو آپا بیگم، کنیز فاطمہ اور صابرہ خاتون پیش پیش ہیں۔ یہ اب بھی مستورات کو تعلیم دے رہی ہیں اور فاطمہ بیگم کا کیا کہنا ان کی وجہ سے تعلیم نسواں کا مدرسہ خوب کام کر رہا ہے۔ مرفاوالی صاحب کو اللہ تعالےٰ تندرستی دے وہ اس اسکول کے سکریٹری ہیں۔ وہ بھی اس اسکول کو چلانے میں بے حد کوشاں ہیں۔ خدا ان لوگوں کو ہمت دے، طاقت دے، تندرستی دے۔ مولوی یوسف صاحب کا یہ دینی گلستان لگایا ہوا ہمیشہ سرسبز و شاداب رہے۔ آمین۔ یہ مضمون ختم ہی ہوا تھا کہ ۱۱ دسمبر ۱۹۸۶ء کو دن کے ۲ بجے کے قریب اطلاع ملی کہ آج حاجی نبی احمد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ مجھ کو کتنا دکھ ہوا اور افسوس ہوا کہ دماغ مختل ہو گیا۔ امت البصیر عرف چھو صاحبہ کے مضمون میں حاجی نبی احمد صاحب کے حالات زندگی کا اختتام کیا۔ خدا کے بھید خدا ہی جانتا ہے۔ ہم کوتاہ عقل اس کے بھید کو ذرہ برابر بھی نہیں سمجھ سکتے۔ اللہ تعالےٰ ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ان کے اعمال تو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں وہ جنتی تھے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ان کی روح سیدھی جنت میں پہنچی ہوگی۔

امداد صابری۔ مدرسہ مولتیہ۔ تحریر مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۸۶ء

اللہ کے گھر میں بار بار حاضری

کعبۃ اللہ دنیائے اسلام کا مرکز ہے اللہ رب العزت نے ہر سال ذی الحجہ کے مہینے میں بہ حسب استطاعت مسلمانوں پر حج فرض کیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے میری قبر کی زیارت کی اس پر میری شفاعت واجب ہو گئی۔

مولانا امداد صابری نے اپنی اہلیہ صاحبہ کے ساتھ ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۹۸۰ء تک خدا کے گھر میں اور حضور خاتم المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ پر حاضری کی سعادتیں حاصل کیں۔

اس زمانے کے تغیرات و تبدیلیاں جو حجاز مقدس میں حرمین شریفین کی توسیع کے سلسلے میں ہوئیں اور سڑکوں کے جال سعودی حکومت نے حاجیوں کو آرام پہنچانے کے لئے فراہم کرنے [illegible] کو نیست و نابود کرنے کی کوششیں کیں۔ اس کا ذکر ان سفرناموں میں ہے۔

۱۹۵۳ء میں حاجیوں کو کیا دقتیں تھیں اور ایک ایک کرکے کس طرح سعودی حکومت نے مٹائیں۔ اس کا بھی ذکر اس میں کیا گیا ہے۔

ہر حاجی اللہ تعالیٰ کا مہمان ہوتا ہے اور حاجی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی کیا کیا نوازشات اور مہربانیاں ہوتی ہیں خاص طور پر اس کی تفصیل کے ساتھ ان سفرناموں میں ذکر کیا گیا ہے۔

ان سفرناموں کی یہ پہلی جلد ہے جس میں چار سفرنامے شائع کئے گئے ہیں۔

اس پہلی جلد کی قیمت تیس روپے ہے۔

ملنے کا پتہ: صابرہ کتاب گھر ۲۴۷۱ چوڑی والان دہلی ۶

امام الہند حضرت مولانا آزاد

امام الہند حضرت مولانا آزاد مولانا امداد صابری کی اہم تصنیف ہے یہ تصنیف حضرت مولانا آزاد کے وجود گرامی کی وجہ سے وقعت پائیگی بلکہ تالیف و تدوین کے حسن و مباحث کی جامعیت سے تحقیق کے معیار اور اسناد کی بنا پر بھی صابری صاحب کی اہم تالیف تسلیم کی جائیگی اور اس لحاظ سے بھی کہ حضرت مولانا آزاد پر اب تک لٹریچر اور سوانح و خدمات کے جو تذکرے شائع ہوئے ہیں ان میں یہ تالیف مولانا علیہ الرحمۃ کی پوری زندگی اور اُن کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔

حضرت امام الہند مولانا آزاد، مولانا صابری کے ممدوح ہیں لیکن مصنف اور مورخ کی حیثیت سے انھوں نے حضرت مولانا آزاد کے حالات زندگی اور افکار و خدمات کے تذکرے میں عقیدتمندانہ طرزِ عمل اور اسلوبِ بیان اختیار نہیں کیا ہے بلکہ اُن کے خیالات و اسلوبِ بیان میں توازن پایا جاتا ہے۔

یہ کتاب مولانا ابو سلمان شاہجہانپوری صاحب نے بہ تقریب صد سالہ پیدائش امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل کمیٹی پاکستان کی جانب سے شائع کی۔ قیمت:- پچپن ۵۵ روپے۔

ملنے کا پتہ۔ صابرہ بکڈپو۔ ۲۶۷ محلہ چوڑیوالان۔ دہلی ۶

دہلی کی یادگار شخصیتیں

اس کتاب میں دہلی کے قدیم خوشنویس، اطباء، موسیقار، اردو فارسی کے شاعرات، بیگمات دہلی کی یادگاریں، خواجہ میر درد کی دنیا سے بے نیازی، ان کے خاندان کی ادبی خدمات، مدرسہ علوم مدرسہ حسین بخش دہلی اور دہلی پنجابی برادری کے اشخاص کی جنگ آزادی میں شرکت کے ساتھ چودھری احمد بخش دہلی اور دہلی پنجابی برادری کے اشخاص کی جنگ آزادی میں شرکت کیا، چودھری احمد بخش صاحب ماسٹر امیر بیگ اینگلو عربک ہائر سکنڈری اسکول دہلی، ایس ایم عبداللہ صاحب، خان بہادر حاجی رشید احمد، بیگم مولانا عبدالرزاق صاحب، برج موہن دتاتریہ کیفی، دھرم نرائن، قاری جلال الدین، حافظ بہادر خاں، حبیب الرحمٰن انقلابی رہنما، سید حیدر رضا، قاری سرفراز عزمی، مفتی شوکت علی فہمی صاحب، حافظ محمد صدیق ملتانی، شیخ محمد عثمان آزاد، عمر فاروقی، علامہ عبدالحق حقانی، مولانا عبدالرحیم قادری، مولوی عزیز مرزا، کرم اللہ خاں شیدا مرزا محمد سعید، محمد مسلم صاحب، مولانا شاہ نسیم، محمد تقی ایڈووکیٹ، موتی لال بسمل صاحب، جسٹس وحید الدین، مولانا محمد یوسف فقیر، امۃ البصیر عرف جیو اور حاجی نبی احمد صاحب، عبدالسلام بی اے، اجودھیا پرشاد وغیرہ وغیرہ کے تفصیلی حالات زندگی درج ہیں۔ یہ کتاب تقریباً سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت چالیس روپے۔

ملنے کا پتہ۔ صابرہ کتاب گھر ۲۶۷۰ محلہ چوڑیوالان دہلی ۶

دہلی کی انقلابی ہستیاں

اس کتاب میں جو مولانا امداد صابری کی تالیف ہے ۱۸۵۷ء کے شہدا کے
حالاتِ زندگی، مولانا محمد باقر ایڈیٹر دہلی اردو اخبار، مولانا امام بخش صہبائی، مولانا فضل حق خیرآبادی۔
سنت نرائن گھڑ والے، بہادر شاہ ظفر، ماسٹر امی چند، ماسٹر اودھ بہاری، بال مکند، محترمہ
بہن ستیہ وتی وغیرہ وغیرہ کے ساتھ اسیران لالہ شنکر لال، لالہ دیش بندھو گپتا، مولانا عارف ہسوی،
حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ صاحب، لالہ ہنونت سہائے، سبحان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب،
حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مسٹر آصف علی بیرسٹر، مولانا ادریس، لالہ دیس راج
چودھری، آتم لکشمی رام لال ورما، زبیدہ دیوی، لالہ رادھا رمن، میر مشتاق احمد، مولانا
نور الدین بہاری، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا عبید اللہ آٹو والے، مولانا مسیح اللہ قاسمی،
سالار عبدالستار، سر سروپ ختر، برج کشن چاندی والے، چودھری حکم سنگھ، چودھری
برہم پرکاش، ڈاکٹر یدھ وبر سنگھ، ارونا آصف علی، کامریڈ بہال سنگھ، کامریڈ
مقیم الدین، کامریڈ سچدت شرما، سرلا دیوی، رشید خاں، جگت گوپال (دلی سونی)
چند بھگی، مکند لال جوہری، محبوب علی منیار، بابا رام آزاد، بہادر دیا لنکار، ترلوک ناتھ
کندرا، واسدیو ہیتوری، کے پی شنکر، سردار رنجن سنگھ، لالہ اونکار ناتھ، سیٹھ (تلیا)
لال چند سہگل، سردار بسنت سنگھ قومی، قاری محمود، مولانا منظر سعید، لالہ رام پیارے لال
ایڈووکیٹ، وید مودداس، چند لال، شوکت علی ہاشمی، پارتی دیوی، چرنجی لال، پالیوال وغیرہ
وغیرہ کے حالاتِ زندگی درج ہیں۔ قیمت: چالیس روپے۔

ملنے کا پتہ۔ صابرہ بک ڈپو، ۲۶۷۰، محلہ چوڑیوالان دہلی

علماء ہند پاک کی حجاز مقدس میں دینی خدمات

جب سے اسلام میں حج فرض ہوا ہے اور اسلام جہاں جہاں پھیلا ہے اسکی بابرکت شعاعوں نے جن
خطوں کو منور و روشن کیا وہاں سے مسلمان حج بیت اللہ کے لئے آنا شروع ہو گئے اور حضرت
خاتم النبیین محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مقدس کی زیارت کیلئے جانے لگے۔
ہندوستان سے بھی مسلمانوں کے قافلے حج بیت اللہ کیلئے روانہ ہونے لگے جس میں ہندوستان
کے ہر صوبے ہر ضلع اور ہر قصبے کے مسلمانوں نے یہ سعادت حاصل کرنی شروع کر دی
اُس زمانہ میں یہ بڑے بڑے منظم و اسلامی قسم کے پانی کے جہاز نہیں تھے ہوائی
جہاز کا نام و نشان تک نہ تھا چھوٹے چھوٹے جہاز عازمین حج کو لے جاتے تھے جن کا تمام دارومدار
ہوا پر ہوتا تھا اور ہوا کے رُخ کا محتاج ہوتا تھا۔ یہ چھوٹے جہاز کافی دنوں میں پہنچتے تھے۔
اسلام کا سب سے پہلا دینی تعلیمی مدرسہ اصحاب الصفہ تھا جس میں رسول
خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو دینی تعلیم فرماتے تھے دیگر صحابہ علیہم السلام دوسرے
صحابیوں کو تعلیم دیتے تھے۔
مدینہ منورہ مکہ معظمہ اور حجاز مقدس میں دار کون کون سے دینی مدرسے قائم ہوئے حضور صلی اللہ علیہ
وسلم اور خلفاء راشدین کے زمانے کے مدرسوں کی حالات اس کتاب میں درج ہیں۔
اس کے بعد ہندوستان کے جلیل القدر علماء کرام حجاز مقدس میں تشریف لے گئے کس طرح علوم دینی کو
مقام مقدس میں فروغ دیا۔ یہ بات ابھی تک علمی دنیا کی نظروں میں نہیں ہے بہت کم تھی اس موضوع پر مولانا امداد صابری صاحب نے علمی و
دینی دنیا پر احسان عظیم کیا ہے یہ کتاب تالیف ہو چکی ہے انشاء اللہ تعالیٰ جلد کتابت و طباعت کے مرحلوں سے گذر کر طبع ہو جائیگی۔

ملنے کا پتہ:۔ صابرہ کتاب گھر، ۲۶۷۰ محلہ چوڑی والان دہلی

فہرستِ مضامین